فہرست مضامین

نمبر شمار	مضامین	صفحہ نمبر
1	دنیا کی آئینی تاریخ کا ایک انوکھا واقعہ	1
2	الٰہی سلسلوں کی مخالفت	7
3	1970ء کے الیکشن اور مولویوں کی ناکامی	10
4	آئین میں ختم نبوت کا حلف نامہ	27
5	کشمیر اسمبلی میں جماعت احمدیہ کے خلاف قرارداد	37
6	1973ء کی ہنگامی مجلس شوریٰ	44
7	لاہور کی اسلامی سربراہی کانفرنس	51
8	رابطہ عالم اسلامی میں تیار ہونے والی سازش	61
9	29 مئی 1974ء کا واقعہ	82
10	فسادات کا آغاز	85
11	صمدانی ٹریبونل کی کارروائی شروع ہوتی ہے	93
12	یکم سے پندرہ جون 1974ء تک کے حالات	96
13	پندرہ جون سے تیس جون 1974ء تک کے حالات	108
14	پاکستان کی قومی اسمبلی پر مشتمل ایک سپیشل کمیٹی کا قیام	114
15	جماعت احمدیہ کا محضر نامہ	125
16	یکم جولائی سے پندرہ جولائی 1974ء تک کے حالات	132

17	قومی اسمبلی کی خاص کمیٹی میں کارروائی	142
18	حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ محضر نامہ پڑھتے ہیں	145
19	5/اگست کو کاروائی شروع ہوتی ہے	150
20	6/اگست کی کاروائی	206
21	7/اگست کی کاروائی	253
22	8/اگست کی کاروائی	296
23	9/اگست کی کاروائی	332
24	10/اگست کی کاروائی	361
25	21/اگست کی کاروائی	415
26	22/اگست کی کاروائی	435
27	23/اگست کی کاروائی	462
28	کاروائی کا آخری دن	481
29	چند اہم نکات کا اعادہ	510
30	اٹارنی جنرل صاحب بحث سمیٹتے ہیں	527
31	قومی اسمبلی کا فیصلہ	545
32	بحیثیت ادارہ پاکستان کی قومی اسمبلی کا انجام	562
33	نواب محمد احمد قصوری کا قتل	565
34	1974ء کے فیصلہ کا منطقی انجام	596

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

حرفِ آغاز

دنیا کی آئینی تاریخ کا ایک انوکھا واقعہ

1974ء میں پاکستان کے آئین میں کی جانے والی دوسری ترمیم بہت سے پہلوؤں سے دنیا کی آئینی تاریخ کا ایک انوکھا فیصلہ تھا۔ اس آئینی ترمیم کے ذریعہ سے بزعمِ خود یہ فیصلہ کیا گیا کہ ایک گروہ کو کس مذہب کی طرف منسوب ہونے کا حق ہے اور اس گروہ کے مذہب کا کیا نام ہونا چاہیئے؟ اس ترمیم سے قبل اس مسئلہ پر غور کے لئے پاکستان کی پوری قومی اسمبلی کو ایک سپیشل کمیٹی میں تبدیل کر دیا گیا تھا اور اس سپیشل کمیٹی نے اس مسئلہ پر غور شروع کیا۔ شروع ہی سے یہ قاعدہ بنا دیا گیا تھا کہ اس کمیٹی کی کارروائی خفیہ رکھی جائے گی اور بار بار اس کا اعادہ کیا گیا اور یہ یقینی بنایا گیا کہ اسمبلی ہال کے باہر کسی کو اس کارروائی کی حقیقت کا علم نہ ہو سکے۔ اس کارروائی کے دوران جماعت احمدیہ کا وفد بھی گواہ کی حیثیت سے پیش ہوا اور اس سپیشل کمیٹی کے سامنے جماعتِ احمدیہ کا مؤقف ایک محضر نامہ کی صورت میں پڑھا گیا اور جماعتِ احمدیہ کا یہ موقف پیش کیا گیا کہ قانون کی رو سے، عقل کی رو سے اور قرآنی تعلیمات اور احادیثِ نبویہ کی رو سے دنیا کی کوئی بھی پارلیمنٹ یا اسمبلی اس سوال کے بارے میں فیصلہ کرنے کی مجاز نہیں ہے۔ اس کے بعد ممبرانِ قومی اسمبلی نے گیارہ روز تک جماعتِ احمدیہ کے وفد سے سوالات کئے۔ ان سوالات اور ان کے جوابات کا تجزیہ تو ہم بعد میں پیش کریں گے لیکن یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ اس کارروائی کے دوران ہی اس کا ریکارڈ محفوظ کرنے کے حوالے سے ایسی باتیں سامنے آئیں جن سے یہ بات واضح ہوتی تھی کہ انصاف کے معروف تقاضے پورے نہیں کئے جا رہے۔ دنیا بھر کی عدالتوں میں یہ طریقہ کار ہے کہ جب کوئی گواہ بیان دیتا ہے تو اس کے بیان کا تحریری ریکارڈ گواہ کو سنایا جاتا ہے اور دکھایا جاتا ہے اور وہ اس بیان کو تسلیم کرتا ہے تو پھر یہ بیان ریکارڈ کا حصہ بنتا ہے۔ لیکن اس کارروائی کے دوران حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ نے فرمایا کہ ہمیں بھی اس کی کاپی دی جائے لیکن انکار کیا گیا اور ایک ممبر اسمبلی کی طرف سے بھی یہ سوال اُٹھایا گیا کہ کیا جماعتِ احمدیہ کے وفد کو اس کی کاپی دی جائے گی تو سپیکر صاحب نے کہا

کہ ان کو اس کی کاپی نہیں دی جائے گی۔ یہ طریقہ کار صرف عدالتوں میں ہی نہیں رائج بلکہ دنیا کی پارلیمنٹوں کی کمیٹیوں میں بھی جب کوئی گواہ پیش ہوتا ہے تو یہی طریقہ کار اپنایا جاتا ہے۔ ہم اس کی دو مثالیں پیش کرتے ہیں۔ برطانیہ کے ہاؤس آف کامنز کی select committees میں گواہی کو ضبطِ تحریر میں لانے کے قواعد میں لکھا ہے:۔

A transcript of what was said in oral evidence is available a few days after the hearing. This uncorrected transcript is :

Published on the committee website ,

And sent to witness

Witnesses are asked to correct the transcript and identify any supplementary information asked for by members of the committee. The transcript will be accompanied by a letter giving details of the very limited sorts of corrections which are acceptable and the deadline by such corrections needs to be sent to committee staff .

ان قواعد سے ظاہر ہے کہ جب پارلیمانی کمیٹی میں کوئی گواہ پیش ہو تو یہ اس گواہ کا حق ہے کہ وہ اپنی گواہی کا تحریری ریکارڈ ملاحظہ کرے اور اگر اس میں کوئی غلطی ہو تو اس کی نشاندہی کر کے اسے درست کرائے۔ آسٹریلیا کی پارلیمنٹ کے قواعد میں لکھا ہے

The Senate resolutions provide that "Reasonable opportunity shall be afforded to the witnesses to make corrections of errors of transcription in the transcript of their evidence and to put before a committee additional material supplementary to their evidence .

(Government Guidelines for Official Witnesses before Parliamentary Committees and Related Matters-November 1989) .

آسٹریلیا کی پارلیمنٹ کے ان قواعد کی رو سے گواہ کو اس چیز کا خاطر خواہ موقع ملنا چاہیئے کہ وہ اپنی گواہی کا تحریری ریکارڈ پڑھ کر اس میں موجود غلطیاں درست کرائے اور اگر یہ گواہ پسند کرے تو اضافی تحریری مواد بھی ریکارڈ میں شامل کر سکتا ہے۔

اس سپیشل کمیٹی میں جماعت کا وفد بحیثیت گواہ پیش ہوا تھا لیکن ان کو ان کے بیان کا تحریری ریکارڈ نہیں دکھایا گیا تا کہ وہ اس میں ممکنہ غلطیوں کی نشاندہی کر سکیں۔

جس دن قومی اسمبلی نے آئین میں دوسری ترمیم کے منظوری دی اس روز وزیرِ اعظم نے قومی اسمبلی میں تقریر کی اور اس میں کہا کہ گو ابھی اس کارروائی کو خفیہ رکھا گیا ہے لیکن بعد میں اس کو منظرِ عام پر لایا جائے گا۔ اس کے بعد یہ کارروائی تو منظرِ عام پر نہ آئی لیکن احمدیوں نے اور انصاف پسند طبقہ نے اس فیصلہ کے چند روز بعد اخبارات میں یہ خبر حیرت سے پڑھی کہ قومی اسمبلی کی سپیشل کمیٹی کی اس کارروائی کا تحریری ریکارڈ مرتب کرنے کا کام مولوی ظفر احمد انصاری صاحب کے سپرد کیا گیا ہے۔

(روزنامہ امن کراچی۔ 12 / ستمبر 1975ء ص4)

یہ ممبر قومی اسمبلی جماعتِ احمدیہ کے اشد مخالف تھے اور اس کارروائی میں ان کے سوالات اور تقاریر اس بات کا ثبوت ہیں۔ اور تقریباً ایک سال کے بعد یہ خبر شائع ہوئی کہ اس کارروائی کو مولوی ظفر انصاری صاحب کے سپرد کیا گیا تھا کہ وہ

"حسبِ خواہش "اس کارروائی کو اغلاط سے پاک کر کے محفوظ کرنے کا کام شروع کریں، معلوم نہیں اب یہ کام کس مرحلہ پر ہے۔

(نوائے وقت 8 ستمبر 1974)

مولانا ابو العطاء صاحب جماعت کے وفد کے رکن تھے۔ انہوں نے اس خبر پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا:

”فیصلے کا یہ کیا انوکھا طریقہ ہے کہ خود ہی لوگ مدعی ہوں اور خود ہی جج بن جائیں اور خود ہی فیصلے کر دیا کریں اور پھر خود ہی اپنی اغلاط کی تصحیح کر لیا کریں؟ کیا یہ ستم ظریفی نہیں کہ خصوصی کمیٹی اپنے ہی ایک رکن کو جو فریقِ مخالف میں شامل تھا مقرر کر دے کہ اپنے ریکارڈ کو گھر میں بیٹھ کر اغلاط سے پاک کر کے مرتب کرے۔ ظاہر ہے مولوی انصاری صاحب اپنی اور اپنے ساتھیوں کی اغلاط کو ہی درست کرنے کی کوشش کریں گے۔“

(الفرقان۔ ستمبر 1975)

پہلے قومی اسمبلی کی سپیشل کمیٹی کی کارروائی کو روزانہ سرکلر کی بنیاد پر تیار کر کے ساتھ کے ساتھ ممبران میں تقسیم کیا جاتا تھا اور ممبران اس میں تصحیح کر کے واپس جمع کراتے تھے۔ بعد میں کسی مرحلہ پر اس کارروائی کو دوبارہ قلمبند کیا گیا۔ اور اس مسودہ میں بہت تبدیلیاں کی گئیں اور جیسا کہ ہم ذکر کر چکے ہیں یہ کام جماعتِ احمدیہ کے اشد مخالف مولوی ظفر انصاری صاحب کے سپرد ہوا تھا۔ اس کے بعد ایک طویل خاموشی طاری ہو گئی۔ (سلسلہ احمدیہ حصہ سوئم میں جو تجزیہ پیش کیا گیا تھا اس کا ماخذ اوّل الذکر سرکلر تھے اور اس کتاب میں درج تبصرہ کا ماخذ وہ اشاعت ہے جو اب منظرِ عام پر آئی ہے)۔ کئی سال گزرے۔ دہائیاں گزریں۔ جماعتِ احمدیہ کی طرف سے بار بار مطالبہ کیا گیا کہ اس کارروائی کو منظرِ عام پر لایا جائے مگر دوسری طرف سکوتِ مرگ طاری تھا۔ مولوی صاحبان اس کارروائی کے حوالے سے متضاد غلط بیانیاں تو کرتے رہے لیکن یہ مطالبہ نہ کرتے کہ اس کارروائی کے اصل ریکارڈ کو منظرِ عام پر لایا جائے۔ کہیں حقائق منظرِ عام پر نہ آ جائیں۔ یہ گروہ اس خوف کے آسیب سے باہر نہ آ سکا۔

آخر کار اس واقعہ کے 36 سال بعد ہائی کورٹ میں دائر ہونے والے ایک مقدمہ کے نتیجہ میں لاہور ہائی کورٹ نے اس کارروائی کو منظرِ عام پر لانے کا حکم دیا۔ اس کے بعد سپیکر قومی اسمبلی محترمہ فہمیدہ مرزا صاحبہ نے اس کارروائی کو شائع کرنے کی اجازت دی۔ جب اس کارروائی کی اشاعت منظرِ عام پر آئی تو اس بات کی ایک بار پھر یہ حقیقت سامنے آگئی کہ اس اشاعت کی وقت بھی جماعتِ احمدیہ کے مخالفین کا گروہ اس عمل پر اثر انداز ہو رہا تھا اور اس گروہ کی کوشش تھی کہ مکمل حقائق سامنے نہ آئیں۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ

1) جماعتِ احمدیہ کا موقف ایک محضر نامہ پر مشتمل تھا۔ دو دن کی کارروائی میں حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ نے یہ موقف خود پڑھ کر سنایا تھا۔ اس اشاعت میں یہ محضر نامہ جو جماعتِ احمدیہ کا اصل موقف تھا شامل نہیں کیا گیا حالانکہ یہ محضر نامہ کارروائی کا اہم حصہ تھا۔ اس کے برعکس جماعت کے مخالفین نے، جن میں مفتی محمود صاحب کا نام بھی شامل ہے جو اپنے مؤقف پر مشتمل طویل تقاریر کی تھیں وہ اس اشاعت میں شامل کی گئیں۔

2) جماعتِ احمدیہ کے موقف کے طور پر محضر نامہ کے ضمیمے کے طور پر جو مضامین اور کتابچے جمع کرائے گئے تھے وہ اس اشاعت میں شامل نہیں کئے گئے اور جو ضمیمے مخالفین نے جمع کرائے تھے وہ اس اشاعت کا حصہ بنائے گئے۔

3) بعض جگہوں کچھ نمایاں سرخیاں لگا کر خلافِ واقعہ تاثر پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مثلاً اس اشاعت کے صفحہ 2360 اور صفحہ 2384 پر جماعتِ احمدیہ کے مخالفین کی تقاریر کے تحریری ریکارڈ میں یہ ہیڈنگ لگائی گئی ہیں "مرزا ناصر احمد صاحب سے" اور نیچے کچھ سوالات درج ہیں۔ اور یہ تاثر پیش کیا گیا ہے کہ گویا حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ سے یہ سوالات کئے گئے تھے اور آپ نے ان کا کوئی جواب نہیں دیا۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ تقاریر 30 / اگست 1974ء کی کارروائی کی ہیں اور اس روز حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ یا جماعتِ احمدیہ کے وفد کا کوئی ممبر وہاں پر موجود ہی نہیں تھا اور نہ ہی یہ سوالات کبھی ان تک پہنچائے گئے۔ خدا جانے یہ سوالات کس سے کئے جا رہے تھے؟

4) قومی اسمبلی کے قوانین میں یہ قاعدہ درج ہے کہ جب کمیٹی میں ایک گواہ کو سنا جاتا ہے

A verbatim record of the proceedings of the committee shall, when a witness is summoned to give evidence, be kept .

اس قاعدہ کے الفاظ بالکل واضح ہیں۔ جب ایک گواہ کمیٹی میں گواہی دے تو اس کے بیان کا حرف بحرف ریکارڈ رکھنا ضروری ہے لیکن کیا ایسا کیا گیا؟ اس اشاعت میں بعض مقامات پر جہاں حضرت خلیفۃ المسیح الثالث ؒ نے حوالہ کے طور پر عربی عبارت پڑھی ہے وہاں اصل عبارت کی جگہ صرف "عربی" لکھنے پر اکتفا کی گئی ہے۔ یہ طریقہ کار قواعد کے بالکل خلاف ہے۔ اصل عبارت درج کیوں نہیں کی گئی؟ مولوی ظفر انصاری صاحب عربی زبان سے بخوبی واقف تھے۔ کئی مولوی صاحبان کو جو اس اسمبلی کے ممبر تھے عربی دانی کا دعویٰ تھا۔ اگر یہ سب عربی عبارت سمجھنے سے عاجز تھے تو حسبِ قواعد ضروری تھا کہ جماعت کے وفد کو متعلقہ حصہ دکھا کر اصل عبارت درج کر لی جاتی ایسا کیوں نہیں کیا گیا؟ یہ گروہ اس بات سے خائف کیوں تھا کہ اس ریکارڈ کا ایک چھوٹا سا حصہ بھی جماعتِ احمدیہ کے وفد کے کسی ممبر کو دکھایا جاتا۔ آخر کیا خوف دامنگیر تھا؟ ہم اس کا فیصلہ پڑھنے والوں پر چھوڑتے ہیں۔

ان وجوہات کی بنا پر اگر انصاف کی نظر سے دیکھا جائے تو اگر جماعتِ احمدیہ یا کسی بھی محقق کی طرف سے اس اشاعت کو مکمل طور پر یا جزوی طور پر مسترد کیا جائے تو یہ ان کا حق ہے۔ جب اس کارروائی کو جزوی طور پر شائع کیا گیا تو اس وقت جماعت کے احمدیہ کے وفد کے پانچوں اراکین وفات پا چکے تھے۔ اب اس اشاعت کی تصدیق کرنا ممکن نہیں رہا۔ لہٰذا اس کتاب میں جہاں یہ الفاظ استعمال کئے گئے ہیں کہ "حضور نے فرمایا۔۔۔۔۔۔ یا "حضرت خلیفۃ المسیح الثالث ؒ نے فرمایا۔۔۔۔۔۔" تو اس سے مراد صرف یہ ہے کہ اس اشاعت میں یہ لکھا ہے کہ حضور نے یہ فرمایا تھا۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ کیا سچ ہے اور کیا غلط؟ لیکن جب بھی اس قسم کا مواد دنیا کے سامنے آتا ہے تو اس کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ اس کتاب میں ہم نے صرف یہ بیان کرنے کی کوشش کی ہے کہ جب ایک عام پڑھنے والا اس کارروائی کو پڑھ کر اصل پس منظر اور حقائق کا جائزہ لیتا ہے اور اصل حوالوں کو سامنے رکھ کر رائے قائم کرنے کی کوشش کرتا ہے تو کیا ممکنہ نتائج سامنے آتے ہیں۔ جس گروہ نے حقائق کو چھپانے کی کوشش کی ہے تو ان کے موقف کی کمزوری کی یہ کیفیت ہے وہ کسی نہ کسی رنگ میں ظاہر ہو ہی جاتی ہے۔

اس تمہید کے بعد میں ہم سب سے پہلے ان واقعات کا پس منظر پیش کرتے ہیں۔

پس منظر

الٰہی سلسلوں کی مخالفت

جب بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی مامور دنیا کی اصلاح کی لیے آتا ہے تو ایک عالم اس مامور کے اور اس کی قائم کردہ جماعت کے خلاف کمربستہ ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اس پیارے کی تکذیب کی جاتی ہے اور اس سے استہزاء کیا جاتا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

كُلَّمَا جَآءَ اُمَّةً رَسُوْلُهَا كَذَّبُوْهُ(المؤمنون:45)

جب بھی کسی امت کی طرف اس کا رسول آیا تو انہوں نے اسے جھٹلا دیا۔

يٰحَسْرَةً عَلَى الْعِبَادِ مَايَاْتِيْهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ(یٰسٓ: 31)

وائے حسرت بندوں پر! ان کے پاس کوئی رسول نہیں آتا مگر وہ اس سے ٹھٹھا کرنے لگتے ہیں۔

لیکن ان تمام تر مخالفتوں کو اور مخالفانہ حربوں کے باوجود اللہ تعالیٰ یہ اعلان کرتا ہے۔

كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِيْ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ(المجادلۃ:22)

اللہ نے لکھ رکھا ہے کہ ضرور میں اور میرے رسول غالب آئیں گے۔ یقیناً اللہ بہت طاقتور (اور) کامل غلبہ والا ہے۔

جب آنحضرتؐ کے غلامِ صادق، حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے خبر پا کر یہ اعلان فرمایا کہ میں تو وہی وجود ہوں جس کے آنے کی خوش خبری نبی اکرمؐ نے دی تھی تو وہی تاریخ دہرائی گئی جو کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مبعوث ہونے والے ہر مامور کی بعثت پر دہرائی جاتی ہے۔ تمام گروہ آپس کے اختلافات بھلا کر آپ کی مخالفت پر متحد ہو گئے۔ ان مخالفین نے تمام حیلے اور تمام مکر استعمال کر کے ایڑی چوٹی کا زور لگایا کہ آپ ناکام ہوں اور آپ کی جماعت کو ختم کر دیا جائے۔ اور بار بار یہ اعلان کیا گیا کہ ہم اس گروہ کو نیست و نابود کر دیں گے۔ لیکن دوسری طرف اللہ تعالیٰ کا مامور اللہ تعالیٰ سے بشارات پا کر یہ اعلان کر رہا تھا۔

”اگر تمام دنیا میری مخالفت میں درندوں سے بدتر ہو جائے تب بھی وہ میری حمایت کرے گا۔ مَیں نامرادی کے ساتھ ہرگز قبر میں نہیں اُتروں گا کیونکہ میرا خدا میرے ہر قدم میں میرے ساتھ ہے اور مَیں اس کے ساتھ ہوں۔ میرے اندرون کا جو اُس کو علم ہے کسی کو بھی علم نہیں۔ اگر سب لوگ مجھے چھوڑ دیں تو خدا ایک اور قوم پیدا کرے گا جو میرے رفیق ہوں گے۔ نادان مخالف خیال کرتا ہے کہ میرے مکروں اور منصوبوں سے یہ بات بگڑ جائے گی اور سِلسلہ درہم برہم ہو جائے گا مگر یہ نادان نہیں جانتا کہ جو آسمان پر قرار پاچکا ہے زمین کی طاقت میں نہیں کہ اس کو محو کر سکے۔ میرے خدا کے آگے زمین و آسمان کانپتے ہیں۔ خدا وہی ہے جو میرے پر اپنی پاک وحی نازل کرتا ہے اور غیب کے اسرار سے مجھے اطلاع دیتا ہے۔ اُس کے سوا کوئی خدا نہیں۔ اور ضروری ہے کہ وہ اس سِلسلہ کو چلاوے اور بڑھاوے اور ترقی دے جب تک وہ پاک اور پلید میں فرق کر کے نہ دکھلا دے۔ ہر ایک مخالف کو چاہیئے کہ جہاں تک ممکن ہو اِس سِلسلہ کے نابود کرنے کے لئے کوشش کرے اور ناخنوں تک زور لگاوے اور پھر دیکھے کہ انجام کار وہ غالب ہوا یا خدا۔۔۔۔۔“

(ضمیمہ براہین احمدیہ حصہ پنجم ص128۔ روحانی خزائن جلد21 ص294و295)

جماعتِ احمدیہ کی سو سال سے زائد کی تاریخ میں بار بار ایسے مراحل آئے جب مخالفین نے اوچھے ہتھکنڈے استعمال کئے اور تمام دنیاوی اسباب استعمال کر کے کوشش کی کہ کسی طرح اس جماعت کو ختم کر دیا جائے۔ جماعت کی تاریخ کا سرسری مطالعہ بھی اس بات کو واضح کر دیتا ہے کہ جب مخالفین نے یہ محسوس کیا کہ وہ دلائل سے جماعتِ احمدیہ کا مقابلہ نہیں کر سکتے اور ان کو یہ نظر آنے لگا کہ ان کی تمام کوششوں کے باوجود یہ جماعت ترقی کی منازل طے کرتی چلی جارہی ہے تو پھر پہلے سے بھی زیادہ زہریلا وار کرنے کی کوشش کی گئی اور اپنی دانست میں پہلے سے بھی زیادہ منظم سازش تیار کی گئی کہ کسی طرح اس جماعت کو ختم کر دیا جائے یا کم از کم اس کی ترقی کو روک دیا جائے۔

جب ہم 1970ء کی دہائی کے آغاز کا جائزہ لیتے ہیں تو ایک ایسا ہی منظر نظر آتا ہے۔ حضرت مصلح موعود کی علالت کے سالوں کے دوران ہمیں مخالفین کے لٹریچر میں اس بات کے واضح آثار نظر آتے ہیں کہ وہ یہ امید لگائے بیٹھے تھے کہ حضرت مصلح موعود کے بعد اب یہ جماعت ختم ہو جائے گی۔ لیکن 1970ء کی دہائی کے آغاز میں مخالفین کو یہ نظر آرہا تھا کہ خلافتِ ثالثہ کے دوران اللہ تعالیٰ کے فضل سے نہ صرف جماعتِ احمدیہ ترقی کرتی چلی جارہی ہے بلکہ اس کے سامنے ترقی کے نئے نئے میدان کھلتے چلے جارہے ہیں۔ 1970ء کے دوران حضرت خلیفۃ المسیح الثالث نے مغربی افریقہ کا دورہ فرمایا۔ اس وجہ

سے وہاں پر جماعت احمدیہ کی ہونے والی ترقی نمایاں ہو کر سب کے سامنے آگئی۔ اور اسی موقع پر حضور نے مجلس نصرت جہاں کے آغاز کا اعلان بھی فرمایا۔ مغربی افریقہ سے واپسی پر حضور نے 10 / اگست 1970ء کو ربوہ میں احمدی ڈاکٹروں سے خطاب کرتے ہوئے احبابِ جماعت کو مطلع فرمایا کہ جماعت کی ترقی دیکھتے ہوئے اب مخالفین ایک نئی سازش تیار کر رہے ہیں۔ حضور نے اس موقع پر فرمایا:۔

”ہماری اس سکیم کا اس وقت تک جو مخالفانہ ردِّ عمل ہوا ہے وہ بہت دلچسپ ہے اور آپ سن کر خوش ہوں گے اس وقت میری ایک Source سے یہ رپورٹ ہے۔ البتہ کئی طرف سے رپورٹ آئے تو میں اسے پختہ سمجھتا ہوں بہر حال ایک Source کی رپورٹ یہ ہے کہ جماعتِ اسلامی کی مجلسِ عاملہ نے یہ ریزولیشن پاس کیا ہے کہ ویسٹ افریقہ میں احمدیت اتنی مضبوط ہو چکی ہے کہ وہاں ہم ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے اس واسطے پاکستان میں ان کو کچل دو تا کہ وہاں کی سرگرمیوں پر اس کا اثر پڑے اور جماعت کمزور ہو جائے۔ بالفاظِ دیگر جو ہمارا حملہ وہاں عیسائیت اور شرک کے خلاف ہے اسے کمزور کرنے کے لیے لوگ یہاں سکیم سوچ رہے ہیں۔ ویسے وہ تلوار اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے کسی مخالف کو نہیں دی جو جماعت کی گردن کو کاٹ سکے۔“

لیکن ابھی جماعتِ احمدیہ کے خلاف ایک اور فسادات شروع کرنے سے قبل مخالفین کو ایک اور ناکامی کا منہ دیکھنا تھا۔

1970ء کے الیکشن اور مولویوں کی ناکامی

پہلے کی طرح اب بھی پاکستان کی نام نہاد مذہبی جماعتیں جماعت احمدیہ کے خلاف ایک شورش برپا کرنے کے لیے پر تول رہی تھیں۔ اور یہ 1970ء کا سال تھا۔ صدر ایوب خان کے دس سالہ دورِ اقتدار کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ اور ملک میں مارشل لاء لگا ہوا تھا اور پورے ملک میں انتخابات کی سرگرمیاں اپنے عروج پر تھیں۔ ہمیشہ کی طرح مذہبی جماعتیں کہلانے والی سیاسی پارٹیوں کو یہ توقع تھی کہ ان کو اس الیکشن میں بہت بڑی کامیابی ملے گی، جس کے بعد ان کے اقتدار کا سورج طلوع ہو گا اور وہ سمجھ رہے تھے کہ اس کے بعد جماعتِ احمدیہ کی ترقی کو روک دینا کوئی مشکل کام نہیں ہو گا۔

پاکستان کے مستقبل کے متعلق ابھرتے ہوئے خدشات اور جماعتِ احمدیہ کا فیصلہ

اُس وقت مشرقی پاکستان میں سیاسی صورتِ حال بڑی حد تک واضح تھی۔ وہاں پر عوامی لیگ سیاسی منظر پر مکمل طور پر حاوی نظر آ رہی تھی۔ اور یہ نظر آ رہا تھا کہ صوبائی خود مختاری کے نام پر مشرقی پاکستان میں یہ جماعت اکثر سیٹیں حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے گی۔ دوسری طرف مغربی پاکستان میں صورتِ حال یہ تھی کہ تقریباً دس جماعتیں میدان میں اتری ہوئی تھیں اور کوئی جماعت اتنی مضبوط نظر نہیں آ رہی تھی کہ یہاں کے سیاسی منظر پر واضح برتری حاصل کر سکے۔ اس صورتِ حال میں دو بڑے خدشات نظر آ رہے تھے۔ ایک تو یہ کہ اس سیاسی خلا میں نام نہاد مذہبی جماعتیں کوئی بڑی کامیابی حاصل کر لیں اور اپنے زعم میں انہیں بڑی کامیابی کی کافی امید بھی تھی۔ علاوہ اس حقیقت کے کہ یہ مذہبی پارٹیاں جماعتِ احمدیہ کی شدید مخالف تھیں۔ ان کے نظریات ایسے تھے کہ وہ پاکستان کی سالمیت اور اہلِ پاکستان کی آزادی کے لیے بھی بہت بڑا خطرہ تھے۔ دوسری طرف یہ خطرہ بھی تھا کہ مغربی پاکستان میں دس کی دس جماعتیں کچھ سیٹیں حاصل کر جائیں اور کوئی بھی اس قابل نہ ہو کہ مستحکم حکومت بنا سکے اور اس طرح ایک سیاسی ابتری اور عدم استحکام کی صورت پیدا ہو جائے۔ اور یہ صورت کسی بھی ملک کے استحکام کے لیے زہر کا درجہ رکھتی ہے۔

یہ امر پاکستان کے احمدیوں کے لیے دوہری پریشانی کا باعث تھا۔ ایک تو یہ کہ آنحضرتؐ کی مبارک تعلیم کے مطابق احمدی جس ملک کا باشندہ ہو اس کا سب سے زیادہ وفادار اور خیر خواہ ہوتا ہے اور جب پاکستان کو نقصان پہنچتا ہے تو اس کا سب

سے زیادہ دکھ پاکستانی احمدیوں کو ہی ہوتا ہے۔ دوسرے یہ کہ پاکستان میں جماعتِ احمدیہ کا مرکز تھا اور اسی مرکز سے پوری دنیا میں اسلام کی عالمگیر تبلیغ کی مہم چلائی جارہی تھی۔ اگر اس ملک میں افراتفری اور طوائف الملوکی کے حالات پیدا ہو جاتی تو اس سانحہ کے جماعت کی مساعی پر منفی اثرات مرتب ہوتے۔ ایک محبِ وطن شہری کی حیثیت سے احمدیوں کو یہ فیصلہ کرنا تھا کہ آئندہ الیکشن میں کس جماعت کو ووٹ دینے ہیں۔

اس مرحلے پر پاکستان پیپلز پارٹی کے چیئر مین اور سابق وزیرِ خارجہ ذوالفقار علی بھٹو صاحب نے جماعت سے رابطہ کیا اور حضرت خلیفۃ المسیح الثالث کی اجازت سے حضرت صاحبزادہ مرزا طاہر احمد صاحب ان سے ملاقات کے لیے گئے۔ بھٹو صاحب نے اپنی انتخابی مہم کے متعلق بات شروع کی، انہیں یہ امید تھی کہ ان کی انتخابی مہم کے لیے جماعت کوئی مالی مدد کرے گی لیکن اس کے جواب میں انہیں بتایا گیا کہ یہ ممکن نہیں ہو گا کیونکہ جماعتِ احمدیہ ایک مذہبی جماعت ہے اور وہ اس طرح ایک سیاسی پارٹی کی مدد نہیں کر سکتی۔ دورانِ گفتگو بھٹو صاحب کو ایک پریس کانفرنس میں شرکت کے لیے جانا پڑا ۔اور پیپلز پارٹی کے ایک لیڈر ڈاکٹر مبشر حسن صاحب نے انتخابی مہم کا خاکہ اور اُن امیدواروں کی فہرست دکھائی جن کو پیپلز پارٹی نے ٹکٹ دیا تھا۔ جب حضرت صاحبزادہ مرزا طاہر احمد صاحب نے یہ فہرست ملاحظہ فرمائی تو ان میں سے اکثریت کمیونسٹ حضرات کی تھی۔ جب بھٹو صاحب واپس آئے تو آپ نے انہیں کہا کہ اگر یہ کمیونسٹ حضرات بھٹو صاحب کی مقبولیت کی آڑ میں کامیاب ہو گئے تو پاکستان پر کمیونسٹوں کا قبضہ ہو جائے گا۔ اگر تو وہ کمیونسٹوں کا قبضہ چاہتے ہیں تو اس لسٹ کو برقرار رکھیں ورنہ اسے تبدیل کر دیں۔ بھٹو صاحب نے پارٹی کے سینیئر لیڈروں کی میٹنگ طلب کی اور پھر یہ اعلان کیا کہ یہ لسٹ حتمی نہیں ہے۔ بالآخر جو نئی لسٹ بنائی گئی اس میں کمیونسٹ حضرات کی تعداد کافی کم تھی۔(1)

اس دوران ملک کی انتخابی مہم میں تیزی آتی جارہی تھی۔ اور بہت سے پہلوؤں سے حالات مخدوش نظر آرہے تھے۔ جماعتِ احمدیہ ایک مذہبی جماعت ہے اور سیاسی عزائم نہیں رکھتی لیکن پاکستان کے احمدی محبّ ِوطن شہری ہیں اور انہیں دیانتداری سے آئندہ انتخابات میں اپنی رائے کے متعلق کوئی فیصلہ کرنا تھا۔ یہ فیصلہ کس طرح اور کن بنیادوں پر کیا گیا۔ اس پر حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ نے مئی ۱۹۷۳ء میں منعقد ہونے والی ہنگامی مجلسِ شوریٰ میں جس کا تفصیلی ذکر بعد میں آئے گا ان الفاظ میں روشنی ڈالی۔

”۔۔۔۔۔ لیکن مغربی پاکستان میں صورت اس کے بالکل برعکس تھی۔ اگر خدانخواستہ یہاں دس پارٹیوں کے ایک جیسے ارکانِ اسمبلی منتخب ہو جاتے تو گویا مغربی پاکستان سے قومی اسمبلی کے ایک سو چالیس ارکان میں سے چودہ چودہ ارکان ہر ایک کے حصہ میں آتے یا اگر تھوڑا بہت فرق بھی ہوتا تو کوئی پارٹی پندرہ اور کوئی بیس کی تعداد میں کامیاب ہوتی۔ کسی ایک پارٹی کو واضح اکثریت حاصل نہ ہوتی تو ان حالات میں مغربی پاکستان بھی باقی نہ ہوتا۔ یہ حصہ ملک بھی ختم ہو چکا ہوتا کیونکہ اکثریتی پارٹی کے علاوہ جو پارٹیاں کامیاب ہوئیں (ایک تو بالکل ناکام ہوئی) ان کے منصوبے اور ان کی سوچ جس نہج پر ہے اس سے پتہ لگتا ہے کہ وہ پاکستان کو مضبوط ہونے کی بجائے کمزور دیکھنا چاہتے ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ وہ پاکستان کو کمزور کرنا چاہتے ہیں یعنی غدار ہیں اور یہ میں اس لئے نہیں کہہ سکتا کہ میرے پاس ایسے ذرائع نہیں کہ میں پوری تحقیق کروں لیکن میں یہ بات پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ ان کی جو پالیسی ہے اور ان کے جو پلیٹ فارم ہیں وہ پاکستان کو مضبوط و مستحکم کرنے والے نہیں پاکستان کو کمزور اور بے بس کرنے والے ہیں۔۔۔۔ چنانچہ جب اللہ تعالیٰ نے میرے دل میں ڈالا کہ اگر مغربی پاکستان میں کوئی ایک پارٹی مضبوط بن کر ابھرے گی اور اسمبلیوں میں اکثریت حاصل کرے گی تو مغربی پاکستان کی حکومت مستحکم ہو گی ورنہ اگر ایک پارٹی نے اکثریت حاصل نہ کی تو حکومت مستحکم نہیں ہو گی۔“ (2)

اس کے بعد حضورؒ نے اس وقت مغربی پاکستان میں مختلف سیاسی جماعتوں کا تجزیہ بیان فرمایا۔ اور فرمایا کہ اس وقت مسلم لیگ تین جماعتوں میں تقسیم ہو چکی تھی۔ ایک مسلم لیگ قیوم گروپ تھا۔ اس کے سربراہ خان عبد القیوم خان بڑے مخلص اور محبِّ وطن راہنما تھے لیکن یہ پارٹی کمزور ہو چکی تھی اور اس کی قیادت میں بھی اختلافات پیدا ہو چکے تھے۔ اور کسی سمجھ دار آدمی کے لیے یہ سمجھنا مشکل نہیں تھا کہ اس پارٹی میں یہ ہمت نہیں کہ وہ پاکستان کی مضبوطی اور استحکام کا باعث بنے۔ اور ایک مسلم لیگ کونسل تھی جس کے سربراہ دولتانہ صاحب تھے۔ انہوں نے اپنی ایک تقریر میں کہا کہ کوئی قادیانی ہماری مسلم لیگ کا ممبر بھی نہیں بن سکتا۔ حالانکہ اس وقت بھی کچھ احمدی ان کی پارٹی کے ممبر تھے اور انہوں نے اس پر احتجاج کیا تو دولتانہ صاحب نے تقریر کے اس حصے کا انکار کر دیا لیکن اس کا ریکارڈ موجود تھا جو ان کو سنا دیا گیا، جس پر وہ کوئی جواب نہ دے سکے۔ اس پر جو احمدی کونسل مسلم لیگ کے ممبر تھے انہوں نے دولتانہ صاحب کو ایک تحریری نوٹس دیا کہ وہ سات دن کے اندر اس بیان کی تردید کریں ورنہ وہ ان کی پارٹی کو چھوڑ دیں گے۔ اس نوٹس پر بہت سے غیر از جماعت دوستوں نے بھی دستخط کر دیئے اور دولتانہ صاحب کی پارٹی کے ایک لیڈر نے بھی جماعت کو یقین دہانی کرائی کہ وہ دولتانہ صاحب سے

اس بیان کے برعکس اعلان کروادیں گے۔ لیکن دولتانہ صاحب نے اپنے ساتھیوں کے مشوروں کا جواب یہ دیا کہ اپنا استعفیٰ پیش کر دیا اور ان ساتھیوں سے خوشامدیں کرا کے دوبارہ کرسیِ صدارت پر بیٹھ گئے۔ حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ نے ۱۹۷۳ء کی ہنگامی مجلسِ مشاورت میں ممتاز دولتانہ صاحب کے متعلق فرمایا:۔

”وہ میرے بھی دوست رہے ہیں اس لئے جتنا میں ان کو جانتا ہوں اتنا شاید ہی کوئی اور جانتا ہو۔ ہم بچپن کی عمر سے دوست رہے ہیں انہوں نے دوستی کا تعلق توڑ دیا لیکن ہم نے تو نہیں توڑا۔ ان کے لئے دوستانہ خیر خواہی کا جذبہ آج بھی اسی طرح موجود ہے جس طرح پہلے تھا۔ اگر وہ ناراض ہیں اور ہماری خیر خواہی نہیں چاہتے تو نہ سہی کسی سے زبردستی تو خیر خواہی نہیں کی جاسکتی اور نہ اس کے مطلب کے کام کئے جاسکتے ہیں۔“(3)

دولتانہ صاحب کا مذکورہ بالا بیان اس لیے بھی زیادہ خدشات کو جنم دے رہا تھا کہ وہ 1953ء میں پنجاب کے وزیرِ اعلیٰ تھے اور انہوں نے جماعت کے خلاف فسادات کی آگ کو عملاً ہوا دی تھی اور اس کوتاہ بینی کی وجہ سے آخرکار انہیں پنجاب کی وزارتِ اعلیٰ سے مستعفی ہونا پڑا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنی غلطیوں سے کوئی سبق حاصل نہیں کیا تھا۔

حضورؒ نے فرمایا کہ کنونشن مسلم لیگ جو کہ سابق صدر ایوب خان صاحب کی پارٹی تھی، اس نے بھی گومگو کی کیفیت اختیار کی اس لیے جماعت نے ان کو بھی چھوڑ دیا۔ پھر حضورؒ نے مذہبی سیاسی جماعتوں کا تجزیہ کرتے ہوئے فرمایا:۔

”باقی کچھ علماء کی سیاسی جماعتیں تھیں مثلاً ایک جماعتِ اسلامی تھی۔ اکثر احمدی دوستوں کو شاید یہ علم نہیں کہ یہ جماعت احمدیوں کے خلاف انتہائی شدید بغض رکھتی ہے یہاں تک کہ اگر ان کو موقع ملے تو ہماری بوٹیاں نوچنے سے بھی گریز نہ کریں مگر اس کے باوجود انہوں نے الیکشن کے دنوں میں اپنی جماعت کو یہ ہدایت دے رکھی تھی کہ احمدیوں کے ساتھ پیار سے باتیں کریں، ان کو ناراض نہ کریں، کیونکہ اگر یہ ہمارے پیچھے پڑ گئے تو ہمیں بہت تنگ کریں گے لیکن جیسا کہ میں نے بتایا ہے ان کو احمدیوں سے شدید بغض اور عناد ہے اس لئے خود تو ہمارے خلاف پوشیدہ طور پر سازشوں میں مصروف رہے لیکن دوسری جماعتوں کو جو تھیں تو مذہبی لیکن بظاہر سیاسی لیبل لگا کر میدان میں اتریں تھیں یعنی جمعیت علمائے پاکستان اور جمعیت علمائے اسلام، ان کو اکسا کر لوگوں نے ہماری مخالفت میں لگا دیا وہ ہمارے خلاف اعلانیہ بڑے بلند بانگ دعویٰ کرتے نہ تھکتے تھے اور کہتے تھے ہم احمدیوں کو مٹا دیں گے۔ پھر جب جماعتِ اسلامی نے دیکھا کہ ان کی ریاکارانہ پالیسی نے جماعتِ احمدیہ پر

کچھ بھی اثر نہیں کیا تو وہ بھی کھلم کھلا ہماری مخالفت پر اتر آئے۔ اب آپ میں سے ہر دوست سمجھ سکتا ہے کہ جماعتِ احمدیہ نے ان مخالف اور معاند پارٹیوں کو تو ووٹ نہیں دینے تھے۔" (3)

حضورؒ نے کچھ اور سیاسی پارٹیوں کا تجزیہ کرنے کے بعد فرمایا کہ ان حالات میں صرف ایک پارٹی رہ جاتی تھی جسے ووٹ دیئے جاسکتے تھے اور وہ پاکستان پیپلز پارٹی تھی۔ حضور نے الیکشن کے وقت اس پارٹی کی حالت بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ 70ء میں اس پارٹی کی حالت یہ تھی کہ بحیثیت پارٹی کامیاب ہونے کے لیے نہ اسے پورا علم حاصل تھا اور نہ کوئی تجربہ۔ اور نئی پارٹی ہونے کی وجہ سے ابھی یہ عوام میں مقبولیت بھی حاصل نہیں کر پائی تھی۔ اس کی اپنی کوئی روایات بھی نہیں تھیں حالانکہ ہر سیاسی پارٹی کی کچھ روایات ہوتی ہیں جو اس کی کامیابی میں ممد و معاون بنتی ہیں۔ حضورؒ نے فرمایا کہ چونکہ ہمیں خدا تعالیٰ کا یہ منشا معلوم ہوتا تھا کہ کسی ایک پارٹی کو مستحکم بنایا جائے چنانچہ ہم نے اپنی عقلِ خداداد سے پاکستان کی سیاست کا جائزہ لیا تو ہم اس نتیجہ پر پہنچے کہ اس وقت پاکستان پیپلز پارٹی ہی ایک ایسی پارٹی ہے جسے کثرت کے ساتھ ووٹ دینا ملکی مفاد کے عین مطابق ہے۔ حضورؒ نے ۱۹۷۰ء کے الیکشن سے قبل کے وقت کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ اس پارٹی کے اکثر ارکان ہم سے مشورہ لیتے تھے۔ انہوں نے ہم سے بہت مشورے لیے گو وہ مشورے لیتے ہوئے ڈرتے بھی تھے اور سمجھتے بھی تھے کہ ان کے بغیر کوئی چارہ کار بھی نہیں۔ (4)

اس طرح مغربی پاکستان میں احمدیوں نے اکثر جگہوں پر پاکستان پیپلز پارٹی کے امیدواروں کی حمایت شروع کر دی۔ لیکن یہ حمایت ہر جگہ پر پاکستان پیپلز پارٹی تک محدود نہیں تھی۔ بلکہ کئی جگہوں پر احمدیوں نے دوسری پارٹیوں کے امیدواروں کی بھی حمایت کی۔ بعض سیٹوں پر احمدیوں نے مسلم لیگ قیوم گروپ کو ووٹ دیئے۔ کچھ سیٹوں پر کنونشن مسلم لیگ کے ایسے امیدوار کھڑے تھے جن کے احمدیوں سے دوستانہ تعلقات تھے۔ جماعت نے ان سیٹوں پر ان کو ووٹ دیئے۔ صوبائی اسمبلیوں کی چار سیٹوں پر بھی احمدیوں نے وعدہ کیا تھا کہ کنونشن مسلم لیگ کو ووٹ دیں گے لیکن جب ان کو قومی اسمبلی کے انتخابات میں شکست ہوگئی تو انہوں نے خود ہی احمدیوں کو لکھ دیا کہ اب حالات ایسے ہوں گئے ہیں کہ ہم آپ کو اس وعدے سے آزاد کرتے ہیں۔ بعض سیٹوں پر احمدیوں نے ایسے آزاد امیدواروں کی حمایت بھی کی جو طبعاً شریف تھے اور احمدیوں سے تعلقات رکھتے تھے۔ اور تو اور ایک سیٹ پر کونسل مسلم لیگ کے ایسے امیدوار کھڑے تھے، جن کا اس پارٹی سے کوئی دیرینہ تعلق نہیں تھا مگر اس پارٹی نے مناسب امیدوار نہ ہونے کی وجہ سے ان کو ٹکٹ دے دیا۔ ان صاحب کے احمدیوں

سے دیرینہ تعلقات تھے۔ احمدیوں نے عرض کی کہ ان کو ووٹ دینے کی اجازت دی جائے۔ چنانچہ ان کو یہ اجازت دی گئی (5)۔ لیکن مجموعی صورتِ حال یہ تھی کہ باقی جماعتوں کی نسبت پاکستان پیپلز پارٹی پیچھے پڑ کر اکثر سیٹوں پر احمدیوں کی حمایت حاصل کر رہی تھی۔ اور دوسری طرف 1970ء کے الیکشن میں کسی ایک جماعت کی مدد کرنا جماعتِ احمدیہ کے لیے اپنی ذات میں ایک بہت نازک مسئلہ تھا۔ کیونکہ جماعتِ احمدیہ ایک مذہبی جماعت ہے اور ایسے معاملات اس کے نزدیک اپنے اصل مقاصد کی نسبت بہت کم اہمیت رکھتے تھے۔ لیکن ملکی حالات کا تقاضا تھا کہ مغربی پاکستان میں کسی ایک پارٹی کو مضبوط شکل میں ابھرنا چاہیے ورنہ ملک کے لیے اس کے خطرناک نتائج نکلیں گے۔ اور بعد کے حالات نے ثابت کیا کہ یہ خدشات سو فیصد صحیح تھے۔ لیکن پیپلز پارٹی والوں کو یہ بات بھی محسوس ہو رہی تھی کہ احمدی ہر جگہ پر ان کی حمایت کیوں نہیں کر رہے۔ چنانچہ ان کے چوٹی کے راہنماؤں میں سے ایک نے حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ کی خدمت میں عرض کی کہ اگر آپ ہماری اتنی مدد کر رہے ہیں تو مکمل مدد کیوں نہیں کرتے۔ یعنی تمام حلقہ ہائے انتخاب میں ان کی حمایت کیوں نہیں کرتے۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے حضورؒ نے 1973ء کی ہنگامی مجلسِ شوریٰ میں فرمایا:

> ”یہ ان کو احساس تھا کہ ہم کلیۃً ان کی مدد نہیں کر رہے کیونکہ الحاق کی صورت نہیں ہے۔ دراصل ہم ان سے الحاق کر ہی نہیں سکتے تھے۔ ہمیں دنیا کے اقتدار اور مال و دولت کی ذرہ بھر پرواہ نہیں ہے اس لئے جب میں اپنے آپ کو ایک مذہبی جماعت کہتا ہوں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ ایک ایسا سلسلہ ہے جسے اللہ تعالیٰ نے جاری فرمایا ہے اور جس کے متعلق خدا تعالیٰ نے یہ فرمایا ہے کہ اگر تم میرے ساتھ محبت اور پیار کا غیر منقطع رشتہ قائم کرو گے تو دین اور دنیا کے سارے انعامات تمہیں دے دوں گا۔
>
> ہم اس حقیقت زندگی کو بھول کر اور خدا تعالیٰ کے انعامات کو چھوڑ کر کسی سیاسی جماعت یا حکومت کے ساتھ دنیوی الحاق کیسے کر سکتے ہیں ہم ان کے زر خرید غلام تو نہیں، ہم غلام ہیں اور اس کا پورے زور سے اعلان کرتے ہیں لیکن ہم صرف اس عظیم ہستی کے غلام ہیں جو واحد و یگانہ ہے۔ دنیا کے ساتھ ہمارے دنیوی تعلقات ہیں، پیار کے تعلقات ہیں، بطور خادم بنی نوع انسان کی خدمت کرنے کے تعلقات ہیں، غم خوار اور ہمدرد کی حیثیت میں ان کی ہمدردی کرنے کے تعلقات ہیں۔ اس لحاظ سے گویا ہر فردِ بشر کے ساتھ ہمارے تعلقات ہیں۔“(6)

مخالفینِ جماعت کا غیظ و غضب

جب جماعت احمدیہ نے ملک کے مستقبل کو مدِ نظر رکھتے ہوئے آئندہ انتخابات میں ووٹ اور حمایت کے لیے مندرجہ بالا فیصلہ کیا تو جماعتِ اسلامی اور دوسری نام نہاد مذہبی جماعتوں کی پریشانی میں خاطر خواہ اضافہ ہو گیا۔ وہ اس امر کو اپنی فرضی کامیابی کے لیے بہت بڑا خطرہ سمجھ رہے تھے۔ انہیں یہ بات کسی طرح نہیں بھا رہی تھی کہ احمدی کسی رنگ میں بھی آئندہ انتخابات میں حصہ لیں۔ دوسری طرف یہ حقیقت ہے کہ پاکستان میں بسنے والے احمدی ملک کے محبِّ وطن شہری ہیں۔ وہ ٹیکس ادا کرتے ہیں اور اپنے شہری ہونے کے دوسرے حقوق ادا کرتے ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ عمومی طور پر احمدی سیاست میں اس لیے نہیں حصہ لیتے کہ ان کے سامنے اور اعلیٰ مقاصد ہیں اور وہ اپنی توانائی کو ان ادنیٰ کاموں پر خرچ نہیں کرتے لیکن یہ ان کا فیصلہ ہے۔ قانونی اور اخلاقی طور پر احمدی اس بات کا مکمل حق رکھتے ہیں کہ وہ جب چاہیں قانون کے مطابق ملک کی سیاست اور انتخابات میں جس طرح پسند کریں حصہ لیں۔ کسی اور گروہ یا جماعت کا یہ حق نہیں ہے کہ اپنے آپ کو ملک کی ٹھیکہ دار سمجھتے ہوئے اس پر اعتراض کرے۔ بہر حال اب مولوی خیالات کے اخبارات اور رسائل اس بات پر اپنے غیظ و غضب کا اظہار کر رہے تھے کہ احمدی اپنے بنیادی شہری حقوق کے مطابق اس انتخابی مہم میں حصہ لے رہے ہیں۔ ان کا خیال تھا کہ یہ حق صرف انہیں حاصل ہے کہ وہ انتخابی مہم میں حصہ لیں اور اس پر ہر طرح سے اثر انداز ہوں بلکہ اس مہم کی آڑ میں جس طرح دل چاہے جماعتِ احمدیہ پر حملہ کریں اور یہ اعلان کریں کہ وہ اقتدار میں آکر احمدیوں کو ان کے بنیادی حقوق سے بھی محروم کر دیں گے۔ لیکن اگر احمدی اپنا قانونی حق استعمال کرتے ہوئے اس کا جواب دیں یا ملکی مفادات کے تحفظ کی خاطر کسی طرح انتخابی عمل میں حصہ لیں تو اس پر وہ آگ بگولہ ہو جاتے تھے۔ ایک طرف تو جماعت کے مخالفین جماعتِ احمدیہ کو اپنا نشانہ بنا رہے تھے اور دوسری طرف وہ ایک دوسرے پر بھی کیچڑ اچھال رہے تھے۔

مولوی ایک دوسرے پر کیچڑ اچھالتے ہیں

رسالہ چٹان جماعت کی مخالفت میں پہلے بھی پیش پیش رہ چکا تھا۔ اس انتخابی مہم میں یہ رسالہ مودودی صاحب کی جماعتِ اسلامی کی حمایت کر رہا تھا اور اس کے مدیر یہ اعلان کر رہے تھے، ”ہم جیسے لاکھوں اشخاص مولانا مودودی سے متاثر ہیں اور صرف اس لئے متاثر ہیں کہ وہ قرآن کی دعوت دیتے، انبیاء سے عشق پر ابھارتے اور معاشرہ کو عہدِ صحابہ کا نمونہ بنانا چاہتے

ہیں۔" (7) اور یہ رسالہ اس بات پر مسلسل اپنے صفحات سیاہ کر رہا تھا کہ احمدی اس مرتبہ انتخابی عمل میں حصہ کیوں لے رہے ہیں (8)۔ وہ یہ واویلا تو کر رہے تھے کہ احمدی پیپلز پارٹی کی مدد کر رہے ہیں لیکن ساتھ کے ساتھ یہ الزام بھی لگا رہے تھے کہ جمعیت العلماء اسلام، جو کہ جماعت کی مخالفت میں پیش پیش رہی تھی، کے جلسے بھی احمدیوں کی مدد سے منعقد کیے جا رہے ہیں۔ اور یہ دعویٰ بار بار کیا جا رہا تھا کہ یہ جماعت اور ان کے لیڈر مثلاً مفتی محمود صاحب قادیانیوں سے مدد حاصل کر رہے ہیں۔ اس سے وہ دو مقاصد حاصل کرنا چاہتے تھے۔ ایک تو یہ کہ ان الزامات سے خوفزدہ ہو کر جمعیت العلماء اسلام اور ان کے قائدین پہلے سے زیادہ بڑھ کر جماعتِ احمدیہ کی مخالفت میں جوش و خروش کا مظاہرہ کریں گے اور اس طرح جماعتِ احمدیہ کو نقصان پہنچے گا۔ اور دوسرا مقصد یہ تھا کہ چونکہ یہ جماعت انتخابات میں جماعتِ اسلامی کے مدِ مقابل کی حیثیت رکھتی تھی اس طرح ان الزامات سے اس حریف کو نقصان پہنچے گا۔ ان الزامات کی زبان ملاحظہ ہو۔ مفتی محمود صاحب کی پارٹی جمعیت العلماء اسلام نے آئین شریعت کانفرنس منعقد کی تو اس پر چٹان نے ایک مضمون شائع کیا جس کا عنوان تھا "قادیانی جماعت نے آئین شریعت کانفرنس کے انعقاد پر دس ہزار روپیہ دیا تھا۔ غلام غوث ہزاروی اور مفتی محمود کس استاد کے آلہ کار ہیں۔" اس مضمون میں مضمون نگار نے انکشاف کیا

> "جمعیت العلماء کے دونوں بزرگ ان دنوں ہوا کے گھوڑے پر سوار ہیں۔ انھیں قادیانی گوارا ہیں، کمیونسٹ عزیز ہیں لیکن مولانا ابو الاعلیٰ مودودی اور آغا شورش کاشمیری کے خلاف جو زہر ان کے دل میں بیٹھ چکا ہے وہ نکلنا مشکل ہے۔
>
> غلام غوث اور مفتی محمود پلکوں سے جاروب کشی کرتے ہوئے مبشر حسن کے گھر جاتے ہیں۔ ان کے جلسوں اور جلوسوں کی رونق سرخے ہوتے، وہی انھیں اچھال رہے ہیں اور ان کی بدولت وہ اچھال چھکا ہو گئے ہیں۔ آئینِ شریعت کانفرنس میں جو سبیلیں لگی تھیں، وہ سرخوں کی تھیں یا پھر ایک سبیل کے لیے قادیانی جماعت نے چندہ دیا تھا۔ راستہ بھر جھنڈے بھی سرخوں یا پیپیوں کے لہرا رہے تھے۔ جمعیت کا ایک بھی جھنڈا کسی کونے یا نکڑ میں نہیں تھا۔" (8)

رسالہ چٹان تو یہاں تک لکھ رہا تھا کہ جمعیت العلماء اسلام مرزائیوں کا بغل بچہ ہے (9)۔

اس الزام پر جمعیت العلماء اسلام نے حکومت سے مطالبہ کیا کہ جھوٹی خبریں شائع کرنے اور ائمہ کرام پر بہتان تراشی کرنے کے الزام میں چٹان رسالہ پر مقدمہ چلایا جائے۔ اس کے جواب میں چٹان نے یہ بیان داغا:۔

”جمعیت میں داخل ہونے کے بعد ہر ایرا غیرا مولانا ہو جاتا ہے۔ شاید اس قسم کے مولانا لعنۃ اللہ علی الکاذبین سے مستثنیٰ ہیں؟۔۔۔

رہا ائمہ کرام کا سوال تو ان کے حدود اربعہ سے مطلع کیجئے۔ ہم شکر گزار ہوں گے، ہم نے تو جمعیت میں ائمہ کرام کی شکل نہیں دیکھی۔ یہ جنس اس کباڑ خانے میں کہاں ہے؟“(10)

جواب میں جمعیت العلماء اسلام والے کس طرح پیچھے رہ جاتے۔ انہوں نے اپنے جریدہ ترجمانِ اسلام میں الزام لگایا کہ مرزائیوں نے چٹان کے اس مضمون پر، جس میں مفتی محمود صاحب اور ان کی پارٹی پر الزام لگایا گیا تھا کہ انہوں نے قادیانیوں سے مالی مدد لی ہے، بہت مسرت کا اظہار کیا اور اس خوشی میں چٹان کے مدیر شورش کاشمیری صاحب کو نذرانہ پیش کرنے کے لیے ان کے رسالے کو اشتہارات سے نوازا۔ اس الزام پر تلملا کر شورش کاشمیری صاحب نے تحریر فرمایا کہ

”۔۔۔ہم ان کوڑھ مغزوں سے نہیں الجھنا چاہتے۔ مفتی محمود اور غلام غوث اب اس قابل نہیں رہے کہ انھیں منہ لگایا جائے۔ ہم ان سے اتنی ہی نفرت کرتے ہیں جتنی قرنِ اوّل میں حلقہ بگوشانِ رسول شرک سے کرتے تھے۔۔۔۔۔۔

مولانا کو یہ بھی معلوم ہے کہ ان کی جماعت کے جو لوگ میرے خلاف اپنی خاندانی زبان استعمال کر رہے ہیں مثلاً مشتے نمونہ از خروارے، جانباز مرزا اور ضیاء القاسمی اپنے اعمال کی رو سے اس قابل ہیں کہ اسلامی حکومت ہو تو انہیں فوراً سنگسار کر دیا جائے۔“ (11)

جماعتِ اسلامی کا جریدہ ایشیا بھی اس مہم میں پوری سرگرمی سے حصہ لے رہا تھا۔ اس نے 9/اگست 1970ء کی اشاعت میں جہاں یہ الزام لگایا کہ جماعتِ احمدیہ اور پیپلز پارٹی کا اتحاد ہو چکا ہے وہاں یہ دعویٰ بھی کیا کہ اب منکرینِ ختمِ نبوت اور نام نہاد محافظینِ ختمِ نبوت بھی ایک گھاٹ پر پانی پی رہے ہیں اور اب جماعتِ احمدیہ اور جمعیت العلماءِ اسلام بھی ایک صف میں کھڑے ہیں۔ اسی مضمون میں یہ تجزیہ بھی شائع کیا گیا کہ بائیں بازو کی جماعتیں پانچ فیصد ووٹ بھی حاصل نہیں کر سکیں گی (12)۔ اس جریدے میں یہ دعویٰ بھی کیا جا رہا تھا کہ اب تو خود پاکستان پیپلز پارٹی کے چیئرمین ذوالفقار علی بھٹو بھی نا امید ہو چکے ہیں کہ ان کی پارٹی کوئی خاطر خواہ کارکردگی دکھا سکے گی اور انتخابات میں دائیں بازو کی جماعتوں کے لیے کوئی خطرہ بن سکے گی۔ اور اب پیپلز پارٹی کے کارکن انتخابی عمل میں کوئی دلچسپی نہیں لے رہے۔(13)

جماعت کی مخالفت میں پیش پیش رہنے والی اور مذہبی جماعتوں کے نام سے موسوم ہونے والی پارٹیوں کی باتوں میں سے اگر نصف بھی صحیح تسلیم کر لی جائیں تو یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ان سب کو قادیانیوں نے خریدا ہوا تھا اور ان میں سے بہت سے مکہ کے مشرکین کی طرح قابلِ نفرت ہیں بلکہ بعض تو اس قابل ہیں کہ انہیں سنگسار کر دیا جائے۔ ایک دوسرے کے متعلق تو ان کی یہ آراء تھیں، لیکن اس کے باوجود اس بات پر لال پیلے ہو رہے تھے کہ احمدی انتخابی عمل میں کیوں حصہ لے رہے ہیں۔ ایک دوسرے کو ان الزامات سے نوازنے کے بعد چند برسوں کے بعد ان پارٹیوں نے ایک اتحاد بھی بنا لیا اور اس میں یہ سب پارٹیاں مفتی محمود صاحب کی صدارت میں ایک انتخابی اتحاد کا حصہ بھی بن گئیں۔ اور کچھ عرصہ قبل یہ الزام تراشی ہو رہی تھی کہ مفتی محمود صاحب قادیانیوں سے مالی مدد لے رہے ہیں۔ اس مثال سے یہ حقیقت ظاہر ہو جاتی ہے کہ اس گروہ کو اگر کسی چیز سے دلچسپی ہے تو وہ حصولِ اقتدار ہے اور اصول نام کی چیز سے یہ لوگ واقف نہیں۔

بھٹو صاحب کا انتخابات سے قبل موقف

اس قسم کے سوالات پیپلز پارٹی کے چیئر مین ذوالفقار علی بھٹو صاحب سے بھی کئے جا رہے تھے کہ کیا پیپلز پارٹی کا جماعتِ احمدیہ سے کوئی معاہدہ ہے یا کیا وہ اقتدار میں آ کر قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دیں گے۔ اور بھٹو صاحب محتاط انداز میں ان سوالات کا جواب دے رہے تھے۔ جولائی 1970ء میں انتخابی مہم کے دوران ایک صحافی نے ان سے سوال کیا کہ کیا پیپلز پارٹی عوام کے اس مطالبہ کی حمایت کرے گی کہ احمدیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا جائے۔ اس کے جواب میں بھٹو صاحب نے کہا

”یہ انتہائی نازک مسئلہ ہے جس پر ملک میں پہلے بھی خون خرابہ ہو چکا ہے اور مارشل لاء لگ چکا ہے اور موجودہ حالات میں اگر اس مسئلہ کو ہوا دی گئی تو مزید خون خرابہ ہونے کا خدشہ ہے۔ ہماری پالیسی یہ ہے کہ ملک میں سوشلسٹ نظام رائج کریں۔ جس میں ہندو عیسائی وغیرہ تمام طبقوں کے عوام کے حقوق کا تحفظ کیا جا سکے۔ یہ قطعاً غلط ہے کہ قادیانی فرقہ کی ہم حمایت کر رہے ہیں۔ ہماری جماعت ترقی پسند ہے جس میں اس قسم کے مسئلوں کے لیے کوئی جگہ نہیں۔“ (14) پھر اس کے ایک ہفتہ کے بعد ایک پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے بھٹو صاحب نے کہا کہ پیپلز پارٹی اور احمدی فرقہ کے درمیان کوئی خفیہ سمجھوتہ نہیں ہوا، تاہم انتخاب میں کسی طبقہ کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ (15)

جماعت کی مخالفت میں تیزی آتی ہے

تمام تر کوششوں کے باوجود وہ جماعتیں جو مذہبی جماعتیں کہلاتی تھیں آپس میں اتحاد نہیں کر پا رہی تھیں بلکہ ایک دوسرے کے خلاف برسرِپیکار تھیں۔ اس پر مستزاد یہ کہ انہیں یہ بات بری طرح چبھ رہی تھی کہ اپنا قانونی حق استعمال کرتے ہوئے کئی احمدی انتخابی عمل میں حصہ کیوں لے رہے ہیں۔ ان کے نزدیک اگر احمدی اپنے شہری حقوق کے مطابق اس عمل میں حصہ لیں تو یہ ایک بہت بڑا جرم تھا۔ وہ اپنے علاوہ باقیوں کو ملک کا دوسرے درجہ کا شہری سمجھتے تھے۔ اب وہ اس حوالے سے پیپلزپارٹی پر حملے کر رہے تھے تاکہ اس طرح ایک طبقہ کی ہمدردیاں حاصل کر سکیں۔ چنانچہ جماعت احمدیہ کے اشد مخالف جریدے چٹان نے انتخابات سے دو ہفتہ قبل 23/ نومبر کے شمارے کے سرورق پر ایک تصویر شائع کی جس میں پیپلزپارٹی کے چیئرمین بھٹو صاحب کو ایک پرندے کی صورت میں دکھایا گیا تھا۔ اس کے ایک پر کے اوپر لکھا تھا مرزائیت اور دوسرے پر کے اوپر لکھا تھا کمیونزم۔ اس شمارے کے آغاز میں ہی یہ واویلا کیا گیا تھا کہ جس دن سے گول میز کانفرنس ختم ہوئی ہے ہم اس دن سے چلّا رہے ہیں

”بھٹو نے اس برعظیم کی سیاسی تاریخ میں پہلی دفعہ مرزائیوں کو سیاسی پناہ دے کر اپنا دست و بازو بنایا اور انتخابی میدان میں مسلمانوں کے علی الرغم لا کھڑا کیا۔

بھٹو مسلمانوں کی اسلام سے شیفتگی کو نئی پود کے سینے سے نکال رہا اور جن شخصیتوں پر مسلمانوں کی نشاۃِ ثانیہ کا انحصار رہا ہے، ان کی عقیدت نئی نسل سے ختم کرنا چاہتا ہے۔“ (16)

بعض اخبارات میں یہ خبریں شائع کی جا رہی تھیں کہ پیپلزپارٹی کے بہت سے اہم کارکنان اسے چھوڑ رہے ہیں اور ان میں سے بعض کے یہ بیان بھی شائع کئے جاتے تھے کہ ہم پیپلزپارٹی کو اس لئے چھوڑ رہے ہیں کیونکہ اس نے جماعتِ احمدیہ سے اتحاد کر لیا ہے (17)۔ یہ شور و غل ان کی اپنی ذہنی بوکھلاہٹ کی عکاسی کر رہا تھا ورنہ جیسا کہ پہلے ذکر آچکا ہے کہ جماعتِ احمدیہ کا کسی سے سیاسی اتحاد ہو ہی نہیں سکتا۔ البتہ بعض مخصوص حالات میں اپنے ملک کے مفادات کی حفاظت کے لیے پاکستانی احمدیوں نے اپنا قانونی حق استعمال کیا تھا اور اس پر کسی کو اعتراض کا حق نہیں ہے۔

مخالفین کی خوش فہمیاں

جماعت کی مخالفت کرنے والی جماعتوں کو آخر تک بہت سی امیدیں تھیں کہ انتخابات میں انہی کا پلّہ بھاری رہے گا۔ کونسل مسلم لیگ کے نائب صدر نے ایک جلسہ میں یہ دعویٰ کیا کہ اگر پیپلز پارٹی کا کوئی امیدوار زرِ ضمانت بچانے میں کامیاب ہو گیا تو وہ عملی سیاست سے مستعفی ہو جائیں گے (18) اور اس کے لیڈر یہ اعلان کر رہے تھے کہ وہ اقتدار میں آکر جداگانہ انتخابات کا نظام لائیں گے، یعنی مذہبی اقلیتوں کو انتخابات میں عام نشستوں سے بھی کھڑا ہونے کی اجازت نہیں ہو گی، ان کی نشستیں علیحدہ ہوں گی تاکہ وہ ملکی سیاست کے دھارے سے علیحدہ ہی رہیں (19)۔ الیکشن میں ایک ماہ سے بھی کم رہ گیا تھا اور جماعت احمدیہ کی اشد مخالف جماعت، جمعیت العلماء پاکستان کو یہ امیدیں لگی ہوئی تھیں کہ وہ اپنی روحانیت کے بَل بوتے پر پارلیمنٹ میں پہنچ جائیں گے۔ چنانچہ ان کے صدر خواجہ قمر الدین سیالوی نے ایک جلسہ میں خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ ہم روحانیت کے بل بوتے پر انتخابات میں کامیابی حاصل کریں گے۔ اور یہ روحانیت ہمیں ورثہ میں ملی ہے۔ اور مزید کہا کہ ہماری جماعت ایسا اسلامی نظام نافذ کرنا چاہتی ہے جو خلافتِ راشدہ کا نمونہ ہو (19)۔ (شاید اپنی روحانیت پر انحصار کا یہ نتیجہ تھا کہ اس جماعت کو انتخابات میں شدید ناکامی کا سامنا کرنا پڑا)۔ جماعتِ اسلامی بھی ایک بہت بڑی کامیابی کے خواب دیکھ رہی تھی۔ چنانچہ اس کے لیڈر جلسوں میں دعوے کر رہے تھے کہ پیپلز پارٹی ملک کی بدلتی ہوئی صورتِ حال میں اب ناقابلِ ذکر ہو چکی ہے۔ اور ان کی کسی بھی سیٹ پر کامیابی مشکوک ہے۔ اور آئندہ انتخابات میں جماعتِ اسلامی یقیناً برسرِ اقتدار آجائے گی (20)۔ جماعتِ اسلامی کو مشرقی پاکستان میں بھی خاطر خواہ کامیابی کی امیدیں تھیں۔ بعد میں جب حمود الرحمن کمیشن کی تحقیق سے معلوم ہوا کہ عوامی لیگ کے قائد مجیب الرحمٰن صاحب نے اس وقت جماعتِ اسلامی اور دولتانہ صاحب کی کونسل لیگ کو انتخابی مفاہمت کی پیشکش کی تھی جس کی رو سے کچھ سیٹوں پر ان جماعتوں کے امیدواروں کے مقابل پر عوامی لیگ اپنے امیدوار نہ کھڑے کرنے کے لیے تیار تھی لیکن ان جماعتوں نے یہ پیشکش اس بنیاد پر مسترد کر دی کہ عوامی لیگ انہیں جتنی نشستیں دینے کے لیے تیار تھی جماعتِ اسلامی اور دولتانہ صاحب کی کونسل لیگ کو اس سے زیادہ نشستیں حاصل کرنے کی امید تھی۔ لیکن آخر نتیجہ یہ نکلا کہ یہ جماعتیں مشرقی پاکستان سے ایک بھی نشست حاصل نہ کر سکیں (21)۔ اخبار نوائے وقت نے انتخابات سے چند روز قبل ایک جائزہ شائع کیا جس کے مطابق 37 فیصد ووٹر پیپلز پارٹی کے حق میں تھے۔ 28 فیصد ووٹر جماعتِ اسلامی کے حق میں اور 26 فیصد دولتانہ صاحب کی کونسل مسلم لیگ کو ووٹ دینے کا ارادہ رکھتے تھے۔ ایسی صورت میں جبکہ

کسی بھی پارٹی کو اکثریت حاصل نہ ہو رہی ہو ایسی جماعتیں بھی بہت اہمیت حاصل کر جاتی ہیں جنہوں نے تقریباً ایک چوتھائی ووٹ حاصل کیے ہوں (22)۔

بہر حال ان قیاس آرائیوں کے درمیان عام انتخابات کا دن آگیا۔ 7/ دسمبر کی رات کو ووٹوں کی گنتی شروع ہوئی۔ کچھ نتائج بھی سامنے آنے شروع ہوئے۔ ووٹنگ شروع ہوتے ہی تین باتیں بہت واضح نظر آرہی تھیں۔ پہلی تو یہ کہ عوامی لیگ مشرقی پاکستان کی تقریباً تمام نشستیں حاصل کر رہی تھی۔ مغربی پاکستان میں پیپلز پارٹی کو اکثر نشستوں پر برتری حاصل ہو رہی تھی۔ اور نام نہاد مذہبی جماعتوں کو عبرتناک شکست کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ ان کے متعلق تمام اندازے غلط ثابت ہو رہے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ جماعتِ اسلامی کے قائد مودودی صاحب کو یقین نہیں آرہا تھا کہ ان کی پارٹی کو اتنی مکمل شکست سے دوچار ہونا پڑا ہے۔ ابھی نصف نشستوں کے نتائج سامنے آئے تھے کہ مودودی صاحب نے اپنی پارٹی کے کارکنان سے اپیل کی کہ پولنگ کے موقع پر جہاں جہاں بھی بے ایمانیاں یا بے قاعدگیاں ہوئی ہیں وہاں سے شہادتیں حاصل کر کے جلد از جلد جماعتِ اسلامی کے مرکزی دفتر بھجوائی جائیں تاکہ حکومت سے تحقیقات کا مطالبہ کیا جائے (23)۔ لیکن جلد ہی ان پر یہ حقیقت منکشف ہوگئی کہ ان کی پارٹی کی شکست کی وجہ کوئی بے قاعدگی یا بے ایمانی نہیں بلکہ لوگوں کی حمایت سے محروم ہونا ہے۔ اس لیے جلد ہی تحقیقات کا مطالبہ ترک کر دیا گیا۔ پورے ملک میں تین سو نشستوں پر انتخابات ہوئے تھے۔ ان میں سے 160 پر عوامی لیگ نے کامیابی حاصل کی۔ ان تمام امیدواروں کا تعلق مشرقی پاکستان سے تھا۔ مشرقی پاکستان کی نشستوں میں سے صرف دو ایسی تھیں جن پر عوامی لیگ کے امیدوار کامیاب نہیں ہوئے۔ مغربی پاکستان کی 138 نشستوں میں سے 81 پر پاکستان پیپلز پارٹی نے کامیابی حاصل کی۔ پیپلز پارٹی نے مشرقی پاکستان سے کوئی امیدوار کھڑا نہیں کیا تھا۔ جماعت اسلامی کو صرف چار نشستوں پر اور جمعیت العلماءِ اسلام، جمعیت العلماء پاکستان اور کونسل مسلم لیگ کو سات سات نشستوں پر کامیابی حاصل ہوئی۔

ان سیاسی پارٹیوں کے لیے جو مذہبی جماعتیں کہلاتی ہیں اور جماعتِ احمدیہ کی مخالفت میں ہمیشہ پیش پیش رہی ہیں یہ نتائج بہت ہی مایوس کن تھے۔ ایک تو یہ کہ ان کو عبرتناک شکست کا سامنا کرنا پڑا تھا اور ان کے تمام دعووں کے برعکس یہ ظاہر ہو گیا تھا کہ یہ پارٹیاں پاکستان کے عوام کی حمایت سے محروم ہیں۔ مغربی پاکستان میں بھی جماعتِ اسلامی کو صرف 4 فیصد ووٹ مل سکے۔ اور سیاسی غلبہ اور اقتدار حاصل کرنے کا ایک اور موقع ان کے ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ اور یہ بات ان کے غیظ و غضب

میں اضافہ کر رہی تھی کہ احمدی اکثر نشستوں پر جس پارٹی کی حمایت کر رہے تھے اس نے مغربی پاکستان میں اکثر نشستوں پر کامیابی حاصل کی ہے۔ جماعت احمدیہ کے لیے تو اس بات کی کوئی اہمیت نہیں کہ ایک سیاسی جماعت نے کامیابی حاصل کی ہے لیکن جماعت کی مخالف مذہبی جماعتوں کا نظریہ تھا کہ مذہبی مقاصد سیاسی تسلط کے بغیر حاصل نہیں کیے جا سکتے۔ انتخابات میں خفت اُٹھانے کے بعد چٹان میں شورش کاشمیری کا یہ اداریہ اس بات کی عکاسی کرتا ہے کہ اس وقت جماعتِ اسلامی کا حامی طبقہ کن خیالات میں غلطاں تھا۔ اس اداریہ کا عنوان تھا "اپنی غلطیوں سے عبرت پکڑو"۔ اس میں شورش کاشمیری صاحب نے لکھا:۔

”اگر واقعہ محض یہ ہوتا کہ انتخاب میں رجعت پسندوں کو شکست ہو گئی ہے اور ان کی جگہ ترقی پسند آ گئے ہیں یا کلاہِ کامیابی کاسہ لیسوں کے سر سے اتار کر انقلابیوں کے سر پر رکھ دی گئی ہے، تو ہم کھلے دل سے خیر مقدم کرتے لیکن پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر جو لوگ پنجاب اور سندھ سے منتخب ہوئے ہیں۔ ان کی واضح اکثریت (90 فیصد) ان افراد پر مشتمل ہے جو خلقتاً انقلاب پسند نہیں اور نہ ان سے توقع کی جا سکتی ہے کہ اپنی بڑی بڑی جاگیروں اور اپنے شاندار ماضی کے باعث غرباء کے ہمدرد ہو سکتے اور اس ملک کی تقدیر بدل سکتے۔۔۔۔

دو گروہوں نے پیپلز پارٹی کے الیکشن کو منظم کیا۔ اوّلاً وہ عناصر جنہیں حادثاتی سوشلسٹ کہہ لیجئے اس عنصر نے اپنے صبح و شام اس غرض سے وقف کر دیے، ان میں آرگنائزر وہ لوگ تھے وہ اپنی جیت صرف اس میں سمجھتے تھے کہ سوشلزم کا لفظ رواج پا رہا ہے اور پرانی قدریں ٹوٹ رہی ہیں۔ یہ لوگ بالطبع مذہب سے متنفر ہیں۔ ان کے علاوہ جن دو فرقوں نے پیپلز پارٹی کی پشت پناہی کی ان میں ایک فرقہ تو مسلمانوں کا فرقہ ہی نہیں اور وہ مسلمانوں سے انتقام لے رہا ہے وہ ہے قادیانی! جس تندہی سے قادیانی امت کی عورتوں مردوں اور بچوں نے پیپلز پارٹی کے لیے کام کیا، اس کی مثال نہیں ملتی۔ لاہور میں طفیل محمد اور جاوید اقبال کے خلاف قادیانی ہر چیز داؤ پر لگائے بیٹھے تھے۔ پسرور کا وہ حلقہ جہاں سے کوثر نیازی چنا گیا ہے تمام تر مرزائیوں کے ہاتھ میں تھا۔ وہ کوثر نیازی کو ووٹ نہیں دے رہے تھے بغض کو ووٹ دے رہے تھے۔ وہ ہر شخص سے انتقام لے رہے تھے جو اسلام کے نام پر کھڑا اور ان کا مذہباً مخالف تھا۔ انھیں کسی حال میں بھی کسی جمعیت العلماء، میاں ممتاز دولتانہ، نوابزادہ نصر اللہ خان اور ابو الاعلیٰ مودودی کا امیدوار گوارا نہ تھا۔۔۔“ (24)

اس اقتباس سے یہ بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ جماعتِ احمدیہ کے مخالفین ان انتخابی نتائج پر پیچ و تاب کھا رہے تھے۔ پیپلز پارٹی کی جیت جماعتِ احمدیہ کے لیے تو کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتی تھی لیکن انتخابات میں شکست نام نہاد مذہبی پارٹیوں کے لیے سوہانِ روح بنی ہوئی تھی۔ یہ امر بھی قابلِ غور ہے کہ شورش کاشمیری صاحب کے نزدیک اگر احمدی ان سیاسی لیڈروں کی قانونی مخالفت کریں یا انہیں ووٹ نہ دیں جو جماعتِ احمدیہ کے خلاف بیان بازی میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کر رہے تھے اور یہ اعلان کر رہے تھے کہ وہ اقتدار میں آکر احمدیوں کو ان کے بنیادی شہری حقوق سے بھی محروم کر دیں گے تو یہ بھی ایک بہت بُری بات تھی۔ گویا احمدیوں پر یہ فرض تھا کہ اپنے مخالفین کی مدد کرتے تا کہ وہ اقتدار میں آکر ان کو بنیادی حقوق سے بھی محروم کر دیتے۔

کوئی یہ خیال کر سکتا ہے کہ انتخابات میں فتح اور شکست تو ہوتی رہتی ہے۔ دنیا میں ایک سیاسی جماعت سے وابستہ لوگوں کو شکست کے بعد وقتی صدمہ تو ہوتا ہے لیکن اس سے ان کے لیے زندگی موت کا مسئلہ نہیں بن جاتا۔ آخر جماعتِ اسلامی اور پاکستان کی دیگر نام نہاد مذہبی جماعتوں میں اس شکست کے بعد ماتم کیوں برپا ہو گیا۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ جہاں تک اقتدار کی خواہش کا تعلق ہے تو وہ اس طبقہ میں سب سے زیادہ ہوتی ہے، اسی لیے اس شکست پر ان کی طرف سے ایسا ردِّ عمل ظاہر ہوا جس کے متعلق خود مولوی طبقہ بھی یہ اقرار کر رہا تھا کہ یہ ردِّ عمل ان کے چہرے پر ایک بد نما داغ ہے۔ چنانچہ 1970ء کے انتخابات میں شکست کے بعد ہفت روزہ چٹان میں جماعتِ اسلامی کے ایک حامی نے جماعتِ اسلامی کی ہمدردی میں ایک مضمون لکھا جس میں یہ اعتراف کیا:۔

"۔۔۔۔۔ جن لوگوں کو انتخابات سے قبل اس الیکشن کو حق و باطل کا معرکہ بتایا گیا تھا۔ اب شکست کے بعد ان کے دلوں کو ٹٹولیے کہ ان پر کیا قیامت گزر گئی اور مرکز کے علاوہ مختلف علاقوں کے امیدواروں اور ان کے حامیوں سے جو حرکات سرزد ہوئیں۔ وہ بجائے خود جماعتِ اسلامی کے منشور اور دستورِ اسلام کے منافی تھیں۔ جن سے نہ صرف یہ مقدس جماعت ہی ہدفِ تنقید بنی۔ بلکہ اس سے دین اسلام کا دامن بھی داغدار ہوا۔"

(ہفت روزہ چٹان۔ 15 فروری 1971ء ص 14)

لیکن ان انتخابات سے مذہبی متعصب گروہ نے ایک اور سبق بھی حاصل کیا تھا اور وہ سبق یہ تھا کہ وہ انتخابات کے ذریعہ سے اقتدار حاصل نہیں کر سکتے بلکہ اب انہیں حصولِ اقتدار کی خواہش پوری کرنے کے لیے اور سیاسی منظر پر دوبارہ اپنی

جگہ بنانے کے لیے دیگر ذرائع کا سہارا لینا ہوگا۔ جماعت کی مخالفت میں پیش پیش جریدہ چٹان میں انتخابات کے بعد ایک مضمون شائع ہوُا جس کا عنوان تھا "انتخابات کے حیرت کدے"۔ اس میں مضمون نگار نے لکھا

”اب پاکستان میں مسئلہ اسلام کے نفاذ کا نہیں، اس کے تحفظ کا پیدا ہو گیا ہے۔ اسی طرح مسئلہ جمہوریت کے تجربے کا نہیں بلکہ جمہوریت کے خطرناک نتائج سے ملک کو بچانے کا ہے۔ عوام دھوکے میں آسکتے ہیں اور آ گئے ہیں۔ اور آئندہ بھی آ سکتے ہیں۔ اس لئے مزید جمہوری تجربہ خطرناک ہو گا۔ صورتِ حال کے مطابق جمہور سے راہنمائی حاصل کرنے کی بجائے جمہور کو راہنمائی دی جائے اور صحیح اور بامقصد انقلاب کی تیاری کی جائے۔“

(ہفت روزہ چٹان، 11 دسمبر 1970ء ص 9)

یہ بات ظاہر ہے کہ انتخابات میں مکمل شکست کے بعد نام نہاد مذہبی سیاستدان اب چور دروازے کے ذریعہ سیاسی منظر میں اور پھر اقتدار کے ایوانوں میں داخل ہونے کی منصوبہ بندی کر رہے تھے اور تاریخ گواہ ہے کہ جب بھی ان کو اس قسم کے مسئلہ سے دوچار ہونا پڑتا ہے، وہ جماعتِ احمدیہ کے خلاف مہم چلا کر اپنا یہ مقصد پورا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

انتخابات کے بعد انتقالِ اقتدار سے قبل 1971ء کی جنگ کا دردناک مرحلہ آیا اور اس کے نتیجہ میں پاکستان دولخت ہو گیا۔

---

(1) A Man of God, by Iain Adamson, George Shepherd Publishers, page95 -92

(2) رپورٹ ہنگامی مجلسِ مشاورت جماعتِ احمدیہ 1973ء ص 11۔12

(3) رپورٹ ہنگامی مجلسِ مشاورت جماعتِ احمدیہ 1973ء ص 16۔

(4) رپورٹ ہنگامی مجلسِ مشاورت جماعتِ احمدیہ 1973ء ص 19 تا 21

(5) رپورٹ ہنگامی مجلسِ مشاورت جماعتِ احمدیہ 1973ء ص 30۔31

(6) رپورٹ ہنگامی مجلسِ مشاورت جماعتِ احمدیہ 1973ء ص 29

(7) چٹان 10/ اگست 1970ء ص 6

(8) چٹان 20/ جولائی 1970ء ص 4، 6

(9) چٹان 17/ اگست 1970ء ص 4

(10) چٹان 27/ جولائی 1970ء ص 6

(11) چٹان 10/ اگست 1970ء ص 5

(12) ایشیا 9/ اگست 1970ء۔

(13) ایشیا 18/ اکتوبر 1970ء ص 1

(14) نوائے وقت 29/ جولائی 1970ء ص 1

(15) مشرق 15/ جولائی 1970ء۔

(16) چٹان 23/ نومبر 1970ء ص 3

(17) 2/ اکتوبر 1970ء ص آخر۔

(18) نوائے وقت 18/ نومبر 1970ء ص 4

(19) نوائے وقت 17/ نومبر 1970ء ص 4

(20) نوائے وقت 19/ نومبر 1970ء ص 7

(21) The Report of Hamoodur Rehman Commission of Inquiry into 1971 War, published by Vanguard, page 75

(22) نوائے وقت 3/ دسمبر 1970ء ص 1

(23) نوائے وقت 8/ دسمبر 1970ء ص 1

(24) چٹان 21/ دسمبر 1970ء ص 3

آئین میں ختمِ نبوت کا حلف نامہ

1971ء کی جنگ کے نتیجہ میں پاکستان دولخت ہو گیا۔ صدر یحییٰ خان نے استعفیٰ دے دیا اور بھٹو صاحب نے ملک کے صدر اور چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کی حیثیت سے ملک کا نظم و نسق سنبھال لیا۔ اب ملک کے آئین کی تشکیل کا مسئلہ درپیش تھا۔ مستقل آئین کی تشکیل میں تو کچھ وقت لگنا تھا، اس دوران ملکی انتظامات چلانے کے لیے قومی اسمبلی نے ایک عبوری آئین کی منظوری دی اور مستقل آئین کا مسودہ تیار کرنے کے لیے ایک 25 رکنی کمیٹی بنائی گئی، اس کمیٹی کے سربراہ وزیرِ قانون محمود علی قصوری صاحب تھے۔ لیکن کچھ عرصہ بعد محمود علی قصوری صاحب نے اختلافات کی وجہ سے وزارت اور اس کمیٹی کی صدارت سے استعفیٰ دے دیا اور عبد الحفیظ پیرزادہ صاحب نے اس کمیٹی کی صدارت سنبھال لی۔ کمیٹی میں اپوزیشن کے کئی ایسے اراکین شامل تھے جو جماعتِ احمدیہ کی مخالفت میں پیش پیش رہے تھے۔ جماعتِ اسلامی کے پروفیسر غفور احمد صاحب، جمعیت العلماء اسلام کے قائد مفتی محمود صاحب، جمعیت العلماء پاکستان کے شاہ احمد نورانی صاحب اس کے ممبر تھے۔ ان کے علاوہ میاں ممتاز دولتانہ صاحب اور سردار شوکت حیات صاحب بھی اس کے ممبر تھے۔ دولتانہ صاحب 1953ء میں جماعتِ احمدیہ کی مخالفت کو اپنے سیاسی مقاصد کے لئے استعمال کرتے رہے تھے۔

اور حضرت چوہدری ظفر اللہ خان صاحب نے “تحدیثِ نعمت” میں بیان فرمایا ہے کہ جب وہ وفاقی کابینہ میں وزیر خارجہ تھے، اس وقت سردار شوکت حیات صاحب بھی دولتانہ صاحب کے ساتھ مل کر مرکزی حکومت پر دباؤ ڈال رہے تھے کہ ظفر اللہ خان کو اس عہدے سے ہٹا دیا جائے۔

بعد میں سامنے آنے والے شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مرحلہ پر جب کہ یہ کمیٹی آئین کی تشکیل کا کام کر رہی تھی ان دنوں میں بھٹو صاحب اپنے سیاسی مخالفین یعنی جماعتِ اسلامی کے ساتھ گفت و شنید کر رہے تھے۔ ایک صحافی مصطفیٰ صادق جو روزنامہ وفاق کے ایڈیٹر بھی رہے ہیں، کے مطابق پہلے پنجاب کے گورنر غلام مصطفیٰ کھر صاحب نے ان کے سامنے اس بات کا اظہار کیا کہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ پاکستان پیپلز پارٹی کے اندر اشتراکی اور قادیانی خطرہ بنے ہوئے ہیں اور ان سے انہیں خطرہ ہے۔ یہ بات تو خلافِ عقل ہے کہ امن پسند احمدیوں سے کسی کو خطرہ تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ اپنی سیاسی ساکھ بڑھانے اور اپنے سیاسی دشمنوں کو رام کرنے کے لئے احمدیوں کے جائز حقوق غصب کرنے کی تمہید باندھی جا رہی تھی۔ مصطفیٰ صادق

صاحب کے ہی مطابق بھٹو صاحب اور مودودی صاحب کی ملاقات ہوئی۔ اس میں بھٹو صاحب نے مودودی صاحب سے تعاون کی اپیل کی اور یہ اپیل بھی کی کہ مودودی صاحب قادیانیوں اور کمیونسٹوں کی سرگرمیوں بلکہ بقول ان کے سازشوں کے معاملے میں ان سے تعاون کریں۔ پھر اس ملاقات کے بعد بھٹو صاحب اور مودودی صاحب مطمئن نظر آتے تھے اور کھر صاحب بھی بہت مسرور تھے کہ جس سیاسی بحران نے ان کی نیندیں حرام کر رکھی تھیں اس کا حل اب نکل آئے گا۔ تو اس طرح ایک بار پھر سیاسی مقاصد کے حصول کے لئے جماعتِ احمدیہ پر مظالم کا سلسلہ شروع کیا جا رہا تھا(1) یہ بیان تو مصطفٰے صادق صاحب کا ہے۔ جب ہم نے ڈاکٹر مبشر حسن صاحب سے جو کہ بھٹو صاحب کی کابینہ کے ایک اہم رکن تھے، اس بات کی بابت استفسار کیا تو ان کا کہنا تھا کہ یہ تو مشکل ہے کہ بھٹو صاحب نے مصطفٰے صادق صاحب سے رابطہ کیا ہو کیونکہ وہ انہیں اس قابلیت کا آدمی نہیں سمجھتے تھے لیکن یہ عین ممکن ہے کہ مودودی صاحب سے رابطہ کیا گیا ہو اور کھر صاحب کو کہا گیا ہو کہ ان سے رابطہ کریں۔ لیکن اس کے ساتھ ڈاکٹر مبشر حسن صاحب کا یہ بھی کہنا تھا کہ اس وقت بھٹو صاحب کو احمدیوں سے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ جب ہم نے مذکورہ بالا واقعہ کے بارے میں پروفیسر غفور صاحب سے استفسار کیا تو ان کا کہنا تھا کہ ان کے علم میں ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ اور عبد الحفیظ پیرزادہ صاحب نے بھی اس بابت سوال پر یہی کہا کہ انہیں اس بات کا علم نہیں ہے۔ لیکن گیارہ اپریل 2012 کو دنیا نیوز چینل پر ایک پروگرام "تلاش" پر غلام مصطفٰے کھر صاحب کا انٹرویو نشر ہوا۔ اور اس میں انہوں نے کہا کہ اس وقت مصطفٰے صادق صاحب نے خود اپنی خدمات انہیں پیش کی تھیں اور انہوں نے پیپلز پارٹی اور جماعتِ اسلامی کے قائد مودودی صاحب کا رابطہ کرایا تھا۔ اور مودودی صاحب نے پیپلز پارٹی کے ساتھ آئین کے ضمن میں جو لائحہ عمل طے کیا تھا، خود ان کی پارٹی کے قائدین اس سے بے خبر تھے لیکن وہ اپنی پارٹی کی قیادت کے ساتھ ہونے والی بات چیت کے بارے میں پیپلز پارٹی کے لیڈروں کو اطلاعات دے رہے تھے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ متفقہ آئین کے لئے جماعتِ اسلامی نے پیپلز پارٹی کے ساتھ تعاون کیا۔ اسی پروگرام میں پیپلز پارٹی کے وفاقی وزیر اور بھٹو صاحب کے قریبی ساتھی ڈاکٹر مبشر حسن صاحب نے یہ اعتراف کیا کہ بھٹو صاحب چاہتے تھے کہ آئین متفقہ طور پر منظور ہو اور اس غرض کے لئے انہیں مولوی ممبرانِ اسمبلی کی حمایت بھی درکار تھی۔ اور یہ حمایت حاصل کرنے کے لئے کم از کم ایک مولوی رکنِ اسمبلی کو بھٹو صاحب نے خود اپنے ہاتھ سے رشوت بھی دی تھی اور یہ کیا تھا کہ ان مولوی صاحب کو اپنے دفتر میں بلایا اور جو رقم بطور رشوت دینی تھی وہ دفتر میں اِدھر اُدھر پھینکی اور ان سے کہا کہ یہ نوٹ اُٹھا لو اور ان مولوی صاحب نے گھٹنوں کے بل رینگ کر فرش سے یہ نوٹ اُ

ٹھائے۔ بھٹو صاحب کا مقصد یہ تھا کہ ان مولوی صاحب کو اس طرح ذلیل بھی کیا جائے جو کہ ان مولوی صاحب نے بخوشی منظور کر لیا۔ حقیقت یہ ہے کہ دستور اصولوں پر بنائے جاتے ہیں۔ خواہ اس کے لئے اختلافِ رائے کا سامنا ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔ اگر اس طرح سربراہِ حکومت اور سربراہِ مملکت نوٹوں کو زمین پر پھینک کر رشوتیں دے رہا ہو اور ممبرانِ اسمبلی گھٹنوں کے بل رینگ کر یہ نوٹ اُٹھا رہے ہوں تو کیا اس سے قوم میں اتحاد پیدا ہو جائے گا۔ کیا ایسا آئین جو کہ اعلیٰ اقدار کی طرف راہنمائی کرے اس طرز پر بنایا جاتا ہے۔ کوئی ذی ہوش اس کا جواب اثبات میں نہیں دے سکتا۔ اس واقعہ سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ آئین بناتے ہوئے سب سے پہلے اصولوں کی قربانی دی گئی تھی۔ جب اصول ہی قربان کر دیئے گئے تو پھر محض متفقہ آئین کے نعرے لگانے سے کیا حاصل کیا جا سکتا ہے۔

(نوٹ: اس کتاب کے بعض حصوں کے لئے ہم نے اس وقت کی بعض اہم سیاسی شخصیات سے انٹرویو لئے۔ ان میں مکرم ڈاکٹر مبشر حسن صاحب جو بھٹو صاحب کی کابینہ میں وزیر اور پاکستان پیپلز پارٹی کے سیکریٹری جنرل رہے، مکرم عبد الحفیظ صاحب پیرزادہ جو بھٹو صاحب کی کابینہ میں وزیر رہے اور 1974ء میں وزیرِ قانون تھے، مکرم صاحبزادہ فاروق علی خان صاحب جو کہ 1974ء میں قومی اسمبلی کے سپیکر تھے، مکرم پروفیسر غفور احمد صاحب جو کہ قومی اسمبلی کے ممبر اور جماعتِ اسلامی کے سیکریٹری جنرل تھے، سابق جج پنجاب ہائی کورٹ مکرم جسٹس صمدانی صاحب جنہیں 1974ء میں انکوائری ٹریبونل میں مقرر کیا گیا تھا اور مکرم ٹی ایچ ہاشمی صاحب جو کہ پاکستان کے سیکریٹری اوقاف تھے اور 1974ء میں رابطہ عالمِ اسلامی کے اجلاس میں حکومتِ پاکستان کے نمائندے کی حیثیت سے شامل ہوئے تھے اور مکرم معراج محمد خان صاحب جو کہ ایک زمانے میں بھٹو صاحب کے خاص رفیق اور ان کی کابینہ میں بھی رہے، شامل ہیں۔ ان انٹرویوز کا تحریری اور آڈیو یا ویڈیو ریکارڈ خلافت لائبریری ربوہ میں محفوظ ہے۔ سوائے مکرم عبد الحفیظ پیرزادہ صاحب کے انٹرویو کے جنہوں نے اگلے روز ریکارڈ کروانے کا فرمایا اور پھر معذرت کر لی۔ اکثر انٹرویوز لینے والی ٹیم میں خاکسار کے علاوہ مکرم مظفر احمد صاحب ڈوگر اور مرزا عدیل احمد صاحب شامل تھے)

کمیٹی نے کام شروع کیا اور لمبی بحث و تمحیث کے بعد 12 / اپریل 1973ء کو قومی اسمبلی نے نئے آئین کی منظوری دے دی۔ بھٹو صاحب کے دور میں وفاقی وزیر اور ان کے قریبی معتمد مکرم رفیع رضا صاحب اپنی کتاب میں تحریر کرتے ہیں کہ آئین کی منظوری سے چند روز قبل تک اپوزیشن راہنماؤں نے اس عمل کا بائیکاٹ کیا ہوا تھا اور وہ کہہ رہے تھے کہ وہ پارلیمانی نظام

چاہتے ہیں اور وزیرِ اعظم کی آمریت نہیں چاہتے۔ بھٹو صاحب نے غلام مصطفیٰ کھر صاحب کے ذریعہ اپوزیشن کی جماعتوں خاص طور پر جماعتِ اسلامی سے رابطہ کیا اور ان سب نے آئین کی حمایت کا اعلان کر دیا۔

(*Zulfikar Ali Bhutto and Pakistan 1967-1977, published by Oxford University Press Karachi 1997 page178*)

جیسا کہ دستور ہے اس آئین میں بھی مختلف عہدوں کے لئے حلف نامے شامل تھے جنہیں اُٹھا کر کوئی شخص ان عہدوں پر کام شروع کر سکتا ہے۔ اس آئین میں صدر اور وزیر اعظم کے لیے جو حلف نامے تجویز کئے گئے تھے ان کے الفاظ سے یہ بات ظاہر ہو جاتی تھی کہ یہ حلف نامے تجویز کرنے والوں نے اپنی طرف سے یہ کوشش کی ہے کہ احمدیوں کو نشانہ بنایا جائے اور اس بات کو یقینی بنانے کے لئے کوشش کی ہے کہ کوئی احمدی ان عہدوں پر مقرر نہ ہو سکے۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ جماعتِ احمدیہ کو سیاسی عہدوں کی بندر بانٹ سے کوئی دلچسپی نہیں لیکن ان حلف ناموں کو تجویز کرنے والوں نے اپنی دانست میں احمدیوں کو تکلیف پہنچانے کی کوشش کی تھی۔ صدر اور وزیرِ اعظم دونوں کے حلف ناموں میں یہ الفاظ شامل تھے

I ,...................... do solemnly swear that I am a Muslim and believe in the unity and oneness of Almighty Allah, the books of Allah, the Holy Quran being the last of them, the prophet hood of Muhammad (peace be upon him) as the last of the prophets and that there can be no prophet after him, the day of judgment ,and all the requirement and teachings of the Holy Quran....................That I will strive to preserve the Islamic ideology which is the basis for the creation of Pakistan.

اس سے پہلے بھی ملک میں دو آئین رائج ہوئے تھے اور ان میں بھی صدر اور وزیر اعظم کے لئے حلف نامے مقرر کئے گئے تھے۔ لیکن ان میں مذہبی عقائد کے متعلق کوئی ایسی عبارات شامل نہیں کی گئی تھیں۔ 1956ء کے آئین میں صدر کے حلف نامے کے الفاظ یہ تھے

I.................do solemnly swear that I will faithfully discharge the duties of the office of president of Pakistan according to law, that I will bear true faith and allegiance to Pakistan, that I will preserve protect and defend the constitution, and that I will do right to all manner of people according to law without fear or favor, affection or ill-will.

اسی طرح ایوب خان صاحب کے دور میں جو آئین بنایا گیا تھا اس کے حلف ناموں میں بھی مذہبی عقائد کا کوئی ذکر نہیں تھا۔ یہ پہلی مرتبہ تھا کہ پاکستان کے آئین میں اس قسم کا حلف نامہ شامل کیا گیا تھا۔

ڈاکٹر مبشر حسن صاحب اس وقت بھٹو صاحب کی کابینہ کے ایک اہم رکن تھے اور وہ اس وقت اس کمیٹی کے رکن بھی مقرر ہوئے تھے جس نے آئین بنانے کا کام کیا تھا۔ ان سے جب ہم نے یہ سوال کیا کہ حلف ناموں میں ختمِ نبوت کا حلف نامہ ڈالنے کی کیا وجہ تھی تو ان کا کہنا تھا کہ گو کہ اس کارروائی کے دوران انہوں نے اس کمیٹی سے استعفیٰ دے دیا تھا کیونکہ وہاں جس طرح بحث ہوتی تھی وہ وقت کو ضائع کرنا تھا کیونکہ آئین نے جس طرح بننا تھا وہ تو اسی طرح بنا لیکن اس کی واضح وجہ یہی تھی کہ بھٹو صاحب کی پہلی کوشش یہ تھی کہ آئین منظور ہو اور پھر یہ خواہش تھی کہ متفقہ آئین منظور ہو۔ اس غرض کے لئے انہیں مذہبی عناصر کو جو Concessions دینے پڑے ان میں یہ بھی شامل تھا۔

اور جب ہم نے عبد الحفیظ پیرزادہ صاحب سے جو کہ آئین بنانے والی کمیٹی کے سربراہ تھے اس بابت سوال پوچھا تو ان کا کہنا تھا کہ پہلے تو صدر کے لئے یہ ضروری قرار دیا گیا کہ وہ مسلمان ہو لیکن جب آئین کا سارا ڈھانچہ بنا اور یہ واضح ہوا کہ سارے اختیارات تو وزیرِ اعظم کے پاس ہوں گے تو مذہبی جماعتوں نے اس بات پر اصرار کیا کہ وزیرِ اعظم کے لئے بھی مسلمان ہونا ضروری قرار دیا جائے اور اس عہدہ کے لئے ختمِ نبوت کا حلف نامہ اُٹھانا بھی ضروری ہو۔

جب ہم نے پروفیسر غفور صاحب جو اس وقت جماعتِ اسلامی کے سیکریٹری تھے اور آئین تیار کرنے والی کمیٹی کے رکن تھے، یہ سوال کیا کہ ان حلف ناموں میں ختمِ نبوت کا حلف نامہ شامل کرنے کی تجویز کس طرف سے آئی تھی جبکہ پہلے جو آئین بنے تھے ان میں اس کا ذکر نہیں تھا؟ تو ان کا جواب تھا کہ پاکستان کے سابقہ آئینوں کو تو میں نے نہیں پڑھا لیکن 1973ء کا آئین بنتے وقت عدلیہ کی آزادی اور صوبائی خود مختاری کے مسئلے پر تو بحث ہوئی تھی لیکن اس حلف نامے کے موضوع پر تو کوئی بحث ہوئی ہی نہیں تھی۔ اس بیان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مذہبی جماعتوں نے ان حلف ناموں میں ختمِ نبوت کا حلف نامہ شامل کرنے کے لئے کوئی خاص دباؤ نہیں ڈالا تھا بلکہ ان کی شمولیت ایک خاص ماسٹر پلان کا حصہ تھی جس کے باقی اجزاء بعد میں ظاہر

ہوتے گئے۔ لیکن اس بات نے مجھے بہت مایوس کیا کہ ایک صاحب جو نہ صرف آئین ساز اسمبلی کے رکن تھے بلکہ آئین کو مرتب کرنے والی کمیٹی کے ایک اہم رکن بھی تھے اور ایک پارٹی کے سیکریٹری جنرل بھی تھے انہوں نے آئین سازی کے عمل کے دوران پرانے آئین کو پڑھا بھی نہیں تھا۔

آئین میں ایک دلچسپ تضاد یہ بھی تھا کہ آئین کی رو سے وزراء، ممبرانِ اسمبلی و سینٹ اور سپیکر اور ڈپٹی سپیکرز کے لئے یہ ضروری نہیں تھا کہ وہ مسلمان ہوں یعنی ایک غیر مسلم بھی یہ عہدے حاصل کر سکتا تھا اور غیر مسلم وزراء بنتے رہے ہیں اور اسمبلی کے ممبر بنتے رہے ہیں۔ لیکن ان کے حلف نامے میں یہ عبارت شامل تھی۔

That I will strive to preserve the Islamic ideology which is the basis for the creation of Pakistan

یعنی اگر ایک غیر مسلم ان عہدوں پر فائز ہو جائے تو وہ یہ حلف اُٹھائے گا کہ وہ غیر مسلم ہونے کے باوجود نظریہ اسلامی کی حفاظت کے لئے کوشاں رہے گا۔

ہم نے پروفیسر غفور صاحب سے یہ سوال کیا کہ ایک غیر مسلم یہ حلف کیسے اُٹھا سکتا ہے کہ وہ اسلامک آئیڈیالوجی کے تحفظ کے لئے کوشاں رہے گا۔ تو پہلے انہوں نے آئین کی کاپی میں متعلقہ حصہ پڑھا اور پھر کہا کہ اس میں یہ نہیں کہا گیا کہ میں مسلمان ہوں۔ یہ آئیڈیالوجی کے نقطہ نظر سے ہے۔ جب آئین میں یہ لکھا ہے کہ ملک میں کوئی قانون اسلام کے خلاف نہیں بنے گا تو غیر مسلم کو بھی یہ حلف اُٹھانا پڑے گا۔

بہر حال یہ واضح تھا کہ اب احمدیوں کے خلاف ایک سازش تیار کی جا رہی ہے۔ اس مرحلہ کے متعلق حضرت خلیفۃ المسیح الرابعؒ نے 1985ء میں فرمایا:۔

"۔۔۔۔۔1974ء کے واقعات کی بنیاد دراصل پاکستان کے 1973ء کے آئین میں رکھ دی گئی تھی۔ چنانچہ آئین میں بعض فقرات یا دفعات شامل کر دی گئی تھیں تا کہ اس کے نتیجہ میں ذہن اس طرف متوجہ رہیں اور جماعتِ احمدیہ کو باقی پاکستانی شہریوں سے ایک الگ اور نسبتاً ادنیٰ حیثیت دی جائے۔ میں نے 1973ء کے آئین کے نفاذ کے وقت اس خطرہ کو بھانپتے ہوئے حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ کی خدمت میں عرض کیا اور آپ کو اس وقت توجہ دلائی۔ بعد ازاں جس طرح بھی ہو سکا جماعت مختلف سطح پر اس مخالفانہ رویہ کے اثرات کو زائل کرنے کی کوشش کرتی رہی لیکن ان کوششوں کے دوران یہ

احساس بڑی شدت سے پیدا ہوا کہ یہ صرف یہاں کی حکومت نہیں کروا رہی بلکہ یہ ایک لمبے منصوبے کی کڑی ہے اور اس معاملہ نے آگے بڑھنا ہے۔ بہر حال 1974ء میں ہمارے خدشات پوری طرح کھل کر سامنے آ گئے۔“

(خطباتِ طاہر جلد 4 ص 54)

لیکن بہت سے تکلیف دہ واقعات سے گزر کر ملک کو ایک دستور مل رہا تھا۔ جماعتِ احمدیہ نے اس موقع پر کوئی مسئلہ نہیں پیدا کیا بلکہ ملکی مفادات کی خاطر اس امر پر خوشی کا اظہار کیا کہ بالآخر ملک کو ایک دستور مل گیا ہے۔ چنانچہ حضرت خلیفة المسیح الثالثؒ نے خطبہ جمعہ میں فرمایا:۔

”گزشتہ ربع صدی میں پاکستان کو بہت سی پریشانیوں میں سے گزرنا پڑا۔ قیامِ پاکستان کے ایک سال بعد بانی پاکستان قائدِ اعظم کی وفات ہوگئی۔ ان کے ذہن میں پاکستان کے لئے جو دستور تھا وہ قوم کو نہ دے سکے۔ پھر ملک کو بعض دوسری پریشانیوں کا منہ دیکھنا پڑا۔ پھر مارشل لاء لگا جس کے متعلق بظاہر یہ سمجھا جاتا ہے کہ اس کی ذمہ داری فوج پر ہے اور یہ بات ایک حد تک درست بھی ہے لیکن اس کی اصل ذمہ داری تو ان لوگوں پر عاید ہوتی ہے جنہوں نے اس قسم کے حالات پیدا کر دیئے کہ فوج کو مارشل لاء لگانا پڑا۔ بہر حال مارشل لاء کا زمانہ بھی پریشانیوں پر منتج ہوا۔ اس کی تفصیل میں جانے کا نہ یہ وقت ہے اور نہ اس کی ضرورت ہے۔ مارشل لاء کے زمانہ میں بھی کچھ قوانین تو ہوتے ہیں جن کے تحت حکومت کی جاتی ہے۔ تاہم ان قوانین کو قوم کا دستور نہ کہا جاتا ہے نہ سمجھا جاتا ہے اور نہ حقیقةً ایسا ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے قوم گویا دستور کے میدان میں پچھلے پچیس سال بھٹکتی رہی ہے چنانچہ ایک لمبے عرصہ کے بعد اللہ تعالیٰ کے فضل سے ایسے حالات پیدا ہوئے ہیں کہ قوم کو ایک دستور مل گیا۔ ہم خوش ہیں اور ہمارے دل اللہ تعالیٰ کی حمد سے لبریز ہیں کہ ہماری اس سرزمین کو جسے اللہ تعالیٰ نے اسلام کی نشاةِ ثانیہ کے لئے منتخب فرمایا ہے اس میں بسنے والی اس عظیم قوم کو اللہ تعالیٰ نے توفیق بخشی کہ وہ اپنے لئے ایک دستور بنائے۔“ (2)

1973ء کے آئین میں جو حلف نامے تجویز کئے گئے تھے ان میں عقائد کا تذکرہ اور ختمِ نبوت کا حلف مولویوں اور مولوی ذہنیت رکھنے والوں کو خوش کرنے کے لئے رکھا گیا تھا۔ اور پیپلز پارٹی کے قائدین بڑے فخر سے کہہ رہے تھے کہ ہم نے ملک کو ایک اسلامی آئین دیا ہے۔ چنانچہ پیپلز پارٹی کے ایک لیڈر افتخار تاری صاحب نے آئین کی منظوری کے بعد بڑے فخر سے یہ بیان دیا:۔

”نیا آئین اسلامی ہے کہ اس میں پارلیمنٹ کی بالا دستی کے باوجود اسلامی مشاورتی کونسل کو سپریم حیثیت دی گئی ہے۔ ہمارے مخالفین بالعموم اور جماعتِ اسلامی والے بالخصوص پیپلز پارٹی پر یہ الزام لگاتے رہے کہ یہ مرزائی فرقہ کے قائدین کی ہدایات اور اشاروں پر چلتی ہے اور موجودہ حکومت کو ربوہ سے حکم آتے ہیں۔ اگر یہ الزام درست ہوتا تو آئین میں اسلامی قوانین کو کیسے اپنایا جا سکتا تھا۔ نیز اس آئین میں محمد مصطفےؐ کے نبی آخر الزمان کو بنیاد بنا کر ان شکوک و شبہات کو قطعی طور پر دور کر دیا گیا جن کی آڑ میں پیپلز پارٹی کو ہدفِ تنقید بنایا جاتا تھا۔“

(روزنامہ امروز 21/اپریل 1973ء ص 2)

چونکہ پیپلز پارٹی اور خود بھٹو صاحب پر مخالفین کی جانب سے مذہب سے بیزار ہونے کا الزام تھا، اس لئے یہ بھی ممکن ہے کہ اس الزام کا رد کرنے کے لئے اور مخالفین کو خوش کرنے اور ان سے ممکنہ طور پر پیش آنے والے خطرات کا سدِ باب کرنے کے لئے پیپلز پارٹی نے اس قدم پر رضامندی ظاہر کی ہو۔ لیکن تعصب اور تنگ نظری کے دوزخ میں جتنا مرضی ڈالو اس میں سے ھَلْ مِنْ مَّزِیْدٍ کی صدائیں بلند ہوتی رہتی ہیں۔ ایک کے بعد دوسرا نامعقول مطالبہ سامنے آتا رہتا ہے۔ اور اگر قوم کی تیرہ بختی سے حکومت ان کے آگے جھکنے کا راستہ اپنا لے تو پھر یہ عفریت معاشرے کی تمام عمدہ قدروں کو نگل جاتا ہے۔ بھٹو صاحب اور پیپلز پارٹی کے دیگر قائدین کی یہ بھول تھی کہ وہ اس طرح تنگ نظر گروہ کو خوش کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ یا جیسا کہ ہم بعد میں اس امر کا جائزہ لیں گے اگر یہ سب کچھ کسی بیرونی ہاتھ کو خوش کرنے کے لئے کیا جا رہا تھا تو یہ خیال محض خوش فہمی تھی کہ یہ بیرونی ہاتھ اسی پر اکتفا کرے گا اور پھر سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ آئین کو بنے ابھی ایک ماہ بھی پورا نہیں ہوا تھا کہ نئے مطالبے شروع ہو گئے۔ یہ مطالبات اسلام کے نام پر کئے جا رہے تھے لیکن ان میں سے اکثر اسلامی تعلیمات کے بالکل برعکس تھے۔ ہم صرف ایک مثال پیش کرتے ہیں تاکہ اندازہ ہو سکے کہ اس گروہ کے خیالات اسلام اور اسلامی ممالک کے لئے کتنا بڑا خطرہ بن سکتے ہیں اور ان میں معقولیت نام کی کسی چیز کا نام و نشان بھی نہیں پایا جاتا۔ ماہنامہ الحق کے اپریل مئی کے شمارے میں آئین کے حوالے سے ان مطالبات کی فہرست شائع ہوئی جو اسمبلی کے اندر اور باہر نام نہاد مذہبی جماعتوں کی طرف سے کئے جا رہے تھے۔ اس رسالے میں "قومی اسمبلی میں مسودہ دستور کی اسلامی ترمیمات کا کیا حشر ہوا" کے نام سے ایک طویل مضمون شائع ہوا۔ اس میں مضمون نگار نے یہ اعتراضات کئے کہ اس آئین کو صحیح اسلامی رنگ دینے کے لئے جو تبدیلیاں ضروری تھیں وہ منظور نہیں کی گئیں۔ یہ صاحب تحریر فرماتے ہیں:

"لیکن ہماری نگاہیں اس سب کچھ کے ہوتے ہوئے مغربی تہذیب سے مستعار بنیادی حقوق کے تصورات پر ٹھہرتی ہیں۔ اور مغربی تہذیب سے مرعوب ہو کر بنیادی حقوق کے نام سے آئین کی رہی سہی اسلامیت بھی ختم ہو جاتی ہے۔ مثلاً موجودہ بنیادی حقوق میں جنس (مرد، عورت) اور مذہب کی تمیز کئے بغیر ہر قسم کی ملازمتوں میں مساوات یہاں تک کہ وہ عدالت کا چیف جسٹس بھی بن سکے، کلیدی مناسب بھی سنبھال سکے، عام مجالس اور مقامات میں داخلہ اور مرد و زن کا اختلاط، تقریر و تحریر کی آزادی کے نام پر اخلاقی اور مذہبی اقدار سے بھی آزادی ہر شخص جو چاہے مذہب اختیار کرے، مسلم اور غیر مسلم (اہلِ ذمہ) مرد و زن سب کو تمام شعبہ ہائے حیات میں ایک لاٹھی سے ہانکنا، اس طرح کی بہت سی مثالیں اسلام کے عطا کردہ حقوق کی نفی کرتی ہیں۔ اور آگے چل کر اسلامی قانون کی کئی اہم دفعات اور تقاضوں کے نفاذ کے لئے سدِّراہ بن سکتی ہیں۔ مثلاً ۔1۔ کوئی مسلمان اپنا مذہب تبدیل نہیں کر سکتا۔ 2۔ اسلامی مملکت میں ارتداد اور اس کی تبلیغ کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔ 3۔ غیر مسلموں پر مخصوص ٹیکس جزیہ لگانے کی گنجائش ہے۔ 4۔ غلامی کے بارہ میں مخصوص حالات میں گنجائش ہے 5۔ عورت حدود اور قصاص جیسے معاملات میں جج نہیں ہو سکتی۔ 6۔ نہ اس کی قضائی ایسے امور میں معتبر ہے۔ 7۔ نہ حدود اور قصاص میں اس کی شہادت معتبر ہے۔ 8۔ نہ وہ اسلامی سٹیٹ کی سربراہ بن سکتی ہے۔ 9۔ نہ کھلے بندوں مردوں کی تفریح گاہوں اور مخلوط اجتماعات میں آجاسکتی ہے۔ 10۔ دو عورتوں کی شہادت ایک مرد کے برابر ہے۔ 11۔ غیر مسلم اور ذمی قاضی اور جج نہیں بن سکتا۔ 12۔ نہ وہ اسلامی آئین سازی کرنے والے اداروں مقننہ یا دستور ساز اداروں کا رکن بن سکتی ہے بالخصوص جب اسمبلی کو اس بات کا پابند کیا گیا ہو کہ وہ کتاب و سنت کے مطابق قانون سازی کرے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اس لئے اسلام ملازمتوں اور انتخابی عہدوں میں امتیاز ناگزیر سمجھتا ہے۔ جبکہ موجودہ بنیادی حقوق غیر مسلم اقوام (جو مرتدین کو بھی شامل ہے) کو نہ صرف صدارت، وزارت عدلیہ کی سربراہی، افواجِ اسلامی کی کمان تک عطا کرنے پر بھی قدغن نہیں لگاتے۔ 14۔ اسلام کی نگاہ میں کلیدی مناسب پر فائز ہونا تو بڑی بات ہے کسی غیر مسلم شہری کی مسلمانوں کے خلاف شہادت بھی معتبر نہیں۔" (3)

گویا ان علماء کے نزدیک صحیح اسلامی نظام تبھی آسکتا تھا جب غلامی کی مشروط اجازت ہو، حالانکہ اسلام نے غلامی کے ختم کرنے کی ابتدا کی تھی۔ عورتوں کو نہ صرف کلیدی عہدوں پر نہ لگایا جائے بلکہ وہ پبلک تفریحی مقامات پر بھی نہیں جا سکتیں۔ اور اگرچہ یہ مولوی حضرات جس سے مذہبی اختلاف ہو گا اس کے خلاف تو زہر اگلیں گے لیکن جس کو یہ غیر مسلم

سمجھیں گے اسے اس بات کی ہرگز اجازت نہیں ہو گی کہ وہ ان کو دلائل سے جواب دے۔ غیر مسلم کو نہ صرف کسی کلیدی عہدے پر مقرر نہیں کیا جائے گا بلکہ کسی مسلمان کے خلاف اس کی گواہی بھی قبول نہیں کی جائے گی۔ یہ لغو خیالات نہ صرف بنیادی انسانی حقوق کے خلاف ہیں بلکہ ان کا اسلام کی تعلیمات سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔

(1) قومی ڈائجسٹ جون 1984ء ص 37-38

(2) الفضل 12/ جون 1973ء

(3) ماہنامہ الحق اپریل مئی 1973ء ص 3 تا 5

کشمیر اسمبلی میں جماعتِ احمدیہ کے خلاف قرارداد

آئین میں شامل کئے گئے حلف ناموں سے یہ ظاہر ہو جاتا تھا کہ سیاستدانوں کا ایک طبقہ، آئین اور قانون میں ایسی تبدیلیاں کرنا چاہتا ہے جن کے نتیجے میں نہ صرف یہ کہ اپنی دانست میں احمدیوں کو غیر مسلم قرار دیا جائے بلکہ احمدیوں کو ان کے بنیادی حقوق سے بھی محروم کر دیا جائے اور انہیں دوسرے درجہ کا شہری بنانے کی کوشش کی جائے۔ اور چونکہ الیکشن میں ان جماعتوں کو مکمل شکست کا سامنا کرنا پڑا تھا جن کو عرفِ عام میں مذہبی جماعتیں کہا جاتا ہے، اس لئے انہیں نئی سیاسی زندگی پانے کے لئے کسی ایسے مسئلہ کو چھیڑنے کی ضرورت تھی جس کی آڑ میں وہ اپنے سیاسی مردے میں کچھ جان پیدا کر سکیں۔ ان پارٹیوں کو صرف اپنے سیاسی مفادات سے غرض ہوتی ہے۔ ان حرکات سے ملک و قوم کو کتنا نقصان پہنچے گا، یہ لوگ اس کی کوئی پرواہ نہیں کرتے۔ ابھی پاکستان کے آئین کو اسمبلی سے منظور ہوئے ایک ماہ بھی نہیں گزرا تھا کہ اس سازش کے آثار مزید واضح ہو کر نظر آنے لگے۔ اس مرتبہ یہ فتنہ کشمیر اسمبلی میں سر اُٹھا رہا تھا۔

اس وقت سردار عبدالقیوم صاحب کشمیر کے صدر تھے اور سردار قیوم صاحب ایک عرصہ سے جماعت احمدیہ کے خلاف سرگرمیوں میں حصہ لے رہے تھے۔ کشمیر کی اسمبلی 25 اراکین پر مشتمل تھی۔ ان میں سے 11 اراکین کا تعلق حزبِ اختلاف سے تھا اور 29/ اپریل 1973ء کو ان اراکین نے کسی وجہ سے اسمبلی کا بائیکاٹ کیا ہوا تھا۔ اس بائیکاٹ کے دوران حکومتی گروہ کے ایک رکن اسمبلی میجر ایوب صاحب نے ایک قرارداد پیش کی جس کے متعلق روزنامہ مشرق نے یہ خبر شائع کی:۔

”آزاد کشمیر اسمبلی نے ایک قرارداد منظور کی ہے جس میں حکومت آزاد کشمیر سے سفارش کی گئی ہے کہ قادیانیوں کو اقلیت قرار دیا جائے۔ ریاست میں جو قادیانی رہائش پذیر ہیں ان کی باقاعدہ رجسٹریشن کی جائے اور انہیں اقلیت قرار دینے کے بعد ان کی تعداد کے مطابق مختلف شعبوں میں ان کی نمائندگی کا یقین کرایا جائے۔ قرارداد میں کہا گیا ہے کہ ریاست میں قادیانیت کی تبلیغ ممنوع ہو گی۔ یہ قرارداد اسمبلی کے رکن میجر محمد ایوب نے پیش کی تھی۔ قرارداد کی ایک شق ایوان نے ہفتہ کے روز بحث کے بعد ایک ترمیم کے ذریعہ خارج کر دی جس میں کہا گیا تھا کہ ریاست میں قادیانیوں کا داخلہ ممنوع قرار دے دیا جائے۔ میجر ایوب نے قرارداد پیش کرتے ہوئے آئین پاکستان میں مندرج صدرِ مملکت اور وزیرِ اعظم کا حلف نامہ پڑھ کر

سنایا اور کہا کہ آئین میں ان عہدیداروں کے لئے مسلمان ہونا لازمی قرار دیا گیا ہے اور اس کے مطابق یہ حلف نامہ تجویز کیا گیا ہے جس میں واضح طور پر کہا گیا ہے کہ حلف اُٹھانے والا یہ اقرار کرتا ہے کہ اس کا ایمان ہے کہ محمد مصطفیٰؐ اللہ تعالیٰ کے نبی ہیں اور ان کے بعد کوئی نبی ہے (سہوِ کتابت معلوم ہوتی ہے۔ اصل میں کوئی نبی نہیں ہے کہ الفاظ لکھے گئے ہوں گے) میجر ایوب نے کہا کہ اصولی طور پر آئین کی اس دستاویز کی رو سے وہ لوگ خودبخود غیر مسلم ہو گئے جو رسول اکرمؐ کو آخری نبی نہیں مانتے اور چونکہ آزاد کشمیر اسمبلی اس سے قبل یہ قرارداد منظور کر چکی ہے اور اس کی روشنی میں قانون سازی بھی کی گئی ہے کہ ریاست میں اسلامی قوانین نافذ کئے جائیں گے اس لئے لازم ہے کہ اس معاملہ میں شریعت کے مطابق واضح احکامات جاری کئے جائیں۔ ایوان کے ایک رکن نے قرارداد کی تائید کرتے ہوئے پاکستان کی بعض عدالتوں کے فیصلے کا حوالہ بھی دیا جن میں قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دیا گیا ہے۔"(1)

گو کہ یہ قرارداد حکومت سے سفارش کے طور پر تھی اور قانون سازی نہیں تھی لیکن یہ بہر حال واضح نظر آ رہا تھا کہ جماعت کے مخالفین کے عزائم کیا ہیں۔ وہ چاہتے تھے کہ احمدیوں کو آئینی طور پر ایک غیر مسلم اقلیت قرار دیا جائے۔ اور انہیں یہ امید تھی کہ اگر احمدیوں کو قانونی طور پر غیر مسلم اقلیت قرار دے دیا جائے تو یہ چیز کم از کم پاکستان میں احمدیت کو ختم کرنے کے لئے کافی ہو گی۔ پہلے اس قدم کی تمہید کے طور پر آئین میں صدر اور وزیرِ اعظم کے لئے ختم نبوت کا حلف اُٹھانا ضروری قرار دیا گیا۔ اور پاکستان کے آئین میں ان حلف ناموں کو بنیاد بنا کر آزاد کشمیر کی اسمبلی میں سفارش کے طور پر یہ قرارداد منظور کرائی گئی تا کہ اسے بنیاد بنا کر پاکستان میں بھی اس قسم کا قانون بنانے کی کوششیں کی جا سکیں۔ لیکن کشمیر اسمبلی میں بھی جو قرارداد پیش کی گئی اس کا سرسری مطالعہ بھی اس بات کو واضح کر دیتا ہے قانونی طور پر احمدیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینا بھی ان کا آخری مقصد نہیں تھا بلکہ اصل مقصد یہ تھا کہ احمدیوں کو ہر قسم کے بنیادی حقوق سے محروم کر دیا جائے۔ مثلاً یہ تجویز کیا گیا تھا کہ احمدیوں کی رجسٹریشن کی جائے اور انہیں آبادی کے تناسب سے مختلف شعبوں میں ملازمتیں دی جائیں۔ حالانکہ کشمیر یا پاکستان میں ایسا کوئی قانون تھا ہی نہیں کہ کسی مذہبی گروہ کو خواہ وہ اکثریت میں ہو یا اقلیت میں ہو ، آبادی کے تناسب سے ملازمتیں دی جائیں گی۔ یہ شوشہ چھوڑنے کا مقصد صرف یہ تھا کہ احمدی میرٹ کی بنیاد پر اپنا حق حاصل نہ کر سکیں۔ اور ان پر ایسا معاشی اور اقتصادی دباؤ ڈالا جائے کہ وہ ارتداد کا راستہ اختیار کریں۔ گو کہ منظوری کے وقت یہ حصہ حذف کر دیا گیا لیکن جو قرارداد میجر ایوب صاحب کی طرف سے پیش کی گئی اس میں یہ شق بھی شامل تھی کہ ریاست

میں احمدیوں کے داخلے پر پابندی لگائی جائے۔ تو اصل ارادے یہی تھے کہ احمدیوں کو ان کے تمام حقوق سے محروم کر دیا جائے ورنہ ریاست میں ہندو، عیسائی اور یہودی تو داخل ہو سکتے تھے لیکن احمدی مسلمانوں کے داخلہ پر پابندی لگانے کی تجویز کی جا رہی تھی۔ گویا یہ ان خدمات کا صلہ دیا جا رہا تھا جو احمدیوں نے اہلِ کشمیر کی مدد کے لئے سرانجام دی تھیں۔ اس قرارداد میں ایک اہم سفارش یہ تھی کہ ریاست میں احمدیوں کی تبلیغ پر مکمل پابندی لگائی جائے۔ یہ بات قابلِ مذمت ہونے کے ساتھ قابلِ فہم بھی تھی کیونکہ مخالفینِ جماعت دلائل کے میدان میں احمدیوں کا مقابلہ کرنے سے کتراتے ہیں اور ان کی ہمیشہ سے یہی خواہش رہی ہے کہ انہیں تو ہر قسم کا زہر اگلنے کی اجازت ہو بلکہ اس غرض کے لئے ہر قسم کی سہولت مہیا کی جائے مگر احمدیوں پر پابندی ہونی چاہئے کہ وہ اس کا جواب نہ دے سکیں۔ یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ کشمیر میں عیسائیت یا دوسرے مذاہب کی تبلیغ پر کوئی پابندی لگانے کی سفارش نہیں کی گئی تھی، صرف احمدیت کی تبلیغ پر پابندی لگانے پر زور تھا۔ احمدیوں کی تبلیغ پر پابندی لگانے پر اصرار اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ یہ گروہ احمدیوں کے دلائل سے خائف رہتا ہے۔

پاکستان کے اکثر بڑے اخباروں میں یہ خبر ایک خاص معنی خیز انداز میں شائع کی جا رہی تھی۔ ایک تو جب نوائے وقت، امروز اور پاکستان ٹائمز میں یہ خبر شائع کی گئی تو یہ شائع نہیں کیا کہ ابھی اس کے مطابق قانون سازی نہیں کی گئی اور یہ قرارداد ایک سفارش کی حیثیت رکھتی ہے بلکہ یہ لکھا گیا کہ کشمیر میں احمدیوں کو غیر مسلم قرار دے دیا گیا ہے۔ دوسرے ان تینوں اخباروں میں یہ لکھا گیا کہ یہ قرارداد متفقہ طور پر منظور کی گئی ہے (3،4،5) جس سے یہ تاثر دیا جا رہا تھا کہ اسمبلی کے تمام اراکین نے اس قرارداد کے حق میں ووٹ دیا تھا حالانکہ حقیقت یہ تھی کہ اس وقت اپوزیشن اسمبلی میں موجود ہی نہیں تھی۔ اور خدا جانے یہ بات صحیح تھی کہ غلط مگر بعض حکومتی اراکین نے بھی احمدیوں کے سامنے اس بات کا اظہار کیا کہ انہوں نے بھی اس کے حق میں ووٹ نہیں دیا جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ ممکن ہے کہ اس وقت بعض حکومتی اراکین بھی اسمبلی میں موجود نہیں تھے جب کسی وجہ سے عجلت میں یہ قرارداد منظور کرائی گئی۔ (5)

یہ بات بھی قابلِ غور تھی کہ وہ اخبارات جو کہ پاکستان کی حکومت کے اپنے اخبارات تھے یعنی امروز اور پاکستان ٹائمز، وہ بھی اس قرارداد کے متعلق صحیح حقائق پیش کرنے کی بجائے بات کو توڑ مروڑ کر پیش کر رہے تھے۔ حقائق کو توڑ مروڑ کر پیش کرنے کا ایک ہی مقصد ہو سکتا تھا اور وہ یہ کہ پاکستان میں جماعت احمدیہ کی مخالفت کو ہوا دی جائے۔ جماعت کی مخالف پارٹیوں کو تو گزشتہ انتخابات میں مکمل شکست کے بعد اس بات کی ضرورت تھی کہ وہ جماعتِ احمدیہ کے خلاف شورش پیدا کر کے اپنی

سیاست کے مردے میں جان ڈالیں لیکن اب اس بات کے آثار واضح نظر آ رہے تھے کہ حکومت میں شامل کم از کم ایک طبقہ اب جماعت احمدیہ کے خلاف سازش میں شریک ہو رہا ہے اور کچھ سرکاری افسران بھی اس رو میں بہہ چکے تھے۔ اور اسی طرح ایک شورش برپا کرنے کی کوشش ہو رہی تھی جس طرح بیس سال قبل 1953ء میں برپا کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ بیس پچیس سال قبل بھی ان نام نہاد مذہبی جماعتوں کو انتخابات میں شکست کا سامنا کرنا پڑا تھا اور انتخابات میں وہ جماعت کامیاب ہوئی تھی جسے جماعتِ احمدیہ کی حمایت حاصل تھی اور ان نام نہاد سیاسی جماعتوں نے سیاسی زندگی حاصل کرنے کے لئے جماعتِ احمدیہ کے خلاف ایک شورش برپا کی تھی اور برسرِ اقتدار پارٹی کا ایک حصہ اپنے مفادات کے لئے مولویوں کی تحریک کی پشت پناہی کرنے پر آمادہ ہو گیا تھا اور وہ اخبارات جماعت کے خلاف زہر اگلنے لگے تھے جنہیں حکومتِ پنجاب کی مالی سرپرستی حاصل تھی۔ اور اب بھی اس بات کے آثار نظر آ رہے تھے کہ تاریخ دہرائی جا رہی ہے۔

بہت جلد پاکستان میں یہ بیان بازی شروع کر دی گئی کہ اب پاکستان میں ایسی قانون سازی کرنی چاہئے جس کے ذریعہ جماعتِ احمدیہ کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا جائے۔ جماعتِ اسلامی کے امیر میاں طفیل محمد صاحب نے کہا کہ آزاد کشمیر کی حکومت کا فیصلہ بالکل صحیح اور حقیقت کے مطابق ہے اور حکومتِ پاکستان کو اس کی پیروی کرنی چاہئے (6)۔ جمعیت العلماء پاکستان کی طرف سے بھی یہ قدم اُٹھانے پر صدر آزاد کشمیر کو مبارکباد دی گئی اور اس جماعت کے صدر شاہ احمد نورانی صاحب نے حکومتِ پاکستان سے مطالبہ کیا کہ وہ احمدیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دے دے۔ اس کے علاوہ مختلف مساجد میں خطیبوں نے بھی اس قرارداد کا خیر مقدم کر کے حکومتِ پاکستان سے مطالبہ کیا کہ احمدیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دے دے (8,7)۔ آزاد کشمیر کی حکومت کو یہ مبارکبادیں صرف ملک کے اندر سے نہیں موصول ہو رہی تھیں بلکہ جلد ہی جماعت کے مخالف جریدوں نے یہ خبر شائع کی کہ رابطہ عالمِ اسلامی کے جنرل سیکریٹری نے تار کے ذریعہ مکہ معظمہ سے پاکستان کے صدر بھٹو کو آزاد کشمیر کی اسمبلی کی اس قرارداد پر مبارکباد کی تار دی ہے۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ یہ تار آزاد کشمیر کے صدر کو نہیں بلکہ پاکستان کے وزیر اعظم کو بھجوائی گئی تھی۔ رابطہ عالم اسلامی کے سیکریٹری جنرل نے دنیا کے مسلمان ممالک سے اپیل کی کہ وہ اپنے ممالک میں قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دیں اور مسلمان فرقوں میں اس گمراہ فرقہ کو اپنا شر پھیلانے کی اجازت نہ دی جائے۔ (9)

جب احمدیوں نے یہ خبریں پڑھیں تو لازماً انہیں بہت تشویش ہوئی اور ان کی طبیعتوں میں غم و غصہ پیدا ہوا۔ فطرتی بات ہے کہ ایسے موقع پر احمدی احباب اپنے امام کی طرف دیکھتے ہیں اور انہی سے راہنمائی کی درخواست کرتے ہیں۔ چنانچہ حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ نے 4/ مئی 1973ء کو ربوہ میں اس قرارداد پر خطبہ جمعہ ارشاد فرمایا اور احباب جماعت کو بعض اصولی ہدایات سے نوازا۔ اس وقت احمدیوں کے دلوں میں جس قسم کے جذبات پیدا ہو رہے تھے اس کے متعلق حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ نے ارشاد فرمایا:۔

”۔۔۔۔۔ غرض جس احمدی دوست نے بھی یہ خبر پڑھی اس کی طبیعت میں شدید غم و غصہ پیدا ہوا۔ چنانچہ دوستوں نے مجھے فون کیے، میرے پاس آدمی بھجوائے، خطوط آئے، تاریں آئیں۔ احباب نے خطوط اور تاروں وغیرہ کے ذریعہ اپنے آپ کو رضاکارانہ طور پر خدمت کے لیے پیش کیا کہ اگر قربانی کی ضرورت ہو تو ہم قربانی دینے کے لیے تیار ہیں۔ چنانچہ میں نے تمام دوستوں کو جنہوں نے خطوط اور تاروں کے ذریعہ مخلصانہ جذبات کا اظہار کیا اور ان کو بھی جو میرے پاس آئے یہی سمجھایا کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں عقل و فراست عطا فرمائی ہے اور عزت اور احترام کا مقام بخشا ہے۔ پس عقل و فراست اور عزت و احترام کا یہ مقام جو خدا تعالیٰ نے اپنے فضل سے ہمیں مرحمت فرمایا ہے، یہ اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ ہم پورے اور صحیح حالات کا علم حاصل کیے بغیر منہ سے کچھ نہ کہیں۔ اس قرارداد کے الفاظ کیا ہیں۔ قرارداد پاس کرنے والوں میں کون کون شامل ہے۔ یہ خبر اخباروں میں نمایاں طور پر کیوں آئی سوائے پاکستان ٹائمز کے جس نے پانچویں صفحے پر شائع کی لیکن چوکھٹا بنا کر گویا اس نے بھی اس کو نمایاں کر دیا۔ جب تک اس کے متعلق ہمیں علیٰ وجہ البصیرت کوئی علم نہ ہو اس وقت تک ہم اس پر کوئی تنقید نہیں کر سکتے۔ میں نے دوستوں سے کہا، ہم حقیقتِ حال کا پتہ کریں گے اور پھر اس کے متعلق بات کریں گے۔“(10)

حضورؒ نے اس خطبہ جمعہ میں اس قرارداد کے پاس ہونے کے صحیح حالات بیان فرمائے اور جس طرح اخبارات نے اس خبر کو شائع کیا اس کا تجزیہ بیان فرمایا۔ حضورؒ نے کشمیر اسمبلی کی قرارداد کی حقیقت بیان کرتے ہوئے فرمایا۔

”پس اگر نو یا بارہ آدمیوں نے اس قسم کی قرارداد پاس کر دی تو خدا کی قائم کردہ جماعت پر اس کا کیا اثر ہو سکتا ہے۔ اس کے نتیجہ میں جو خرابیاں پیدا ہو سکتی ہیں وہ یہ نہیں کہ جماعتِ احمدیہ غیر مسلم بن جائے گی۔ جس جماعت کو اللہ تعالیٰ مسلمان کہے اسے کوئی ناسمجھ انسان غیر مسلم قرار دے تو کیا فرق پڑتا ہے۔ اس لیے ہمیں اس کا فکر نہیں ہمیں فکر ہے تو اس بات کا کہ

اگر یہ خرابی خدانخواستہ انتہا تک پہنچ گئی تو اس قسم کے فتنہ وفساد کے نتیجے میں پاکستان قائم نہیں رہے گا۔ اس لیے ہماری دعائیں ہیں ہماری کوششیں ہیں اور ہمارے اندر حُبُّ الوطنی کا یہ جذبہ موجزن ہے کہ کسی قسم کا کوئی بھی فتنہ نہ اُٹھے کہ جس سے خود پاکستان کا وجود خطرے میں پڑ جائے۔ آخر فتنہ وفساد یہی ہے نہ کہ کچھ سر کٹیں گے، کچھ لوگ زخمی ہوں گے۔ کون ہوں گے، کیا ہو گا، یہ تو اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے لیکن جب اس قسم کا فساد ہو گا تو دنیا میں ہماری ناک کٹے گی، ہر جگہ پاکستان کی بدنامی ہو گی۔“ (11)

حضور نے فرمایا کہ اب جماعتِ اسلامی اور جماعت احمدیہ کی مخالف جماعتیں حکومت کو دھمکیاں دے رہی ہیں کہ اگر ان کے مطالبات نہ مانے تو 1953ء جیسے حالات پیدا ہو جائیں گے۔ دراصل یہ لوگ 1953ء کا نام لے کر اپنے نفسوں کو دھوکہ دے رہے ہیں۔ ان لوگوں کو اس وقت اتنی ذلّت اٹھانی پڑی تھی کہ اگر وہ ذرا بھی سوجھ بوجھ سے کام لیتے تو 53ء کا نام بھی نہ لیتے مگر جماعتِ احمدیہ نے اس فساد فی الملک میں اللہ تعالیٰ کی تائید و نصرت کے عظیم نشان دیکھے۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت نے جماعت کو بڑی ترقی عطا فرمائی اس لیے ہمارے حق میں 53ء بڑا مبارک زمانہ ہے جس میں جماعت بڑی تیزی سے ترقی اور رفعتوں میں کہیں سے کہیں جا پہنچی۔ حضور نے بیان فرمایا کہ ایسے بھی احمدی ہیں جو 1953ء میں احمدیوں کے گھروں کو آگ لگانے کے لیے نکلا کرتے تھے مگر بعد میں حق کو پہچان کر خود احمدی ہو گئے۔

حضور نے خطبہ جمعہ کے آخر میں فرمایا:۔

”میرا خیال ہے کہ میں نے ایک احمدی کا جو صحیح مقام ہے وہ آپ کو سمجھا دیا ہے۔ آپ دعا کریں اور اس مقام پر مضبوطی سے قائم رہیں کیونکہ ہمارے لئے جو وعدے ہیں اور ہمیں جو بشارتیں ملی ہیں وہ اس شرط کے ساتھ ملی ہیں کہ خدا تعالیٰ نے ہمیں جس مقام پر سرفراز فرمایا ہے اس کو بھولنا نہیں اور اس کو بھولنا نہیں اور اس کو چھوڑنا نہیں۔ خدا تعالیٰ کے دامن کو مضبوطی سے پکڑے رکھنا ہے۔ آنحضرتؐ سے پیار کرتے رہنا ہے۔ اپنے آپ کو کچھ نہیں سمجھنا۔ بے لوث خدمت میں آگے رہنا ہے اور اس طرح اللہ تعالیٰ کے پیار کو حاصل کرنا ہے اور جب دنیا پیار کو کلّی طور پر قبول کرنے سے انکار کر دے تو حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے اس الہام کو یاد رکھنا کہ ”اُٹھو نمازیں پڑھیں اور قیامت کا نمونہ دیکھیں“ (12)

یہ ایک عجیب بات ہے کہ جب ہم نے جماعتِ اسلامی کے لیڈر پروفیسر غفور صاحب سے انٹرویو کے دوران آزاد کشمیر اسمبلی کی اس قرار داد کے بارے میں دریافت کیا تو انہوں نے کہا کہ انہیں اس کا علم نہیں اور یہ بھی کہا کہ 1973ء میں تو

قادیانیوں کے بارے میں کوئی Issue نہیں تھا۔ جب انہیں میاں طفیل محمد صاحب امیر جماعتِ اسلامی کے بیان کا حوالہ دیا گیا تو انہوں نے کہا کہ مجھے یاد نہیں ہے۔ اور پھر دہرایا کہ 1973ء میں تو قادیانیوں کے بارے میں کوئی Dispute نہیں تھا۔

(1) مشرق یکم مئی 1973ء ص 6۔
(2) نوائے وقت 30/ اپریل 1973ء ص 1
(3) پاکستان ٹائمز 30/ اپریل 1973ء۔
(4) امروز 30/ اپریل 1973ء ص 1
(5) آزاد کشمیر اسمبلی کی ایک قرارداد پر تبصرہ از حضرت امام جماعتِ احمدیہ، ناشر نظارت اشاعت لٹریچر و تصنیف صدر انجمن احمدیہ پاکستان ربوہ ص 4۔
(6) نوائے وقت 3/ مئی 1973ء ص 1
(7) نوائے وقت 16/ مئی 1973ء ص 2
(8) نوائے وقت 5/ مئی 1973ء ص آخر۔
(9) المنبر 6/ جولائی 1973ء ص 15،14
(10) آزاد کشمیر اسمبلی کی ایک قرارداد پر تبصرہ از حضرت امام جماعتِ احمدیہ، ناشر نظارت اشاعت لٹریچر و تصنیف صدر انجمن احمدیہ پاکستان ربوہ ص 3،2
(11) آزاد کشمیر اسمبلی کی ایک قرارداد پر تبصرہ از حضرت امام جماعتِ احمدیہ، ناشر نظارت اشاعت لٹریچر و تصنیف صدر انجمن احمدیہ پاکستان ربوہ ص 5،4
(12) آزاد کشمیر اسمبلی کی ایک قرارداد پر تبصرہ از حضرت امام جماعتِ احمدیہ، ناشر نظارت اشاعت لٹریچر و تصنیف صدر انجمن احمدیہ پاکستان ربوہ ص 16

1973ء کی ہنگامی مجلسِ شوریٰ

اب تک ہم یہ جائزہ لیتے رہے ہیں کہ 1973ء کے پہلے تین ماہ کے اختتام تک اس بات کے آثار نظر آرہے تھے کہ جماعتِ احمدیہ کے مخالفین پہلے کی طرح ایک بار پھر جماعت احمدیہ کے خلاف سازش تیار کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ لیکن بہت سے حقائق ابھی منظرِ عام پر نہیں آئے تھے۔ احبابِ جماعت کو بھی یہ علم نہیں تھا کہ 1953ء کی نسبت بہت زیادہ وسیع پیمانہ پر یہ سازش تیار کی جا رہی تھی۔ 1973ء کی مجلسِ مشاورت حسب معمول 30 مارچ تا یکم اپریل 1973ء منعقد ہوئی تھی۔ اب ایسے حالات پیدا ہو رہے تھے جن سے جماعت کو آگاہ کرنا ضروری تھا۔ چنانچہ حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ کے خصوصی ارشاد پر 27 مئی 1973ء کو مجلسِ مشاورت کا ایک ہنگامی اجلاس طلب کیا گیا۔ حسبِ قواعد اس میں جملہ نمائندگان مجلسِ مشاورت 1973ء کو مدعو کیا گیا کیونکہ قواعد کے مطابق کسی مجلسِ شوریٰ کا نمائندہ پورے سال کے لئے نمائندہ ہوتا ہے۔

جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے حضورؒ نے اس موقع پر 1970ء کے انتخابات کے وقت ملک کی صورت حال اور انتخابات میں جماعتِ احمدیہ کے فیصلے کی حکمت کا تفصیلی تجزیہ فرمایا۔ چونکہ اس وقت تک یہ بات ظاہر ہو چکی تھی کہ پاکستان پیپلز پارٹی کا ایک گروہ باوجود اس حقیقت کے کہ انتخابات کے مرحلہ پر احمدیوں نے ان کی مدد کی تھی اور وہ خود درخواست کر کے احمدیوں کی مدد طلب کر رہے تھے، اب جماعت کی مخالفت میں سرگرم نظر آرہے تھے۔ وہ اقتدار میں آکر سمجھتے تھے کہ اب انہیں اس غریب مزاج گروہ کی کیا ضرورت ہے بلکہ اب احمدیوں کی مخالفت کر کے وہ مولویوں کی آنکھوں کا تارہ بن سکتے ہیں۔ دنیاوی نگاہ سے دیکھا جائے تو ان کا تجزیہ غلط بھی نہیں تھا لیکن وہ یہ بات نہیں سمجھ پا رہے تھے کہ اس غریب جماعت کا ایک مولا ہے جو ان کی حفاظت کر رہا ہے۔ حضور نے اس مجلسِ شوریٰ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ پیپلز پارٹی کے منتخب اراکین کے تین گروپ ہیں۔ پہلا گروہ وہ ہے کہ جب سے انہوں نے ہوش سنبھالا ہے وہ جماعتِ احمدیہ کے دشمن چلے آرہے ہیں۔ اور اب جب کہ وہ اسمبلیوں کے ممبر اور حق و انصاف کے امین ہیں ہنوز ہمارے بڑے سخت مخالف اور معاند ہیں۔ اور جماعت احمدیہ نے صرف ملک کے استحکام کی خاطر انتخابات میں ان لوگوں کی مدد کی تھی۔ دوسرا گروہ ایسے افراد پر مشتمل ہے جن کے اندر کسی قسم کا مذہبی تعصب نہیں۔ وہ انتخاب سے پہلے بھی ہمارے دوست تھے اور اب بھی ہیں تاہم یہ دوستی اسی قسم کی دوستی ہے

جو دنیا میں دنیا کی خاطر پیدا ہوتی ہے۔ یہ اس قسم کی دوستی نہیں جس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ ہم نے تو تمہارے لئے عزت اور شرف کا سامان آسمانوں سے نازل کیا تھا اور تم اس سے بے اعتنائی برت رہے ہو۔ پیپلز پارٹی کا ایک تیسرا گروہ بھی ہے اور اس کی شاید اکثریت ہے۔ یہ گروہ نیوٹرل ہے یعنی نہ ہمارے ساتھ اس کی کوئی دوستی ہے اور نہ ہمارے ساتھ اس کی کوئی دشمنی ہے۔ چونکہ پارٹی میں اس گروہ کی اکثریت ہے اور دنیا میں بالعموم نیوٹرل کی اکثریت ہوا کرتی ہے اس لئے اگر پیپلز پارٹی کی قیادت ان کو صحیح راستہ بتادے گی تو وہ صحیح راستہ پر چل پڑیں گے اگر ان کو غلط راستہ پر ڈال دیں گے تو غلط راستہ پر چل پڑیں گے۔ حضور نے ان تین گروہوں کا تجزیہ کرنے کے بعد فرمایا:۔

”۔۔۔۔۔پھر چونکہ ہم نے کوئی سودا بازی نہیں کی تھی کوئی معاہدہ نہیں کیا تھا اس لئے اگر پیپلز پارٹی کا وہ معاند گروہ (جس کا میں پہلے تجزیہ کر آیا ہوں اور جو پندرہ بیس فیصد سے زیادہ نہیں) اگر احمدیت مردہ باد کا نعرہ لگائے تو کسی احمدی دوست کو یہ نہیں سوچنا چاہیے کہ پیپلز پارٹی کا ہم سے کوئی معاہدہ تھا جس کی انہوں نے کوئی خلاف ورزی کی ہے۔ ہمارا ان کے ساتھ کوئی معاہدہ نہیں ہے ہم نے ان کے ساتھ کوئی سودا بازی نہیں کی۔ اگر وہ ہمارے ساتھ کوئی زیادتی کریں تو ہمیں دکھ ہو گا، گلہ شکوہ اور غصہ نہیں آئے گا کیونکہ سودا بازی کا مطلب یہ ہے کہ جس سے ہم سودا بازی کر رہے ہیں وہ ہمیں غلام سمجھ کر یا مال سمجھ کر مارکیٹ میں لے جائے اور یہ تو ہم ایک لمحہ کے لیے بھی برداشت نہیں کر سکتے لیکن جیسا کہ میں نے بتایا ہے اس معاند گروہ کی طرف سے ہمیں آوازیں پہنچتی رہتی ہیں کہ ہم یہ کریں گے اور وہ کریں گے لیکن ہم پیپلز پارٹی کو بحیثیت مجموعی موردِ الزام نہیں ٹھہرا سکتے۔ میں آج کی بات کر رہا ہوں کل کا مجھے پتہ نہیں کیا ہو گا۔ نہ ہمیں اس بات کا کوئی حق ہے کیونکہ ہم نے ان کے ساتھ کوئی سودا ہی نہیں کیا۔ ہم نے ان کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا ہے اس شرط کے ساتھ کہ صرف وہی ہمارے دوست نہیں ہوں گے اور بھی ہوں گے کیونکہ ان کے ساتھ ہم نے کوئی الحاق تو نہیں کیا تھا۔ ہم نے تو دوسری پارٹیوں کے بعض امیدواروں کو بھی ووٹ دیئے تھے اب ان کی مرضی ہے کہ وہ دوستی کے حق کو نباہیں یا نہ نباہیں۔ ہمیں تعلیم دینے والے نے یہ فرمایا ہے کہ تم نے خود دوستی نہیں توڑنی لیکن ہمیں خدا نے یہ اختیار تو نہیں دیا کہ دوسروں کو مجبور کریں کہ ضرور دوستی قائم رکھی جائے۔ دوستی کا تعلق ضرور ہے لیکن ہم ان کو خدا نہیں سمجھتے نہ داتا سمجھتے ہیں۔ اَن داتا کا تو کوئی سوال ہی نہیں ہے۔ دوست یہ یاد رکھیں پھر میں کہتا ہوں کہ یاد رکھیں ہمارے لئے ایک ہی دروازہ ہے جس کی دہلیز پر ہم کھڑے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کا دروازہ ہے۔ خدا کی رحمت کے دروازے کے مقابلہ میں ان دروازوں کی حیثیت ہی کیا ہے اور ہم نے ان کی طرف منہ کیوں

کرنا ہے اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ کوئی ہمارا محافظ اور Savior ہے تو وہ بڑا ہی نالائق اور بیوقوف ہے، اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ کسی سے ہم نے دولت لینی ہے یا کسی سے ہم نے اثر و رسوخ حاصل کرنا ہے تو اس سے زیادہ ناسمجھ اور کوئی نہیں ہم تو ایک ہی ہستی کے در پر جا پڑے ہیں اور اپنے اِس مقامِ عجز اور فروتنی پر خوش ہیں اور مطمئن ہیں اور راضی ہیں۔۔۔۔۔

بعض لوگوں نے (یہی جو پیپلز پارٹی میں ہمارا معاند اور مخالف گروپ ہے اس میں سے بعض نے) یہ کہنا شروع کر دیا کہ یہ ہمارے بہت سر چڑھ گئے ہیں سفارشیں لے کر آ جاتے ہیں۔ سمجھتے ہیں کہ ہم ان کی سفارشیں مانیں گے اس قسم کی باتیں سننے میں آئیں۔ اگرچہ ہم اس بات کا پیپلز پارٹی کو بحیثیت جماعت الزام نہیں دیتے کیونکہ اس قسم کی باتیں کرنے والا ان کی پارٹی کا چھوٹا سا حصہ ہے لیکن میں نے سوچا کہ اگر اس چھوٹے سے حصہ کی طرف سے بھی اس قسم کی آواز نکلتی ہے تو ان سے بالکل تعلق نہیں رکھنا چاہیئے۔ چنانچہ میاں طاہر احمد صاحب بہت سارے کام کرتے تھے ان کو میں نے بلا کر مزاحاً کہا کہ اب آپ اپنے آپ کو Under House Arrest سمجھیں آپ نے باہر بالکل جانا ہی نہیں۔ یہ (پیپلز پارٹی والے) اپنے آپ کو کیا سمجھتے ہیں کیا ہم ان کے محتاج ہیں۔ ہم اگر کسی کے محتاج ہیں تو خدائے قادر و توانا کے محتاج ہیں۔ خدا کرے کہ ہماری یہ احتیاج ہمیشہ قائم رہے عمل کے لحاظ سے بھی اور اعتقاد کے لحاظ سے بھی اور ایمان کے لحاظ سے بھی۔ غرض وہی خدائے قادر و توانا ہے جو ہماری ہر ایک احتیاج کو پورا کرنے والا ہے۔ دنیا نے ہماری ضرورتوں کو کیا پورا کرنا ہے اور ہم نے ان سے کیا مانگنا ہے۔ غرض میاں طاہر احمد صاحب کو میں نے روک دیا کہ آپ باہر جائیں ہی نہ۔ ہمیں ضرورت ہی کوئی نہیں تاہم اس کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ اگر پیپلز پارٹی کے پندرہ بیس فیصد لوگ اس قسم کی باتیں کریں تو ہم نے پارٹی سے ناراض ہو جانا ہے۔ ان پندرہ بیس فیصد لوگوں سے بھی اگر کہیں اتفاقاً ملاقات ہو جائے تو کیا وہ حسنِ اخلاق جو اسلام نے ہمیں سکھائے ہیں اور حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے ان اخلاق کا ہماری زندگیوں میں دوبارہ احیاء فرمایا ہے۔ وہ ہم چھوڑ دیں گے؟ نہیں ہر گز نہیں! ہم اسی طرح بشاشت اور مسکراتے چہروں کے ساتھ ان سے ملیں گے اور ان کی نالائقیوں کا ہم ان کے سامنے اظہار بھی نہیں کریں گے۔۔۔۔۔”(1)

پھر حضرت مرزا ناصر احمد صاحب خلیفۃ المسیح الثالثؒ نے موجودہ حالات پر منطبق ہونے والے قرآنِ کریم کے بعض احکامات اور حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے ارشادات بیان فرمائے اور ان کی روشنی میں جماعتِ احمدیہ کی اہم ذمہ داریاں اور ان سے عہدہ برآ ہونے کا صحیح طریق بیان فرمایا اور فرمایا کہ ہمیں اجتماعی زندگی میں فساد سے بچنے کا حکم دیا گیا ہے اور فساد

کرنے والوں کو قرآنِ کریم سخت انتباہ کرتا ہے البتہ خود حفاظتی میں تو گولی چلانا بھی جرم نہیں ہے۔ حضورؒ نے اس ضمن میں 1947ء کے پُر آشوب دور کا ذکر فرمایا، جب ہر طرف قتل و غارت کا بازار گرم تھا اور افراتفری پھیل گئی تھی۔ لیکن اس دور میں بھی احمدیوں نے دلیری سے حالات کا مقابلہ کیا تھا۔ پھر حضورؒ نے حال میں ہی منظرِ عام پر آنے والی آزاد کشمیر اسمبلی کی قرارداد پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا:۔

”میں نے اپنے اس خطبہ میں جس میں مَیں نے آزاد کشمیر اسمبلی کی ایک قرارداد پر تبصرہ کیا ہے بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ھُوَ سَمّٰکُمُ الْمُسْلِمِیْنَ کہہ کر خود ہمارا نام مسلمان رکھا ہے اور پھر اسی آیہ کریمہ میں اس نے یہ بھی بتایا ہے کہ میں نے تمہارا نام مسلمان کیوں رکھا ہے۔ دوست اس آیت کو پیشِ نظر رکھیں اور اسے بار بار پڑھتے رہیں اور اس حقیقت کو یاد رکھیں کہ ہمیں خدائے قادر و توانا نے مسلمان کا نام دیا ہے۔ جس آدمی کو خدا نے مسلمان کا نام دیا ہو اسے خدا کی مخلوق میں سے کوئی یا ساری مخلوق مل کر بھی غیر مسلم کیسے قرار دے سکتی ہے۔ البتہ اس قسم کے اعلان کرنے پر تو کوئی پابندی نہیں اور نہ خود ہی اپنے اسلام کا ڈھنڈورا پیٹنے کا کوئی فائدہ ہے۔ اسلام کا فائدہ تو تب ہے جب کہ انسان خدا کی نگاہ میں بھی مسلمان ہو کیونکہ اسلام کوئی شہد کی شیشی تو نہیں کہ اسے آپ گھر لے جائیں گے اور بوقتِ ضرورت استعمال کر لیں گے یا یہ کوئی ریشم کے نرم و نفیس کپڑے تو نہیں جسے آپ اپنی عورتوں کو پہنا دیں گے اور وہ ان سے خوشی اور فخر محسوس کریں گی۔ اسلام تو ایک ایسی حقیقت ہے جس کی معرفت کا راز صرف اسی شخص پر کھلتا ہے جو خدا کا ہو کر خدا کی نگاہ میں حقیقی مسلمان ٹھہرتا ہے۔ خدائی ٹھیکیداروں کی طرف سے کسی کو مسلمان بنانے یا نہ بنانے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔۔۔۔۔

پس یہ اور اس قسم کی دوسری باتیں سراسر بے ہودہ ہیں ان سے ڈرنے کی قطعاً ضرورت نہیں لیکن ہم نے تدبیر ضرور کرنی ہے اور وہ ہم انشاء اللہ کریں گے۔“ (2)

جیسا کہ ہم ذکر کر چکے ہیں کہ اس بات کے آثار واضح نظر آ رہے تھے کہ جماعت احمدیہ کے خلاف ایک گہرا منصوبہ تیار کیا جا رہا ہے لیکن ابھی تک جماعتی عہدیداران میں سے ایک بڑی تعداد کو بھی اس کی تفصیلات کا علم نہیں تھا۔ لیکن اب یہ ضروری تھا کہ کم از کم جماعت احمدیہ کے ذمہ دار افراد کو اس منصوبے کی تفصیلات سے آگاہ کیا جائے۔ اس تمہید کے بعد حضورؒ نے نمائندگانِ مجلسِ مشاورت کو آگاہ فرمایا کہ اب جماعتِ احمدیہ کے خلاف تین خطرناک منصوبے تیار کئے جا رہے ہیں۔ اور ان منصوبوں سے محفوظ رہنے کی حکیمانہ نصائح سے نوازا۔ حضورؒ نے فرمایا کہ پہلا منصوبہ، جس کی خبر اللہ تعالیٰ نے دو مبارک

رؤیا میں دی تھی، وہ دو سیاسی جماعتوں نے مل کر بنایا ہے۔ اور وہ منصوبہ یہ ہے کہ ایک ہی وقت میں امامِ جماعت اور بہت سے افرادِ جماعت کو قتل کر دیا جائے۔ حضورؒ نے فرمایا کہ رؤیا میں اللہ تعالیٰ نے یہ بھی بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے اس منصوبے کو ناکام کر دے گا اور انہیں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑے گا اور فرمایا کہ یہ تو ٹھیک ہے کہ ہمیں کامیابی کی بہت بشارتیں دی گئی ہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم اپنی ذمہ داریاں بھول جائیں۔ ہم نے جو تدبیر کرنی ہے اور بیداری کا نمونہ دکھانا ہے اور اپنے مخالف اور معاند کے سامنے یک جہتی اور اتحاد کا مظاہرہ کرنا ہے اور اس دنیا سے استغناء کے جو مظاہرے دنیا کو دکھانے ہیں وہ آسمان سے فرشتوں نے آکر نہیں دکھانے یہ تو ہمارا کام ہے کہ ہم حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے کماحقہ تدبیر کریں۔ بیداری اور چوکسی، اتحاد اور اتفاق کا ایسا شاندار مظاہرہ کریں کہ ہمارے مخالفین کو ہمارے خلاف کچھ کہنے یا کرنے کی جرأت نہ ہو۔"(3)

حضورؒ نے دوسرے منصوبے کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

"دوسرا منصوبہ بھی نہایت ہی خبیثانہ منصوبہ ہے۔ اس کے متعلق بھی دیر سے خبریں مل رہی تھیں۔ جن لوگوں نے اس قسم کا منصوبہ بنایا ہے انہوں نے دراصل احبابِ جماعت کو پہچانا نہیں کہ وہ کس مٹی کے بنے ہوئے ہیں۔ اس منصوبہ کے دو حصے ہیں۔ ایک یہ ہے کہ دنیوی عزت و وجاہت یا شان و شوکت یا مال و زر کے بل بوتے پر وہ احبابِ جماعت کے سروں کو اپنے سامنے جھکا دیں اور بزعمِ خود جماعت کو اتنا تنگ کریں کہ دوست ان کے سامنے جھکنے پر مجبور ہو جائیں۔ ایسے لوگ جو اس قسم کے منصوبے بناتے ہیں کتنے نالائق اور بیوقوف ہیں۔ وہ سمجھتے نہیں کہ ہم تو صرف ایک آستانہ پر جھکتے ہیں۔ وہ دیکھتے نہیں کہ ایک ہی در ہے جس پر ہمارا سر جھکتا ہے اور وہ خدا تعالیٰ کا در ہے۔۔۔۔۔۔

یہ اپنے آپ کو کیا سمجھتے ہیں۔ جماعتِ احمدیہ اور اس کے افراد انہیں کیا وقعت دیتے ہیں۔ سیاسی پارٹیوں کے نام پر باہر سے پیسے کھا کر وہ ہم پر رعب جماتے ہیں کہ وہ یہ کر دیں گے وہ کر دیں گے۔"(4)

حضورؒ نے مخالفین کے تیسرے منصوبے کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے فرمایا:

"تیسرا منصوبہ ربوہ میں منافقین کے ذریعہ ایک متوازی جماعت قائم کرنے سے متعلق ہے۔ خدا تعالیٰ نے ایسا تصرف فرمایا کہ مجھ تک ان کی بات پہنچ گئی۔ ہمارے مخالفین کچھ منافقوں کو ساتھ ملا کر ربوہ میں ہی ان کا مرکز بنا کر ایک متوازی جماعت قائم کر کے جماعت احمدیہ کو دو حصوں میں بانٹ دینا چاہتے ہیں تا کہ اس طرح جماعتِ احمدیہ کی طاقت ٹوٹ جائے مگر

وہ اس بات کو سمجھتے نہیں کہ منافق کا سر تو اس لئے بچا ہوا ہے کہ خدا کہتا ہے کہ نہیں! میں اس کو سزا دوں گا۔ تمہاری سزا سے زیادہ سخت سزا دوں گا۔ تم خدا کے مقابلہ پر منافق کی بھلا کیا حفاظت کر سکو گے۔

منافقت آج کا روگ نہیں یہ تو بہت پرانا روگ ہے۔ جماعتِ احمدیہ بڑے بڑے مشکل مراحل سے گزری ہے اور ہر مرحلے پر بڑے بڑے منافقوں سے اس کا پالا پڑا ہے۔ حضرت مصلح موعود کی خلافت کی ابتداء میں جماعتِ احمدیہ کو منافقوں کے سب سے بڑے فتنہ کا مقابلہ کرنا پڑا۔ وہ ایک ایسا فتنہ تھا کہ اس کے بعد کے فتنے اس کا عشرِ عشیر بھی نہیں تھے۔ اس وقت منافقین نے یہ اعلان کیا تھا کہ جماعت کا 95 فیصد حصہ ان کے ساتھ ہے اور صرف 5 فیصد خلافت سے وابستہ ہے۔ جماعت کے اندر نفاق کا اس سے بڑا منصوبہ اور کون سا ہو گا۔ مگر جماعت احمدیہ نے اپنے اولوالعزم امام کی راہنمائی میں اپنی تاریخ کے اس سب سے بڑے فتنے کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور منافقین کو اپنے اندر سے اس طرح نکال باہر کیا جس طرح دودھ میں اگر مکھی پڑ جائے تو لوگ اس کو نکال کر باہر پھینک دیتے ہیں۔ چنانچہ جب کبھی ایسے حالات پیدا ہوئے جماعت نے نفاق کے گند کو باہر نکال پھینک دیا اور ہم نے اپنے آپ کو عسلِ مصفّٰی کی طرح پاک وصاف پایا۔

پس اگر اب بھی لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ منافقوں کو شہ دے کر یا ان کو چند لاکھ روپے دے کر، جماعتِ احمدیہ کے مقابلہ میں ایک نئی تنظیم کھڑی کر کے اور ان کو بعض عمارتوں پر قبضہ دلا کر جماعتِ احمدیہ کو ناکام بنا دیں گے تو یہ ان کی بھول ہے۔ عمارتیں کیا چیز ہوتی ہیں۔ پتھر کے بنے ہوئے مکانوں کی حیثیت کیا ہے ان سے بڑھ کر خوبصورت اور پختہ مکانوں کو تو ہم تقسیمِ ملک کے وقت قادیان میں چھوڑ آئے ہوئے تھے۔"(5)

حضور نے اس ہنگامی مجلسِ مشاورت میں مخالفین کے یہ تین منصوبے بیان کرنے کے بعد فرمایا:

"غرض مخالفین اور معاندین نے ان دنوں ہمارے خلاف جو منصوبے بنائے ہیں ان کے متعلق میں نے احباب کو مختصراً بتا دیا ہے تا کہ وہ باخبر رہیں اور حسنِ عمل پر زور دیں۔ تاہم اپنے اعمالِ صالح پر فخر بھی نہیں کرنا چاہئے کیونکہ جو ظاہر میں عملِ صالح سمجھا جاتا ہے انسانی آنکھ بعض دفعہ اس کے اندر کے کیڑے کو نہیں دیکھ سکتی۔ چنانچہ ایسا عمل انجام کار رد کر دیا جاتا ہے ۔ وہ عند اللہ قبول نہیں ہوتا۔ ہمیں تو صرف ایک چیز کا پتہ ہے اور وہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے الفاظ میں بتانے کے لائق ہے۔

آپ فرماتے ہیں:۔

لوگ کہتے ہیں کہ نالائق نہیں ہوتا قبول
میں تو نالائق بھی ہو کر پا گیا درگاہ میں بار

پھر حضورؒ نے فرمایا:

''احباب یاد رکھیں کہ جہاں تک دشمن کا تعلق ہے دشمن کو کبھی حقیر نہیں سمجھنا چاہئے۔ اس واسطے دشمن کو چونکہ کبھی حقیر نہیں سمجھنا چاہئے ہمیں لاپرواہ نہیں ہونا چاہئے لیکن جہاں تک ہمارے انجام کا تعلق ہے ہمیں گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ ہم لاپرواہ تو نہیں ہوں گے۔ ہم قربانیاں تو دیں گے اور دیتے چلے جائیں گے۔ کام تو ہم کریں گے اور اپنی تدبیر کو انتہاء تک پہنچائیں گے۔ اپنے عمل کو حسن و احسان سے مزین کر کے خدا کے حضور پیش کریں گے اور خدا سے یہ کہیں گے۔ اے خدا! تو اسے اپنے فضل سے قبول فرما لیکن اپنے اوپر فخر نہیں کریں گے۔''(6)

اس خطاب کے بعد حضور نے لمبی پُر سوز دعا کروائی جس کے بعد مجلسِ مشاورت کا یہ غیر معمولی اجلاس اختتام پذیر ہوا۔

جہاں تک جماعتِ احمدیہ کا تعلق ہے وہ پوری دنیا میں اسلام کی تبلیغ کے لئے کوشاں تھی اور ان کا امام انہیں آئندہ پیش آنے والے خطرات سے آگاہ کر رہا تھا اور وہ اپنے رب کے حضور دعاؤں میں مشغول تھا اور مخالفینِ جماعت پہلے سے بھی زیادہ زہریلا وار کرنے کی تیاری کر رہے تھے۔

(1) رپورٹ ہنگامی مجلسِ مشاورت جماعت احمدیہ مئی 1973ء ص 41 تا 43۔

(2) رپورٹ ہنگامی مجلسِ مشاورت جماعت احمدیہ مئی 1973ء ص 108۔109۔

(3) رپورٹ ہنگامی مجلسِ مشاورت جماعت احمدیہ مئی 1973ء ص 111 تا 112۔

(4) رپورٹ ہنگامی مجلسِ مشاورت جماعت احمدیہ مئی 1973ء ص 116۔117۔

(5) رپورٹ ہنگامی مجلسِ مشاورت جماعت احمدیہ مئی 1973ء ص 117۔118۔

(6) رپورٹ ہنگامی مجلسِ مشاورت جماعت احمدیہ مئی 1973ء ص 123۔125۔

لاہور کی اسلامی سربراہی کانفرنس

1973ء کے جلسہ سالانہ پر صد سالہ جوبلی کے منصوبے کا ذکر کرتے ہوئے حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ نے مسلمانوں کے تمام فرقوں کو اتحادِ عمل کی دعوت دی تھی اور فرمایا تھا کہ تمام فرقوں کو دنیا میں قرآنِ کریم اور رسول اللہؐ کی عظمت کے اظہار کے لیے کام کرنا چاہئے۔ اس سے قبل 19 / اکتوبر 1973ء کے خطبہ جمعہ میں حضور نے عالمِ اسلام کے اتحاد پر زور دیتے ہوئے فرمایا تھا کہ

”پس حکومتِ وقت یا دوسری اقوامِ عالم جن کا تعلق اسلام سے ہے ان کا یہ کام ہے (ہر فرد اگر اپنے طور پر اس قسم کے منصوبے بنائے تو فائدہ کی بجائے نقصان ہوا کرتا ہے) کہ وہ سر جوڑیں اور منصوبے بنائیں اور پھر ہر اسلامی ملک کی ذمہ داریوں کی تعیین کریں مثلاً کہیں کہ فلاں ملک اس مہم اور مجاہدے میں یہ یہ خدمات اور قربانیاں پیش کرے یا اس قسم کا ایثار اور قربانی سامنے آنی چاہئے۔ جب سارے اسلامی ممالک کسی منصوبے کے ماتحت اسلام کے دشمن کو جو اپنے ہزار اختلافات کے باوجود اکٹھا ہو گیا ہے اس کے منصوبوں کو ناکام بنانے کے لئے ایک جدوجہد، ایک عظیم جہاد اور مجاہدے کا اعلان کریں گے پھر دیکھیں گے کہ کون اس میدان میں آگے نکلتا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ہم اللہ تعالیٰ کے فضل سے ایک اور ایک ہزار کی نسبت سے آگے نکل جائیں گے بلکہ ہم دعا کریں گے کہ اللہ تعالیٰ اس سے بھی زیادہ آگے نکلنے کی ہمیں توفیق عطا فرمائے۔“

(خطباتِ ناصر جلد پنجم ص262)

اور اسی خطبہ جمعہ میں حضور نے فرمایا تھا، پاکستان کی حکومت ملک کی خاطر جو بھی قربانی مانگے گی اللہ تعالیٰ کے فضل سے احمدی سب سے بڑھ کر قربانیاں پیش کریں گے۔ اس پس منظر میں جب کہ جماعتِ احمدیہ کے خلاف نفرت کی ایک مہم چلائی جا رہی تھی، حضرت مرزا ناصر احمد صاحب خلیفۃ المسیح الثالثؒ پوری دنیا کے مسلمانوں کو محبت کا پیغام دے رہے تھے، مشترکہ طور پر اسلام کی خاطر قربانیاں کرنے کی دعوت دے رہے تھے۔

فروری 1974ء میں پاکستان کے شہر لاہور میں اسلامی سربراہی کانفرنس منعقد ہو رہی تھی۔ اور مسلمان ممالک کے سربراہان نے اس کانفرنس میں شرکت کرنی تھی۔ اس کانفرنس سے بہت سی توقعات وابستہ کی جارہی تھیں کہ اس میں عالمِ

اسلام کے اتحاد اور ترقی کے لیے منصوبے بنائے جائیں گے، فیصلے کئے جائیں گے۔ مگر یہ کانفرنس ایک خاص پس منظر میں ہو رہی تھی۔

بھٹو صاحب ایک ذہین سیاستدان تھے، ان کی خواہش تھی کہ انہیں بین الاقوامی سطح پر ایک نمایاں مقام حاصل ہو۔ وہ صرف عزائم ہی نہیں صلاحیتیں بھی رکھتے تھے۔ وہ تیسری دنیا کا لیڈر بننے کی کوشش بھی کرتے رہے۔ مگر اس منظر پر پہلے پنڈت جواہر لال نہرو اور پھر ان کی صاحبزادی اور بھارت کی وزیرِ اعظم اندرا گاندھی کی قد آور شخصیتیں حاوی تھیں۔ بین الاقوامی سطح پر اپنا لوہا منوانے کا ایک راستہ یہ تھا کہ وہ عالمِ اسلام کے ایک لیڈر کے طور پر نمایاں ہو کر سامنے آئیں۔ اس سلسلے میں انہیں سعودی عرب کے فرمانروا شاہ فیصل کی پوری حمایت حاصل تھی۔ ان کا مشترکہ خواب یہ تھا کہ بھٹو صاحب اسلامی دنیا کے سیاسی لیڈر اور سعودی عرب کے بادشاہ عالمِ اسلام کے روحانی لیڈر اور خلیفہ کے طور پر سامنے آئیں۔ شروع میں تو شاہ فیصل کو عالمِ اسلام میں کوئی نمایاں مقام حاصل نہیں تھا۔ مگر ان کے پاس دولت کی ریل پیل تھی اور سعودی عرب کے فرمانروا مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کے متولّی بھی تھے اور ہر مسلمان کا دل ان مقدس مقامات کی محبت سے لبریز تھا۔ مغربی طاقتوں کا مفاد بھی اس میں تھا کہ کسی طرح شاہ فیصل کو دنیائے اسلام کا روحانی پیشوا بنا دیا جائے تا کہ اس طرح مشرقِ وسطیٰ میں مغرب کے مفادات محفوظ کر دیئے جائیں۔ اور یہ سب کچھ اس طرح دبے پاؤں کیا جائے کہ سادہ لوح مسلمانوں کو اس کی خبر بھی نہ ہو۔ یعنی اعلانات تو سعودی عرب کے لاؤڈ سپیکروں سے کئے جا رہے ہوں اور ان کا مائیکروفون مغرب کے ہاتھ میں ہو۔ یہ بات پڑھنے والوں کے لئے کسی اچھنبے کا باعث نہیں ہونی چاہئے۔ بڑی طاقتیں اپنے مقاصد کے لئے اس قسم کے کھیل کھیلتی رہتی ہیں اور یہ پہلی مرتبہ نہیں تھا کہ مغربی طاقتیں اپنے مقاصد کے لئے اس قسم کا کھیل شروع کریں۔ پہلی جنگِ عظیم کے دوران برطانوی حکومت نے اسی طرح کی کوشش کی تھی۔ پہلی جنگِ عظیم کے دوران ترکی کی سلطنتِ عثمانیہ جرمنی کا ساتھ دے رہی تھی اور ہندوستان کے بہت سے مسلمان ترکی کی خلافتِ عثمانیہ سے ہمدردی رکھتے تھے۔ یہ چیز انگریز حکمرانوں کو پریشان کر رہی تھی۔ چنانچہ انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ اگر ایک ایسے شخص کو بطور خلیفہ کے لئے کھڑا کیا جائے جو سلطنتِ برطانیہ کے ساتھ تعلق اور ہمدردی رکھتا ہو تو یہ ان کے لئے بہت مفید ہو گا۔ اس کے لئے انہیں یہ خیال آیا کہ جو حکمران اس وقت حجاز پر حکومت کر رہا ہے اور ان کے ہاتھ میں بھی ہے اسے اس کام کے لئے کھڑا کیا جائے۔ اس وقت حجاز پر شریفِ مکہ شریف حسین کی حکومت تھی اور اس وقت ان کے انگریز حکومت سے قریبی تعلقات بھی تھے اور چونکہ حجاز میں مکہ اور مدینہ واقع ہیں اس

لئے حجاز سے وابستہ ہر چیز کے لئے ان کے دل میں ایک نرم گوشہ پیدا ہونا قدرتی بات تھی۔ چنانچہ انڈیا آفس کے ایک افسر کریو Crewe نے 13/ اپریل 1915ء کو حکامِ بالا کو جو رپورٹ بھجوائی اس میں لکھا:۔

”۔۔۔۔۔۔ میں نہیں سمجھتا کہ استنبول پر قبضہ ہو جانے کے بعد شریفِ مکہ حسین سے متعلق ہماری پالیسی کی وجہ سے ہمیں کوئی پریشانی ہوگی۔ ہمیں چاہئے کہ ہم اسے ترکی کی غلامی سے نجات دینے کے لئے ہمارے بس میں جو کچھ ہے وہ کریں۔ لیکن اس سلسلے میں انتہائی احتیاط کی ضرورت ہے اور کسی کو یہ پتہ نہ چلے کہ ہم اسے مقامِ خلافت پر بٹھانا چاہتے ہیں۔ ہندوستان میں آج کل پان اسلام ازم کی جو تحریک چلی ہوئی ہے اس کا منبع اور مرکز استنبول ہے۔ یہاں کے اسلام پسند عناصر اس بات کو قطعی پسند نہیں کریں گے کہ خلافت عثمانیوں کے ہاتھ سے نکل جائے۔ لیکن شریفِ مکہ یا کوئی اور عرب سنی لیڈر اپنے آپ کو عثمانیوں سے آزاد کر کے خلافت جیسے متبرک عنوان کو حاصل کر لے تو مسلمان رائے عامہ اور ہندوستانی مسلمانوں کے لئے بھی ان کا ساتھ دینے کے سوا اور کوئی چارہ کار نہیں رہ جائے گا۔۔۔۔۔۔

لیکن اس کے باوجود میرا خیال یہ ہے کہ آئندہ مسئلہ خلافت کی بنا پر مسلمانوں میں پھوٹ پڑ سکتی ہے۔ در حقیقت دیکھا جائے تو اس پھوٹ میں ہمارا سراسر فائدہ ہی ہے۔“

(بحوالہ تحریکِ خلافت تحریر ڈاکٹر میم کمال او کے، باسفورس یونیورسٹی استنبول، ترجمہ ڈاکٹر نثار احمد اسرار۔ سنگِ میل پبلیکیشنز لاہور 1991ء۔ ص62 تا 63)

جیسا کہ خدشہ ظاہر کیا جا رہا تھا جب شریف حسین نے سلطنتِ عثمانیہ سے بغاوت کی تو ہندوستان کے مسلمانوں نے اس کے خلاف شدید ردِّ عمل ظاہر کیا۔ اس وقت حجاز پر شریف مکہ کی اور نجد کے علاقہ پر سعودی خاندان کی حکومت تھی۔ جب شریف مکہ نے یہودیوں کے فلسطین میں آباد ہونے کے خلاف ردِّ عمل دکھایا تو برطانوی حکومت نے اس سے اپنی حمایت کا ہاتھ کھینچ لیا اور سعودی خاندان نے حجاز پر بھی قبضہ کر لیا۔

ایک عرصہ سے تو جماعت احمدیہ کے مخالف علماء اپنے گلے پھاڑ پھاڑ کر یہ الزام لگاتے رہے ہیں کہ جماعتِ احمدیہ کو اور جماعتِ احمدیہ کی خلافت کو برطانوی استعمار نے اپنے مقاصد کے لئے کھڑا کیا تھا۔ لیکن یہ انکشافات تو خود غیر احمدی مسلمانوں میں سے محققین نے کیے ہیں کہ اصل میں تو مغربی قوتوں کا یہ ارادہ تھا کہ سنی عرب لیڈروں میں سے کسی کو جو اُن کے ہاتھ میں ہو عالمِ اسلام کا خلیفہ بنا کر اپنے مقاصد پورے کئے جائیں۔

عالمِ اسلام میں ایک وقت میں دو خلفاء تو نہیں ہو سکتے۔ اللہ تعالیٰ کے فضل سے جماعتِ احمدیہ میں تو خلافت قائم تھی۔ اور یہ بات اس گروہ کو کسی طرح بھی برداشت نہ تھی جو شاہ فیصل کو عالمِ اسلام کا خلیفہ بنا کر اپنے مقاصد حاصل کرنا چاہتے تھے۔ اس کے علاوہ یہ مسئلہ بھی تھا کہ مختلف ممالک میں مختلف فقہی گروہوں کی پیروی کرنے والے مسلمان اکثریت میں تھے۔ سعودی عرب کے بادشاہ وہابی تھے جبکہ انڈونیشیا کے اکثر مسلمان شافعی، افریقہ کے اکثر مسلمان مالکی اور کئی دوسرے مسلمان ممالک میں حنفی مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ اس لئے اس بات کا امکان تھا کہ دوسرے مسلک سے تعلق رکھنے والے علماء سعودی حکمرانوں سے رشوت لیتے ہوئے اور ان کی قیادت قبول کرتے ہوئے ہچکچائیں۔ لیکن اگر یہ مدد مدارس اور مساجد کے نام پر دی جاتی تو ظاہر تھا کہ کم ردِّ عمل ہوتا اور اگر اس امداد کو جماعتِ احمدیہ کی مخالفت کے ساتھ مشروط کر دیا جاتا تو دوسرے مسلک کے علماء کو یہ پیشکش قبول کرنے میں کوئی عذر نہ ہوتا، کیونکہ وہ تو پہلے ہی جماعت کی مخالفت پر ادھار کھائے بیٹھے تھے۔ اس طریق پر دنیا بھر کے مسلمان سعودی اثر کے نیچے آجاتے اور کوئی خاص ردِّ عمل بھی پیدا نہ ہوتا۔

اب جب کہ لاہور میں ہونے والی اسلامی سربراہی کانفرنس کا آغاز قریب آرہا تھا اور یہ اطلاعات موصول ہو رہی تھیں کہ اس کانفرنس کے موقع پر جماعتِ احمدیہ کے خلاف ایک باقاعدہ مہم کا آغاز ہونے والا ہے۔ اس ضمن میں جماعت کی طرف سے حضرت صاحبزادہ مرزا طاہر احمد صاحب نے وزیرِ خارجہ پاکستان عزیز احمد صاحب کو اپنے خدشات سے آگاہ کیا۔ لیکن وزیرِ خارجہ نے اس سے اتفاق نہ کیا اور کہا کہ ہرگز اس بات کا کوئی امکان نہیں کہ اس موقع کو جماعت احمدیہ کے خلاف مہم چلانے کے لیے استعمال کیا جائے بلکہ اس موقع پر مذہبی پروپیگنڈا پر سختی سے پابندی ہو گی اور اس نازک موقع پر کوئی سیاسی شوشہ چھوڑنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ پھر حضرت صاحبزادہ مرزا طاہر احمد صاحب کی بھٹو صاحب سے ملاقات ہوئی، انہوں نے بھٹو صاحب کے سامنے بھی کوئی لگی لپٹی رکھے بغیر اپنے خدشات کا اظہار کیا۔ اس پر بھٹو صاحب نے بھی یقین دلایا کہ جماعتِ احمدیہ کے خلاف کسی قسم کا پروپیگنڈا نہیں کیا جائے گا۔ لیکن اس بات کے شواہد بھی سامنے آرہے تھے کہ یہ سب زبانی جمع خرچ کی جا رہی ہے۔ ناقابلِ تردید ثبوت سامنے آرہے تھے اور وہ پمفلٹ بھی مل چکے تھے جنہیں جماعتِ اسلامی نے چھپوایا تھا اور انہیں اس موقع پر مندوبین میں وسیع پیمانے پر تقسیم کرنے کا پروگرام تھا۔

اور ان ارادوں کو مکمل طور پر خفیہ رکھنے کے لیے کوئی خاص کوشش بھی نہیں کی جا رہی تھی۔ جماعت کے مخالف جرائد بھی شاہ فیصل کو عالمِ اسلام کا خلیفہ بنانے کا پروپیگنڈا کر رہے تھے۔ اور اس کے ساتھ جماعتِ احمدیہ کے خلاف زہر بھی

اگلا جارہا تھا۔ مثلاً رسالہ چٹان میں کانفرنس کے بعد یہ اطلاع شائع ہوئی کہ شاہ فیصل نے افریقہ میں تبلیغِ اسلام کے لئے خزانوں کے منہ کھول دیئے ہیں اور ان کی کاوشوں کے نتیجے میں عیسائی مشنری اور قادیانی مراکز میں شگاف پڑنے لگے ہیں۔ اور یہ بھی لکھا گیا کہ افریقہ کے صحراؤں میں توحید کی جو صدائیں گونج رہی ہیں اور اس ظلمت کدے میں قرآن و سنت کی جو روشنی پھیل رہی ہے اس کا سہرا دراصل شاہ فیصل کے سر پر ہے۔ اور اگر شاہ فیصل کی کوششوں کی یہی رفتار رہی تو آئندہ دس سال میں افریقہ اسلام کا گہوارہ بن جائے گا۔ اور اس ساری مدح سرائی کا ماحصل یہ تھا کہ اس کے آخر میں لکھا گیا

”یوگینڈا کے مردِ آہن عیدی امین مبارکباد کے مستحق ہیں۔ جو لاہور میں منعقد ہونے والی اسلامی ملکوں کی سربراہ کانفرنس میں یہ تجویز پیش کرنے والے ہیں کہ شاہ فیصل کو عالمِ اسلام کا لیڈر تسلیم کیا جائے۔ ہمیں امید ہے کہ تمام مسلم راہنما اس تجویز کی حمایت کریں گے اور شاہ فیصل کو متفقہ طور پر اسلامی دنیا کا راہنما تسلیم کرکے اتحادِ اسلامی کی داغ بیل ڈالیں گے۔

ہم اس موقع پر پاکستان کے مختلف مکاتبِ فکر کے علماء کرام کی خدمت میں یہ اپیل کرتے ہیں کہ وہ تمام فرقوں کے علماء پر مشتمل ایک وفد تشکیل دیں جو اسلامی کانفرنس کے موقعہ پر مسلم سربراہوں خصوصاً شاہ فیصل، معمر القذافی اور عیدی امین سے ملاقات کرکے قادیانیوں کے بارے میں یادداشت پیش کریں۔ اور انہیں بتائیں کہ قادیانیت اسلام اور مسلمانوں کے لئے صیہونیت سے کم خطرناک نہیں ہے۔ اور اس کے سدِّباب کے لئے تمام اسلامی ملکوں کو مشترکہ لائحہ عمل تیار کرنا چاہئے۔“

غانا سے موصول ہونے والی اس تحریر کے نیچے چٹان کے مدیر نے لکھا:۔

”اسلامی کانفرنس کے بعد خط ملا، لیکن شاہ فیصل کو عالمِ اسلام کا لیڈر بنانے کی تحریک سے چٹان متفق ہے بلکہ بہت پہلے سے اس کا داعی ہے۔“

(چٹان 4/ مارچ 1974ء ص 14و15)

نہ صرف یہ بلکہ ایسے اشتہارات جرائد میں شائع کروائے جارہے تھے جن میں شاہ فیصل کو قائدِ ملّتِ اسلامیہ کا خطاب دیا گیا تھا۔

(چٹان 25/ فروری 1974ء)

یہ پراپیگنڈا کچھ اس انداز سے کیا جارہا تھا کہ خلفاءِ راشدین کی عظمت کا بھی کچھ دھیان نہیں کیا جارہا تھا۔ اسی جریدے نے شاہ فیصل اور دیگر سربراہانِ مملکت کی لاہور آمد کی منظر کشی پر جو رپورٹ شائع کی اس میں کچھ اس طرز میں زمین آسمان کے قلابے ملائے گئے کہ اس رپورٹ کی ایک سرخی یہ تھی

"ابوبکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ اور علیؓ اسی طرح سیکیورٹی کا انتظام کر لیتے تو آج تاریخ یقیناً مختلف ہوتی۔"

اور اس کے ساتھ شاہ فیصل کی تصویر شائع کی ہوئی تھی اور نیچے یہ سرخی تھی۔

"شاہ فیصل کے آتے ہی ساری فضا احترام کے سانچے میں ڈھل گئی"

گویا یہ کہا جارہا تھا کہ جس عمدہ طریق پر بھٹو صاحب اور ان کی ٹیم نے سیکیورٹی کا انتظام کیا ہے نعوذُ باللہ ایسے عمدہ طریق پر انتظامات کرنے کی توفیق تو خلفاء راشدین کو بھی نہیں ہوئی تھی۔ لیکن جس طرح چند سال بعد بھٹو صاحب کا تختہ الٹا گیا اس سے اس کی حقیقت خوب ظاہر ہو جاتی ہے اور اسی رپورٹ میں چٹان نے لکھا کہ جب شاہ فیصل ایئرپورٹ پر اترے تو ان کی آمد نے ایئرپورٹ کی فضا کو ایک عجیب تقدس دے دیا تھا۔ اور ان کی چال میں ایک وقار اور تمکنت تھی اور چہرے پر نور کا ایک ہالہ بھی تھا۔

(چٹان 11/ مارچ 1974ء ص 15و16)

اس مدح سرائی کا مقصد کیا تھا اس پر کسی تبصرہ کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ پاکستان اس کانفرنس کا سپانسر تو تھا ہی کیونکہ یہ کانفرنس پاکستان میں ہی ہو رہی تھی لیکن اس کے ساتھ سعودی بادشاہ شاہ فیصل بھی اس کانفرنس کے Co-sponsor تھے۔

کانفرنس شروع ہوئی تو تمام خدشات درست ثابت ہوئے۔ بھٹو صاحب نے ہدایت دی کہ جب بیرونی ممالک کے سربراہان اور مندوبین آئیں تو ان کے ساتھ کسی احمدی فوجی افسر کی ڈیوٹی نہ لگائی جائے۔ لیکن راز زیادہ دیر تک راز نہ رہ سکا۔ افریقہ سے آئے ہوئے ایک وزیرِ اعظم کو جب جماعت کے خلاف دستاویزات دی گئیں تو انہوں نے یہ پلندہ اپنے ایک احمدی دوست کو تھمادیا۔ یہ دستاویزات کیا تھیں جماعتِ احمدیہ کے خلاف جھوٹے الزامات اور زہر افشانیوں کا ایک طومار تھا۔ اس میں جماعت اور خلیفہ وقت کے خلاف جی بھر کے زہر اگلا گیا تھا۔

(A Man of God, by Ian Adamson ,George Shepherd Publishers, Great Britain P. 96-100)

مخالفین اس موقع کو جماعتِ احمدیہ کی مخالفت کی آگ بھڑکانے کے لیے استعمال کرنا چاہتے تھے اور ساتھ ساتھ یہ شور مچارہے تھے کہ حکومت کو چاہئے کہ ایسا انتظام کرے کہ قادیانی اس کانفرنس پر اثر انداز نہ ہو سکیں۔ بلکہ اس بات پر شور بھی مچا رہے تھے کہ یہ کیا ظلم ہوا کہ ایک قادیانی فرم کو اس کانفرنس کی میزبانی کا ٹھیکہ دے دیا گیا ہے اور اس کے ساتھ اس بات کا بھی اظہار کیا کہ یہ بات ربّ العالمین کے حضور معتوب ہونے کی نشانی ہے۔ اس فرم سے مراد ان کی شیزان کی کمپنی تھی۔

(المنبر یکم فروری 1974ء ص6)

بہر حال سربراہی کانفرنس شروع ہوئی اور اس کا اختتام ہوا۔ پسِ پردہ اس میں کیا کیا کچھ ہوا تھا۔ اس کا اندازہ بعد میں منظرِ عام پر آنے والے واقعات سے بخوبی ہو جاتا ہے۔

لیکن اس کانفرنس کے دوران اور بعد میں بھی بہت سے جرائد جس قسم کا پراپیگنڈا کرتے دکھائی دیئے اس کا اندازہ ان چند مثالوں سے ہو جاتا ہے۔ رسالہ المنبر نے شاہ فیصل کی مدح سرائی کرتے ہوئے لکھا۔

”سعودی عرب کے فرمانروا۔ خادم الحرمین شاہ فیصل ہیں۔ موقع تفصیل کا نہیں، فیصلِ معظم کی صحرائی زندگی، اس دور میں اپنے عظیم المرتبت مجاہد فی سبیل اللہ، توحیدِ الٰہی میں قابلِ رشک مقام پر فائز اور دینی بصیرت میں ممتاز شخصیت، سلطان عبد العزیز رحمۃ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً کی تربیت اور جہاد اور اس کے تقاضوں کی تکمیل سے لے کر شاہ فیصل کے لقب سے ملقب ہونے اور اس کے بعد۔۔۔۔۔۔ اس عظیم فرمانروا نے خداداد بصیرت دینی حمیت، سیاسی دانش، اسلامی اخوت اور ایثار اور قربانی کے جو نقوش عہدِ حاضر میں ثبت فرمائے ہیں اور ان سے ان کی شخصیت کا جو نکھار اپنوں و بیگانوں نے مشاہدہ کیا ہے، اسی کا نتیجہ ہے کہ یورپ اور پورا مغرب اس عظیم المرتبت قائد کے تیوروں سے سہما ہوا ہے اور عالمِ اسلام ان کی شخصیت پر اظہارِ فخر و مباہات کر رہا ہے۔“

اور اس کے ساتھ ہی اس جریدہ نے یہ بھی لکھا کہ حکومت کو یہ انتظام کرنا چاہئے کہ قادیانیوں کا سایہ بھی اس کانفرنس پر نہ پڑے۔ حالانکہ حقیقت یہ تھی کہ خود جماعتِ احمدیہ کے مخالفین اس موقع کو اپنے مقاصد کے لئے استعمال کر رہے تھے۔ یہ ہمیشہ سے اس گروہ کا طریق رہا ہے کہ جب خود کوئی حرکت کرنی ہو تو یہ شور مچا دیتے ہیں کہ قادیانی یہ سازش کر رہے ہیں۔

(المنبر یکم تا 8/ فروری 1974ء)

اسی جریدہ نے کانفرنس کے بعد اس بات پر بھی سخت برہمی کا اظہار کیا کہ جب شاہ فیصل شاہی مسجد میں نمازِ جمعہ پڑھنے آئے تھے تو انہوں نے پہلے دو رکعت تحیۃ المسجد نماز ادا کی تھی اور اس کے بعد جب انہوں نے طویل اور رقت سے بھری ہوئی دعا کی تو ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے اور انہوں نے ان آنسوؤں کو پونچھا تھا۔ اور لاکھوں لوگوں نے اس منظر کو ٹی وی پر دیکھا تھا اور اس سے ان پر بہت اثر ہوا تھا۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ جب دوبارہ یہ مناظر ٹی وی پر دکھائے گئے تو رقت پیدا ہونے والا اور آنسو پونچھنے والا منظر کاٹ دیا گیا جس پر سب کو بہت صدمہ ہوا۔ اور اس جریدہ نے بہت اصرار سے لکھا کہ یہ سب کچھ ایک سازش کے تحت کیا گیا ہے تا کہ اسلامی ذوق ابھر نہ سکے۔

(المنبر 1 تا 8/ مارچ 1974ء)

پھر اسی جریدے نے اسلامی سربراہی کانفرنس کے اختتام پر لکھا کہ پہلے یہ فیصلہ ہو چکا تھا کہ شاہ فیصل کانفرنس کے موقع پر شاہی مسجد لاہور میں جمعہ پڑھائیں لیکن پھر ایک طبقہ کی طرف سے یہ مسئلہ اُٹھایا گیا کہ چونکہ شاہ فیصل وہابی عقیدہ کے ہیں اس لئے ان کے پیچھے ہماری نماز نہیں ہوتی۔ پھر اس مسئلہ پر مختلف لوگوں کی طرف سے تاریں دی گئیں۔ جب یہ چیز شاہ فیصل کے علم میں آئی تو انہوں نے جمعہ پڑھانے سے انکار کر دیا۔ پھر اس جریدے نے احمدیوں کے خلاف یہ لکھ کر زہر اگلا کہ یہ سب کچھ احمدیوں اور کمیونسٹوں کی سازش کی وجہ سے ہوا ہے۔

(المنبر 29/ مارچ 1974ء)

یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ مسلمانوں کے مختلف فرقوں سے تعلق رکھنے والے بہت سے لوگ ایک دوسرے کے پیچھے نماز نہیں پڑتے۔ اگر شاہ فیصل اس وجہ سے شاہی مسجد میں نماز نہیں پڑھا سکے تو اس سے احمدیوں کا کیا تعلق۔ انہیں تو کوئی شاہی مسجد میں نماز پڑھنے بھی نہیں دیتا کجا یہ کہ وہ کسی بادشاہ کو وہاں پر نماز پڑھانے سے روکیں۔

یہ تلملاہٹ صرف اس بات تک محدود نہیں تھی کہ شاہ فیصل شاہی مسجد لاہور میں نمازِ جمعہ نہیں پڑھا سکے بلکہ یہ بھی لکھا جا رہا تھا کہ یوگنڈا کے عیدی صدر امین نے اپنے اعلان کے مطابق اس کانفرنس پر شاہ فیصل کو عالمِ اسلام کا خلیفہ بنانے کی تجویز رکھی تھی لیکن اس پر کماحقہ توجہ نہیں دی گئی جیسا کہ المنبر نے لکھا۔

”پچھلے سال سے یہ صدا سنائی دے رہی تھی کہ افریقہ کے مردِ مجاہد جنرل عیدی امین حفظہ اللہ نے حج کے موقع پر ایک اخباری ملاقات میں یہ کہا تھا کہ عالمِ اسلام اپنے مسائل کا اگر کوئی حل چاہتا ہے تو اس کا آغاز اس بات سے ہو گا کہ عالمِ اسلام اپنا

کوئی راہنما منتخب کرے اور پوری اسلامی دنیا کی باگ ڈور اس کے ہاتھ میں ہو اور اس کام کے اہل میری نظروں میں امام الحرمین ،خادم الحرمین پاسبانِ حرمین والیِ مملکتِ سعودی عرب جلالۃ الملک فیصلِ معظم بن عبد العزیز آلِ سعود ایدہ اللہ و حفظہ کی شخصیت ہے کیونکہ ان کی مومنانہ بصیرت اور عمیق نظر پوری دنیا کے مسائل پر احاطہ کئے ہوئے ہے اور پھر جنرل عیدی امین نے یہ خواہش بھی ظاہر کی کہ پاکستان میں منعقد ہونے والی اسلامی سربراہی کانفرنس میں یہ فیصلہ کیا جانا چاہئے اور یہ کہ میں اس کانفرنس میں مسلم علمائے دین کے سامنے یہ تجویز رکھوں گا۔ اس کے بعد انہوں نے کئی مرتبہ مختلف مواقع پر اس بات کا اظہار بھی کیا اور پھر اس کانفرنس میں اور بہتر اور مفید تجاویز کے علاوہ اسے بھی پیش کیا گیا مگر ہمیں حیرت اور دکھ ہے کہ ان کی اس معقول بات پر کسی کو توجہ دینے کی توفیق نصیب نہ ہوئی اور یہ ممکن بھی کیسے تھا کہ جس کانفرنس پر یہودیوں، کمیونسٹوں اور قادیانیوں کا سایہ اوّل تا آخر ہو کوئی ایسی بات کیونکر عمل کا قالب اختیار کر سکتی ہے جو اسلامیانِ عالم کی بھلائی کی ہو۔"

(المنبر 29/مارچ 1974ء صفحہ آخر)

اس رطب و یابس سے ظاہر ہے کہ جو بھی ہاتھ شاہ فیصل کو عالمِ اسلام کا خلیفہ بنانے کے لئے زور لگا رہے تھے انہیں ابھی اس میں خاطر خواہ کامیابی نہیں ملی تھی۔ اور وہ اس مقصد کے لئے ہمدردیاں حاصل کرنے کے لئے جماعتِ احمدیہ کے خلاف لوگوں کے ذہن میں زہر گھول رہے تھے تاکہ اس نفرت کو آڑ بنا کر اپنے مقاصد حاصل کئے جا سکیں۔ اور لوگوں کو یہ باور کرایا جا سکے کہ اگر عالمِ اسلام ایک خلیفہ کے ہاتھ پر جمع نہیں ہو پا رہا تو یقیناً یہ قادیانیوں کی سازش ہے۔ یہ ایک دو جریدوں سے چند مثالیں دی گئی ہیں۔ جن کو پڑھنے سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ اس سازش کا رخ کس طرف تھا اور اس کے پیچھے کیا مقاصد تھے۔

ہم نے اس اہم مرحلہ کے بارے میں دوسری طرف کا نقطہ نظر معلوم کرنے کی کوشش بھی کی۔ چنانچہ جب اس امر کا ذکر ڈاکٹر مبشر حسن صاحب سے انٹرویو کے دوران کیا اور ان سے سوال پوچھا کہ یہ کس طرح ہوا کہ اسلامی سربراہی کانفرنس کے موقع پر جماعتِ احمدیہ کے خلاف پراپیگنڈا کیا گیا تو ان کا کہنا تھا کہ میرا نہیں خیال کہ عزیز احمد یا ذوالفقار علی بھٹو کی طرف سے یہ جان کر کیا گیا تھا۔ میرا خیال ہے کہ وہ اسے روک نہیں سکتے تھے۔ چونکہ بھٹو صاحب پاکستان کی تاریخ کے ایک مضبوط وزیر اعظم سمجھے جاتے ہیں اس لئے ہمارے لئے یہ بات تعجب انگیز تھی۔ چنانچہ ہم نے پھر ان سے یہ سوال کیا

They were helpless?(وہ مجبور تھے؟)۔

اس پر مبشر حسن صاحب نے پھر واضح طور پر کہا

(ہاں وہ مجبور تھے)Yes, they were helpless.۔

اس پر میں نے دریافت کیا کہ وہ کون سے ہاتھ تھے؟ اس پر ان کا جواب تھا

”وہ خفیہ ہاتھ جن کا پتہ ہی نہیں چلتا۔ گورنمنٹ کو پتہ ہی نہیں چلا۔“

اور پھر انہوں نے اس بات کا اعادہ ان الفاظ میں کیا P.M. knew he was helpless(وزیرِ اعظم کو پتہ تھا کہ وہ مجبور ہے)۔

اس کے بعد مبشر حسن صاحب نے کہا کہ انہوں نے اگست 1974ء میں وزیرِ اعظم بھٹو صاحب کو خط لکھا تھا جس میں ملک میں موجود مختلف حالات کا ذکر کر کے کہا تھا کہ وہ جو کچھ کر رہے ہیں اس کا نتیجہ مارشل لاء کی صورت میں نکلے گا۔ بھٹو صاحب نے اس خط کا جواب نہیں دیا لیکن اس پر انہوں نے لکھا کہ جو کچھ مبشر نے کہا وہ سچ ہے اور پھر تین آدمیوں کو اس خط کی نقول بھجوا دیں۔

ایک اور بات کا ذکر کرنا ہوگا کہ بنگلہ دیش کے علاوہ چھ نئے ممالک پہلی مرتبہ اس کانفرنس میں شامل تھے اور ان سب ممالک کا تعلق افریقہ سے تھا۔ اور یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ ان چھ میں سے تین ممالک یوگینڈا، گیمبیا اور گنی بساؤ تھے۔ بعد میں ان تین ممالک میں جماعت احمدیہ کی مخالفت میں حکومتوں نے انتہائی اقدامات اُٹھائے۔

اس کانفرنس میں ایک ہی غیر سرکاری تنظیم کا وفد شامل تھا اور یہ تنظیم رابطہ عالمِ اسلامی تھی۔ اور اس کے سیکریٹری جنرل قزاز صاحب اس کے وفد کی قیادت کر رہے تھے۔ صرف ڈیڑھ ماہ کے بعد اس تنظیم نے ایک کانفرنس مکہ مکرمہ میں منعقد کی اور اس میں یہ قرارداد منظور کی گئی کہ مسلمان ملکوں میں جماعتِ احمدیہ کو غیر مسلم قرار دے دینا چاہئے۔ اور ان پر پابندیاں لگا دینی چاہئیں۔ اور جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں جب آزاد کشمیر اسمبلی نے جماعت احمدیہ کے خلاف قرارداد منظور کی تو قزاز صاحب نے بھٹو صاحب کو مبارکباد کا پیغام بھجوایا تھا اور لکھا تھا کہ یہ قرارداد اسلامی ممالک کے لئے قابلِ تقلید ہے۔

اس کانفرنس پر کانفرنس کے سیکریٹری جنرل کے فرائض محمد حسن التہامی صاحب نے سنبھالے تھے۔ ان سے قبل یہ فرائض ملیشیا کے تنکو عبد الرحمن سر انجام دے رہے تھے۔ اور جب 7/ ستمبر 1974ء کو پاکستان کی قومی اسمبلی نے جماعتِ احمدیہ کے خلاف قرارداد منظور کی تو اس سے چند روز قبل یہ صاحب پاکستان پہنچ گئے تھے اور اس قرارداد کے بعد فوراً ہی انہوں نے اس قرارداد کا خیر مقدم کرتے ہوئے یہ بیان دیا تھا کہ اب باقی اسلامی ممالک کو بھی اس قرارداد کی پیروی کرنی چاہئے۔

رابطہ عالم اسلامی میں تیار ہونے والی سازش

1962ء میں حج کے موقع پر مکہ مکرمہ میں رابطہ عالمِ اسلامی کے نام سے ایک تنظیم قائم کی گئی اور اس کا مرکزی دفتر بھی مکہ مکرمہ میں بنایا گیا۔ اس کے مقاصد یہ مقرر کئے گئے تھے۔ اسلام کا پیغام دنیا بھر میں پھیلایا جائے۔ ایک بہتر سوسائٹی کے قیام کے لیے کوششیں کی جائیں، مسلم اُمّہ میں تفرقہ دور کیا جائے۔ ان رکاوٹوں کو دور کیا جائے جو عالمِ اسلام کی ایک لیگ قائم کرنے میں حائل ہیں وغیرہ۔ لیکن عملاً اس تنظیم سے تفرقہ اور فساد پیدا کرنے کا کام لیا گیا۔ یہ تنظیم سعودی فرمانرواؤں کے زیرِ اثر کام کرتی ہے۔ 1974ء میں اس تنظیم نے کیا کردار ادا کیا یہ پڑھنے سے قبل یہ حقائق جاننے ضروری ہیں کہ 1953ء میں بھی جماعتِ احمدیہ کے خلاف فسادات کی آگ بھڑکائی گئی تھی اور ان فسادات کے بعد ہونے والی عدالتی تحقیقات کی رپورٹ کے مطابق یہ سب کچھ ایک سازش کے تحت اور بھاری رشوتیں دے کر کرایا گیا تھا۔ اس دور میں بھی یہ کوشش کی گئی تھی کہ پہلے رابطہ عالم اسلامی (جو اس وقت مُؤتمر کے نام سے کام کرتی تھی) احمدیوں کے غیر مسلم ہونے کی قرارداد پاس کرے اور پھر اس کو بنیاد بنا کر یہ فتنہ ایک نئی قوت کے ساتھ پاکستان میں اُٹھایا جائے۔ چنانچہ جماعتِ احمدیہ کے شدید مخالف خلیل الرحمن سجاد ندوی صاحب اپنی تحریر ”نگاہِ اوّلین“ میں اعتراف کرتے ہیں کہ جب 1952ء میں مُؤتمر عالمِ اسلامی کا اجلاس کراچی میں منعقد ہؤا تو اس وقت اس کی صدارت مفتیِ اعظم فلسطین امین الحسینی صاحب کر رہے تھے۔ پاکستانی علماء کا ایک وفد جن میں وہ علماء بھی شامل تھے جو کہ مُؤتَمر کے اجلاس میں مدعو تھے، ان سے ملا اور یہ خواہش ظاہر کی کہ موتمر کے اس اجلاس میں احمدیوں کو غیر مسلم قرار دیا جائے لیکن مفتی اعظم فلسطین امین الحسینی صاحب اس کے لئے کسی طور تیار نہیں ہوئے۔ پھر یہ صاحب لکھتے ہیں:۔

”راقم سطور کے نزدیک اس کی وجہ یہ تھی کہ ان حضرات کی گفتگو سے ان کو وہ یقین واطمینان حاصل نہیں ہو سکا جو ان کے نزدیک تکفیر کے لئے ضروری تھا۔“

(ماہنامہ بیّنات کراچی جنوری، فروری 1988ص 15)

لاہور میں منعقد ہونے والی اسلامی سربراہی کانفرنس کے اختتام کے صرف ڈیڑھ ماہ کے بعد رابطہ عالم اسلامی کا ایک اجلاس مکہ مکرمہ میں منعقد کیا گیا۔ اس میں مختلف مسلمان ممالک کے وفود نے شرکت کی۔ اس میں ایک سب کمیٹی میں جماعتِ احمدیہ کے متعلق بھی کئی تجاویز پیش کی گئیں۔ اس کمیٹی کا نام کمیٹی برائے Cults and Ideologies تھا۔ اس کے

چیئرمین مکہ مکرمہ کی اُمُّ الْقُرٰی یونیورسٹی میں اسلامی قانون کے Associate پروفیسر مجاہدُ الصَّوَّاف تھے۔ اس کمیٹی کے سپرد بہائیت، فری میسن تنظیم، صیہونیت اور جماعتِ احمدیہ کے متعلق تجاویز تیار کرنے کا کام تھا۔ اس کمیٹی میں سب سے زیادہ زور و شور سے بحث اس وقت ہوئی جب اجلاس میں جماعتِ احمدیہ کے متعلق تجاویز پر تبادلہ خیالات ہوا۔ اور اس بات پر اظہارِ تشویش کیا گیا کہ پاکستان کی بیوروکریسی، ملٹری اور سیاست میں احمدیوں کا اثرورسوخ بہت بڑھ گیا ہے۔ اور یہ ذکر بھی آیا کہ اگر احمدی غیر مسلم بن کر رہیں تو کوئی مسئلہ نہیں لیکن مسئلہ یہ ہے کہ احمدی افریقہ اور دوسری جگہوں پر اپنے آپ کو عالمِ اسلام کی ایک اصلاحی تنظیم کے طور پر پیش کرتے ہیں اور لوگوں کو دھوکا دیتے ہیں اور اس بات پر اظہارِ تشویش کیا گیا کہ قادیانیوں نے حیفا میں اسرائیلی سرپرستی میں اپنا مشن قائم کیا ہے اور اسے چلا رہے ہیں۔ (یہ تاریخی حقائق کے بالکل خلاف تھا۔ کبابیر، حیفا میں جماعت اسرائیل کے قیام سے بہت پہلے قائم تھی اور دوسرے لاکھوں مسلمانوں کی طرح انہوں نے اس وقت بے انتہا تکالیف اٹھائی تھیں جب وہاں پر یہودی تسلط قائم کیا جارہا تھا۔ اور اس وقت حیفا میں صرف احمدی ہی نہیں رہ رہے تھے بلکہ دوسرے بہت سے مسلمان بھی رہ رہے تھے) بہرحال خوب جھوٹ بول کر مندوبین کو جماعت کے خلاف بھڑکایا گیا۔ تمام تگ ودو کے بعد جماعت احمدیہ کے متعلق تجاویز پیش کی گئیں اور یہ تجویز کیا گیا کہ تمام عالمِ اسلام کو قادیانیوں کی ریشہ دوانیوں سے مطلع کیا جائے کیونکہ قادیانی مسلمانوں کی سیکیورٹی کے لیے بالخصوص مشرق اوسط جیسے حسّاس علاقہ میں ان کے لیے سنگین خطرہ ہیں کیونکہ قادیانی جہاد کو منسوخ سمجھتے ہیں اور ان کو برطانوی استعمار نے اپنے مقاصد کے لیے کھڑا کیا تھا اور یہ لوگ صیہونیت اور برطانوی استعمار کو مضبوط کر رہے ہیں اور قادیانی ان طریقوں سے اسلام کو نقصان پہنچا رہے ہیں۔ یہ اپنی عبادت گاہیں تعمیر کر رہے ہیں جہاں سے یہ اپنے عقائد کی تبلیغ کر رہے ہیں اور اپنی خلافِ اسلام سرگرمیوں کو مضبوط کرنے کے لیے سکول اور یتیم خانے تعمیر کر رہے ہیں اور قرآنِ کریم کے تحریف شدہ تراجم دنیا کی زبانوں میں شائع کر رہے ہیں اور اس کام کے لیے انہیں اسلام کے دشمن مدد مہیا کر رہے ہیں۔ جماعت احمدیہ کے متعلق یہ فلمی منظر کشی کرنے کے بعد کمیٹی نے یہ تجاویز پیش کیں۔

1۔ تمام اسلامی تنظیموں کو چاہیئے کہ وہ قادیانی معابد، مدارس، یتیم خانوں اور دوسرے تمام مقامات میں جہاں وہ اپنی سرگرمیوں میں مشغول ہیں ان کا محاسبہ کریں۔

2۔ ان کے پھیلائے ہوئے جال سے بچنے کے لیے اس گروہ کے کفر کا اعلان کیا جائے۔

3۔ قادیانیوں سے مکمل عدم تعاون اور مکمل اقتصادی، معاشرتی اور ثقافتی بائیکاٹ کیا جائے۔ ان سے شادی سے اجتناب کیا جائے اور ان کو مسلمانوں کے قبرستان میں دفن نہ کیا جائے۔

4۔ کانفرنس تمام اسلامی ملکوں سے مطالبہ کرتی ہے کہ ان کی ہر قسم کی سرگرمیوں پر پابندی لگائی جائے اور ان کی املاک کو مسلمان تنظیموں کے حوالے کیا جائے۔ اور قادیانیوں کو سرکاری ملازمتوں میں نہ لیا جائے۔

5۔ قادیانیوں کے شائع کیے گئے تحریف شدہ تراجمِ قرآن مجید کی نقول شائع کی جائیں۔ اور ان تراجم کی اشاعت پر پابندی لگائی جائے۔

جب یہ تجاویز کمیٹی کے سامنے آئیں تو مختلف تنظیموں کے مندوبین نے ان سے اتفاق کیا اور اس قرارداد پر دستخط کر دیئے۔ پاکستان کے سیکریٹری اوقاف ٹی ایچ ہاشمی صاحب نے بھی اس قرارداد پر دستخط کئے لیکن اتنا اختلاف کیا کہ انہیں ان تجاویز کے مذہبی حصہ سے اتفاق ہے لیکن انہیں اس تجویز سے اتفاق نہیں کہ قادیانیوں کو ملازمتوں میں لینے پر پابندی لگائی جائے۔ اس کی جگہ انہیں غیر مسلم قرار دینا کافی ہو گا۔ اس پر کمیٹی کے صدر جناب ڈاکٹر مجاہدُ الصَّوّاف نے کہا کہ علماء کے فتوے کے پیشِ نظر سعودی حکومت نے ایک شاہی فرمان کے ذریعہ اس بات پر پابندی لگا دی ہے کہ قادیانی سعودی عرب میں داخل ہوں یا انہیں یہاں پر ملازمت دی جائے۔ اس طرح یہ قرارداد منظور کر لی گئی۔

اب یہ صورتِ حال ظاہر و باہر تھی کہ جماعتِ احمدیہ کے خلاف ایک ایسی سازش تیار کی جا رہی ہے جو کسی ایک ملک تک محدود نہیں ہو گی بلکہ اس کا جال بہت سے ممالک میں پھیلا ہو گا اور اب پاکستانی حکومت بھی اس بات کا تہیہ کئے بیٹھی ہے کہ آئین میں احمدیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا جائے اور اس طرح ان کو ان کے بنیادی حقوق سے محروم کیا جائے۔ اور اس قرارداد کے متن سے یہ بات بالکل عیاں تھی کہ مقصد صرف یہ نہیں کہ دستوری طور پر احمدیوں کو غیر مسلم قرار دیا جائے بلکہ جو بھی یہ سازش کر رہا تھا وہ احمدیوں کی تبلیغ سے خائف تھا اور اس کی یہ کوشش تھی کہ جماعت کی تبلیغ کو ہر قیمت پر روکا جائے۔ اور یہ ارادے واضح طور پر نظر آ رہے تھے کہ احمدیوں کو ان کے بنیادی حقوق سے محروم کر کے اپنے سامنے جھکنے پر مجبور کیا جائے۔

یہاں یہ بات خاص طور پر قابلِ توجہ ہے اس قرارداد پر پاکستان کے ایک فیڈرل سیکریٹری نے دستخط کئے تھے جب کہ ابھی ملک میں احمدیوں کے خلاف فسادات کا نام و نشان بھی نہیں تھا۔ جب ہم نے ڈاکٹر مبشر حسن صاحب سے پوچھا کہ کیا یہ ممکن ہے کہ ایک فیڈرل سیکریٹری حکومت کی رضامندی کے بغیر ایسی قرارداد پر دستخط کر دے تو ان کا جواب تھا کہ ہاں یہ گورنمنٹ سے پوچھے بغیر نہیں ہو سکتا۔ جب ان سے پھر یہ سوال کیا گیا کہ اس کا مطلب تو یہ بنتا ہے کہ یہ پلان فسادات کے شروع ہونے سے پہلے ہی بن چکا تھا کہ احمدیوں کو پاکستان میں غیر مسلم قرار دیا جائے۔ اس کے جواب میں انہوں نے کہا۔

”پلان بن نہیں چکا تھا۔ بس جس حد تک ہوا، اُس حد تک ہوا۔ اب اس کی جو Execution ہے۔ That is a different matter۔“

لیکن یہ بات ظاہر ہے کہ ایک فیڈرل سیکریٹری ایسی قرارداد پر ملک سے باہر جا کر دستخط کر آتا ہے کہ جس پر عمل کے نتیجہ میں ملک کی آبادی کے ایک حصہ کو اس کے بنیادی حقوق سے محروم کرنے کا عمل شروع ہو جانا تھا، لازمی بات ہے کہ ملک کی کابینہ کو کم از کم اس بات کا نوٹس تو لینا چاہئے تھا۔ جب ڈاکٹر مبشر حسن صاحب سے یہ سوال پوچھا گیا کہ کیا کابینہ میں اس قرارداد پر کوئی بات ہوئی تھی؟ تو ان کا جواب تھا کہ نہیں کابینہ میں اس پر کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔

یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ رابطہ عالمِ اسلامی مکہ مکرمہ میں سعودی حکومت کی سرپرستی میں کام کرتی ہے اور اس کو مالی وسائل بھی سعودی عرب کی حکومت کی طرف سے مہیا کئے جاتے ہیں۔ اور جب کمیٹی کے اجلاس میں پاکستان کے ایک وفاقی سیکریٹری نے صرف اس بات کی مخالفت کی کہ احمدیوں کی ملازمتوں پر پابندی لگانا مناسب نہ ہو گا تو سعودی عرب کے مندوب ڈاکٹر مجاہد الصواف نے برملا کہا کہ سعودی عرب میں تو علماء کے فتوے کی بنا پر شاہی فرمان جاری ہو چکا ہے کہ قادیانیوں کو سعودی عرب میں ملازمتیں نہ دی جائیں۔ اور ساری الزام تراشیوں کا مرکز یہ تھا کہ قادیانیوں کو برطانوی استعمار نے اپنے مقاصد کے لیے کھڑا کیا اور استعمال کیا اور دوسرا بڑا الزام یہ لگایا جا رہا تھا کہ قادیانی جہاد (یعنی جہاد قتال) کے قائل نہیں ہیں۔ اس پس منظر میں یہ جائزہ لینا ضروری ہے کہ جن فرمانرواؤں کی طرف سے یہ الزامات لگائے جا رہے تھے، تاریخ کیا بتاتی ہے کہ ان کے تاجِ برطانیہ کے ساتھ کیسے تعلقات رہے اور انہوں نے گزشتہ ایک صدی میں کس کس سے جہاد اور قتال کیا۔ اس کے لیے ہمیں نوے برس پہلے کی تاریخ کا مختصر سا جائزہ لینا پڑے گا۔

پہلی جنگ عظیم کے دوران حجاز سمیت موجودہ سعودی عرب کا علاقہ بھی سلطنتِ عثمانیہ کا حصہ تھے۔ اور سلطنتِ عثمانیہ جرمنی کا ساتھ دے رہی تھی۔ اس سلطنت کو کمزور کرنے کے لیے برطانیہ اور اس کے ساتھی کوششیں کر رہے تھے کہ کسی طرح عرب ترکی کی سلطنتِ عثمانیہ کے خلاف کھڑے ہو جائیں۔ اس وقت نجد کے علاقے پر سعودی خاندان اور حجاز پر شریفِ مکہ کی حکومت تھی۔ برطانیہ کے ایجنٹوں نے شریفِ مکہ سے تو روابط بڑھائے اور اپنے ایجنٹ لارنس کو استعمال کر کے شریفِ مکہ سے سلطنتِ عثمانیہ کے خلاف بغاوت کرائی۔ لیکن اس کے ساتھ ان کے ایجنٹ سعودی خاندان سے بھی مستقل رابطے رکھ رہے تھے۔ سب سے پہلے یہ رابطہ کیپٹن ولیم شیکسپیئر کے ذریعہ ہوا جو کویت میں برطانیہ کے پولیٹکل ایجنٹ تھے انہوں نے 1910ء میں نجد کے فرمانروا عبد العزیز بن عبد الرحمن ابنِ سعود سے ملاقات کی اور دونوں میں دوستی اور ملاقاتوں کا آغاز ہوا۔ ولیم شیکسپیئر نے ابنِ سعود کو برطانیہ کی حمایت کے لیے آمادہ کیا۔ اور برطانیہ کو ان کی مدد کی ضرورت اس لیے تھی تاکہ انہیں دوسری مسلمان حکومتوں کے خلاف جنگ کرنے پر آمادہ کیا جا سکے۔ 1915ء میں سعودی خاندان اور سلطنتِ برطانیہ کے مابین ایک معاہدہ طے پایا جس میں سعودی ریاست کو سلطنتِ برطانیہ کی ایک Protectorate کی حیثیت حاصل ہو گئی۔ برطانیہ کی نمائندگی پرسی کوکس (Percy Cox) کر رہے تھے۔ اس معاہدے کی اوّل شرط میں درج تھا کہ سعودی فرمانروا اپنا جانشین نامزد کریں گے لیکن کسی ایسے شخص کو جانشین نامزد نہیں کیا جائے گا جو کسی طرح بھی برطانوی سلطنت کی مخالفت کرتا ہو اور معاہدے میں یہ درج تھا کہ اگر سعودی ریاست پر کسی نے حملہ کیا تو برطانیہ جس حد تک اور جس طرح مناسب سمجھے گا ان کی مدد کرے گا۔ ابنِ سعود کا خاندان کسی اور قوم یا طاقت کے ساتھ کوئی خط و کتابت یا معاہدہ نہیں کرے گا اور اگر کوئی اور حکومت ان سے رابطہ کرے گی تو اس کی اطلاع فوری طور پر برطانیہ کو دی جائے گی اور سعودی خاندان اپنے علاقے میں کسی اور ملک کو مراعات نہیں دے گا۔ اس معاہدے کا فائدہ یہ ہوا کہ ابنِ سعود کے خاندان کو سلطنتِ برطانیہ سے پانچ ہزار پاؤنڈ کی مدد اور ہتھیار ملنے لگے اور پھر برطانوی سلطنت کی خواہش کے مطابق سعودی خاندان نے اپنے ہمسائے میں ابنِ رشید کی حکومت سے جنگ شروع کی اور انہیں شکست دی۔

جیسا کہ ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں اس وقت حجاز پر جس میں مدینہ منورہ اور مکہ مکرمہ بھی ہیں، شریفِ مکہ کی حکومت تھی۔ ابنِ سعود سمجھتے تھے کہ وہ اس علاقہ پر قبضہ کر سکتے ہیں لیکن شریف مکہ کو برطانوی حکومت کی حمایت حاصل تھی اور وہ برطانوی حکومت سے کثیر مالی مدد بھی پاتے تھے۔ ابنِ سعود نے برطانوی حکّام کے سامنے اس بات کا اظہار بھی کیا تھا۔ لیکن

ایک ایسا واقعہ ہوا جس نے شریف مکہ اور برطانیہ کے تعلقات پر بُرا اثر ڈالا۔ شریف مکہ فلسطین میں یہودیوں کی بڑھتی ہوئی آمد کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھے اور وہ مستقبل میں بالفور اعلانیہ کے نتیجے میں پیدا ہونے والے حالات کو دیکھ رہے تھے۔ پہلی جنگِ عظیم کے بعد 1921ء میں مشہور برطانوی ایجنٹ لارنس ایک معاہدے کا مسودہ لے کر شریف مکہ کے پاس آئے۔ اس میں شریف مکہ کے لیے بہت سی مالی اور فوجی مدد کا عہد تھا اور انہیں اس مدد کی اشد ضرورت بھی تھی لیکن ایک شرط یہ بھی تھی کہ شریف مکہ فلسطین میں برطانوی مینڈیٹ کو تسلیم کر لیں۔ اس کا نتیجہ یہ نظر آرہا تھا کہ فلسطین میں یہودیوں کا عمل دخل بڑھتا جائے گا۔ شریف مکہ نے اس بات پر اصرار کیا کہ برطانیہ فلسطین کے بارے میں اپنے وہ وعدے پورے کرے جو اس نے پہلی جنگِ عظیم کے دوران کیے تھے۔ لارنس نے انہیں آمادہ کرنے کی کوشش کی کہ فلسطین کے مسئلہ سے ان کا تعلق نہیں۔ لیکن انہوں نے اس بات کو گوارہ نہ کیا کہ اس طرز پر فلسطین کے مفادات کا سودا کیا جائے۔ ان کے اس اصرار نے انگریز حکومت کو ان کے خلاف کر دیا۔ اب عبد العزیز محسوس کرتے تھے کہ ان کے لیے میدان خالی ہے۔ اب وہ حجاز پر قبضہ کر کے اپنی سلطنت کو مزید وسیع کر سکتے تھے۔ 1924ء میں انہوں نے حجاز پر حملہ کر دیا۔ جب طائف پر قبضہ ہوا تو سعودی افواج نے کافی قتل و غارت کی۔ شریف مکہ نے مدد کے لیے بار بار برطانوی سلطنت سے اپیل کی لیکن سب بے سود۔ اس اختلاف کے بعد اب برطانوی حکومت ان کی مدد کے لیے تیار نہیں تھی۔ ان کی افواج عبد العزیز کی افواج کے سامنے شکست کھاتی گئیں۔ اس طرح موجودہ سعودی عرب وجود میں آیا۔ اس ابتدائی تاریخ کے جائزے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ شروع ہی سے سعودی فرمانرواؤں اور برطانوی حکومت کے قریبی تعلقات تھے۔ انہوں نے اپنی ریاست کے لیے یہ درجہ قبول کیا تھا کہ اسے برطانوی حکومت کی Protectorate کا درجہ حاصل ہو۔ اور یہاں تک معاہدہ کیا کہ کسی ایسے شخص کو ولی عہد نہیں مقرر کیا جائے گا جو برطانوی حکومت کے خلاف ہو۔ اور سعودی حکومت کسی اور حکومت سے خط و کتابت تک نہیں کرے گی اور کسی اور ملک کو اپنی زمین پر مراعات نہیں دے گی۔ اور وہ سالہا سال برطانوی حکومت سے مالی مدد اور اسلحہ لیتے رہے اور اس کے ساتھ انہوں نے کبھی بھی کسی غیر مسلم حکومت سے کوئی جنگ یا جہاد نہیں کیا بلکہ ہمیشہ مسلمان حکومتوں سے جنگ کرتے رہے اور ایسا برطانوی حکومت کے منشا کو پورا کرنے کے لیے بھی کیا گیا اور جب حجاز کے حکمران نے اس وجہ سے برطانیہ سے معاہدہ کرنے سے انکار کیا کہ اس کی شرائط میں برطانیہ کا فلسطین پر مینڈیٹ تسلیم کرنا پڑتا تھا اور اس سے لازماً یہودیوں کو اس بات کا موقع مل جاتا تھا کہ وہ فلسطین میں قدم جمائیں اور بعد میں عملاً ایسا ہی ہوا تو عبد العزیز نے اس موقع کو

غنیمت جانتے ہوئے شریف مکہ کی ریاست پر حملہ کیا اور ان کی حکومت کا خاتمہ کر دیا۔ اس کے بعد کی تاریخ بھی اس ابتدائی تاریخ سے مختلف نہیں لیکن اس معروف تاریخ کی تفصیلات میں جانے کی ضرورت نہیں۔

(تفصیلات کے لئے دیکھیں)

The Britain and Saudi Arabia ,1939-1925

The Imperial Oasis by Clive Leather dale page 372

The Kingdom by Robert Lacey, 168 -188

یہ امر قابلِ حیرت ہے کہ اس تاریخی پس منظر کے باوجود سعودی حکومت کا اصرار تھا کہ قادیانیوں کو برطانوی استعمار نے اپنے مقاصد کے لیے کھڑا کیا تھا اور قادیانی برطانیہ کے مقاصد کے لیے کام کرتے ہیں اور جہاد کے منکر ہیں۔ اس تاریخی پس منظر کے ساتھ تو ان کی طرف سے یہ الزامات مضحکہ خیز لگتے ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ خود الزام لگانے والی حکومت کو برطانوی سلطنت نے کھڑا کیا تھا اور حجاز پر قبضہ کرنے کے بعد سعودی حکومت قانونی طور پر سلطنتِ برطانیہ کی Protectorate کی حیثیت سے چلتی رہی تھی اور ان کی مدد کے ساتھ اور ان کی خواہش کے مطابق مسلمانوں ہی سے جنگ کر کے اور ان کو اپنے مظالم کا نشانہ بناتے رہے تھے۔

ایک دوسری بات قابلِ ذکر ہے اور وہ یہ کہ رابطہ عالمِ اسلامی میں بحث کے دوران سعودی مندوب مجاہدُ الصَّوّاف نے جو کہ سب کمیٹی کی صدارت بھی کر رہے تھے یہ دلیل بھی پیش کی کہ سعودی عرب کے علماء نے تو یہ فتویٰ دے دیا ہے کہ قادیانیوں کو سرکاری ملازمتوں میں نہ لیا جائے اور اس کی پیروی میں سعودی حکومت نے فرمان بھی جاری کر دیا ہے۔ تو اس ضمن میں یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ ایسا تو ہونا ہی چاہئے تھا۔ کیونکہ جماعتِ احمدیہ کے قیام سے صدیوں پہلے ہی بہت سے صلحاءِ امت نے یہ پیشگوئی کر رکھی تھی کہ جب مہدی علیہ السلام کا ظہور ہو گا تو علماء ہرگز ان کی تائید نہیں کریں گے بلکہ اس کے سخت مخالف ہوں گے۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ حضرت محی الدین ابن عربیؒ علماء کے متعلق تحریر فرماتے ہیں:۔

”پس وہ اپنے کینوں کو اکٹھا کرتے ہیں۔ اور وہ لوگوں کی طرف جھکی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہیں اور اپنے ہونٹوں کو ذکر کرتے ہوئے ہلاتے ہیں تاکہ دیکھنے والا یہ سمجھے کہ وہ ذکر کر رہے ہیں اور وہ عجمی زبان میں کلام کرتے اور استہزاء کرتے ہیں اور

نفس کی رعونت ان پر غالب آجاتی ہے۔ اور ان کے دل بھیڑیوں کے دلوں کی طرح ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی طرف نہیں دیکھے گا۔

اللہ تعالیٰ کو ان کی کوئی ضرورت نہیں۔ وہ لوگوں کے لئے بھیڑ کی جلد پہنتے ہیں وہ ظاہری دوست اور پوشیدہ دشمن ہیں۔ پس اللہ ان کو واپس لوٹا دے گا اور ان کو ان کی پیشانیوں کے بالوں کی طرف سے پکڑ کر اس کی طرف لے جائے گا جس میں ان کی خوش بختی ہے اور جب امام مہدی ظاہر ہوں گے تو اس کے شدید ترین دشمن اس زمانہ کے علماء ہوں گے۔ ان کے پاس کوئی حکومت باقی نہیں رہے گی اور نہ ہی انہیں عام لوگوں پر کوئی فضیلت ہوگی اور ان کے پاس فیصلہ کرنے کا علم تھوڑا ہی ہوگا اور اس امام کے وجود سے تمام عالم سے اختلافات اُٹھا دیئے جائیں گے اور ایسا کیوں نہ ہو کیونکہ اس کے ہاتھ میں تلوار ہوگی۔ فقہاء اس کے قتل کا فتویٰ دیں گے اور لیکن خدا تعالیٰ اس کو تلوار کے ساتھ غلبہ نصیب کرے گا۔“

(فتوحاتِ مکیہ مصنّفہ حضرت محی الدین ابنِ عربیؒ، المجلد الثالث، ناشر دار صادر بیروت صفحہ 336)

(جماعتِ احمدیہ کے مسلک کے مطابق تلوار سے مراد خدا تعالیٰ کے جلالی نشانوں اور برہانِ قاطعہ کی تلوار ہی ہو سکتی ہے۔ جیسا کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے بہت سے الہامات اور رؤیا سے ظاہر ہوتا ہے۔)

حضرت مجدد الف ثانیؒ تحریر فرماتے ہیں:۔

”پس ہمارے پیغمبرؐ کی سنت آپ سے پہلی سنتوں کی ناسخ ہے۔ اور حضرت عیسیٰؑ نزول کے بعد اسی شریعت کی متابعت کریں گے۔ کیونکہ اس شریعت کا نسخ جائز نہیں ہے۔ قریب ہوگا کہ علماءِ ظواہر اس کے اجتہادات کا باریکی اور پوشیدگی کی وجہ سے انکار کریں اور کتاب و سنت کا مخالف سمجھیں۔“

(مکتوباتِ امامِ ربانی، حضرت مجدد الف ثانیؒ، حصہ ششم دفتر دویم، باہتمام حافظ محمد رؤف مجددی ص 13 و 14)

شیعہ کتب میں بھی یہی بیان ہوتا آیا ہے کہ علماءِ ظاہر کا طبقہ مہدی علیہ السلام کی مخالفت پر کمربستہ ہوگا۔ چنانچہ اَلصِّرَاطُ السَّوِیّ فِیْ اَحْوَالِ الْمَهْدِیّ میں حضرت مہدی علیہ السلام کے ظہور کے متعلق لکھا ہے:۔

”جب تک ان میں حالتِ منتظرہ پہلے سے پیدا نہ ہوگی ہرگز اطاعت و اتباع میں سبقت نہ کر سکیں گے۔ بلکہ ہرگز ایمان نہ لائیں گے۔ بلکہ مثلِ شیطان شک و شبہ کر کے اپنے قیاسات باطل رکیکہ سے اس کی حجت کا انکار کریں گے۔ بلکہ اس کے مقابلہ کو تیار اور عداوت اور دشمنی پر آمادہ ہو جائیں گے اور ہر طرح سے اس کو اور اس کے معتقدین کو اذیّت پہنچانے کی کوشش

کریں گے۔ علماء اس کے قتل کے فتوے دیں گے اور بعض اہلِ دُوَل اس کے قتل کے لیے فوجیں بھیجیں گے اور یہ تمام نام کے مسلمان ہی ہوں گے۔"

(الصراط السوی فی احوال المہدی مصنفہ مولوی سید محمد سبطین السرسوی، ناشر مینجر البرہان بکڈپو لاہور، صفحہ 507)

اس دور میں اہلِ حدیث کے عالم نواب صدیق حسن خان صاحب اپنی کتاب "حجج الکرامۃ فی آثار القیامۃ" میں تحریر کرتے ہیں۔

"جب مہدی علیہ السلام احیاءِ سنت اور اماتتِ بدعت پر مقاتلہ فرمائیں گے تو علماءِ وقت جو کہ فقہاء کی تقلید کرتے ہیں اور اپنے بزرگوں اور آباء واجداد کی پیروی کے خوگر ہوں گے کہیں گے کہ یہ شخص ہمارے دین وملّت پر خانہ برانداز ہے اور مخالفت کریں گے اور اپنی عادت کے موافق اس کی تکفیر و تضلیل کا فیصلہ کریں گے۔"

(حجج الکرامۃ فی آثار القیامۃ صفحہ 363 مصنفہ نواب صدیق حسن خان صاحب مطبع شاہجہان بھوپال)

تو ان مختلف فرقوں کے لٹریچر سے یہی ثابت ہے کہ ان کا ہمیشہ سے یہی نظریہ رہا ہے کہ حضرت مہدی علیہ السلام کے ظہور کے وقت اس وقت کے علماء ان کی مخالفت بلکہ قتل پر کمربستہ ہوں گے۔ ہماری تحقیق کے مطابق تو کبھی کسی فرقہ نے اس بات کا اعلان کیا ہی نہیں کہ جب امام مہدی کا ظہور ہو گا تو اس وقت کے علماء ان کی تائید اور حمایت کریں گے۔

بلکہ مختلف ائمہ احادیث نے جب قربِ قیامت کی علامات کے بارے میں احادیث جمع کیں تو ان میں اس وقت کے نام نہاد علماء کے بارے جس قسم کی احادیث بیان ہوئی ہیں ان کی چند مثالیں درج کی جاتی ہیں۔

چنانچہ کنز العمال فی سنن الاقوال والافعال میں کتاب القیامۃ میں آنحضرتؐ کا یہ ارشاد منقول ہے

"تَكُوْنُ فِيْ اُمَّتِيْ فَزْعَةٌ فَيَصِيْرُ النَّاسُ اِلٰى عُلَمَاءِ هِمْ فَاِذَا هُمْ قِرَدَةٌ وَ خَنَازِيْرُ"۔

یعنی میری امت پر ایسا وقت آئے گا کہ لوگ اپنے علماء کی طرف جائیں گے اور دیکھیں گے کہ ان کی جگہ بندر اور سور بیٹھے ہوں گے۔

(کنز العمال فی سنن الاقوال والافعال تالیف علّامہ علاؤالدین علی المتقی۔ الجزء الثالث عشر، ناشر دار الکتب العلمیہ، بیروت لبنان۔ ص 124)

یہ دو احادیث بھی پیش ہیں

”عبد اللہ بن عمروؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ علم کو اس طرح نہیں اُٹھائے گا کہ بندوں سے اسے نکال لے لیکن اسے اُٹھائے گا علماء کے اُٹھانے کے ساتھ یہاں تک کہ جب کسی عالم کو باقی نہیں رکھے گا تو لوگ جاہلوں کو سردار بنا لیں گے ان سے مسائل پوچھیں گے۔ وہ بغیر علم کے فتویٰ دیں گے۔ خود بھی گمراہ ہوں گے اور دوسروں کو بھی گمراہ کریں گے۔“

(متفق علیہ۔ مشکوۃ شریف مترجم، ناشر مکتبہ رحمانیہ اردو بازار۔ لاہور۔ ص 65)

”حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا: قریب ہے کہ لوگوں پر ایک ایسا زمانہ آئے، نہیں باقی رہے گا اسلام مگر نام اس کا اور نہ باقی رہے گا قرآن مگر رسم اس کی۔ ان کی مسجدیں آباد ہوں گی مگر حقیقت میں ہدایت سے خالی ہوں گی۔ ان کے علماء آسمان کے نیچے بدترین مخلوق ہوں گے۔ ان سے فتنہ نکلے گا اور ان میں ہی لوٹ جائے گا۔“

(رواہ البیھقی فی شعب الایمان۔ مشکوۃ شریف مترجم، جلد اول، ص 76، ناشر مکتبہ رحمانیہ اردو بازار لاہور)

جیسا کہ پہلے ہم ذکر کر چکے ہیں پاکستان کی طرف سے اوقاف کے فیڈرل سیکریٹری تجمل ہاشمی صاحب نے رابطہ عالمِ اسلامی کی قرارداد پر دستخط کئے تھے۔ اور ہم نے اس کتاب کی تالیف کے دوران ان کا انٹرویو بھی لیا۔ اور جب ان سے اس بابت یہ سوال کیا گیا تو ان کا کہنا یہ تھا:

”میرے لحاظ سے کسی کو کہہ دینا کہ یہ مسلمان ہے یا مسلمان نہیں۔ یہ میں سمجھتا ہوں۔ میں تو کسی کو نہیں کہہ سکتا کہ وہ میرے سے بہتر مسلمان ہے یا نہیں مسلمان ہے۔“

پھر انہوں نے یہ بھی کہا کہ ”کوئی کسی کو نہیں کہہ سکتا کہ وہ مسلمان ہے کہ نہیں ہے۔“

اس کے باوجود یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ ان کا یہ بھی کہنا تھا کہ ان کو حکومت نے نہیں کہا تھا کہ وہ اس قرارداد پر دستخط کریں۔ اس کے باوجود جبکہ ان کا عقیدہ یہ تھا کہ کسی شخص کو یہ حق بھی نہیں کہ وہ یہ کہے کہ دوسرا شخص مسلمان ہے یا نہیں پھر بھی انہوں نے اس قرارداد پر دستخط کر دیئے۔ اور اس کے علاوہ ان کا یہ بھی کہنا تھا کہ رابطہ عالم اسلامی کی اور اس کی قراردادوں کی کوئی اہمیت بھی نہیں تھی پھر بھی انہوں نے پاکستان کے داخلی معاملہ پر بیرونِ ملک جا کر اس بحث میں حصہ لیا اور ایک ایسی قرارداد پر دستخط بھی کر دیئے جس کے مطابق پاکستان کی آبادی کے ایک حصہ کا اقتصادی اور معاشی بائیکاٹ بھی کیا جانا تھا۔ البتہ ان کا یہ کہنا تھا کہ سعودی حکومت کے پاس پیسہ تھا اور وہ اس کے بل بوتے پر ایسی کانفرنسیں کراتے تھے یا

کتابیں لکھوا کر اور انہیں خرید کر یا پھر ویسے ہی علماء کی مدد بھی کرتے تھے۔ پھر ان سے دریافت کیا گیا کہ اس کمیٹی میں احمدیوں پر یہ الزام بھی لگایا گیا تھا کہ وہ جہاد کے قائل نہیں۔ اس پر ان کا جواب یہ تھا کہ بھائی جہاد کسے کہتے ہیں۔ آج تک کسی نے جہاد کی Definition کی ہے۔ اگر جہاد کا مطلب یہی ہے کہ تلوار اُٹھانا تو وہ کن حالات میں اُٹھائی جائے۔ جہاد کے تو اور بھی بڑے مطلب ہیں۔ جب ان سے پوچھا گیا کہ وہاں کون سب سے زیادہ اس قرارداد میں دلچسپی لے رہا تھا تو ان کا جواب تھا کہ سعودی سب سے زیادہ اس قرارداد کو منظور کرانے میں دلچسپی لے رہے تھے۔ پھر رابطہ کے اس اجلاس میں اس بات کی نشاندہی کی گئی تھی کہ اس وقت احمدی پاکستان کی سول سروس میں اور ملٹری میں بہت نمایاں پوزیشن حاصل کرتے جاتے ہیں جبکہ حقیقت یہ تھی کہ اس وقت احمدی ایسی نمایاں پوزیشن پر موجود ہی نہیں تھے۔ جب ان سے کہا گیا کہ اس وقت تو احمدی ایسی کسی نمایاں پوزیشن پر موجود ہی نہیں تھے۔ تو ان کا بے ساختہ جواب یہ تھا کہ ایم ایم احمد تو تھے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ ایم ایم احمد اس قرارداد کے وقت پاکستان میں موجود نہیں تھے بلکہ ورلڈ بینک میں جا چکے تھے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اگر کوئی احمدی اپنی صلاحیت کی بنا پر کوئی پوزیشن حاصل کرتا ہے تو یہ اُس کا حق ہے۔ اُس پر کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہئے۔

اب سابق وفاقی وزیر مبشر حسن صاحب کا یہ کہنا ہے کہ یہ ممکن نہیں کہ ایک فیڈرل سیکریٹری حکومت کی مرضی کے خلاف ایسی قرارداد پر دستخط کر آئے اور تجمل ہاشمی صاحب کا یہ کہنا تھا کہ حکومت نے انہیں نہیں کہا تھا کہ اس قرارداد پر دستخط کرو۔ اب پڑھنے والے خود فیصلہ کر سکتے ہیں کہ کون سا جواب حقیقت کے قریب تر ہو سکتا ہے۔

جماعت کے مخالفین کی طرف سے رابطہ عالم اسلامی کی اس قرارداد کا حوالہ بار بار دیا گیا ہے۔ 1974ء میں جب جماعت کے خلاف قراردادیں پیش کی گئیں تو بھی اس فیصلہ کو امّتِ مسلمہ کے مشترکہ فیصلہ کے طور پر پیش کیا گیا اور اس کے بعد بھی اب تک ہر سطح پر اس قرارداد کا حوالہ دیا جاتا ہے اور اس قرارداد پر دستخط کرنے والا پاکستانی مندوب خود اقرار کرتا ہے کہ اس قرارداد کے مندرجات سے تو مجھے اتفاق ہی نہیں تھا۔ میں نے تو ویسے ہی اس پر دستخط کر دیئے تھے۔ اس وقت سعودی حکومت کے پاس مدد دینے کے لئے پیسے تھے اور اس وقت وہ مختلف ذرائع سے مدد کیا کرتے تھے۔ اب پڑھنے والے خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اس قرارداد کی اصل حقیقت کیا ہے۔

اس باب کے آخر میں یہ ذکر کرنا مناسب ہو گا کہ اس تنظیم رابطہ عالمِ اسلامی کا آغاز کیسے ہوا اور اس کا بالواسطہ طور پر جماعت احمدیہ کی تاریخ سے کیا تعلق تھا؟ مُؤتمر عالمِ اسلامی کا پہلا اجلاس 1926ء میں ہوا۔ ایک سال قبل ہی سلطان

عبد العزیز ابنِ سعود نے جو کہ پہلے صرف نجد پر حکمران تھے، حجاز پر قبضہ کیا تھا۔ اس سے قبل حجاز پر شریفِ مکہ کی حکمرانی تھی۔ سلطان عبد العزیز ابن سعود وہابی مسلک سے تعلق رکھتے تھے۔ جب حجاز پر ان کا قبضہ ہوا تو پوری دنیا کی طرح ہندوستان میں یہ خبریں پہنچیں کہ حجاز میں ان کے حملہ کے نتیجہ میں بہت خون ریزی کی گئی ہے اور صحابہ کی بہت سے قبروں کے نشانات اور بعض مزاروں پر سے گنبدوں کو منہدم کیا گیا ہے کیونکہ وہابی مسلک کے تحت ان چیزوں کو بدعت سمجھا جاتا ہے۔ ان خبروں نے ہندوستان میں بھی بے چینی کی لہر پیدا کر دی۔ لیکن عبد العزیز ابنِ سعود اور ان کے حامیوں کی طرف سے ان خبروں کو مبالغہ آمیز قرار دیا گیا۔ مولوی شبیر عثمانی صاحب جو جماعتِ احمدیہ کے اشد ترین مخالفین میں سے تھے ان کی سوانح حیات، حیاتِ عثمانی میں لکھا ہے:۔

> ”لیکن ابنِ سعود حنبلی مذہب کے تھے۔ عبد الوہاب نجدی کے ہم مشرب تھے کہ وہ بھی حنبلی تھا، انہوں نے مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کی خدمت کا چارج لیتے ہی آثارِ حجاز کو منہدم کرا دیا۔ صحابہ کے تمام پختہ مزارات کو پیوست زمین کر دیا، قبروں کا نام ونشان نہ چھوڑا۔ البتہ کچی قبریں نشانی کے طور پر رہنے دیں۔ ترکوں نے تقریباً تمام متبرک اور محترم شخصیتوں کی قبروں پر قُبّے بنوا دیئے تھے، اور ان پر ان کے نام بھی کندہ کرا دیئے تھے لیکن سب کو صاف کرا دیا گیا۔ جنگِ احد کے شہداء بالخصوص امیر حمزہ رضی اللہ عنہم کی قبریں ہموار حالت میں ہیں جو میں نے اپنی آنکھوں سے 1965ء میں دیکھی ہیں۔ اب چاروں طرف صرف پتھروں کے ٹکڑے رکھے ہوئے ہیں۔ جنت البقیع میں بھی مزارات کا یہی حال ہے۔ ان کا نظریہ یہ تھا کہ اسلام کے فرزند یہاں آکر قبروں کو سجدہ کرتے ہیں۔ لہٰذا ان آثار کو ہی اڑا دیا۔ ایسا کرنے سے دنیائے اسلام میں ہیجان پھیل گیا اور مشرق سے لے کر مغرب تک اضطراب اور جوش و غضب کی لہر دوڑ گئی۔ احتجاج کیا گیا۔ جس کے نتیجے میں سلطان ابنِ سعود نے ممالکِ اسلامیہ سے تبادلہ خیالات کے لئے ایک مؤتمر (اجتماع) منعقد کی جس میں ہندوستان، کابل، مصر، شام، حجاز، روس وغیرہ کے علماء کو دعوت دی گئی۔“

(حیاتِ عثمانی، ص 237، مصنفہ پروفیسر محمد انوار الحسن شیر کوٹی، ناشر مکتبہ دار العلوم کراچی)

ان حالات میں خلافت کمیٹی کی طرف سے جو تار سلطان ابنِ سعود کو بھجوایا گیا جس میں یہ مطالبہ کیا گیا تھا کہ حجاز کے متعلق معاملات کے بارے میں ایک عالمی مؤتمر اسلامی منعقد کی جائے اس کے متعلق خود مولانا محمد علی جوہر تحریر کرتے ہیں کہ اس کے جواب میں سلطان ابنِ سعود کا تار ملا کہ

”آپ کا تار ملا۔ آپ کے اور مسلمانانِ ہند کے صحیح خیالات کا شکریہ۔۔۔۔۔۔ آخری فیصلہ تمام دنیائے اسلام کے ہاتھ میں ہے۔“

(مولانا محمد علی آپ بیتی اور فکری مقالات ص228۔ مرتبہ سید شاہ محمد قادری ناشر تخلیقات)

مئی 1926ء میں ہندوستان سے ایک وفد مکہ مکرمہ روانہ ہوا تاکہ وہاں پر سلطان عبد العزیز ابن سعود کی صدارت میں منعقد ہونے والی مؤتمر عالمِ اسلامی میں شرکت کر سکے۔ اس وفد کی صدارت سید سلمان ندوی کر رہے تھے اور اس کے ممبران میں مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی صاحب، مولوی شبیر عثمانی، مفتی کفایت اللہ، عبد الحلیم، احمد سعید، شعیب قریشی، محمد عرفان، ظفر علی خان صاحب وغیرہ شامل تھے۔ یہ وفد ہندوستان سے روانہ ہوا اور حجاز پہنچا۔ بہت سے لوگ جن میں مولانا محمد علی جوہر بھی شامل تھے یہ امید رکھتے تھے کہ ابنِ سعود نے حجاز پر قبضہ تو کر لیا ہے لیکن وہ اس مقدس خطے پر اپنی موروثی بادشاہت قائم کرنے کی بجائے یہاں پر تمام عالمِ اسلام کے مشورے سے ایک علیحدہ نظامِ حکومت قائم کریں گے اور سلطان عبدالعزیز ابن سعود نے اپنی ایک تار میں بھی اس بات کا اشارہ دیا تھا کہ حجاز کے خطے میں تمام عالمِ اسلام کے مشورے سے ہی ایک نظامِ حکومت قائم کیا جائے گا لیکن وہاں پہنچ کر جو آثار دیکھے تو یہ سب امیدیں دم توڑنے لگیں۔ سلطان عبد العزیز ابنِ سعود بھی حجاز پر اپنی موروثی ملوکیت قائم کر رہے تھے۔ چنانچہ وہاں پہنچ کر کیا ہوا اس کے متعلق رئیس احمد جعفری اپنی کتاب ”سیرت محمد علی“ میں تحریر کرتے ہیں:۔

”جب محمد علی آمادہ ہوئے تو یہ تجویز ہوئی کہ ایک وفد بھی خلافت کمیٹی کی طرف سے حجاز بھیجا جائے وہ موتمرِ اسلام میں شرکت کرے اور خلافت کمیٹی کا نظریہ پیش کرے اور سلطان ابنِ سعود کو ان کے مواعید یاد دلائے۔

مولانا سید سلمان ندوی صدر وفد مقرر ہوئے۔ مسٹر شعیب قریشی سیکریٹری اور علی برادران ممبر، اس طرح یہ وفد موتمر میں شرکت کے لئے حجازِ مقدس روانہ ہو گیا۔

محمد علی کی صحت یہیں سے خراب تھی، وہاں پہنچے تو آب و ہوا کی ناموافقت کی وجہ سے علیل ہو گئے اور بائیں حصہ جسم پر خفیف سا فالج کا حملہ بھی ہوا لیکن وہ ان چیزوں کو خاطر میں نہیں لائے اور اپنا کام برابر پورے استقلال سے جاری رکھا۔

موتمر میں عالم اسلام کے اکثر نمائندے شریک ہوئے تھے، خود سلطان ابنِ سعود نے موتمر کا افتتاح کیا تھا۔ اکثر نمائندے "جلالۃ الملک" کے جلال و جبروت سے متاثر و مرعوب تھے لیکن محمد علی کا ایک حق گو وجود ایسا تھا جو خدم و حشم، جاہ و

جلال، عظمت و جبروت کسی چیز سے بھی متاثر نہیں ہوا۔ اس نے وہیں موتمر میں سلطان ابنِ سعود سے پورے آزادانہ لہجہ میں تخاطب کیا کہ یہ ملوکیت کیسی؟ اسلام میں تو شخصیت کی بیخ کنی کی گئی۔ شوریٰ اور جمہوریت کو تفوق حاصل ہے۔ تم کتاب و سنت کے تمسک کے مدعی ہو پھر یہ قیصر و کسریٰ کی پیروی کیوں؟ محمد علی کے اس آوازہ حق نے تمام لوگوں کو چونکا دیا اور یہ احساس پیدا کر دیا کہ ابھی عالمِ اسلام حق گو اور حق پرست شخصیتوں سے خالی نہیں ہے۔ گو آج صحابہ کرام کا وجودِ گرامی ہمارے درمیان نہیں پھر بھی ایسی ہستیاں ابھی موجود ہیں جو حق کے لئے سارے عالم اسلام سے دشمنی مول لے سکتی ہیں اور کسی شاہ و شہریار کو خاطر میں نہیں لاتیں۔۔۔۔۔۔

سب سے زیادہ تعجب خیز بات یہ ہے کہ خلافت کمیٹی کی پالیسی۔ ہدایات اور نصب العین سے جن لوگوں کو کامل اتفاق تھا جن کی صدارت اور جن کی تائید سے یہ خبریں پاس ہوئی تھیں اور ابنِ سعود کو بھیجی گئی تھیں انہوں نے نہایت شدومد سے اختلاف کیا۔ ملوکیت کی حمایت کی اور وعدہ خلافیوں پر پردہ ڈالنا چاہا۔"

(سیرت محمد علی حصہ اول و دوم ص448 تا450، مصنفہ رئیس احمد جعفری، ناشر کتاب منزل لاہور)

مولانا محمد علی جوہر صاحب نے جن خیالات کا بھی اظہار کیا ہو یہ ظاہر ہے کہ موتمرِ عالمِ اسلامی کے پہلے اجلاس میں کم از کم ہندوستان کا جو وفد شریک ہوا اس میں شبیر عثمانی صاحب، ظفر علی خان صاحب اور سلمان ندوی صاحب جیسے افراد موجود تھے جو کہ جماعتِ احمدیہ کے شدید مخالف تھے اور ان میں سے کئی ایسے تھے جو کہ سلطان عبد العزیز کی مخالفت کرتے گئے تھے اور پھر وہاں جا کر انہوں نے اپنا موقف بدل لیا تھا۔

یہ واقعات 1926ء کے ہیں اور یہ سال جماعتِ احمدیہ کی تاریخ میں بھی ایک خاص اہمیت رکھتا ہے کیونکہ اس سال لندن میں مسجد فضل لندن کا افتتاح ہوا تھا۔ اور یہ مغربی دنیا میں جماعتِ احمدیہ کی پہلی مسجد تھی۔ جب اس کے افتتاح کا معاملہ پیش ہوا تو یہ فیصلہ ہوا کہ عراق کے بادشاہ کے چھوٹے بھائی امیر زید جو اس وقت آکسفورڈ میں تعلیم پا رہے تھے یا عراق کے بادشاہ شاہ فیصل جو اس وقت انگلستان کے دورہ پر تھے، سے اس مسجد کا افتتاح کرایا جائے۔ اس کے لئے شاہ فیصل کو خط بھی لکھا گیا لیکن ان کی طرف سے کوئی تسلی بخش جواب موصول نہیں ہوا تو پھر سلطان عبد العزیز ابنِ سعود کو تار دی گئی کہ وہ اپنے کسی صاحبزادے کو اس بات کے لئے مقرر کریں کہ وہ مسجد فضل لندن کا افتتاح کریں۔ اور ان کے انگریز دوست نے بھی انہیں لندن سے تار دی کہ آپ اس مسجد کے افتتاح کے موقع پر ہر دلعزیزی حاصل کر سکتے ہیں۔ چنانچہ امام مسجد لندن حضرت مولانا

عبد الرحیم درد صاحب کی باقاعدہ درخواست پر انہوں نے بذریعہ تار جواب دیا کہ ہم اس درخواست کو قبول کرتے ہیں اور ہمارا بیٹا فیصل ستمبر میں لندن کے لئے جدہ سے روانہ ہو گا۔ 23 ستمبر 1926ء کو شاہِ حجاز کے صاحبزادے امیر فیصل انگلستان پہنچے اور امام مسجد لندن کی سرکردگی میں ان کا پُرتپاک خیر مقدم کیا گیا اور تمام اخبارات میں بھی یہ خبریں شائع ہو گئیں کہ وہ لندن کی نئی مسجد کا افتتاح کریں گے۔ امیر فیصل کا قیام بطور سرکاری مہمان ہائیڈ پارک ہوٹل میں تھا۔ لیکن جلد ہی ایسے آثار ظاہر ہونا شروع ہو گئے کہ امیر فیصل کسی وجہ سے مسجد کے افتتاح یا جماعت کی طرف سے دیئے گئے استقبالیہ میں شرکت کرنے سے متردّد ہیں۔ 29 / ستمبر کی رات کو جماعت کی طرف سے ان کے اعزاز میں استقبالیہ دیا جانا تھا اور یہ پروگرام ان کی رضامندی سے رکھا گیا تھا اور 3 / اکتوبر کو مسجد کا افتتاح کیا جانا تھا۔ لیکن امام مسجد لندن کو مسٹر جارڈن جو کہ جدہ میں برطانوی کونسل تھے کا پیغام ملا کہ وہ انہیں ملیں۔ ملاقات پر ان کو بتایا گیا کہ 29 / ستمبر کی تاریخ اس استقبالیہ کے لئے مناسب نہیں کیونکہ اسی تاریخ کو حکومتِ برطانیہ کی طرف سے بھی دعوت ہے لیکن جب حضرت مولانا عبد الرحیم درد صاحب نے اس بات کی نشاندہی فرمائی کہ حکومت کی طرف سے دعوت دوپہر کو ہے اور جماعت کی طرف سے استقبالیہ رات کو ہے لیکن برطانوی افسران اس بات پر مصر رہے کہ یہ دعوت 29 / ستمبر کو نہیں ہونی چاہئے بلکہ مسجد کے افتتاح کے بعد 6 / اکتوبر کو ہونی چاہئے۔ یہ بات بہت معنی خیز تھی کہ دعوت قبول تو سعودی فرمانروا نے کی تھی لیکن اس پروگرام میں ردوبدل کا اختیار اب برطانوی حکومت کے پاس آ چکا تھا۔ اور سعودی شہزادے اور ان کا وفد محض خاموش تھا۔ اور دوسری طرف اخبارات میں خبریں چھپ رہی تھیں کہ امیر فیصل اس نئی مسجد کا افتتاح کریں گے۔ لیکن اب اس بات کے آثار واضح ہو رہے تھے کہ امیر فیصل اب مسجد کا افتتاح نہیں کریں گے۔ 28 ستمبر کو حضرت مولانا عبد الرحیم درد صاحب کو ایک بااثر شخصیت کی طرف سے خط ملا کہ امیر فیصل اس افتتاح میں شریک نہیں ہو سکیں گے اور وجہ یہ بتائی گئی کہ سلطان عبد العزیز کی طرف سے کوئی تار ملا ہے جس کی وجہ سے یہ رکاوٹ پیدا ہوئی ہے اور یہ بھی کہا کہ اس کی وجہ ہندوستانی مسلمانوں کی طرف سے کی جانے والی مخالفت ہے لیکن اس کے بعد یہ بھی معلوم ہوا کہ یہ خبر پہنچانے والے صاحب خود بھی اصل وجہ سے بے خبر ہیں۔ لیکن وہ صاحب یہ خیال ظاہر کر رہے تھے کہ مسجد کے افتتاح کی تقریب ملتوی کر دی جائے لیکن حضرت مولانا عبد الرحیم درد صاحب کا خیال یہی تھا کہ مسجد کا افتتاح بہر حال مقرر کردہ تاریخ پر کیا جائے۔ حضرت مصلح موعود کی خدمت میں بھی صورتِ حال لکھ کر راہنمائی کے لئے درخواست کی گئی تو حضور نے بھی اسی خیال کے مطابق حکم دیا کہ افتتاح کی تیاری رکھی جائے۔ پھر حجاز کے وزیر خارجہ خود حضرت درد

صاحب سے ملے اور کہا کہ ہمیں اس صورتِ حال کا بہت افسوس ہے۔ اصل میں سلطان عبد العزیز کی طرف سے یہ تار ملا تھا کہ تم اپنی ذمہ داری پر اس مسجد کا افتتاح کر سکتے ہو اور وہاں کے مسلمانوں سے بھی مشورہ کر لینا اور ہم نے سلطان کے حکم کی وضاحت کے لئے تار دی ہے اگر مثبت جواب آیا تو ہم اس تقریب میں بڑی خوشی سے شامل ہوں گے۔ لیکن آخر تک حجاز سے کوئی جواب موصول نہیں ہوا۔ اور حضور سے لی گئی اجازت کے مطابق سر عبد القادر صاحب نے مسجد کا افتتاح کیا۔ اس وقت جو بھی حالات سامنے نظر آ رہے تھے اس کے مطابق کوششیں کی جا رہی تھیں لیکن اس رکاوٹ کے پیچھے بھی اللہ تعالیٰ کی حکمت کام کر رہی تھی۔ چونکہ ایک عرصہ کے بعد امیر فیصل نے سعودی مملکت کے فرمانروا کی حیثیت سے جماعت کے مخالف ایک عالمی نفرت انگیز مہم میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا تھا اس لئے اللہ تعالیٰ کی حکمت نے اس بات کو پسند نہیں کیا کہ وہ اُس مسجد کا افتتاح کر سکے جس کو بعد میں جماعت کی تاریخ میں ایک خاص اہمیت ملنی تھی۔

(تاریخ مسجد فضل لندن ص 45 تا 60، مصنفہ حضرت ڈاکٹر میر محمد اسماعیل صاحب، ناشر مینیجر بکڈپو تالیف واشاعت قادیان)

انگلستان کے اس دورہ کے دوران امیر فیصل نے مسجد کا افتتاح تو نہیں کیا لیکن وہ دوسرے معاملات میں مصروف رہے۔ اس وقت تو یہ حقائق پوری طرح سامنے نہیں آئے تھے لیکن اب یہ معروف حقائق بن چکے ہیں کہ ان دنوں امیر فیصل سلطنتِ برطانیہ کے عہدیداروں سے مذاکرات کر رہے تھے۔ اور ان مذاکرات کا مرکزی نقطہ یہ تھا کہ برطانیہ حجاز پر ان کے والد کی بادشاہت کو قبول کر لے۔ اور کچھ عرصہ کے بعد ان مذاکرات کا نتیجہ بھی سامنے آ گیا اور مئی 1927ء میں باقاعدہ طور پر Treaty of Jeddah پر دستخط ہوئے جس کے نتیجہ میں حجاز اور نجد کے علاقہ پر سعودی خاندان کی حکومت تسلیم کر لی گئی۔ لیکن یہ بات قابلِ غور ہے کہ پہلی مرتبہ جن افسران نے اس بات کا اظہار کیا تھا کہ امیر فیصل جماعتِ احمدیہ کی تقریب میں شامل نہیں ہوں گے وہ سعودی حکومت کے کوئی عہدیدار نہیں تھے بلکہ برطانوی سفارتکار تھے اور اس وقت امیر فیصل برطانوی عہدیداروں سے مذاکرات کر رہے تھے۔ اور ان مذاکرات کی کامیابی برطانوی حکومت کی خوشنودی پر منحصر تھی۔

(The late King Faisal, his life, personality and methods of Government by Marianne Ali reza P8.)

(یہ مضمون انٹرنیٹ پر موجود ہے)

یہ سوال بار بار اُٹھایا گیا ہے کہ آخر میں امیر فیصل نے مسجد فضل کا افتتاح کیوں نہیں کیا جب کہ وہ اپنے ملک سے اس ارادہ سے چلے تھے کہ اس افتتاح کی تقریب میں حصہ لیں۔ جیسا کہ ایک مرحلہ پر تاثر دیا گیا تھا۔ اگر یہ باور کیا جائے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کے دباؤ کی وجہ سے ایسا کیا گیا تھا تو اس بات پر یقین کرنا مشکل ہے کیونکہ ہندوستان کے مسلمان کسی طرح اس پوزیشن میں تھے ہی نہیں کہ سعودی مملکت پر کسی قسم کا دباؤ ڈال سکیں اور تاریخی طور پر اس قسم کا کوئی خاطر خواہ بیان یا ثبوت بھی نہیں ملتا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی طرف سے کوئی ایسا دباؤ پیدا کیا گیا تھا۔ ان کے کئی قائدین سلطان عبد العزیز کے خلاف بیان دیتے ہوئے ہندوستان سے گئے تھے اور حجاز مقدس پہنچ کر ان سے اتنا مرعوب ہوئے تھے کہ ان کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے واپس آئے تھے اور یہ بھی باور نہیں کیا جا سکتا کہ انگلستان کے مسلمانوں کی طرف سے ایسی صورتِ حال پیدا کی گئی تھی کیونکہ اس وقت انگلستان میں مسلمان برائے نام تعداد میں موجود تھے اور ان کی ایک بڑی تعداد نے خود اس تقریب میں شمولیت کی تھی۔ اس وقت سعودی مملکت خفیہ طور پر سلطنتِ برطانیہ سے جس قسم کے مذاکرات کر رہی تھی اس کے لئے یہ بہت ضروری تھا کہ کسی طرح سلطنتِ برطانیہ کی ناراضگی نہ مول لی جائے۔

بہر حال امیر فیصل نے جو کہ بعد میں سعودی مملکت کے فرمانروا بھی بنے اس دورہ میں مسجد فضل کا افتتاح تو نہیں کیا لیکن انہوں نے مغربی طاقتوں کی طرف بالخصوص سلطنتِ برطانیہ کے بارے میں جس طرح دوستانہ رویہ ظاہر کیا اس نے بہت سے لوگوں کو حیران کیا اور اس کے متعلق مسلمان قائدین نے آوازیں بلند کرنی شروع کیں۔ چنانچہ مولانا محمد علی جوہر نے امیر فیصل کے اس دورہ کے بارے میں یہ الفاظ لکھے۔ الفاظ کافی سخت ہیں ہم اس کی تصدیق یا تردید کی بحث میں پڑے بغیر اس لئے درج کر رہے ہیں کہ تا کہ یہ اندازہ لگایا جا سکے کہ اس وقت اس دورہ کا عام مسلمان قائدین میں کیا ردِّ عمل تھا۔ مولانا محمد علی جوہر موتمر عالمِ اسلامی کے اجلاس کے انجام اور امیر فیصل کے دورہ کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

”جو حشر جمہوریت کی تعریف اور مقدس مقامات کے احترام کا ہوا وہ ایک عالم جانتا ہے۔ جو حشر موتمر عالم اسلام کا کیا جا رہا ہے اس کے متعلق جلد کچھ عرض کروں گا۔ شرف عدنان بے اوّل موتمر کے صدر کا تار جو علّامہ سید سلمان ندوی نائب صدر موتمر کے نام موصول ہوا وہ آپ کے سامنے ہے۔ پڑھیئے اور سلطان ابنِ سعود کے ایفائے عہد کا لطف اُٹھائیے۔ یہ ہے وہ تمسک بالکتب والسنۃ جو ہدم مقابر مآثر اور مزارِ رسولِ اکرم (روحی فداہ) کے قرب وجوار تک کو اندھیرے میں ہی چھوڑنے سے ہی ثابت ہوتا ہے یا پھر شاہ انگلستان اور ملکہ ہالینڈ کے ہاتھوں سے صلیبی تمغہ اپنے نائب اور صاحبزادے کے سینے پر لٹکوانے

سے اور اس کی تصویر ان حسین چھوکریوں کے ساتھ کھنچوانے جو لندن میں نیم عریانی کے لباس کی اپنے خوبصورت اور ڈھلے ہوئے جسموں پر نمائش کر کے دکان میں آنے والوں کو خریداری پر آمادہ کرتی ہیں۔ یہ صاحبزادے کس کے لئے یہ نیم عریاں لباس خریدنے گئے تھے۔ یہ آج تک معلوم نہ ہوا مگر شاید لباس کے خریدار نہ ہوں۔۔۔۔۔ (آگے کچھ زیادہ سخت الفاظ حذف کر دیئے گئے ہیں)۔ غرض جو کچھ ہو ہے "فعلِ فیصل" اور تمسک بالکتب والسنۃ۔"

(ہمدرد 13/ نومبر 1927ء بحوالہ مولانا محمد علی جوہر آپ بیتی اور فکری مقالات ص828 مرتبہ سید شاہ محمد قادری)

مخالفین جماعت کے ارادے ظاہر ہوتے ہیں

اب یہ بات ظاہر وباہر ہوتی جا رہی تھی کہ جماعت کے مخالفین ایک بار پھر جماعتِ احمدیہ کے خلاف ایک بڑے منصوبے پر عملدرآمد کرنے کی تیاری کر رہے ہیں۔ اور 1953ء میں تو جماعت کی مخالف شورش کا دائرہ بڑی حد تک صوبہ پنجاب تک محدود تھا مگر اب 1974ء میں جبکہ جماعتِ احمدیہ پہلے کی نسبت دنیا بھر میں بہت زیادہ ترقی کر چکی تھی۔ مخالفین کی کوشش تھی کہ پوری دنیا میں جماعتِ احمدیہ کے خلاف سازشوں کا جال بچھایا جائے۔ مگر چونکہ ابھی بھی پوری دنیا کی جماعتوں میں پاکستان کی جماعت سب سے زیادہ اہم تھی اور جماعت کا مرکز بھی پاکستان میں تھا اس لیے سب سے زیادہ زہریلا وار یہیں پر کرنے کی تیاریاں ہو رہی تھیں تاکہ احمدیت پر ایسا وار کیا جائے جس سے جماعت کا عالمی تبلیغی جہاد اس سے بُری طرح متاثر ہو۔ چنانچہ 1974ء کے آغاز میں جماعت مخالف رسائل میں یہ اشتہارات چھپنے لگے کہ قادیانیت کی مخالفت کے لیے قادیانی محاسبہ کمیٹی قائم کی گئی ہے۔ اور اس کے لیے چندہ جمع کرنے کی اپیل کی گئی۔

(ہفت روزہ چٹان 28/ جنوری 1974ء ص15)

اس کو تو شاید معمول کی بات سمجھا جاتا لیکن اس کے ساتھ یہ اعلانات چھپنے لگے کہ مرکزی قادیانی کمیٹی کو ایک ہزار نوجوانوں کی ضرورت ہے۔ اور کالج کے طلبا خاص طور پر اس طرف توجہ کریں۔

(ہفت روزہ چٹان 27/ مئی 1974ء ص17)

اور اس کے ساتھ جماعت کے مخالف جریدے عوام الناس کو احمدیت کے خلاف بھڑکانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے تھے۔ اور یہ سب کچھ کس انداز میں کیا جا رہا تھا اس کا اندازہ اس مثال سے لگایا جا سکتا ہے جیسا کہ پہلے ذکر آچکا ہے کہ

حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ نے آنحضرتؐ کی سنت کی روشنی میں احبابِ جماعت کو تلقین فرمائی تھی کہ وہ گھڑ سواری میں دلچسپی لیں اور پھر صد سالہ جوبلی کے لیے چندہ کی تحریک کی گئی۔ اس پر المنبر نے 8/ مارچ 1974ء کی اشاعت کے سرورق پر یہ اعلان جلی حروف میں شائع کیا۔

”ربوہ میں دس ہزار انعامی گھوڑوں کی فوج ۔۔۔۔۔۔ اور ۔۔۔۔۔۔ نو کروڑ روپیہ کے فنڈ ۔۔۔۔۔۔ کی فراہمی ۔۔۔۔۔۔ کن مقاصد کے لئے؟ ۔۔۔۔۔۔ مزید بر آں ۔۔۔۔۔۔ قادیانی سیاست کا رخ ۔۔۔۔۔۔ اب کس جانب ہے؟ ۔۔۔۔۔۔ اور ہم مسلمان کیا سوچ رہے ہیں؟ ۔۔۔۔۔۔ کیا کر رہے ہیں؟ ۔۔۔۔۔۔ کیا کرنا چاہتے ہیں؟ ۔۔۔۔۔۔ اور ۔۔۔۔۔۔ ہمیں کیا کرنا چاہیئے؟“

شروع ہی سے جماعت کے مخالفین کا یہ طریق رہا ہے کہ جب وہ ملک میں کوئی شورش یا فساد برپا کرنے کی تیاریاں کر رہے ہوں تو یہ واویلا شروع کر دیتے ہیں کہ قادیانی ملک میں فساد پھیلانے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ ورنہ اس دور میں کوئی دس ہزار گھوڑوں کی فوج پال کر کیا کر سکتا ہے، اس کا جواب کسی سے پوشیدہ نہیں۔ جنہوں نے فسادات برپا کرنے ہوں یا بغاوت کا ماحول پیدا کرنا ہو وہ گھوڑے پالنے کا تردد نہیں کرتے۔

یہ بات واضح تھی کہ اب جماعت کے خلاف شورش کی تیاریاں ہو رہی ہیں اور اس مرتبہ تعلیمی اداروں کے طلبا کو بھی اس فساد میں ملوث کیا جائے گا۔

احبابِ جماعت کو صبر سے کام لینے کی تلقین

جیسا کہ ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ 1974ء تک جماعت کے خلاف تیار کی جانے والی عالمی سازش کے آثار افق پر واضح نظر آرہے تھے اور حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ 1973ء کی ہنگامی مجلسِ شوریٰ میں تفصیل سے بیان فرما چکے تھے کہ جماعت کے مخالفین اب کس طرح کی سازش تیار کر رہے ہیں۔ اس پس منظر میں حضور نے 24/ مئی 1974ء کے خطبہ جمعہ میں فرمایا کہ اس دنیا میں انبیاء اور مامورین کا آنا دنیا کی بھلائی اور خیر خواہی کے لیے ہوتا ہے۔ اس لیے منکرین پر گرفت فوراً نہیں ہوتی تا کہ اُن میں سے زیادہ سے زیادہ لوگ ہدایت پا جائیں اور جب عذاب آئے بھی تو سب کے سب ہلاک نہیں ہوتے جو باقی رہ جاتے ہیں ان میں سے بہت سے ہدایت پا کر دین کی تقویت کا باعث بن جاتے ہیں اور اس طرح ایمان لانے والوں کی تربیت کی جاتی ہے اور امتحان لیا جاتا ہے۔ پھر حضور نے جماعت کو مخاطب کر کے فرمایا:۔

”ہماری جماعت اس وقت مہدی اور مسیح علیہ السلام کی جماعت ہے اور وہ احمدی جو یہ سمجھتا ہے کہ ہمیں دکھ نہیں دیئے جائیں گے، ہم پر مصیبتیں نازل نہیں کی جائیں گی۔ ہماری ہلاکت کے سامان نہیں کئے جائیں گے ہمیں ذلیل کرنے کی کوششیں نہیں کی جائیں گی اور آرام (کے) ساتھ ہم آخری غلبہ کو حاصل کر لیں گے وہ غلطی خوردہ ہے اس نے اس سنت کو نہیں پہچانا جو آدم سے لے کر آج تک انسان نے خدا تعالیٰ کی سنت پائی۔ ہمارا کام ہے دعائیں کرنا۔ اللہ تعالیٰ کا یہ کام ہے کہ جس وقت وہ مناسب سمجھے اس وقت وہ اپنے عزیز ہونے کا اپنے قہار ہونے کا جلوہ دکھائے اور کچھ کو ہلاک کر دے اور بہتوں کی ہدایت کے سامان پیدا کر دے۔۔۔۔۔۔

پس ہمارا کام اپنے لئے یہ دعا کرنا ہے کہ جو ہمیں دوسروں کے لیے دعائیں کرنے کے لیے تعلیم دی گئی ہے کہیں ہم اس کو بھول نہ جائیں۔ ہمارا کام غصہ کرنا نہیں۔ ہمارا کام غصہ پینا ہے۔ ہمارا کام انتقام اور بدلہ لینا نہیں، ہمارا کام معاف کرنا ہے۔ ہمارا کام دعائیں کرنا ہے ان کے لئے جو ہمارے اشد ترین مخالف ہیں کیونکہ وہ پہچانتے نہیں اور اللہ تعالیٰ کی رحمت سے محروم ہیں۔“

پھر احباب کو ہر حالت میں غصہ کے ردِ عمل سے بچنے کی تلقین کرتے ہوئے حضور نے فرمایا:۔

”۔۔۔۔۔۔مجھے جو فکر رہتی ہے وہ یہ ہے کہ احبابِ جماعت میں نئے آئے ہوئے بھی ہیں۔ ان کو کہیں اپنے مخالف کے خلاف اس قسم کا غصہ نہ آئے جس کی اجازت ہمیں ہمارے ربّ نے نہیں دی۔ خدا تعالیٰ نے کہا ہے میری خاطر تم ظلم سہو میں آسمانی فرشتوں کو بھیجوں گا تاکہ تمہاری حفاظت کریں۔ اب ظاہر ہے اور موٹی عقل کا آدمی بھی یہ جانتا ہے کہ اگر کسی فرد پر کوئی دوسرا فرد حملہ آور ہو اور جس پر حملہ کیا گیا ہے اس کو اپنے دفاع کے لیے ان دو چار ہتھیاروں میں سے جو میسر ہیں کسی ایک ہتھیار کے منتخب کرنے کا موقع ہو تو عقل کہتی ہے کہ اس کے نزدیک جو سب سے زیادہ مضبوط اور مؤثر ہتھیار ہوگا وہ اسے منتخب کرے گا تو اگر ہماری عقل یہ کہتی ہے کہ ایک مومن کی عقل کو یہ فیصلہ کرنا چاہئے کہ اگر دنیا کے سارے دلائل بھی ہمارے پاس ہوں اور ان کے ساتھ ہم اپنے مخالف کا مقابلہ کریں تو ہماری اس تدبیر میں وہ قوت اور طاقت نہیں جو ان فرشتوں کی تدبیر میں ہے جنہیں اللہ تعالیٰ آسمان سے بھیجے اور کہے کہ میرے بندوں کی حفاظت کرو اور اس کی خاطر مخالفین سے لڑو۔ پس جب یہ بات ہے تو ہماری عقل کہتی ہے کہ ہمیں کمزور ہتھیار سے اپنے مخالف کا مقابلہ نہیں کرنا چاہئے۔ جب ہمیں ایک مضبوط ہتھیار بھی میسر آسکتا ہے اور آرہا ہے تو ہمارے خدا نے ہمیں یہ کہا کہ تمہارا کام ہے دعائیں کرنا اور میرا کام

ہے تم سے قربانیاں لینا تاکہ تم میرے فضلوں کے زیادہ سے زیادہ وارث بن جاؤ اور تمہاری اجتماعی زندگی کی حفاظت کرنا۔ خدا تعالیٰ کا یہ وعدہ ہے اور اس کے بعد ہمیں اپنے غصے نہیں نکالنے چاہئیں۔ تمہارا کام ہے دعائیں کرو۔

گالیاں سن کر دعا دو پاکے دکھ آرام دو۔

جہاں کہیں تمہیں کوئی تکلیف دینے والا ہے وہاں خود سوچو کہ کوئی ایسی صورت نہیں ہو سکتی کہ ہم اس کی کسی تکلیف کو دور کر کے اللہ تعالیٰ کے اس حکم کو ماننے والے ہوں۔"(1)

29/ مئی کا واقعہ

جب خلیفہ وقت کسی بھی معاملہ میں کوئی ہدایت فرمائیں تو بیعت کرنے والوں کا کام ہے کہ اس ارشاد کو غور سے سن کر اس پر بڑی احتیاط سے عمل کریں۔ اگر پوری جماعت میں سے ایک گروہ بھی خواہ وہ گروہ چھوٹا سا گروہ ہی کیوں نہ ہو اس ہدایت پر عمل پیرا ہونے پر کوتاہی کا مظاہرہ کرے تو اس کے سنگین نتائج نکلتے ہیں۔ حضور اقدس نے 24/ مئی 1974ء کے خطبہ جمعہ میں احبابِ جماعت کو یہ تلقین فرمائی تھی کہ ہمارا کام غصہ کرنا نہیں بلکہ غصہ کو ضبط کرنا ہے۔ اور اس خطبہ میں حضور نے یہ بھی فرمایا کہ مجھے جو فکر رہتی ہے وہ یہ ہے کہ احبابِ جماعت میں نئے آئے ہوئے بھی ہیں۔ ان کو کہیں اپنے مخالف کے خلاف غصہ نہ آ جائے۔ جہاں ہمیں کوئی تکلیف دے رہا ہو وہاں ہمیں یہ سوچنا چاہئے کہ ہم اس کی کوئی تکلیف کیسے دور کر سکتے ہیں۔ (2)

اس خطبہ جمعہ سے چند روز قبل 22/ مئی 1974ء کو نشتر میڈیکل کالج کا ایک گروپ چناب ایکسپریس پر ٹرپ پر جاتے ہوئے ربوہ سے گزرا اور ان طلباء نے ربوہ کے پلیٹ فارم پر مرزائیت ٹھاہ کے نعرے لگائے اور پٹری سے پتھر اُٹھا کر پلیٹ فارم پر موجود لوگوں پر اور قریب والی بال کھیلنے والے لڑکوں پر چلائے (3)۔

اس طرح اشتعال دلانے کی کوشش کی گئی لیکن اس وقت کسی تصادم کی نوبت نہیں آئی۔ جب بعد میں اس واقعہ پر ٹریبونل قائم کیا گیا تو یہ شواہد سامنے آئے کہ مئی 1974ء میں نشتر میڈیکل کالج ملتان کے طلباء نے سیر کے لئے راولپنڈی، مری اور سوات جانے کا پروگرام بنایا۔ پہلے یہی پروگرام تھا کہ کالج کی طالبات اور کچھ اساتذہ اپنے اہلِ خانہ کے ہمراہ اس سیر میں شامل ہوں گے۔ اور پروگرام یہ تھا کہ یہ طلباء ریل گاڑی خیبر میل کے ذریعہ جائیں گے۔ یہ امر مدِّ نظر رہے کہ گاڑی خیبر میل ربوہ سے نہیں گزرتی تھی لیکن ریلوے حکام نے ان کی بوگی خیبر میل کے ساتھ لگانے کی بجائے چناب ایکسپریس کے ساتھ لگانے کا فیصلہ کیا جو کہ ربوہ سے ہو کر گزرتی تھی۔ درخواست یہ کی گئی تھی کہ ان طلباء کو دو بوگیاں مہیا کی جائیں اور پہلے پروگرام یہ تھا کہ یہ گروپ سیر کے لئے 18/ مئی 1974ء کو سیر کے لئے روانہ ہو گا۔ لیکن جب 18/ مئی کو نشتر میڈیکل کالج کے طلباء اور طالبات اور ان کے کچھ اساتذہ اپنے اہلِ خانہ کے ہمراہ 18/ مئی کو ملتان کے ریلوے سٹیشن پہنچے تو معلوم ہوا کہ ان کے لئے دو نہیں بلکہ ایک بوگی مخصوص کی گئی ہے۔ اور یہ بوگی اتنے بڑے گروپ کے لئے ناکافی تھی۔ حالانکہ ریزرویشن کے

بارے میں یہ معلومات تو بہت پہلے مل جاتی ہیں لیکن ہوا یہ کہ اس گروپ کو یہ پتہ سٹیشن پہنچ کر چلا کہ ان کے لئے دو نہیں بلکہ ایک بوگی مخصوص کی گئی ہے۔ چنانچہ اس پروگرام کو کچھ دن کے لئے ملتوی کر دیا گیا۔ اور پھر ریلوے حکام نے یہی فیصلہ کیا کہ صرف ایک ہی بوگی مہیا کی جا سکتی ہے اور پھر اس درخواست پر کہ یہ بوگی خیبر میل کے ساتھ لگائی جائے یہی فیصلہ برقرار رکھا کہ یہ بوگی چناب ایکسپریس کے ساتھ لگائی جائے گی۔ چنانچہ جگہ کی قلت کی وجہ سے یہی فیصلہ کیا گیا کہ اب صرف طلباء جائیں گے اور طالبات، اساتذہ اور ان کے اہلِ خانہ اس پروگرام میں شامل نہیں ہوں گے۔ ٹریبونل نے اپنی رپورٹ میں لکھا کہ 22/ مئی کو جب یہ طلباء ریلوے سٹیشن سے گزرے تو کسی نے انہیں جماعت کے اخبار روزنامہ الفضل کی کاپی پیش کی۔ ان طلباء نے احمدیت کے خلاف نعرے لگائے۔ اس رپورٹ میں درج شواہد کے مطابق ان میں سے بعض طلباء نے اپنے کپڑے اتار دیئے اور ان کے جسم پر صرف زیر جامہ ہی رہ گئے اور انہوں نے اس عریاں حالت میں رقص کرنا شروع کیا اور ربوہ کے لوگوں سے حوروں کا مطالبہ کیا۔

لیکن اس اشتعال انگیزی کے باوجود کوئی ہنگامہ نہیں ہوا اور گاڑی ربوہ سے نکل گئی۔ یہاں پر دو باتیں قابلِ ذکر ہیں ایک تو یہ کہ اگر یہ طلباء اپنی درخواست کے مطابق خیبر میل سے جاتے تو یہ گروپ ربوہ سے نہ گزرتا اور اگر ان کے ساتھ ان کے کالج کے اساتذہ اپنے اہلِ خانہ کے ہمراہ اور کالج کی طالبات بھی ہوتیں تو یہ طلباء اس طرز پر اشتعال انگیزی نہ کر سکتے۔ اور یہ ایک حکومتی محکمہ کا فیصلہ تھا کہ انہیں چناب ایکسپریس سے بھجوایا جائے۔ اور دو بوگیاں بھی ریلوے نے مہیا نہیں کیں جن کی وجہ سے ایسی صورت پیدا ہوئی کہ صرف لڑکے ہی اس گروپ میں شامل ہو سکے۔

22/ مئی کے واقعہ کے بعد حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ نے وہ خطبہ ارشاد فرمایا جس کا ذکر ہم کر چکے ہیں اور احبابِ جماعت کو ارشاد فرمایا کہ کسی طرح بھی اشتعال میں نہیں آنا اور صبر کا دامن پکڑے رکھنا ہے اور حضور کا یہ ارشاد صرف خطبہ جمعہ تک محدود نہیں تھا بلکہ حضور اس امر کی اس کے بعد بھی بار بار تلقین فرماتے رہے کہ ہر حال میں صبر کا دامن پکڑے رکھنا ہے۔ چنانچہ صاحبزادہ مرزا مظفر احمد ابن مکرم صاحبزادہ ڈاکٹر مرزا منور احمد صاحب جو حضور کے بھتیجے ہیں بیان کرتے ہیں کہ میں نے 22/ مئی 1974ء کے بعد گھر میں بھی اور ڈیوٹی دیتے ہوئے بھی بار بار حضور سے صبر کی تلقین سنی۔ مجھے الفاظ یاد نہیں ہیں لیکن حضور نے یہ بار بار فرمایا تھا کہ ہم نے ہر صورت میں صبر سے کام لینا ہے اور کوئی سختی نہیں کرنی اور میرے ذہن میں حضور کی یہ ہدایت اتنی پختگی سے گھر کر چکی تھی کہ 29/ مئی کو جب نشتر میڈیکل کالج کے یہ طلباء واپسی پر پھر ربوہ سے گزر

رہے تھے تو میں نے ربوہ کے کچھ نوجوانوں کو سٹیشن جاتے ہوئے دیکھا اور مجھے احساس ہوا کہ انہوں نے حضور کی ہدایت کو سمجھا نہیں اور میں ان کا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا کہ حضور نے ان طلباء کو مارنے سے منع کیا ہے لیکن ایک کے علاوہ باقی نے میری بات پر پوری طرح توجہ نہیں دی۔

جب یہ طلباء 29/ مئی کو واپس ربوہ سے گزرے تو ربوہ کے کچھ جوشیلے نوجوان سٹیشن پر جمع ہو گئے اور نشتر میڈیکل کالج کے طلباء کو مارنا پیٹنا شروع کر دیا۔ ان نوجوانوں کا یہ فعل یقیناً جماعت احمدیہ کی تعلیمات اور ملکی قانون کے خلاف تھا اور اس کے علاوہ حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ کی واضح ہدایات کے بھی خلاف تھا لیکن وقت گزرنے کے ساتھ کچھ عقل کا مظاہرہ بھی ہونے لگا اور گاڑی چلنے سے قبل ربوہ کے نوجوانوں نے نشتر میڈیکل کالج کے طلباء کو قریب واقعہ رحمت بازار سے مشروب منگوا کر پلایا اور ربوہ کے بعض لڑکے جو کہ حضور کی ہدایات سے واقف تھے نشتر میڈیکل کالج کے طلباء پر گر کر انہیں مارنے والوں کی ضربوں سے بچانے لگے (4)۔ اور اس واقعہ کی وجہ سے دو گھنٹے ٹرین وہاں پر رکی رہی اور جب سٹیشن ماسٹر صاحب نے جو کہ احمدی تھے گاڑی کو چلانے کا حکم دیا تو معلوم ہوا کہ گاڑی کا ویکیوم نکل گیا ہے اور گاڑی چل نہیں سکتی اور پھر اس کو ٹھیک کرنے میں بھی دیر لگی۔

فسادات کا آغاز

جیسا کہ اس صورتِ حال میں ہونا ہی تھا چند دنوں میں ہی، منظم طریق پر پورے ملک میں فسادات کی آگ بھڑکا دی گئی بلکہ اسی روز ہی مولویوں نے پورے ملک میں فسادات کی آگ بھڑکانے کی کوششیں شروع کر دیں۔ یہ ناخوشگوار واقعہ تو بہر حال ہوا تھا اور جیسا کہ ہم بعد میں اس سلسلہ میں حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ کے ارشادات پیش کریں گے۔ اس واقعہ کو بہت بڑھا چڑھا کر پیش کیا جا رہا تھا اور ایک منظم طریق کے ذریعہ اس کی تشہیر کی جا رہی تھی اور اس کو بنیاد بنا کر پورے ملک میں فسادات برپا کئے جا رہے تھے۔ یہ حقیقت ہے کہ اس واقعہ میں کوئی جانی نقصان نہیں ہوا تھا۔ کسی مضروب کی ہڈی نہیں ٹوٹی تھی۔ کسی مضروب کی چوٹ کو قانون کی رو سے Grievous injury نہیں کہا جا سکتا تھا لیکن فسادات کو ہوا دینے کے لئے ایک طرف تو بعض اخبارات اور جرائد لکھ رہے تھے کہ نشتر میڈیکل کالج کے کئی طلباء کی حالت نازک تھی اور دوسری طرف یہی جرائد لکھ رہے تھے کہ جب یہ طلباء لائلپور پہنچے تو ان کو پلیٹ فارم پر ابتدائی طبی امداد دی گئی۔ اور سرکاری اہلکاروں نے انہیں کہا کہ وہ لائلپور کے ہسپتال میں آ کر علاج کروا سکتے ہیں تو ان طلباء نے کہا کہ وہ ملتان میں اپنے ہسپتال جا کر علاج کرائیں گے (5)۔

یہ کہنے والے طب کے پیشہ سے منسلک تھے اور یقیناً جانتے تھے کہ شدید زخمی کے لیے علاج میں چار گھنٹے بلکہ اس سے بھی زیادہ کی یہ تاخیر جان لیوا بھی ہو سکتی ہے لیکن اس کے باوجود انہوں نے لائلپور کے ہسپتال میں علاج کے لیے جانا پسند نہیں کیا حالانکہ یہ ہسپتال ریلوے سٹیشن کے بالکل قریب واقع ہے۔ اس سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ ان طلباء میں سے کوئی بھی شدید زخمی نہیں تھا۔ ان میں سے علاج کے لیے کوئی لائلپور کے ہسپتال تو نہیں گیا لیکن اسی وقت ان میں سے کچھ زخمی طلباء لائلپور کے تعلیمی اداروں میں پہنچ گئے اور وہاں طلباء کو جلوس نکالنے پر آمادہ کرنا شروع کر دیا۔

اخبارات اور رسائل میں جو خبریں آ رہی تھیں ان میں بھی عجیب تضاد پایا جا رہا تھا۔ مثلاً جماعت کے اشد مخالف جریدے چٹان نے جو خبر شائع کی اس میں لکھا کہ ربوہ سٹیشن پر پانچ چھ سو گرانڈیل قادیانیوں نے نشتر کالج کے طلباء پر حملہ کیا۔ بلکہ اپنی سرخی میں لکھا کہ ”نشتر میڈیکل کالج کے ایک سو طلباء پر ربوہ میں قادیانی کتوں کا حملہ (5)“۔ دوسری طرف اخبار

نوائے وقت نے اسی واقعہ کی رپورٹ کرتے ہوئے لکھا کہ حملہ کرنے والے قادیانیوں کی تعداد پانچ ہزار تھی۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ رپورٹنگ حقائق پر بنیاد رکھنے کی بجائے اندازوں اور مبالغوں کی بنا پر کی جارہی تھی۔ (6)

اس واقعہ کی اطلاع ملتے ہی ایس پی اور ڈی آئی جی پولیس ربوہ پہنچ گئے (8,7)۔ اسی رات ربوہ میں پولیس نے گرفتاریاں شروع کر دیں اور ستر سے زائد احباب کو گرفتار کیا گیا۔ کئی ایسے نوجوانوں کو گرفتار کیا گیا جو اس واقعہ میں ملوث تھے لیکن کئی اور ایسے راہ چلتے احباب کو بھی گرفتار کر لیا گیا جن کا اس واقعہ سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ مقصد صرف گنتی کو پورا کرنا تھا۔ ایک مرحلہ پر پولیس والے تعلیم الاسلام کالج پہنچ گئے اور پرنسپل صاحب سے کہا کہ ہمیں یہاں حکومت کی طرف سے سو ڈیڑھ سو لڑکا گرفتار کرنے کا حکم ہے۔ پرنسپل صاحب نے کہا کہ جس وقت یہ واقعہ ہوا کالج کے جو طلبا کالج میں موجود تھے، وہ بے قصور ہیں انہیں کس جرم کی بنا پر آپ کے حوالے کیا جائے لیکن وہ مصر رہے اور کالج کے لڑکوں کو ہراساں کیا گیا ہاسٹل کا گھیراؤ کر لیا گیا لیکن پھر کالج سے وسیع پیمانے پر گرفتاریوں کا ارادہ ترک کر دیا۔ حضرت خلیفۃ المسیح الثالث سٹیشن کے واقعہ کے وقت ربوہ سے باہر اپنے فارم نصرت آباد تشریف لے گئے تھے، آپ اسی روز واپس ربوہ تشریف لے آئے۔

یہاں ایک اور بات کا ذکر بے جا نہ ہو گا۔ ہم سے انٹرویو میں صاحبزادہ فاروق علی خان صاحب نے کہا کہ میں نے کابینہ کے سامنے حنیف رامے سے پوچھا کہ واپسی پر نشتر میڈیکل کالج کے طلباء کی بوگی دوسرے راستے سے بھی آ سکتی تھی۔ پھر انہوں نے کہا کہ بھٹو صاحب نے کہا کہ مجھے اب تک پتا نہیں چلا کہ رامے کس کے ساتھ ہے۔ بعد میں رسالہ چٹان کے ایڈیٹر شورش کاشمیری صاحب نے تحقیقاتی ٹریبونل کے روبرو بیان دیا کہ جب 29 / مئی کو ربوہ کے سٹیشن پر واقعہ ہوا ہے اس رات وزیر اعظم بھٹو کے سیکریٹری مسٹر افضل سعید نے فون کیا کہ بعض بیرونی طاقتیں پاکستان کے ٹکڑے ٹکڑے کرنا چاہتی ہیں ہم سب کو چاہئے کہ ہم داخلی امن برقرار رکھیں اور اس کے ساتھ شورش کاشمیری صاحب نے یہ الزام بھی لگایا کہ قادیانی وزیر اعظم کو قتل کرنے کی سازش کرتے رہے ہیں اور ان کا ارادہ ہے کہ وہ فسادات سے فائدہ اُٹھا کر ملک میں اپنا اقتدار قائم کر لیں۔

(امروز یکم اگست 1974ء ص اوّل و آخر)

شروع ہی سے اس بات کے آثار ظاہر ہو گئے تھے کہ ملک گیر فسادات شروع کئے جارہے ہیں اور جس فتنہ کی تمہید کچھ سالوں سے باندھی جارہی تھی اس کی آگ کو منظم طور پر اور حکومت کی آشیرباد کے ساتھ بھڑکایا جارہا ہے۔ حضور نے چند احباب کو پرائیویٹ سیکریٹری کے دفتر میں طلب فرمایا اور حضور کی نگرانی میں ایک سیل نے مرکز میں کام شروع کر دیا۔ ہر

طرف سے فسادات کی اور احمدیوں پر ان کے گھروں، مساجد اور دوکانوں پر حملہ کی خبریں آرہی تھیں۔ جو اطلاع ملتی پہلے حضور اقدس اسے خود ملاحظہ فرماتے اور پھر قصرِ خلافت میں ایک گروپ جو مکرم چوہدری حمید اللہ صاحب کی زیر نگرانی کام کر رہا تھا، وہ اس اطلاع کے مطابق متاثرہ احمدی دوستوں کی مدد کے لئے اقدامات اُٹھاتا اور ان کی خیریت معلوم کرنے کے لیے رضاکار روانہ کیے جاتے۔ اس کام کے لیے ضلع سرگودھا سے تعلق رکھنے والے رضاکار خدمات سرانجام دے رہے تھے۔ اس دور میں شہر سے باہر فون ملانا بھی ایک نہایت مشکل امر تھا۔ پہلے کال بک کرائی جاتی اور پھر گھنٹوں اس کے ملنے یا نہ ملنے کا انتظار کرنا پڑتا اور اس سے بڑھ کر مسئلہ یہ تھا کہ مرکزِ سلسلہ کی تمام فون کالیں ریکارڈ کر کے ان کے ریکارڈ کو حکومت کے حوالے کیا جا رہا تھا۔ اس لیے جماعتوں سے رابطہ کی یہی صورت تھی کہ ان کی خیریت دریافت کرنے کے لیے آدمی بھجوائے جائیں۔ مرکز میں کام کرنے والا یہ سیل اس بات کا اہتمام کر رہا تھا کہ ہر واقعہ کی اطلاع وزیر اعظم اور دیگر حکومتی عہدے داروں کو باقاعدگی سے دی جائے۔ اس سیل میں مکرم چوہدری حمید اللہ صاحب، مکرم چوہدری ظہور احمد صاحب باجوہ ناظر امورِ عامہ، مکرم صاحبزادہ مرزا خورشید احمد صاحب اور مکرم صاحبزادہ مرزا غلام احمد صاحب کام کر رہے تھے۔ جب ان فسادات کا آغاز ہوا تو کام کا دباؤ اتنا تھا کہ حضور اقدس اور ان کے ساتھ کام کرنے والے رفقاء کو کچھ راتیں چند لمحے بھی سونے کا وقت نہیں مل سکا اور کچھ روز مسلسل جاگ کر کام کرنا پڑا۔

بیرونِ پاکستان کی جماعتوں کو بھی حالات سے مطلع رکھنا ضروری تھا اور یہ بھی ضروری تھا کہ احمدیوں پر ہونے والے مظالم سے عالمی پریس اندھیرے میں نہ رہے۔ حکومتِ پاکستان اور جماعت کے مخالف حلقوں کی یہ بھرپور کوشش تھی کہ پوری دنیا کو اندھیرے میں رکھا جائے۔ حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ نے لندن مشن کے سپرد یہ کام کیا کہ وہ پوری دنیا کی جماعتوں کو پاکستان میں ہونے والے واقعات سے باخبر رکھے۔ چنانچہ فسادات کے دوران ہفتہ میں دو مرتبہ پاکستان سے لندن اطلاعات بھجوائی جاتی تھیں۔ لندن سے تمام جماعتوں کو حالات سے مطلع رکھا جاتا۔ حضرت چوہدری سر محمد ظفر اللہ خان صاحب نے لندن میں ایک پریس کانفرنس بلوائی۔ اس پریس کانفرنس میں عالمی پریس کے نمائندے شریک ہوئے۔ اس طرح حقیقتِ حال عالمی پریس تک پہنچ گئی۔ یہ بات پاکستان کے سفارت خانہ کو سیخ پا کرنے کے لئے کافی تھی۔ پاکستان کے سفارت خانہ کے ایک افسر نے لندن مشن کے انچارج کو ملاقات کے لیے بلایا اور اس بات پر بہت برہمی کا اظہار کیا اور کہا کہ یہ سلسلہ فوراً بند ہونا چاہئے۔ انہیں جواب دیا گیا کہ پاکستان میں احمدیوں پر مظالم کا سلسلہ بند کر دیا جائے تو یہ سلسلہ بھی بند کر دیا جائے گا۔ (9)

اگلے روز ہی پنجاب کے مختلف مقامات پر فسادات کی آگ بھڑک اُٹھی۔ اور 30 مئی کو چنیوٹ، چک جھمرہ، لائلپور، گوجرہ، مانانوالا، شور کوٹ، خانیوال، ملتان، بہاولپور، صادق آباد، ضلع ساہیوال، ڈنگا، راولپنڈی، اسلام آباد، کوہاٹ، ڈیرہ اسماعیل خان اور سرگودہا میں فسادات ہوئے جن کے دوران احمدیوں کے گھروں اور دوکانوں پر حملے ہوئے اور انہیں نذرِ آتش کیا گیا اور لوٹا گیا۔ ان کی مساجد کو نقصان پہنچایا گیا۔ ان پر پتھراؤ کیا گیا۔ ان کی کاروباری املاک کو آگ لگائی گئی، تعلیمی اداروں میں احمدی طلباء کی املاک اور کتب کو نذرِ آتش کیا گیا، احمدیوں کو مختلف مقامات پر زدوکوب کیا گیا۔ بعض مقامات پر مفسدین نے جماعتی لائبریری کی دیگر کتب کے علاوہ قرآنِ کریم کے بہت سے نسخے بھی شہید کئے۔ جب احمدیوں پر حملے ہو رہے تھے تو پولیس خاموش تماشائی بنی رہی لیکن مزید ظلم یہ کیا کہ ڈیرہ اسماعیل خان اور سرگودہا میں مفسدین کو قابو کرنے کی بجائے کچھ احمدیوں کو گرفتار کر لیا۔

سٹیشن والے واقعہ کے اگلے دن ہی پنجاب اسمبلی میں اس پر بحث شروع ہو گئی۔ اور اس بحث میں حکومتی پارٹی کے اراکین جماعت کی مخالفت میں پیش پیش تھے اور اس بات کا اظہار کر رہے تھے کہ ہم ناموسِ رسالت پر اپنا سب کچھ قربان کر دیں گے۔ حالانکہ یہاں پر ناموسِ رسالت کا کوئی سوال نہیں تھا، ایک بَلوہ کے واقعہ پر بات ہو رہی تھی۔ یہ بات قابلِ غور ہے کہ ایک بَلوہ کا واقعہ ہوا تھا یقیناً حکومت کا حق تھا کہ وہ قصوروار افراد کے خلاف قانونی کاروائی کرتی لیکن اس کا مذہبی عقائد سے کوئی تعلق نہیں تھا اور نہ ہی دنیا میں ایسا کہیں ہوتا ہے کہ اگر کوئی قانون شکنی کا مرتکب ہو تو اسمبلی میں اس کے مذہبی خیالات پر زور و شور سے بحث شروع ہو جائے۔ حکومتی پارٹی کے اراکین اس مسئلہ کو مذہبی رنگ دینے میں پیش پیش تھے۔ پیپلز پارٹی کے ایک رکنِ اسمبلی نے صاف الفاظ میں احمدیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کا مطالبہ کیا اور اس بات کی طرف اشارہ کیا کہ احمدی بہت سے کلیدی عہدوں پر فائز ہیں۔ پیپلز پارٹی کا نعرہ تھا، اسلام ہمارا مذہب ہے، جمہوریت ہماری سیاست ہے اور سوشلزم ہماری معیشت ہے۔ ایک حکومتی رکنِ اسمبلی، سابق کرکٹ کیپٹن حفیظ کاردار صاحب نے اپنی تقریر میں کہا کہ ہمارا تو منشور ہی یہ ہے کہ اسلام ہمارا دین ہے۔ اس کے بعد ایک اور رکنِ اسمبلی نے کہا کہ ہمارے منشور میں سوشلزم بھی شامل ہے اس پر ایوان میں شور مچ گیا کہ غیر متعلقہ بات شروع کر دی گئی ہے، موضوع پر بات کی جائے۔ وزیر اعلیٰ، حنیف رامے صاحب نے بھی ختمِ نبوت پر ایمان کا ذکر کیا اور کہا کہ وہ اپنے آپ کو اپنے خاندان کو اور اپنی جائیداد کو ناموسِ رسالت پر قربان کرنے کے لیے تیار ہیں۔ اس کے ساتھ انہوں نے کہا کہ 1953ء میں مارشل لاء کی مثال قائم ہوئی تھی اور اب بعض

قوتیں مارشل لاء لگانا چاہتی ہیں لیکن جمہوریت کا کارواں چلتا رہے گا۔ پھر وزیر اعلیٰ نے اس بات کا اعلان کیا کہ جسٹس صمدانی کو ربوہ سٹیشن کے واقعہ کی تحقیقات کے لئے مقرر کیا جا رہا ہے (10)۔

پنجاب اسمبلی میں حکمران پیپلز پارٹی کے اراکین جس قسم کے بیانات دے رہے تھے ان سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ خود حکومت اس بات کی کوشش کر رہی ہے کہ عوام کے مذہبی جذبات بھڑکیں اور فسادات زور پکڑ جائیں۔ یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ اس دور میں پیپلز پارٹی کا کوئی رکن اسمبلی وزیر اعظم بھٹو صاحب کے منشاء کے بغیر اس نوعیت کی بیان بازی کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔

اس پس منظر میں حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ نے 31/ مئی کے خطبہ جمعہ کے آغاز میں سورۃ محمد کی یہ آیت تلاوت فرمائی۔

یٰاَیُّھَاالَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَلَا تُبْطِلُوْٓا اَعْمَالَکُمْ۔

۔۔۔۔وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ وَاللّٰہُ مَعَکُمْ وَلَنْ یَّتِرَکُمْ اَعْمَالَکُمْ (محمد:36,3)

ترجمہ: اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور اپنے اعمال کو باطل نہ کرو۔

۔۔۔۔۔تم ہی غالب آنے والے ہو اور اللہ تمہارے ساتھ ہے اور وہ ہرگز تمہیں تمہارے اعمال (کا بدلہ) کم نہیں دے گا۔

ان آیات کی تلاوت کے بعد حضورؒ نے فرمایا:۔

"اُمّتِ مسلمہ کو ان آیات میں ان بنیادی صداقتوں سے متعارف کرایا گیا ہے۔ ایک تو یہ کہ اگر امتِ مسلمہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت سے عملاً باہر نکلنے کی کوشش کرے تو ان کے اعمال کا موعود نتیجہ نہیں نکلے گا اور ان کے اعمال باطل ہو جائیں گے اور دوسرے یہ کہ دنیا جتنا چاہے زور لگا لے وہ امتِ مسلمہ پر، اگر وہ امت اسلام پر حقیقی معنی میں قائم ہو کبھی غالب نہیں آسکتی۔ علو اور غلبہ امتِ مسلمہ کے ہی مقدر میں ہے اور اس کی وجہ یہ ہے فرمایا وَاللّٰہُ مَعَکُمْ کہ ان کا ایک حقیقی تعلق اللہ تعالیٰ سے ہوتا ہے۔۔۔۔۔"

پھر حضور نے فرمایا:۔

”ہمیں سختی سے اس بات کی تاکید کی گئی تھی کہ گالیوں کا جواب دعاؤں سے دینا اور جب کسی کی طرف سے دکھ دیا جائے تو اس کا جواب اس رنگ میں ہو کہ اس کے لئے سکھ کا سامان پیدا کیا جائے۔ اسی لئے پچھلے جمعہ کے موقع پر بھی میں نے ایک رنگ میں جماعت کو خصوصاً جماعت کے نوجوانوں کو یہ نصیحت کی تھی کہ یہ تمہارا مقام ہے اسے سمجھو اور کسی کے لئے دکھ کا باعث نہ بنو اور دنگا فساد میں شامل نہ ہو اور جو کچھ خدا نے تمہیں دیا ہے وہ تمہارے لیے تسکین کا بھی باعث ہے، ترقیات کا بھی باعث ہے۔ وہ ہے صبر اور دعا کے ساتھ اپنی اپنی زندگی کے لمحات گزارنا۔ صبر اور دعا کے ساتھ اپنی زندگی کے لمحات گزارو مگر اہلِ ربوہ میں سے چند ایک نے اس نصیحت کو غور سے سنا نہیں اور اس پر عمل نہیں کیا اور جو فساد کے حالات جان بوجھ کر اور جیسا کہ قرائن بتاتے ہیں بڑی سوچی سمجھی سکیم اور منصوبہ کے ماتحت بنائے گئے تھے اس کو سمجھے بغیر جوش میں آکر وہ فساد کی کیفیت جس کے پیدا کرنے کی کوشش کی گئی تھی مخالفت کی اس تدبیر کو کامیاب بنانے میں حصہ دار بن گئے اور فساد کا موجب ہوئے۔

29 / مئی کو سٹیشن پر یہ واقعہ ہوا۔ اس وقت اس واقعہ کی دو شکلیں دنیا کے سامنے آتی ہیں۔ ایک وہ جو انتہائی غلط اور باطل شکل ہے مثلاً ایک روزنامہ نے لکھا کہ پانچ ہزار نے حملہ کر دیا۔ مثلاً یہ کہ سوچی سمجھی سکیم کے ماتحت ایسا کیا گیا وغیرہ وغیرہ۔ یہ بالکل غلط ہے اس میں شک نہیں لیکن دوسری شکل یہ ہے کہ کچھ آدمیوں نے بہر حال اپنے مقام سے گر کر اور خدا اور رسول کی اطاعت کو چھوڑتے ہوئے فساد کا جو منصوبہ دشمنوں کی طرف سے بنایا گیا تھا اسے کامیاب کرنے میں شامل ہو گئے۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا اور چونکہ ایسا ہوا اور اگر دشمن کو آپ کے دس آدمی ایک ہزار نظر آتے ہیں تو اس سے آپ کی براءت نہیں ہوتی یہ تو اللہ تعالیٰ کی شان ہے لیکن آپ کی براءت اس سے نہیں ہوتی جتنے بھی اس جھگڑے میں شامل ہوئے انہوں نے غلطی کی اور سوائے نفرت اور مذمت کے اظہار کے ان کے اس فعل کے خلاف ہم کچھ نہیں کر سکتے نہ امام جماعت احمدیہ اور نہ جماعتِ احمدیہ۔ اس لئے انہوں نے تو غلطی کی اور چونکہ وہ دشمن کی سوچی سمجھی تدبیر تھی اور ایک نہایت بھیانک منصوبہ ملک کو خراب اور تباہ کرنے کے لیے بنایا گیا تھا اب اس میں آپ کا ایک حصہ شامل ہو گیا اور اب ملک کے ایک حصہ میں آگ لگی ہوئی ہے اور اس آگ کو اس رنگ میں ہوا دی جا رہی ہے کہ یہ شدت اختیار کرے گی۔ یہ آگ جہاں لگی ہے وہاں 1953ء کی آگ سے زیادہ شدید طور پر لگی ہوئی ہے۔ اُس وقت حکومتِ وقت زیادہ تدبر اور زیادہ انصاف سے کام لے رہی

تھی۔ اس وقت جو رپورٹیں آرہی ہیں اگر وہ درست ہیں تو ان سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ حکومتِ وقت نہ تدبر سے کام لے رہی ہے نہ انصاف سے کام لے رہی ہے۔۔۔۔۔۔

میں حقیقت بیان کرنے کے لیے یہ کہتا ہوں ورنہ میرا یہ کام نہیں تھا کہ میں یہ بتاؤں کہ ان کو کیا کرنا چاہئے۔ جو سیاستدان ہیں ان کو اپنا مفاد خود سمجھنا چاہئے۔ اگر نہیں سمجھیں گے تو دنیا میں حکومتیں آتی بھی ہیں جاتی بھی ہیں۔ میری اس سے کوئی غرض نہیں میں تو مذہبی آدمی ہوں۔

نصیحت کرنا میرا کام ہے ان کو بھی ایک رنگ میں نصیحت کر دی، سمجھنا نہ سمجھنا ان کا کام ہے لیکن اصل چیز میں آپ کے سامنے اوّل یہ لانا چاہتا ہوں کہ جنہوں نے بھی غلطی کی، غلطی کی ہے اور ہمیں اس چیز کو تسلیم کرنا چاہئے۔ دوسرے یہ کہ صرف انہوں نے غلطی نہیں کی بلکہ انہوں نے اپنی ناسمجھی کے نتیجہ میں دشمن کے ایک سوچے سمجھے منصوبہ میں شمولیت کی اور جماعت کے لیے بھی پریشانی کے سامان پیدا کرنے کے موجب بنے اور ملک کے لیے بھی کمزوری کا سامان پیدا کرنے کے موجب بنے۔ میں سمجھتا ہوں اور میں انہیں یہ نصیحت کرنا چاہتا ہوں کہ وہ کم از کم دس ہزار مرتبہ استغفار کریں اور توبہ کریں اور اللہ تعالیٰ سے اپنے گناہ کی معافی مانگیں۔ جو بھی اس معاملہ میں شامل ہوئے ہیں۔ مجھے ان کا علم نہیں لیکن جو بھی شامل ہوئے ہیں وہ کم از کم دس ہزار مرتبہ استغفار کریں اور خدا تعالیٰ کے حضور عاجزانہ جھکیں اور اپنی بھلائی کے لئے اور خود کو اللہ تعالیٰ کی ناراضگی سے بچانے کے لئے دس ہزار مرتبہ اس سے معافی مانگیں اور اس کے حضور عاجزانہ جھکے رہیں جب تک اللہ تعالیٰ انہیں معاف نہ کر دے۔“

(خطباتِ ناصر جلد 5 ص534 تا 536)

31 / مئی کو بھی حکومت نے حالات پر قابو پانے کے لیے کوئی خاص قدم نہیں اُٹھایا۔ خاص طور پر صوبہ پنجاب میں مولوی لوگوں کو احمدیوں پر، ان کے گھروں، ان کی مساجد اور ان کی دوکانوں پر حملے کرنے کے لیے اکسا رہے تھے۔ جن مقامات کا ذکر آچکا ہے ان میں تو فسادات جاری تھے۔ ان کے علاوہ اس روز ماموں کانجن، کمالیہ، بھیرہ، دنیا پور، عارفوالہ، بہاولنگر، خانپور ضلع رحیم یار خان، سانگرہ، سانگلہ ہل، حافظ آباد، مریدکے، گوجرانوالہ، منڈی بہاؤالدین، مری، کیمبل پور اور مظفر آباد بھی فسادات کی لپیٹ میں آگئے۔ اسی روز ان فسادات نے پنجاب کی حدود سے نکل کر دوسرے صوبوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ چنانچہ صوبہ سندھ میں سکھر میں اور سرحد میں پشاور میں بھی فسادات شروع ہو گئے۔ احمدیوں پر ہر طرح کے

وحشیانہ مظالم کئے جارہے تھے۔ ان پر ارتداد کے لیے دباؤ ڈالا جارہا تھا لیکن حکومت اگر کچھ کر رہی تھی تو احمدیوں کو ہی گرفتار کر رہی تھی تا کہ ان کی قوت مدافعت دم توڑ دے۔ اس روز بھی مفسدین پر گرفت کرنے کی بجائے گوجرانوالہ میں ان بارہ خدام کو گرفتار کر لیا گیا جو اپنی مسجد کی حفاظت کے لیے ڈیوٹی دے رہے تھے اور کیمبلپور میں احمدیوں کو پولیس نے حکم دیا کہ وہ اپنے گھروں تک محدود رہیں۔

وزیر اعلیٰ پنجاب نے 30 / مئی کو پنجاب اسمبلی میں یہ اعلان کیا کہ ربوہ کے واقعہ کی ہائی کورٹ کے جج سے تحقیقات کرائی جائیں گی اور انہوں نے اسمبلی کو مطلع کیا کہ ربوہ سے اکہتر افراد کو گرفتار کیا جاچکا ہے اور جرم ثابت ہونے پر سخت سزا دی جائے گی۔ (11)

صمدانی ٹریبیونل کی کارروائی شروع ہوتی ہے

ہائی کورٹ کے جج جسٹس صمدانی نے جنہیں اس واقعہ کی تحقیقات کے لئے مقرر کیا گیا تھا اسی روز لاہور میں ابتدائی کام شروع کر دیا۔ یہاں ایک امر قابلِ ذکر ہے کہ ایک عدالتی کمیشن 1953ء میں بھی قائم کیا گیا تھا لیکن اس کے سپرد یہ کام تھا کہ وہ 1953ء کے فسادات کے تمام پہلوؤں پر تحقیق کر کے رپورٹ مرتب کرے اور اس کے دائرہ کار میں احمدیوں پر ہونے والے مظالم پر تحقیق کرنا بھی آتا تھا اور احمدیوں پر ہونے والے مظالم کے متعلق تحقیق کر کے اس کے بارے میں بھی مواد رپورٹ میں شامل کیا گیا تھا لیکن کمیشن کے سپرد صرف یہ کام تھا کہ وہ ربوہ کے سٹیشن پر ہونے والے واقعہ پر تحقیق کرے۔ حالانکہ جب اس کمیشن نے کام شروع کیا تو پورے ملک میں احمدیوں پر ہر قسم کے مظالم کئے جا رہے تھے۔ ان کی املاک کو لوٹا جا رہا تھا ان کے گھروں کو نذرِ آتش کیا جا رہا تھا، ان کو شہید کیا جا رہا تھا لیکن ان سب واقعات پر کبھی تحقیقات نہیں کی گئیں ان کے بارے میں حقائق کبھی قوم کے سامنے نہیں لائے گئے۔ جب جسٹس صمدانی سے یہ سوال کیا گیا کہ ان کے کمیشن کا کام صرف سٹیشن والے واقعہ تک محدود کیوں رکھا گیا؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ یہ تو گورنمنٹ کا کام تھا جو کام گورنمنٹ نے کیا ہے میں اس کے متعلق جوابدہ نہیں ہوں۔ جو کچھ میں نے کیا ہے اس کے متعلق اگر سوال پوچھیں تو جواب دے سکوں گا۔

جب صمدانی ٹریبونل میں گواہوں کے پیش ہونے کا عمل شروع ہوا تو یہ بات جلد ہی سامنے آگئی کہ ایک طبقہ اس واقعہ کی تفصیلات کو بہت مبالغہ کر کے اور اس میں جھوٹ ملا کر پیش کر رہا ہے تا کہ یہ ثابت کیا جا سکے کہ یہ واقعہ خود احمدیوں نے ہی کرایا تھا تا کہ ملک گیر فسادات شروع کرائے جا سکیں اور اس کی آڑ میں احمدی پاکستان کی حکومت پر قبضہ کر سکیں۔ حقائق کا ادنیٰ سا بھی علم رکھنے والا اس الزام کو مضحکہ خیز ہی سمجھے گا لیکن اس وقت ٹریبونل میں یہ الزام بڑے شدّ و مدّ سے پیش کیا جا رہا تھا۔

(مشرق 22 جون 1974ء ص 1)

ایک گواہ تو اس حد تک آگے چلے گئے کہ انہوں نے ٹریبونل کے روبرو جماعتِ احمدیہ پر یہ الزام لگا دیا کہ یہ فسادات احمدیوں نے خود ہی شروع کرائے ہیں تا کہ ملک میں بدامنی پھیل جائے اور اس سے فائدہ اُٹھا کر احمدی جرنیل اقتدار پر قبضہ کر

لیں اور ساتھ یہ شوشہ چھوڑا کہ جنرل ٹکا خان صاحب کے بعد جو کہ اس وقت پاکستانی برّی افواج کے سربراہ تھے چار سینیئر جرنیل قادیانی ہیں۔ یہ بات بھی بالکل خلافِ واقعہ تھی اور اگر ٹربیونل چاہتا تو اس دعویٰ کو آسانی سے چیک کیا جا سکتا تھا اور محض ایک سوال کر کے یہ ظاہر کیا جا سکتا تھا کہ محض جھوٹا الزام لگا کر عوام کو بھڑکایا جا رہا ہے لیکن ایسا نہیں کیا گیا۔ اگر حکومت خود چاہتی تو اس بات کی تردید کر سکتی تھی کہ یہ چار فرضی سینیئر قادیانی جنرل موجود نہیں ہیں لیکن حکومت نے بھی ایسا نہیں کیا۔ اگر اخبارات حقائق شائع کرنا چاہتے تو چار سینیئر جرنیلوں کے نام شائع کر کے یہ ظاہر کر سکتے تھے کہ یہ احمدی نہیں ہیں اس لئے اس فرضی سازش کا الزام مضحکہ خیز ہے لیکن اخبارات نے یہ نامعقول الزام تو شائع کیا مگر حقائق شائع نہیں کئے۔ اس سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ یہ سب کچھ ایک بھونڈے ڈرامے سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا تھا اور ایک طرف تو یہ سٹوڈنٹ لیڈر یہ الزام لگا رہے تھے اور دوسری طرف یہ اعتراف بھی کر رہے تھے کہ جس جلسے سے میں نے خطاب کیا تھا اس میں مقررین نے یہ اعلان کیا تھا کہ اگر قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت نہ قرار دیا گیا تو پنجاب کے کسی تعلیمی ادارے میں طلباء کو داخل نہیں ہونے دیا جائے گا۔ (مشرق 20 جون 1974ء ص 1) اس وقت جو ملک میں حالات پیدا کئے جا رہے تھے ان میں کسی نے یہ سوچنے کی زحمت گوارا نہیں کی کہ آخر وہ کون سے سینیئر جرنیل ہیں جو کہ عقیدہ کے اعتبار سے احمدی ہیں۔ نہ یہ سوال عدالت میں کیا گیا اور نہ ان اخبارات میں جہاں ان الزامات کو سرخیوں کے ساتھ صفحہ اوّل پہ شائع کیا جا رہا تھا یہ سوال اٹھایا گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ جب احمدیت کے مخالفین کسی خلافِ قانون سرگرمی کی منصوبہ بندی کر رہے ہوں تو وہ یہ واویلا شروع کر دیتے ہیں کہ احمدی اس بات کی منصوبہ بندی کر رہے ہیں اور یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ جب چند سال کے بعد ایک جرنیل نے اقتدار پر قبضہ کیا تو ان کا تعلق جماعتِ احمدیہ سے نہیں تھا بلکہ ان کا شمار احمدیت کے اشد ترین مخالفین میں سے ہوتا تھا۔ جب ہم نے جسٹس صمدانی صاحب سے اس الزام کے متعلق دریافت کیا تو انہوں نے فرمایا کہ جہاں تک مجھے یاد ہے اس بات پر کوئی توجہ نہیں کی گئی تھی۔ جسٹس صمدانی صاحب کی یہ بات تو درست ہے کہ اس بات پر شاید ٹربیونل نے کوئی توجہ نہیں کی تھی لیکن یہ جھوٹے الزامات لگا کر اور انہیں نمایاں کر کے شائع کر کے ملک میں احمدیوں کے خلاف فسادات تو بھڑکائے جا رہے تھے۔ ایک اور صاحب نے تو ایک روز ٹربیونل کے روبرو یہ بیان بھی دیا کہ حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمد خلیفۃ المسیح الثانی نے یہ اعلان کیا تھا کہ خدام الاحمدیہ اسلام کی فوج ہے اور ہم بہت جلد اقتدار میں آنے والے ہیں (مشرق 27 جون 1974ء ص 1)۔

اس قسم کے رویہ کے متعلق ہمارے ساتھ انٹرویو میں جسٹس صمدانی صاحب نے فرمایا کہ چند گواہوں کی کوشش تھی کہ ٹریبونل کو احمدیوں کے خلاف متعصب کر دیا جائے لیکن میں متعصب نہیں ہوا۔

حکومت کی طرف سے اس موقع پر فرقہ وارانہ خبروں کی اشاعت پر پابندی لگائی گئی اور جب صوبائی اسمبلی میں اس قدم کے خلاف تحاریکِ التوا پیش ہوئیں تو سپیکر نے انہیں خلاف ضابطہ قرار دے دیا۔ لیکن بڑی احتیاط سے یہ خبریں بھی نہیں شائع کی جا رہی تھیں کہ ملک بھر میں احمدیوں پر مظالم کے پہاڑ توڑے جا رہے ہیں اور کئی احمدیوں کو وحشیانہ انداز میں شہید کیا جا رہا ہے۔ تمام اخبارات نے اس معاملہ میں ایک مصلحت آمیز خاموشی اختیار کی ہوئی تھی۔ (12)

یکم سے پندرہ جون تک کے حالات

یکم جون تک حکومت اور قانون نافذ کرنے والوں کا رویہ واضح ہو کر سامنے آچکا تھا۔ اور اب مفسدین محسوس کر رہے تھے کہ انہیں کھلی چھٹی ہے۔ اس روز 41 مقامات پر فسادات ہوئے۔ سکھر اور پشاور کے علاوہ باقی سب شہر اور قصبے صوبہ پنجاب کے تھے۔ یوں تو پورے صوبے میں فسادات کی آگ لگی ہوئی تھی لیکن اس روز سب سے بڑا سانحہ گوجرانوالہ میں پیش آیا۔ یہاں پر سول لائن اور سیٹلائٹ ٹاؤن کے علاوہ باقی سب علاقوں میں احمدیوں کے مکانوں اور دوکانوں کو نذرِ آتش کیا گیا۔ بلوائیوں نے پہلے محمد افضل صاحب اور پھر ان کے بیٹے محمد اشرف صاحب کو بڑے دردناک انداز میں شہید کیا۔ پہلے محمد اشرف صاحب کے پیٹ میں چھرے مارے گئے جس سے انتڑیاں باہر آگئیں اور پھر اینٹوں سے سر کوٹا گیا۔ جب دم توڑتے ہوئے محمد اشرف نے پانی مانگا تو کسی ظالم نے منہ میں ریت ڈال دی۔ جب نوجوان بیٹے کو اس طرح قتل کر دیا گیا تو باپ کو کہا کہ تم اب بھی ایمان لے آؤ اور مرزا غلام احمد قادیانی کو گندی گالیاں دو۔ انہوں نے جواب دیا کہ کیا تم مجھے اپنے بیٹے سے بھی کمزور ایمان کا سمجھتے ہو۔ اس پر ان کو بھی اسی طرح شہید کر دیا گیا۔ پھر دوپہر کے وقت سعید احمد خان صاحب، ان کے خسر چوہدری منظور احمد صاحب اور چوہدری منظور احمد صاحب کے بیٹے چوہدری محمود احمد صاحب کو شہید کر دیا گیا۔ جب سعید احمد خان صاحب کو شہید کرنے کے لیے جلوس آیا تو ان کے ساتھ پولیس بھی تھی۔ سعید احمد خان صاحب نے تھانیدار کو کہا کہ وہ بلوائیوں کو روکیں مگر سب بے سود جب وہ واپس جانے کے لیے مڑے تو تھانیدار نے اشارہ کیا اور جلوس آپ پر ٹوٹ پڑا اور پتھروں اور ڈنڈوں سے آپ کو شہید کر دیا۔ ان کے علاوہ قریشی احمد علی صاحب کو بھی سفاکانہ انداز میں شہید کر دیا گیا۔ گوجرانوالہ میں بہت سے مواقع پر پولیس بلوائیوں کو روکنے کی بجائے ان کا ساتھ دے رہی تھی۔

یکم جون کو مندرجہ بالا مقامات پر سارا دن احمدیوں کے خلاف جلوس نکلتے رہے، اشتعال انگیز تقریریں کی گئیں اور لوگوں کو احمدیوں کی قتل و غارت پر اکسایا گیا۔ پہلے کی طرح اس روز بھی مفسدین کی بڑی توجہ احمدیوں کی دوکانوں کی طرف رہی۔ اس کے پیچھے احمدیوں کو نقصان پہنچانے کے علاوہ لوٹ مار کر کے خود فائدہ اُٹھانے کا جذبہ بھی کارفرما تھا۔ سانگلہ ہل، وزیر آباد اور ڈسکہ میں احمدیوں کی فیکٹریوں کو آگ لگائی گئی اور یہاں سے کثیر مقدار میں سامان لوٹا گیا۔ اس کے علاوہ احمدیوں کے مکانوں پر اور ان کی مساجد پر حملے کئے گئے۔

ایک طرف تو یکم جون کو احمدیوں کو بے دردی سے شہید کیا جا رہا تھا اور ملک کے کئی مقامات پر احمدیوں کے گھروں، مساجد، دوکانوں اور فیکٹریوں کو لوٹا جا رہا تھا اور ان کو آگ لگائی جا رہی تھی اور دوسری طرف اسی روز قومی اسمبلی میں بھی سٹیشن کے واقعہ کی بازگشت سنائی دی۔ لیکن کسی نے یہ نہیں کہا کہ احمدیوں کو قتل کیا جا رہا ہے اور ان پر مظالم کے پہاڑ توڑے جا رہے ہیں۔ قومی اسمبلی میں اپوزیشن کچھ Credit لینے کے لیے بے تاب تھی۔ چوہدری ظہور الٰہی جو مسلم لیگ سے اسمبلی کے ممبر تھے وہ سٹیشن کے واقعہ پر تحریکِ التوا پیش کرنا چاہتے تھے۔ سپیکر کا اصرار تھا کہ یہ معاملہ صوبائی حکومت سے تعلق رکھتا ہے اور اس پر تحقیق کے لیے جج مقرر کیا جا چکا ہے، اس لیے ممبرانِ قومی اسمبلی اپنی تقریر کو صرف قانونی نکات تک محدود رکھیں۔ اور چوہدری ظہور الٰہی صاحب سٹیشن پر ہونے والا واقعہ اپنی طرز پر پورا کا پورا قومی اسمبلی کو سنانے پر مصر تھے، زیادہ تر وقت اسی بحث میں گزر گیا۔ لیکن چند قابلِ ذکر امور یہ تھے کہ پچھلے دو روز سے لائلپور میں احمدیوں کے مکانوں کو آگ لگائی جا رہی تھی۔ جب قومی اسمبلی میں بحث نے طول پکڑا تو ایک ممبر نے کہا کہ اپوزیشن والے اس مسئلہ کو ہوا دے کر ملک میں افراتفری پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ اور وزیرِ قانون نے کہا کہ لائلپور میں مکان کس نے جلائے تھے؟ اس میں اشارہ تھا کہ لائلپور میں احمدیوں کے مکان جلانے کے پیچھے اپوزیشن کی کچھ جماعتیں ملوث تھیں۔ اس پر چوہدری ظہور الٰہی صاحب غصے سے بھڑک اٹھے۔ ایک ممبر اسمبلی مولوی غلام غوث ہزاروی نے اس بات پر زور دیا کہ حضرت مرزا ناصر احمد کو گرفتار کرنا ضروری ہے۔ اور ایک رکنِ اسمبلی احمد رضا قصوری صاحب نے جو احمدیت کے خلاف مختلف جگہوں پر اپنے جذبات کا اظہار کرتے رہے تھے نے ایک جملہ یہ کہا کہ سٹیشن پر یہ واقعہ انٹیلی جنس نے کرایا ہے۔ الغرض یہ دوڑ لگی ہوئی تھی کہ کسی طرح احمدیت کی مخالفت میں کچھ بیان بازی کر کے اپنے سیاسی مقاصد حاصل کیے جائیں (13)۔

جب ہم فسادات کے آغاز سے لے کر پندرہ جون تک کے فسادات کا جائزہ لیتے ہیں تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ ختم ہونے کی بجائے ان کا دائرہ وسیع ہوتا گیا اور حکومت بھی ان پر قابو پانے کی کوئی سنجیدہ کوشش نہیں کر رہی تھی۔ حکومت کا رویہ کیا تھا اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ 3/جون کو حکومت کے ریونیو منسٹر رانا اقبال احمد صاحب نے گوجرانوالہ کے بار روم میں وکلاء سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ احمدیوں کا جو نقصان ہوا ہے وہ ان کی غلطی کی وجہ سے ہوا ہے۔ جب جلوس آیا تو افضل صاحب نے پستول دکھایا تو عوام نے مشتعل ہو کر انہیں قتل کر دیا۔ اگر احمدی مزاحمت نہ کرتے تو کوئی خاص نقصان نہ ہوتا۔ پھر انہوں نے کچھ احمدیوں کا نام لے کر کہا کہ وہ مجھ سے سختی سے پیش آئے اور پھر وزیر صاحب نے فرمایا کہ

علماء نے بہت تعاون کیا ہے اور ان کا رویہ معقول تھا۔ کوئی بھی صاحبِ شعور شخص اگر وزیر صاحب کے ارشاد کا سرسری تجزیہ بھی کرے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ باوجود اس کے کہ کتنے ہی احمدی گوجرانوالہ میں شہید کر دیئے گئے تھے لیکن وزیر صاحب فرما رہے تھے کہ احمدی غلطی کر رہے ہیں وہ اگر اپنی املاک کا دفاع نہ کریں اور جلوسوں کو لوٹ مار کی خواہش پوری کرنے دیں تو احمدیوں کی جان بچ جائے گی۔ گویا ان کی حکومت میں اپنی املاک کا جائز دفاع کرنا بھی ایک ناقابلِ معافی جرم تھا۔ اور حکومت کا کام صرف مظلوموں پر اعتراض کرنا تھا۔ 1974ء کے فسادات میں کتنے ہی احمدی اس حالت میں شہید کر دیئے گئے کہ ان کے پاس اپنے دفاع کے لیے ایک چھڑی بھی نہیں تھی۔ ان نہایت قابل وزیر صاحب نے اس راز سے پردہ نہیں اٹھایا کہ ان کی شہادت کس وجہ سے ہوئی۔ پندرہ جون تک پاکستان کے 120 شہروں اور قصبوں میں فسادات کا آغاز ہو چکا تھا۔ ان میں اکثر مقامات صوبہ پنجاب سے تعلق رکھتے تھے لیکن پاکستان کے باقی صوبوں اور شمالی علاقہ جات کے کچھ مقامات میں فسادات کی آگ بھڑکنی شروع ہو چکی تھی۔ احمدیوں کو دھمکیاں دے کر ارتداد پر آمادہ کرنے کی کوششیں کی جا رہی تھیں۔ ان کو مارا پیٹا جا رہا تھا۔ ان کے گھروں پر حملے ہو رہے تھے، پتھراؤ کیا جا رہا تھا، سامان لوٹا جا رہا تھا اور ان سترہ دنوں میں کئی مقامات پر احمدیوں کے 270 مکانات کو نذرِ آتش کیا گیا یا انہیں لوٹا گیا۔ احمدیوں کی دوکانیں اور فیکٹریاں بھی خاص طور پر شورش کرنے والوں کی توجہ کا مرکز بنی ہوئی تھیں۔ پندرہ جون تک احمدیوں کی 340 دوکانوں کو لوٹ مار یا آتشزدگی کا نشانہ بنایا گیا اور چھ فیکٹریوں کو تاخت و تاراج کیا گیا۔ دیگر کاروباری مراکز کا نقصان اس کے علاوہ تھا۔ فسادات کے ابتدائی سترہ دنوں میں احمدیوں کی 25 مساجد کو شہید کیا گیا اور تین پر قانون نافذ کرنے والے اداروں کی آشیرباد سے قبضہ کر لیا گیا۔ 20 مقامات پر جماعت کی قائم کردہ چھوٹی چھوٹی لائبریریوں کو آگ لگا دی گئی اور قرآنِ کریم کے کئی نسخے شہید کر دیئے گئے۔ کئی جگہوں پر پولیس نے فسادات پر قابو پانے کی بجائے ان احمدیوں کو گرفتار کرنا شروع کر دیا جو اپنے مکانات کی حفاظت کر رہے تھے۔ پندرہ جون تک ربوہ کے اسیران سمیت 108 احمدیوں کو گرفتار کیا جا چکا تھا۔ بہت سے شہروں میں مولوی لوگوں کو اکسا رہے تھے کہ وہ احمدیوں کا بائیکاٹ کریں اور ان کو ضروریاتِ زندگی بھی نہ فروخت کریں۔ ربوہ کے ارد گرد کے دیہات کو بھی بھڑکایا جا رہا تھا کہ وہ ربوہ تک ضروریاتِ زندگی نہ پہنچائیں۔ اب تک 21 احمدی جامِ شہادت نوش کر چکے تھے اور 9 کے متعلق یہ علم نہیں تھا کہ وہ زندہ ہیں یا انہیں بھی شہید کیا جا چکا ہے۔ دس شہداء کا تعلق گوجرانوالہ سے تھا اور ساہیوال، ٹوپی اور بالا کوٹ، کوئٹہ، حافظ آباد، ٹیکسلا، پشاور اور ایبٹ آباد کے احمدی بھی شہادت کے مقام پر سرفراز ہو چکے تھے۔

(تفصیلات کے لئے دیکھیے شہدائے احمدیت شائع کردہ طاہر فاؤنڈیشن ربوہ)

2 / جون کو گوجرانوالہ میں مکرم بشیر احمد صاحب اور منیر احمد صاحب، غلام قادر صاحب اور چوہدری عنایت اللہ صاحب نے شہادت پائی۔ 4 / جون کو مکرم محمد الیاس عارف صاحب نے ٹیکسلا میں اور 8 / جون کو مکرم نقاب شاہ مہمند صاحب کو پشاور میں شہید کیا گیا۔ پھر 9 / جون کو ٹوپی میں غلام سرور صاحب اور ان کے بھتیجے اسرار احمد خان صاحب کو شہید کر دیا گیا۔ 9 / جون کو ہی کوئٹہ میں مکرم سید مولود احمد بخاری صاحب کو شہید کیا گیا۔ 11 جون کو مکرم محمد فخر الدین بھٹی صاحب کو ایبٹ آباد میں اور اسی تاریخ کو مکرم محمد زمان خان صاحب مکرم مبارک احمد خان صاحب کو بالا کوٹ میں شہید ہونے کی سعادت حاصل ہوئی۔ ایبٹ آباد میں مکرم محمد فخر الدین صاحب کو جس انداز میں شہید کیا گیا وہ اتنا بہیمانہ تھا کہ جس کے پڑھنے سے مشرکینِ مکہ کے کیے گئے مظالم کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ ان کو شہید کرنے کے بعد بھی ہجوم ان کی لاش پر گولیاں برساتا رہا۔ نعش کے ناک، کان کاٹ کر مُثلہ کیا گیا اور خنجروں سے وار کر کے نعش کی بے حرمتی کی گئی۔ بھٹی صاحب کے گھر کا سارا سامان نکال کر اسے نذرِ آتش کیا گیا اور اس الاؤ میں ان کی لاش کو پھینک دیا گیا۔ شرپسند جلتی ہوئی آگ میں بھی نعش پر سنگ باری کرتے رہے۔ ختم نبوت اور ناموسِ رسالت کے نام پر تحریک چلانے والوں کی اخلاقی حالت کا یہ عالم تھا۔

ان فسادات کے آغاز میں احمدیوں پر ہونے والے مظالم کا مختصر ذکر کرنے کے بعد ہم یہ جائزہ لیتے ہیں کہ ان دنوں میں ملک کی قومی اسمبلی میں اس مسئلہ پر کیا بحث کی جا رہی تھی۔ 3 جون 1974ء کو ایک بار پھر سٹیشن کے واقعہ پر قومی اسمبلی میں بحث شروع ہوگئی۔ وقفہ سے کچھ دیر پہلے جماعتِ اسلامی کے پروفیسر غفور احمد صاحب نے کہا کہ باوجود اس کے کہ اس واقعہ کا تعلق صوبائی حکومت سے ہے لیکن یہ ایک قومی اہمیت کا مسئلہ ہے اس لئے اس پر قومی اسمبلی میں بحث ہونی چاہئے اور یہ بھی کہا کہ اس واقعہ کا تعلق مذہب سے ہے۔ اس کے بعد جمعیت العلماء اسلام کے مفتی محمود صاحب کچھ نکات بیان کرنے کے لیے کھڑے ہوئے۔ انہوں نے کہا کہ ربوہ میں جو واقعہ ہوا ہے وہ ایک جارحانہ کاروائی ہے جو مرزائی فرقہ کے لوگوں نے مسلمانوں کے خلاف کی ہے اور یہ ایک قومی مسئلہ ہے۔ انہوں نے زور دے کر کہا یہ پاکستان کی سالمیت کا مسئلہ ہے۔ اور دعویٰ کیا کہ ہم ایوان کے سامنے ثابت کریں گے کہ یہ ایک منصوبہ تھا اور ایک پروگرام تھا اور اتفاقی حادثہ نہیں تھا۔

ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ سٹیشن پر ہونے والا واقعہ جماعتی تعلیمات کے اور قانون کے خلاف تھا۔ لیکن یہ واقعہ جس میں کسی شخص کی جان نہیں گئی، کسی مضروب کی ہڈی نہیں ٹوٹی، جو ایک قصبہ تک محدود تھا، تو مفتی محمود صاحب کے نزدیک

پاکستان کی سالمیت کے لیے ایک بڑا خطرہ تھا اور ایک بھیانک جارحیت تھی۔ لیکن اس روز تک پاکستان کے کئی مقامات پر احمدیوں کے خلاف فسادات شروع ہو چکے تھے اور انہیں ہر طرح کے مظالم کا نشانہ بنایا جا رہا تھا۔ اور کئی احمدیوں کو ملک کے مختلف مقامات پر ظالمانہ طریق پر شہید کیا جا چکا تھا۔ یہ بات مفتی صاحب کے نزدیک نہ تو ملک کی سالمیت کے لیے خطرہ تھی اور نہ ہی اس سے کسی قسم کی جارحیت کی بو آتی تھی۔ اور نہ ہی دیگر ممبرانِ اسمبلی کو یہ توفیق ہوئی کہ وہ احمدیوں پر ہونے والے ان مظالم پر دو حرف ہی کہہ دیتے۔

وقفہ کے بعد وزیرِ اعظم ذوالفقار علی بھٹو تقریر کے لیے کھڑے ہوئے۔ انہوں نے کہا کہ دنیا بھر کے مہذب لوگ یہ سوچتے ہیں کہ ہم میں برداشت ختم کیوں ہو گئی ہے۔ کیا ہم اپنے مسائل کو مہذب طریق سے حل نہیں کر سکتے۔ جب بھی ہمارا ایک مسئلہ ختم ہوتا ہے ہم ایک اور مسئلہ تلاش کر لیتے ہیں تاکہ ہم آپس میں لڑ سکیں۔ پھر کہا کہ یہ مسئلہ کوئی نیا مسئلہ نہیں۔ یہ مسئلہ تقسیمِ ہند سے پہلے سے موجود تھا۔ یہ وہ مسئلہ ہے جس کی وجہ سے تقسیمِ ہند کے بعد لاہور میں پہلا مشہور مارشل لاء لگا تھا۔ مجھے کوئی حیرت نہیں کہ اس معاملہ کا آغاز کیوں ہوا ہے جب ہم ایک مسئلہ حل کر لیتے ہیں تو ہم ایک دوسرا مسئلہ پیدا کرتے ہیں۔ پھر انہوں نے اپوزیشن اراکین کے بعض نکات سے اتفاق کرتے ہوئے کہا کہ مجھے اس سے انکار نہیں کہ یہ ایک سنگین مسئلہ ہے۔ بے شک یہ ایک قومی مسئلہ ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ غالب امکان ہے کہ یہ ایک منصوبہ کے تحت کیا گیا ہے۔ اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں کہ اس مسئلہ کو حل کرنا چاہئے لیکن یہ کوئی نیا مسئلہ نہیں ہے۔ اور نہ ہی ہم نے اسے پیدا کیا ہے۔

پھر انہوں نے کہا کہ اس پر بحث بھی ہونی چاہیے لیکن اس وقت جب خون بہنا بند ہو جائے اور ملک میں امن کا راج ہو پھر ہمیں ٹھنڈے دماغ سے اور معتدل انداز میں اس پر بات کرنی چاہئے اور چاہئے کہ ہم اس بارے میں کسی فیصلہ پر پہنچیں۔

اس کے بعد وزیرِ اعظم نے اپوزیشن جماعتوں پر الزام لگاتے ہوئے کہا کہ وہ ایک عرصہ سے اس مسئلہ کو ہوا دینے کی کوشش کر رہے تھے اور موقع کی تلاش میں تھے کہ انہیں کوئی موقع ملے کیونکہ انہیں دوسرے مواقع پر حکومت کے مقابل پر زک اُٹھانی پڑی ہے۔ پھر انہوں نے کہا کہ آئین کی منظوری اپوزیشن ممبران نے بھی دی تھی اور اس کے آرٹیکل 106 (13) میں اقلیت کی وضاحت کی گئی ہے۔ 1973ء کا آئین جو بھٹو صاحب کی حکومت کا ایک کارنامہ سمجھا جاتا ہے۔ اور جس پر اکثر اپوزیشن کے اراکین نے بھی دستخط کیے تھے۔ اس کے آرٹیکل 106 (13) میں صوبائی اسمبلی میں مذہبی اقلیتوں کے لیے مخصوص نشستوں کا ذکر ہے۔ اور ان مذہبی اقلیتوں کے نام بھی لکھے ہیں۔ اور آئین میں یہ اقلیتیں عیسائی، ہندو، سکھ، بدھ اور

پارسی لکھی گئی ہیں۔ بھٹو صاحب یہ نکتہ بیان کر رہے تھے کہ جب آئین منظور ہوا تھا تو اپوزیشن کے اکثر علماء، جن میں مفتی محمود صاحب بھی شامل تھے اس پر دستخط کیے تھے بلکہ اس کی منظوری پر مفتی صاحب نے ہی دعا کرائی تھی۔ اس آئین کو بنانے کے لیے اسمبلی نے جو کمیٹی تشکیل دی تھی، مفتی محمود صاحب اس کے ممبر بھی تھے اور اس وقت انہوں نے مختلف نکات اٹھائے تھے لیکن یہ نکتہ نہیں اٹھایا تھا کہ احمدی غیر مسلم اقلیت ہیں ان کا نام بھی آئین کی اس شق میں غیر مسلم اقلیتوں میں درج ہونا چاہیے۔

اس مرحلہ پر یہ کارروائی ایک گرا ہوا انداز اختیار کر گئی۔ ایک رکن اسمبلی احمد رضا قصوری صاحب نے مداخلت کرتے ہوئے کہا کہ نو اراکین نے آئین پر دستخط نہیں کیے تھے۔ (دراصل تین اراکین نے اس آئین کی منظوری کے وقت ووٹ نہیں دیا تھا۔ یہ تین اراکین شاہ احمد نورانی صاحب، محمود علی قصوری صاحب اور احمد رضا قصوری صاحب تھے)(14)۔

اس پر وزیر اعظم غصہ میں آ گئے اور کہا:

You keep quiet. I have had enough of you. Absolute poison. I will not tolerate your nuisance

ترجمہ: خاموش رہو۔ میں تمہیں کافی برداشت کر چکا ہوں۔ مکمل زہر۔ میں تمہاری بدتمیزی برداشت نہیں کروں گا۔

اس پر تلخی بڑھی اور احمد رضا قصوری صاحب نے وزیر اعظم کو بندر کہا۔ پھر سپیکر نے مداخلت کی اور وزیر اعظم نے پھر تقریر شروع کی۔

اس کے بعد وزیرِ اعظم نے تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا کہ ہم نے آئین میں صدر اور وزیر اعظم کے حلف میں ختمِ نبوت کے عقیدہ کا حلف داخل کیا ہے اور کہا کہ اس طرح ہم نے واضح کیا ہے کہ پاکستانی قوم ختمِ نبوت پر ایمان لاتی ہے اور یہ کہ ہمارے نبی کے بعد اب کوئی اور نبی نہیں ہو سکتا۔ اور پھر وزیرِ اعظم نے اس بات پر زور دیا کہ ہمیں عدالتی تحقیقات کے نتائج کا انتظار کرنا چاہیے۔ (15)

اس روز جب قومی اسمبلی میں کوئی شخص یہ کہنے کو تیار نہیں تھا کہ گوجرانوالہ میں اتنے احمدی شہید کر دیئے گئے ہیں۔ پاکستان میں کتنے ہی مقامات پر احمدیوں کو ہر طرح کے مظالم کا نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ ملک کے وزیرِ اعظم بھی اگر کوئی بات کر رہے تھے تو بہت عمومی انداز میں کہ ہمیں ایک دوسرے سے لڑنا نہیں چاہیے، ملک میں پہلے ہی بہت سے مسائل ہیں اور

پورے ملک میں احمدیوں پر جو مظالم ہو رہے تھے ان پر وہ کھل کر کچھ نہیں کہہ رہے تھے۔ آج ملک کے سب سے بالا منتخب اداروں میں بھی کوئی احمدیوں پر ہونے والے مظالم پر ایک لفظ کہنے کو تیار نہیں تھا کیونکہ یہ سب سمجھ رہے تھے کہ یہ تو ایک لاچار اور کمزور سا گروہ ہے اس کے متعلق آواز بلند کر کے ہم اپنا سیاسی مستقبل کیوں خطرہ میں ڈالیں۔ لیکن ملک کی تاریخ کے سب سے مضبوط وزیرِ اعظم کو اندازہ نہیں تھا کہ آج کی بحث میں ان کے منہ سے ایک ایسا جملہ نکل گیا ہے جو کچھ برس بعد ان کے خلاف قتل کے مقدمہ میں دلیل کے طور پر پیش کیا جائے گا۔ بھٹو صاحب نے احمد رضا قصوری صاحب کو کہا تھا کہ میں تمہاراNuisanceبرداشت نہیں کر سکتا۔ کچھ سال بعد جب بھٹو صاحب پر یہ مقدمہ چل رہا تھا کہ انہوں نے احمد رضا قصوری صاحب پر قاتلانہ حملہ کرایا، جس میں ان کے والد قتل ہو گئے تو یہی جملہ ان کے خلاف دلیل کے طور پر پیش کیا گیا کہ انہوں نے قومی اسمبلی میں اس بات کا اظہار کیا تھا کہ وہ اب قصوری صاحب کو برداشت نہیں کر سکتے۔ چنانچہ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس بات کے شواہد موجود ہیں کہ بھٹو صاحب احمد رضا صاحب کو راستہ سے ہٹانا چاہتے تھے۔(16)

اگلے روز بھی قومی اسمبلی میں اس موضوع پر مختصر سی گفتگو ہوئی۔اور مفتی محمود صاحب نے سٹیشن والے واقعہ کے متعلق کہا:۔

"۔۔۔۔۔ آج میں نے اخبار میں پڑھا ہے کہ مرزا ناصر کو بھی تحقیقات میں شامل کر لیا گیا ہے۔ہم یہ جانتے ہیں کہ ربوہ میں کوئی واقعہ ان کی مرضی کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا اس کو گرفتار کر لیا جائے۔"(17)

اس روز قومی اسمبلی میں ربوہ کے سٹیشن پر ہونے والے واقعہ کے بارے میں سات تحاریکِ التوا پیش کی گئیں اور اپوزیشن نے کہا کہ وزیرِ اعظم نے ان حالات کا سارا الزام ہم پر لگا دیا ہے اور ہم جواب دینا چاہتے ہیں۔ لیکن سپیکر نے اس دن ان پر بحث کی اجازت نہیں دی۔ اس پر اپوزیشن کے اراکین نے واک آؤٹ کیا اور نکلتے ہوئے ختمِ نبوت زندہ باد کے نعرے لگائے۔

5/ جون کے اخبارات میں یہ خبریں شائع ہونے لگ گئیں کہ حکومت قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے پر سنجیدگی سے غور کر رہی ہے اور اس بارے میں سرکاری فیصلہ کا جلد اعلان کر دیا جائے گا۔(18)

9 / جون کو لاہور میں کل پاکستان علماء و مشائخ کونسل منعقد ہوئی اور اس میں مطالبہ پیش کیا گیا کہ قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دے کر انہیں کلیدی اسامیوں سے برطرف کیا جائے اور ربوہ کی زمین ضبط کر لی جائے ورنہ 14 / جون سے ملک گیر ہڑتال کر دی جائے گی۔ (19)

اس کتاب کی تالیف کے دوران جب ہم نے پروفیسر غفور احمد صاحب سے انٹرویو کیا اور یہ دریافت کیا کہ کیا یہ بنیادی حقوق کی خلاف ورزی نہیں ہے کہ کسی گروہ کے متعلق یہ مطالبہ کیا جائے کہ اس سے تعلق رکھنے والے کلیدی آسامی پر فائز نہیں ہونے چاہئیں۔ اس پر پہلے انہوں نے جواب دیا کہ آئین میں تو صرف صدر اور وزیر اعظم کے عہدہ کے لئے پابندی ہے دوسرے تمام عہدوں پر قادیانیوں سمیت کوئی بھی مقرر ہو سکتا ہے۔ جب ہم نے انہیں پھر یاد دلایا کہ یہ مطالبہ اس وقت کی اپوزیشن کی طرف سے کیا گیا تھا جس کے وہ خود رکن تھے تو اس پر انہوں نے فرمایا:۔

”ہو گا۔ میں نے آپ کو بتایا ناں کہ اس ساری چیز کو اس کے بیک گراؤنڈ میں دیکھیں۔ قادیانیوں کو بھی اس بات کا احساس کرنا چاہئے کہ وہ اس ملک کے شہری ہیں تو کیا بات ہے کہ ملک کی ایک بہت بڑی Majority کے جذبات ان کے خلاف ہیں۔ کوئی نہ کوئی وجہ تو اس کی ہو گی۔

پھر کہنے لگے کہ اس کی وجہ میں نے آپ کو یہ بتائی ہے کہ جب آپ اپنے اثر کو ناجائز استعمال کریں گے تو اس سے دوسرے Hurt ہوں گے اور پھر اس کی یہ مثال دی کہ سر ظفر اللہ کی لوگ Respect کرتے تھے کہ انہوں نے پاکستان کو Preach کیا لیکن انہوں نے میرٹ کی بجائے تعلقات پر بہت بھرتیاں کیں۔“

پروفیسر غفور احمد صاحب کا یہ بیان بہت دلچسپ ہے۔ اوّل تو یہی بات محلِّ نظر ہے کہ ملک کی اکثریت احمدیوں کے خلاف ہے۔ لیکن اگر ان کا نظریہ تسلیم کر لیا جائے تو پھر صورتِ حال یہ بنے گی کہ اگر کسی ملک کی اکثریت کسی اقلیت کے خلاف ہو جائے تو ہمیں لازماً یہ ماننا پڑے گا کہ قصور اس اقلیت کا ہی ہے اس لئے ان پر ہر ظلم روا ہے۔ مثلاً اگر انتہا پسند ہندوؤں کے زیرِ اثر ہندوستان کی اکثریت وہاں کے مسلمانوں کے خلاف ہو جائے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ انتہا پسند ہندوستان میں بہت ووٹ بھی لیتے رہے اور ان کا رویہ مسلمانوں کے ساتھ اچھا نہیں ہوتا تھا۔ بلکہ جماعتِ اسلامی یا پاکستان کی دوسری مذہبی پارٹیوں کو تو کبھی اتنی کامیابی نہیں ملی جتنی ہندو انتہا پسند پارٹیوں کو ہندوستان میں ملتی رہی ہے۔ تو اس صورت میں اگر یہ اکثریت میں ہوتے ہوئے مسلمانوں کے خلاف قدم اُٹھائیں تو کیا پھر پروفیسر غفور صاحب یہ نتیجہ نکالیں گے کہ قصور ضرور

ہندوستان کے مسلمانوں کا ہی ہے۔ مگر یہ نظریہ انصاف کے مطابق نہیں ہو گا بلکہ اس اندھے تعصب کی بجائے یہ دیکھنا چاہئے کہ جن پر الزام لگایا جارہا ہے۔ ان پر لگائے جانے والے الزاموں کی حقیقت کیا ہے۔ یا پھر ہم یہ مثال لے سکتے ہیں کہ اگر کسی مغربی ملک میں وہاں کی اکثریت وہاں کے مسلمانوں سے ناروا سلوک کرے اور ان کے خلاف جذبات کو خواہ مخواہ ہوا دی جائے تو کیا لازماً اس سے نتیجہ یہ نکلے گا کہ قصوروار مسلمان ہی تھے۔ کوئی بھی صاحبِ عقل اس فلسفہ کو تسلیم نہیں کر سکتا۔ ان کا دوسرا الزام بھی بہت دلچسپ ہے اور وہ یہ کہ حضرت چوہدری ظفر اللہ خان صاحب نے تعلقات کی بنا پر بھرتیاں کیں۔ اس سوال کے پس منظر میں یہ الزام بھی مضحکہ خیز ہے۔ سوال تو یہ تھا کہ 9 جون 1974ء کو اپوزیشن نے جس میں پروفیسر غفور صاحب کی پارٹی بھی شامل تھی یہ مطالبہ کیوں کیا کہ احمدیوں کو کلیدی آسامیوں سے برطرف کر دیا جائے تو اس کے جواب میں اس مطالبہ کی وجہ یہ بیان کی جارہی ہے کہ اس مطالبہ سے کوئی پچیس سال پہلے ایک احمدی وزیر نے تعلقات کی بنا پر غلط بھرتیاں کی تھیں اس لئے 1974ء میں یہ مطالبہ پیش کرنا پڑا۔ اور یہ الزام بھی غلط ہے کیونکہ اس وقت 1953ء کی عدالتی تحقیقات کے دوران جماعتِ اسلامی نے بھی اپنا بیان اور موقف پیش کیا تھا اور اس تحریری موقف میں بھی یہی الزام لگایا تھا کہ احمدیوں نے آزادی کے بعد اپنے آپ کو حکومتی اداروں میں بالخصوص ایئر فورس، آرمی، سفارت خانوں میں، مرکزی اور صوبائی حکومتوں میں مستحکم کر لیا تھا۔ اب یہ سوچنے کی بات ہے کہ وزارتِ خارجہ میں تو حضرت چوہدری ظفر اللہ خان صاحب وزیرِ خارجہ تھے لیکن آرمی، ایئر فورس، صوبائی حکومتوں اور مرکزی حکومت کے سربراہ تو احمدی نہیں تھے۔ یہ کس طرح ممکن ہوا کہ احمدی ان میں ناجائز تصرف حاصل کرتے گئے۔ اور اگر وزارتِ خارجہ میں بھی ایسا ہوا تھا تو جماعتِ اسلامی نے اس کا ثبوت کیا پیش کیا تھا؟ جماعتِ اسلامی اس کا کوئی ثبوت نہیں پیش کر سکی تھی۔ وہ کون سے لوگ تھے جن کو سفارت خانوں میں ناجائز طور پر بھرتی کیا گیا تھا؟ جماعتِ اسلامی تحقیقاتی عدالت میں کوئی ایک نام بھی پیش کرنے سے قاصر رہی تھی۔ اس بات کا کوئی ثبوت پیش نہیں کیا تھا کہ حضرت چوہدری ظفر اللہ خان صاحب نے تعلقات کی بنا پر بھرتیاں کی تھیں۔ کوئی ایک مثال نہیں پیش کی گئی تھی۔ اس لئے کہ اس بات کا کوئی ثبوت تھا ہی نہیں یہ الزام بالکل بے بنیاد ہے۔ جنرل ضیاء کے دورِ مارشل لاء میں پروفیسر غفور صاحب نے بھی وزارت قبول کی تھی۔ اس وقت ان کے پاس موقع تھا کہ اس وقت احمدیوں کی مثالیں پیش کرتے جنہیں دوسروں کا حق مار کر میرٹ کے خلاف ملازمتیں دی گئی تھیں۔ لیکن وہ ایسا نہیں کر سکے کیونکہ احمدیوں کو تو کئی دہائیوں سے ان کے جائز حقوق سے بھی محروم کیا گیا، ان کو میرٹ کے خلاف ملازمتیں دینے کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ یہ

لوگ نہ 1953ء میں اس بات کا کوئی ثبوت پیش کر سکے، نہ 1974ء میں اس الزام کی سچائی ثابت کرنے کے لئے کوئی مثال پیش کر سکے اور نہ آج تک اس الزام کو ثابت کرنے کے لئے کوئی معقول ثبوت پیش کیا گیا ہے۔ نصف صدی سے زائد عرصہ بیت گیا بغیر ثبوت کے ایک بات ہی دہرائی جا رہی ہے کہ حضرت چوہدری ظفر اللہ خان صاحب نے پچاس سال پہلے کچھ احمدیوں کو ناجائز طور پر وزارتِ خارجہ میں بھرتی کر لیا تھا۔

اس دوران Associated Press نے حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ سے انٹرویو لیا۔ اس انٹرویو میں حضور نے ارشاد فرمایا کہ ان فسادات کے پیچھے حکومتِ پاکستان کا ہاتھ کار فرما ہے۔ آپ نے فرمایا کہ دنیا کی کوئی طاقت ہمیں تباہ و برباد نہیں کر سکتی۔ دنیا کے پچاس ممالک میں احمدیت موجود ہے۔ اگر پاکستان میں احمدی ختم بھی کر دیئے جائیں تو باقی دنیا میں موجود رہیں گے۔ (20)

جماعت کے مخالف مولویوں نے 14 /جون 1974ء کو ایک ملک گیر ہڑتال کی اپیل کی۔ ملکی اخبارات میں مختلف تجارتی تنظیموں اور مجلس تحفظِ ختم نبوت اور دوسری تنظیموں کی طرف سے اعلانات شائع ہو رہے تھے کہ قادیانیوں کا مکمل سماجی اور معاشی بائیکاٹ کیا جائے۔ ان سے کسی قسم کے مراسم نہ رکھے جائیں اور نہ ہی کسی قسم کا لین دین کیا جائے۔ اور ملک کا ایک حصہ اس مہم میں حصہ بھی لے رہا تھا۔ اس مرحلہ پر حکومتِ وقت کے جو اعلانات شائع ہو رہے تھے ان کی روش کا اندازہ ان مثالوں سے ہو جاتا ہے۔ 12 /جون کو وزیرِ اعلیٰ پنجاب حنیف رامے صاحب نے بیان دیا کہ حکومت قادیانیت کے مسئلہ کا مستقل حل تلاش کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ جماعت احمدیہ اور دیگر فرقوں کا مذہبی اختلاف ایک مذہبی معاملہ ہے لیکن حنیف رامے صاحب یہ دعویٰ کر رہے تھے کہ یہ حکومت کا کام ہے مذہبی اختلافات کے معاملات کا مستقل حل تلاش کرے۔ اس کے ساتھ رامے صاحب نے شورش برپا کرنے والوں کو یہ خوش خبری سنائی کہ امیر جماعتِ احمدیہ کو شاملِ تحقیق کر لیا گیا ہے۔ اور پھر اعلان کیا کہ ہمارے اور عامۃ المسلمین کے جذبات اور عقائد ایک ہیں اور پھر یہ خوش خبری سنائی کہ صوبہ پنجاب میں مکمل امن و امان قائم ہے اور پھر مولویوں کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے کہا کہ امن قائم کرنے کا کام اکیلے حکومتِ وقت نہیں کر سکتی تھی عوام کے شعور، اخبارات اور علماء کے تعاون سے یہ کام ممکن ہوا ہے۔ (21)

جیسا کہ ہم پہلے ہی جائزہ لے چکے ہیں کہ جس وقت رامے صاحب نے یہ بیان دیا اس وقت پورے صوبے میں احمدیوں کے خون کی ہولی کھیلی جا رہی تھی، ان کے گھر اور املاک کو آگیں لگائی جا رہی تھیں اور لوٹا جا رہا تھا لیکن وزیر اعلیٰ پنجاب کو

صوبے میں امن و امان نظر آ رہا تھا۔ مولویوں کا گروہ پورے ملک میں لوگوں کو اکسا رہا تھا کہ وہ احمدیوں کا خون بہائیں اور وزیرِ اعلیٰ صاحب ان کے کردار کو سراہ رہے تھے۔ اخبارات احمدیوں کی قتل و غارت اور ان پر ہونے والے مظالم کی خبروں کا مکمل بائیکاٹ کیے بیٹھے تھے اور ان میں روزانہ جماعت کے خلاف جذبات بھڑکانے والا مواد شائع ہوتا تھا اور اپیلیں شائع ہو رہی تھیں کہ احمدیوں کا مکمل بائیکاٹ کر دو، ان سے روزمرہ کا لین دین بھی نہ کرو لیکن پنجاب کے وزیر اعلیٰ اخبارات کی تعریف کر رہے تھے کہ انہوں نے امن قائم کرنے کے لیے مثالی تعاون کیا ہے۔ وزیرِ اعلیٰ پنجاب کے بیان کو حقائق کی کسوٹی پر پرکھا جائے تو ایک ہی نتیجہ نکل سکتا ہے اور وہ یہ کہ یہ فسادات حکومت کی آشیرباد سے کرائے جا رہے تھے۔

وزیرِ اعظم کا انکشاف کہ ان حالات کے پیچھے بیرونی ہاتھ کارفرما ہے

13 / جون 1974ء کو وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو صاحب نے ایک نشری تقریر کی اور اس میں کہا کہ جو شخص ختمِ نبوت پر ایمان نہیں لاتا وہ مسلمان نہیں ہے۔ اور کہا کہ بجٹ کا اجلاس ختم ہوتے ہی جولائی کے آغاز میں یہ مسئلہ قومی اسمبلی میں پیش کیا جائے گا اور 90 سالہ اس مسئلہ کو اکثریت کی خواہش اور عقیدہ کے مطابق حل کیا جائے گا اور اس سلسلہ میں وہ اپنا کردار ادا کریں گے۔ لیکن کسی کو امنِ عامہ کو خراب کرنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ انہوں نے کہا کہ وہ ایک مضبوط اعصاب کے سیاستدان ہیں اور وہ جو فیصلہ کریں گے انہیں اس پر فخر ہو گا۔ بھٹو صاحب نے کہا کہ یہ ٹھیک ہے کہ الیکشن میں قادیانیوں نے انہیں ووٹ دیئے تھے لیکن انہیں قادیانیوں نے خریدا نہیں اور نہ وہ ان کے محتاج ہیں۔ اور انہیں شیعہ سنی اور دوسرے فرقہ کے لوگوں نے بھی ووٹ دیئے تھے۔ (22)

لیکن ان سب باتوں کے ساتھ وزیر اعظم نے اس بات کا بھی برملا اظہار کیا کہ نہ صرف وہ بلکہ کئی دوسرے لوگ بھی یہ بات دیکھ رہے ہیں کہ ان حالات کے پیچھے بھی غیر ملکی ہاتھ کارفرما ہے اور یہ محض اتفاق نہیں ہے کہ ایک طرف بھارت نے ایٹمی دھماکہ کیا، دوسری طرف افغانستان کے صدر سرکاری مہمان کی حیثیت سے ماسکو پہنچ گئے۔ اور پاکستان میں یہ مسئلہ اُٹھا دیا گیا۔ ربوہ کا واقعہ ان واقعات سے علیحدہ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا۔ اور کہا کہ یہ پاکستان کی سالمیت اور وحدت کے لیے خطرہ ہے۔ (24,23)

یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ اگرچہ حکومت مذہبی جماعتیں، اپوزیشن کی جماعتیں اور مولویوں کا گروہ سب جماعت کے خلاف شورش سے اپنا سیاسی قد بڑھانے کے لیے اس شورش کو ہوا دے رہے تھے اور اس کارنامہ کا سہرا اپنے سر باندھنے کے لیے کوشاں تھے لیکن یہ سب جانتے تھے کہ اس شورش کی باگیں ان کے ہاتھ میں نہیں بلکہ ملک سے باہر ہیں اور کوئی بیرونی ہاتھ اس بساط پر مہروں کو حرکت دے رہا تھا اور بھٹو صاحب جیسا ذہین سیاستدان یہ بھی دیکھ رہا تھا کہ اس راستہ میں کئی ممکنہ خطرات بھی تھے۔

14 جون کو خطبہ جمعہ میں حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ نے احبابِ جماعت کو ان الفاظ میں استغفار کی طرف توجہ دلائی:۔

”پس جیسا کہ میں نے بتایا ہے کہ خدا تعالیٰ کی حفاظت میں آنے کے لیے استغفار ہے اس لئے تم اٹھتے بیٹھتے ہر وقت خدا سے مدد مانگو۔ پچھلے جمعہ کے دن پریشانی تھی لیکن بشاشت بھی تھی اور گھبراہٹ کا کوئی اثر نہیں تھا لیکن بہر حال ہمارے کئی بھائیوں کو تکلیف پہنچ رہی تھی جس کی وجہ سے ہمارے لئے پریشانی تھی۔ میں نے نماز میں کئی دفعہ سوائے خدا تعالیٰ کی حمد کے اور اس کی صفات دہرانے کے اور کچھ نہیں مانگا۔ میں نے خدا سے عرض کیا کہ خدایا تو مجھ سے بہتر جانتا ہے کہ ایک احمدی کو کیا چاہئے۔ اے خدا! جو تیرے علم میں بہتر ہے وہ ہمارے ہر احمدی بھائی کو دے دے۔ میں کیا مانگوں میرا تو علم بھی محدود ہے میرے پاس جو خبریں آرہی ہیں وہ بھی محدود ہیں اور کسی کے لیے ہم نے بد دعا نہیں کرنی، ہاں یاد رکھو بالکل نہیں کرنی۔ خدا تعالیٰ نے ہمیں دعائیں کرنے کے لیے اور معاف کرنے کے لیے پیدا کیا ہے۔ اس نے ہمیں نوعِ انسان کا دل جیتنے کے لیے پیدا کیا ہے۔ اس لئے ہم نے کسی کو نہ دکھ پہنچانا ہے اور نہ ہی کسی کے لیے بد دعا کرنی ہے۔ آپ نے ہر ایک کے لیے خیر مانگنی ہے۔ یاد رکھو ہماری جماعت ہر ایک انسان کے دکھوں کو دور کرنے کے لیے پیدا کی گئی ہے۔ لیکن اپنے اس مقام پر کھڑے ہونے کے لیے اور روحانی رفعتوں کے حصول کے لیے یہ نہایت ضروری ہے کہ اُٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے اور سوتے جاگتے اس طرح دعائیں کی جائیں کہ آپ کی خوابیں بھی استغفار سے معمور ہو جائیں۔“ (25)

پندرہ جون سے تیس جون تک کے حالات

جون کے آخری دو ہفتہ میں بھی جماعتِ احمدیہ کے خلاف فتنہ کی آگ بھڑکانے کی مہم پورے زور و شور سے جاری رہی۔ اور اب یہ فتنہ پرور اس بات کے لیے بھرپور کاوشیں کر رہے تھے کہ کسی طرح احمدیوں کا معاشی، معاشرتی اور کاروباری بائیکاٹ اتنا مکمل کیا جائے کہ اس کے دباؤ کے تحت ان کے لیے جینا ناممکن بنا دیا جائے اور وہ اپنے عقائد کو ترک کرنے پر مجبور ہو جائیں۔ ہم اس مرحلہ پر پڑھنے والوں کو یہ یاد دلاتے جائیں کہ جیسا کہ ہم 1973ء کی ہنگامی مجلسِ شوریٰ کے ذکر میں یہ بیان کر چکے ہیں کہ حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ نے اس وقت یہ فرمایا تھا کہ مخالفین یہ منصوبہ بنا رہے ہیں کہ احمدیوں پر اتنا معاشی اور اقتصادی دباؤ ڈالا جائے کہ وہ ان کے سامنے جھکنے پر مجبور ہو جائیں۔ اور 1974ء میں ہی مکہ مکرمہ میں رابطہ عالمِ اسلامی کا جو اجلاس ہوا تھا اس میں بھی یہ قرارداد منظور کی گئی تھی کہ احمدیوں کا معاشی اور اقتصادی بائیکاٹ کیا جائے اور ان کو سرکاری ملازمتوں میں نہ لیا جائے۔ اور اب فسادات شروع ہونے کے بعد ان مقاصد کے حصول کے لئے ہر طرح کا ناجائز ذریعہ استعمال کیا جا رہا تھا۔

سرگودھا کی دو دکانوں پر جلی حروف میں یہ اعلان لکھ کر لگایا گیا تھا کہ یہاں سے مرزائیوں کو سودا نہیں ملے گا۔ بعض اوقات جو احمدی گھروں سے باہر نکلتے تو ڈیوٹی پر مامور کچھ لڑکے ان سے استہزاء کرتے، ان پر موبل آئل پھینکتے۔ ان فتنہ پردازوں کی حالت اتنی پست ہو چکی تھی کہ 18/جون کو چنیوٹ میں ایک دس سالہ احمدی لڑکا جب گھر سے باہر نکلا تو اس کے کپڑوں کو آگ لگا دی گئی۔ لیکن خدا نے اس کی جان بچا لی۔ گوجر خان میں ایک بیمار احمدی دوائی لینے کے لیے نکلا تو پورے شہر میں اسے کسی نے دوائی بھی فروخت نہ کی۔ یہ لوگ احمدیوں کو تکلیف دینے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں کھونا چاہتے تھے خواہ اس کے لیے کتنی ہی پستی میں کیوں نہ گرنا پڑے۔ ان کے مظالم سے زندہ تو زندہ فوت شدہ بھی محفوظ نہ تھے۔ 22/جون کو خوشاب میں ایک احمدی کی قبر کو اکھیڑ کر اس کی بے حرمتی کی گئی۔ یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ انہیں فسادات کے دوران ضلع خوشاب میں قائدآباد کے مقام پر ایک بہت بڑا جلوس نکال کر احمدیوں کی چھ دکانوں کو نذرِ آتش کر دیا گیا، لائبریری جلائی گئی اور احمدیوں کو زدوکوب کیا گیا۔ اس ضلع میں بعض احمدیوں کے مکانوں کو آگ لگائی گئی اور بعض پر نشانات لگائے گئے کہ ان کو نذرِ آتش کرنا ہے لیکن پھر مفسدین کو کامیابی نہیں ہوئی۔ اسی ضلع میں 17/جون 1974ء کو ایک گاؤں چک 39 ڈی بی میں ایک بڑے جلوس نے محاصرہ کر لیا اور احمدیوں کو مرتد ہونے کے لئے الٹی میٹم دیا۔ احمدیوں کی فصلیں تباہ کی گئیں۔ اسی ضلع میں اکتوبر کے

مہینے میں روڈہ کے مقام پر احمدیوں کی مسجد کو شہید کر دیا گیا۔ اور پھگلہ صوبہ سرحد میں دو غیر احمدی احباب کا صرف اس وجہ سے بائیکاٹ کر دیا گیا کہ انہوں نے ایک احمدی کی تدفین میں شرکت کی تھی۔ 26/ جون کو فتح گڑھ میں ایک احمدی کی تدفین زبردستی رکوا دی گئی۔ ڈسکہ میں ایک احمدی کی چھ ماہ کی بچی فوت ہو گئی۔ جب تدفین کا وقت آگیا تو سات آٹھ سو افراد کا جلوس اسے روکنے کے لیے پہنچ گیا۔ سرکاری افسران سے مدد طلب کی گئی تو انہوں نے کسی مدد سے انکار کر دیا۔ ناچار بچی کو جماعت کی مسجد کے صحن میں ہی دفن کیا گیا۔ جب پاکستان میں ہر طرف وحشت و بربریّت رقص کر رہی تھی تو اس پس منظر میں اخبارات احمدیوں پر ہونے والے مظالم کا تو ذکر تک نہیں کر رہے تھے البتہ یہ سرخیاں بڑے فخر سے شائع کر رہے تھے کہ علماء کی اپیل پر احمدیوں کا مکمل سماجی اور اقتصادی بائیکاٹ شروع ہو گیا ہے۔ چنانچہ 16/ جون کو یہ خبر نوائے وقت کے صفحہ اوّل کی زینت بنی کہ تحریک ختم نبوت کی اپیل پر آج مسلمانوں نے قادیانیوں کا مکمل سماجی اور سوشل بائیکاٹ شروع کر دیا ہے اور یہ کہ قادیانیوں کے ریسٹورانٹ پر گاہکوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر تھی۔

اس مرحلہ پر پاکستان کے کچھ سیاسی لیڈر دوسرے ممالک کے سربراہان سے بھی اپیلیں کر رہے تھے کہ وہ قادیانیت کو کچلنے کے لیے اپنا اثر و رسوخ استعمال کریں اور اس طرح دوسرے ممالک کو پاکستان کے اندرونی معاملات میں مداخلت کرنے کی دعوت دی جا رہی تھی۔ چنانچہ جماعتِ اسلامی کے امیر طفیل محمد صاحب نے سعودی عرب کے شاہ فیصل کو ایک تار کے ذریعہ اپیل کی کہ پاکستان میں جو فتنہ قادیانیت نے سر اُٹھا رکھا ہے، اس کو کچلنے کے لیے اور اس کا مقابلہ کرنے کے لیے وہ اپنا اثر و رسوخ استعمال کریں۔ انہوں نے مزید لکھا کہ جس طرح رابطہ عالمِ اسلامی کے اجلاس میں قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دیا گیا تھا اسی طرح پاکستان میں بھی ہونا چاہئے اور لکھا کہ میں حرمین شریفین کے خادم ہونے کے ناطے سے اپیل کرتا ہوں کہ آپ اس مسئلہ میں اپنا اثر و رسوخ اور دوسرے ذرائع استعمال کریں (26)۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جب بھی جماعتِ احمدیہ کے خلاف ایسی شورش برپا کی گئی تو اس کے بہت سے کرتا دھرتا افراد کی پرورش بیرونی ہاتھ کرتے ہیں اور اس کے نتیجہ میں دوسرے ممالک کو اس ملک کے داخلی معاملات میں دخل دینے کا موقع مل جاتا ہے اور پھر یہ منحوس چکر چلتا رہتا ہے اور اس ملک کی پالیسیوں کی باگ ڈور بیرونی عناصر کے ہاتھ میں چلی جاتی ہے۔ بعد میں پاکستان میں جو حالات رونما ہوئے وہ اس بات کی صداقت کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ خادم حرمین شریفین یا کسی اور بیرونی سربراہِ مملکت کا یہ کام نہیں کہ پاکستان یا کسی اور ملک کے اندرونی معاملات میں مداخلت کرے لیکن یہ حکومتِ وقت کا کام بھی ہے کہ وہ اس چیز کا نوٹس لے اور یہ نوبت نہ آنے دے

کہ کسی بیرونی ہاتھ کو ملک میں مداخلت کا موقع ملے۔ جب ہم نے ڈاکٹر مبشر حسن صاحب سے یہ سوال کیا کہ کیا میاں طفیل محمد کا یہ بیان غیر ملکی سربراہ کو ملک کے اندرونی معاملات میں مداخلت کی دعوت دینے کے مترادف نہیں ہے۔ تو اس موقع پر جو سوال جواب ہوئے وہ یہ تھے۔

”ڈاکٹر مبشر حسن صاحب۔ ممکن ہے کہ انہوں نے وہ ان کے کہنے پر ہی کیا ہو کہ تم یہ demand کرو۔

سلطان: کس کے کہنے پر؟

ڈاکٹر مبشر حسن صاحب: باہر والوں کے۔

سلطان: شاہ فیصل کے کہنے پر؟

ڈاکٹر مبشر حسن صاحب: ہاں۔

سلطان: اچھا۔

ڈاکٹر مبشر حسن صاحب: ان کے یا کسی اور کے۔ جہاں سے بھی انہیں پیسے آتے تھے۔

سلطان: میاں طفیل محمد کو جماعتِ اسلامی کو پیسے ملتے تھے؟

مبشر حسن: ہاں ہاں۔

سلطان: ان کے کہنے پر انہوں نے کہا OK تم یہ کرو؟

ڈاکٹر مبشر حسن صاحب: ہاں تم یہ demand کرو بھئی ہم کر دیں گے۔ خود بخود ہم نے تو نہیں کیا۔ demand ہو رہی تھی بھائی عوام سے۔"

جب ہم نے عبد الحفیظ پیرزادہ صاحب سے سوال کیا کہ میاں طفیل محمد صاحب کا یہ بیان غیر ملکی مداخلت کو دعوت دینے کے مترادف نہیں تھا تو انہوں نے کہا:

Jamat e Islami always did it, JUI always did, JUP always did it”

جماعتِ اسلامی ہمیشہ یہی کرتی تھی، جمعیت علماءِ اسلام ہمیشہ یہی کرتی تھی، جمعیت علمائے پاکستان ہمیشہ یہی کرتی تھی۔

حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ نے 21/جون 1974ء کے خطبہ جمعہ میں احمدیوں کے خلاف بائیکاٹ کی مہم کا ذکر کر کے فرمایا کہ رسولِ کریمؐ کو اور آپ کے صحابہ کو شعبِ ابی طالب میں جو تکالیف پہنچائی گئیں وہ بہت زیادہ تھیں۔ اور پھر آپ کا مکی

دور تکالیف کا دور تھا۔ ان کی محبت کا تقاضا ہے کہ اگر دسیوں برس تک بھی ہمیں تکالیف اُٹھانی پڑیں تو ہم اس پیار کے نتیجہ میں دنیا پر ثابت کر دیں کہ جو لوگ خدا تعالیٰ کی معرفت رکھتے ہیں اور محمدؐ کے ساتھ پیار کرتے ہیں جوع کی حالت بھی ان کی وفا کو کمزور نہیں کرتی۔ وہ اسی طرح عشق میں مست رہتے ہیں جس طرح پیٹ بھر کر کھانے والا شخص مست رہتا ہے۔ ان دنوں جماعت کے خلاف حلقوں کی طرف سے یہ مطالبہ بڑے زور شور سے کیا جا رہا تھا کہ احمدیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا جائے۔ حضور نے اس نامعقول مطالبہ کا تجزیہ کرتے ہوئے فرمایا کہ دنیا بھر میں ایک شخص کا مذہب وہی سمجھا جاتا ہے جس کی طرف وہ خود اپنے آپ کو منسوب کرتا ہو۔ حضور نے اس ضمن میں چین جیسے کمیونسٹ مذہب کی مثال دی۔ اور اس ضمن میں ان کے قائد چیئرمین ماؤ کے کچھ اقتباسات پڑھ کر سنائے۔ اور فرمایا کہ کسی حکومت کا یہ حق نہیں کہ وہ فیصلہ کرے کہ کسی شہری کا مذہب کیا ہے۔ اور یو این او کے انسانی حقوق کے منشور کا حوالہ دیا جس پر پاکستان نے دستخط کیے ہوئے ہیں۔ اور پھر اس مضمون پر پاکستان کے آئین کا تجزیہ کرتے ہوئے حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ نے فرمایا:۔

”آخر میں میں اپنے دستور کو لیتا ہوں ہمارا موجودہ دستور جو عوامی دستور ہے، جو پاکستان کا دستور ہے۔ وہ دستور جس پر ہمارے وزیرِ اعظم صاحب کو بڑا فخر ہے، وہ دستور جو ان کے اعلان کے مطابق دنیا میں پاکستان کے بلند مقام کو قائم کرنے والا اور اس کی عزت اور احترام میں اضافہ کا موجب ہے، یہ دستور ہمیں کیا بتاتا ہے؟ اس دستور کی بیسویں دفعہ یہ ہے

(a)Every Citizen shall have the right to profess, practice and propagate his religion and

(b) Every religious denomination and every sect thereof shall have the right to maintain and manage its religious institution .

اس کا مطلب یہ ہے کہ پاکستان کے ہر شہری کو ہمارا یہ دستور جو ہمارے لیے باعثِ فخر ہے یہ ضمانت دیتا ہے کہ جو اس کا مذہب ہو اور جس مذہب کا وہ خود اپنے لئے فیصلہ کرے وہ اس کا مذہب ہے۔ (بھٹو صاحب یا مفتی محمود صاحب یا مودودی صاحب نہیں بلکہ) جس مذہب کے متعلق وہ فیصلہ کرے وہی اس کا مذہب ہے اور وہ اس کا زبانی اعلان کر سکتا ہے۔ یہ دستور اسے حق دیتا ہے کہ وہ یہ اعلان کرے کہ میں مسلمان ہوں کہ نہیں اور اگر وہ یہ اعلان کرے کہ میں مسلمان ہوں تو یہ آئین جس پر پیپلز پارٹی کو بھی فخر ہے (اور ہمیں بھی فخر ہے اس لئے یہ دفعہ اس میں آ گئی ہے) یہ دستور کہتا ہے کہ ہر شہری کا یہ حق

ہے کہ وہ اعلان کرے کہ میں مسلمان ہوں یا مسلمانوں کے اندر میں وہابی ہوں یا اہلِ حدیث ہوں یا اہلِ قرآن ہوں یا بریلوی ہوں (وغیرہ وغیرہ تہتر فرقے ہیں) یا احمدی ہوں تو یہ ہے مذہبی آزادی۔۔۔۔۔

پس ہزار ادب کے ساتھ اور عاجزی کے ساتھ یہ عقل کی بات ہم حکومت کے کان تک پہنچانا چاہتے ہیں کہ جس کا تمہیں انسانی فطرت نے اور سرشت نے حق نہیں دیا جس کا تمہیں حکومتوں کے عمل نے حق نہیں دیا، جسکا تمہیں یو این او کے Human Rights نے (جس پر تمہارے دستخط ہیں) حق نہیں دیا، چین جیسی عظیم سلطنت جو مسلمان نہ ہونے کے باوجود اعلان کرتی ہے کہ کسی کو یہ حق نہیں کہ کوئی شخص Profess کچھ کر رہا ہو اور اس کی طرف منسوب کچھ اور کر دیا جائے۔ میں کہتا ہوں میں مسلمان ہوں، کون ہے دنیا میں جو یہ کہے گا کہ تم مسلمان نہیں ہو۔ یہ کیسی نامعقول بات ہے۔ یہ ایسی نامعقول بات ہے کہ جو لوگ دہریہ تھے انہیں بھی سمجھ آگئی۔ پس تم وہ بات کیوں کرتے ہو جس کا تمہیں تمہارے اس دستور نے حق نہیں دیا۔۔" (27)

ایک طرف تو جماعتِ احمدیہ کے متعلق حکومت اور اپوزیشن دونوں کے ارادے اچھے نہیں معلوم ہو رہے تھے اور دوسری طرف ملک میں احمدیوں پر ہر قسم کا ظلم کیا جا رہا تھا تا کہ وہ اس دباؤ کے تحت اپنے عقائد ترک کر دیں۔ لیکن جب ابتلاؤں کی شدت اپنی انتہا پر پہنچی ہو تو ایک عارف باللہ یہ دیکھ رہا ہوتا ہے کہ ان مشکلات کے ساتھ اللہ کی نصرت آ رہی ہے۔ چنانچہ 28 جون کے خطبہ جمعہ میں حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ نے فرمایا:۔

"ہمارا زمانہ خوش رہنے، مسکراتے رہنے اور خوشی سے اچھلنے کا زمانہ ہے۔ ہمیں اللہ تعالیٰ نے یہ بشارت دی ہے کہ اس زمانہ میں نبی اکرمؐ کا جھنڈا دنیا کے ہر ملک میں گاڑا جائے گا۔ اور دنیا میں بسنے والے ہر انسان کے دل کی دھڑکنوں میں محمدؐ کی محبت اور پیار دھڑکنے لگے گا۔ اس لئے مسکراؤ!۔

مجھے یہ خیال اس لئے آیا کہ بعض چہروں پر میں نے مسکراہٹ نہیں دیکھی۔ ہمارے تو ہنسنے کے دن ہیں۔ نبی اکرمؐ کی فتح اور غلبہ کی جسے بشارت ملی ہو وہ ان چھوٹی چھوٹی باتوں کو دیکھ کر دل گرفتہ نہیں ہوا کرتا اور جو دروازے ہمارے لیے کھولے گئے ہیں وہ آسمانوں کے دروازے ہیں۔" (28)

جماعتِ احمدیہ کی مخالفت اتنی اندھی ہو چکی تھی کہ ان فسادات کے دوران ایک گیارہ برس کے احمدی بچے کو بھی ہجکہ نامی گاؤں سے گرفتار کر لیا گیا۔ پولیس اس بچے کو گرفتار کرنے کے لئے آئی تو سپاہی ہتھکڑی لگانے لگے۔ بچے کی عمر اتنی چھوٹی

تھی کہ ہتھکڑی لگائی گئی تو وہ بازو سے نکل گئی۔ اس پر پولیس والے نے صرف بازو سے پکڑ کر گرفتار کرنے پر اکتفا کیا۔ البتہ اتنی مہربانی کی کہ اس بچے کو اپنے بھائیوں سمیت جیل میں اس احاطے میں رکھا گیا جہاں پر ربوہ سے گرفتار ہونے والے اسیران کو رکھا گیا تھا۔ اس احاطے میں سات کوٹھریاں تھیں۔ اسیران کو شام چار بجے کوٹھریوں میں بند کر دیا جاتا اور صبح چار بجے وہاں سے نکال دیا جاتا۔ ان کا وقت یا تو دعاؤں میں گزرتا یا پھر دل بہلانے کو کوئی کھیل کھیلنے لگ جاتے۔ مغرب عشاء کے وقت جب ہر کوٹھری سے اذان دی جاتی تو جیل کی فضاء اذانوں سے گونج اُٹھتی۔ جیل میں کھانا اتنا ہی غیر معیاری دیا جاتا جتنا پاکستان کی جیلوں میں دیا جاتا ہے۔ صبح کے وقت گڑ اور چنے ملتے اور شام کو بدمزہ دال روٹی ملتی۔ گرمی کے دن تھے اور جیل میں پنکھا تک موجود نہیں تھا البتہ حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ نے وہاں پر پنکھے لگانے کا انتظام فرما دیا تھا۔ اَسّی افراد کے لئے ایک لیٹرین تھی جس کی دن میں صرف ایک مرتبہ صفائی ہوتی تھی۔ اور اگر کوٹھریوں میں جانے کے بعد بارہ گھنٹے کے دوران کسی کو قضائے حاجت کی ضرورت محسوس ہوتی تو اسے لیٹرین میں جانے کی اجازت بھی نہیں ہوتی تھی اور اس کے لیے ناقابلِ بیان صورت پیدا ہو جاتی تھی۔ جب یہ گیارہ سالہ بچہ اپنے رشتہ داروں سمیت رہا ہوا تو اس کے والد ملک ولی محمد صاحب حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ کے ساتھ ملاقات کرنے گئے مگر اس بچے کو اپنے ساتھ نہ لے کر گئے حضور نے اس بچے کے بارہ میں دریافت کرنے کے بعد ارشاد فرمایا کہ اس بچے کو بھی ملاقات کے لئے لاؤ۔ جب یہ بچہ حضور سے ملاقات کے لئے حاضر ہوا تو حضور نے گلے لگا کر پیار کیا اور پرائیویٹ سیکریٹری کو ارشاد فرمایا کہ ان کی تصویریں بنانے کا انتظام کیا جائے۔ یہ بچہ اب تک تاریخِ احمدیت کا سب سے کم عمر اسیر ہے۔ یہ اسیر مبشر احمد خالد صاحب مربی سلسلہ ہیں۔

پاکستان کی قومی اسمبلی پر مشتمل ایک سپیشل کمیٹی قائم ہوتی ہے

پاکستان کے وزیرِ اعظم ذوالفقار علی بھٹو صاحب اس بات کا اظہار کر چکے تھے کہ جب قومی اسمبلی بجٹ کے معاملات سے فارغ ہو گی، قادیانی مسئلہ قومی اسمبلی میں پیش کیا جائے گا تا کہ اس دیرینہ مسئلہ کا کوئی حل نکالا جائے۔ 30/جون 1974ء کو قومی اسمبلی میں بجٹ کی کارروائی ختم ہوئی، اس موقع پر وزیر اعظم بھی ایوان میں موجود تھے۔ اس مرحلہ پر اپوزیشن کے ممبران نے ایک قرارداد پیش کی کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے پیروکاروں کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا جائے۔ اس پر وزیر قانون عبدالحفیظ پیرزادہ صاحب نے کہا کہ حکومت اصولی طور پر اس قرارداد کی مخالفت نہیں کرتی بلکہ اس کا خیر مقدم کرتی ہے۔ وزیرِ قانون نے تجویز دی کہ کارروائی کو دو گھنٹے کے لیے ملتوی کر دیا جائے تا کہ حکومت اپوزیشن کے مشورہ کے ساتھ کوئی قرارداد تیار کر سکے یہ تجویز منظور کر لی گئی۔ ان دو گھنٹوں میں سپیکر کے کمرہ میں ایک میٹنگ ہوئی۔ جس میں وزیر قانون پیرزادہ صاحب، سیکریٹری قانون محمد افضل چیمہ صاحب، پنجاب کے وزیرِ اعلیٰ حنیف رامے صاحب اور اپوزیشن کے ممبران میں سے مفتی محمود صاحب، شیر باز مزاری صاحب، شاہ احمد نورانی صاحب، غلام فاروق صاحب اور سردار شوکت حیات صاحب نے شرکت کی۔ اپوزیشن کے ممبران نے یہ واضح کیا کہ وہ ہر قیمت پر اپنی قرارداد کو ایوان میں پیش کریں گے۔ اس وقفہ میں مشورہ کے بعد ایوان کا اجلاس دوبارہ شروع ہوا۔ اس میں وزیرِ قانون نے قرار داد پیش کی کہ ایک سپیشل کمیٹی قائم کی جائے جو ایوان کے تمام اراکین پر مشتمل ہو۔ اور سپیکر اسمبلی اس کے چیئرمین کے فرائض ادا کریں۔ اس کمیٹی کے سپرد مندرجہ ذیل تین کام ہوں گے۔

1)۔ اسلام میں اس شخص کی کیا حیثیت ہے جو حضرت محمدؐ کو آخری نبی نہ مانتا ہو۔

2)۔ ایک مقررہ وقت میں ممبران کمیٹی سے قراردادیں اور تجاویز وصول کرنا اور ان پر غور کرنا۔

3)۔ غور کرنے، گواہوں کا بیان سننے اور دستاویزات کا مطالعہ کرنے کے بعد اس مسئلہ کے متعلق تجاویز مرتب کرنا۔

اس کے ساتھ وزیرِ قانون نے کہا کہ اس کمیٹی کی کارروائی بند کمرہ میں (In Camera) ہو گی۔

ایوان نے متفقہ طور پر یہ قرارداد منظور کر لی۔ اس کے بعد اپوزیشن کے 22 اراکین کے دستخطوں کے ساتھ ایک قرارداد پیش کی گئی۔ ایوان میں اس قرارداد کو شاہ احمد نورانی صاحب نے پیش کیا اس پر مختلف پارٹیوں کے اراکین کے دستخط تھے۔ اس قرارداد کے الفاظ تہذیب سے کلیۃً عاری تھے۔

اس قرارداد کے الفاظ تھے

”چونکہ یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ مرزا غلام احمد قادیانی نے حضرت محمدؐ کے بعد جو اللہ کے آخری نبی ہیں نبوت کا دعویٰ کیا۔

اور چونکہ اس کا جھوٹا دعویٰ نبوت، قرآنِ کریم کی بعض آیات میں تحریف کی سازش اور جہاد کو ساقط کر دینے کی کوشش، اسلام کے مسلّمات سے بغاوت کے مترادف ہے۔

اور چونکہ وہ سامراج کی پیداوار ہے جس کا مقصد مسلمانوں کے اتحاد کو پارہ پارہ کرنا ہے۔

چونکہ پوری امتِ مسلمہ کا اس بات پر کامل اتفاق ہے کہ مرزا غلام احمد کے پیروکار خواہ مرزا غلام احمد کو نبی مانتے ہوں یا اسے کسی اور شکل میں اپنا مذہبی پیشوا یا مصلح مانتے ہوں وہ دائرہ اسلام سے خارج ہیں۔

چونکہ اس کے پیروکار خواہ انہیں کسی نام سے پکارا جاتا ہو۔ وہ دھوکا دہی سے مسلمانوں کا ہی ایک فرقہ بن کر اور اس طرح ان سے گھل مل کر اندرونی اور بیرونی طور پر تخریبی کارروائیوں میں مصروف ہیں۔

چونکہ پوری دنیا کے مسلمانوں کی تنظیموں کی ایک کانفرنس میں جو 6 تا 10/ اپریل مکہ مکرمہ میں رابطہ عالمِ اسلامی کے زیر اہتمام منعقد ہوئی، جس میں دنیا بھر کی 140 مسلم تنظیموں اور انجمنوں نے شرکت کی اس میں کامل اتفاقِ رائے سے یہ فیصلہ کر دیا گیا کہ قادیانیت جس کے پیروکار دھوکا دہی سے اپنے آپ کو اسلام کا ایک فرقہ کہتے ہیں۔ دراصل اس فرقہ کا مقصد اسلام اور مسلم دنیا کے خلاف تخریبی کارروائیاں کرنا ہے اس لئے اب یہ اسمبلی اعلان کرتی ہے کہ مرزا غلام احمد کے پیروکار خواہ انہیں کسی نام سے پکارا جاتا ہو مسلمان نہیں ہیں اور یہ کہ اسمبلی میں ایک سرکاری بل پیش کیا جائے تاکہ اس اعلان کو دستور میں ضروری ترامیم کے ذریعے عملی جامہ پہنایا جا سکے اور یہ کہ اسلامی جمہوریہ پاکستان میں ایک غیر مسلم اقلیت کی حیثیت سے ان کے جائز حقوق کا تحفظ کیا جا سکے۔“

وزیرِ قانون نے اس قرارداد میں جو انہوں نے پیش کی تھی اور اپوزیشن کی پیش کردہ قرارداد میں مشترکہ امور کی نشاندہی کی۔ ایوان نے اس قرارداد کو بھی سپیشل کمیٹی میں پیش کرنے کی منظوری دے دی۔ (29تا31)

اب یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ ابھی اس موضوع پر اسمبلی کی باقاعدہ کارروائی شروع ہی نہیں ہوئی اور ابھی جماعتِ احمدیہ کا موقف سنا ہی نہیں گیا تو اپوزیشن ایک مشترکہ قرارداد پیش کرتی ہے کہ احمدیوں کو آئین میں غیر مسلم قرار دیا جائے اور حکومت یہ کہتی ہے کہ ہم اس قرارداد کا خیر مقدم کرتے ہیں تو باقی کیا رہ گیا۔ اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ ابھی کارروائی شروع نہیں ہوئی تھی کہ اصل میں فیصلہ ہو چکا تھا اور بعد میں جو کچھ کارروائی کے نام پر ہوا وہ محض ایک ڈھونگ تھا۔ جب ہم نے ڈاکٹر مبشر حسن صاحب سے اس بارے میں سوال کیا تو ان کا جواب تھا کہ مجھے صحیح تو معلوم نہیں لیکن یہ ہوا ہو گا کہ جب قرارداد پیش ہوئی ہو گی تو پیرزادہ صاحب بھٹو صاحب کے پاس گئے ہوں گے کہ یہ قرارداد ہے اب کیا Attitude لیں۔ تو بھٹو صاحب نے کہا ہو گا کہ پیش ہونے دو۔ مخالفت نہ کرو۔ تو اب انہیں یہ سمجھ میں نہیں آئی کہ کیا الفاظ استعمال کریں۔ تا کہ یہ کہہ بھی دیں اور ان الفاظ میں نہ کہیں اب تو پکڑے گئے۔ اور پھر جب ہم نے یہ بات دہرائی کہ یہ واقعہ تو 30 جون کا ہے تو ڈاکٹر مبشر حسن صاحب نے کہا۔

”ہاں بالکل بیوقوف تھا لاء منسٹر۔ اگر وہ بھٹو صاحب کا ساتھی ہوتا تو اس طرح انہیں expose نہ کرتا۔“

جب انہیں کہا گیا کہ یہ تو انصاف سے بعید ہے کہ ایک فرقہ کا موقف سنے بغیر آپ فیصلہ سنا دیں۔ اس پر ان کا جواب تھا۔

”نیت تو ہو گئی تھی۔“

جب ہم نے یہ سوال اس وقت کے سپیکر صاحب صاحبزادہ فاروق علی خان صاحب سے پوچھا کہ جب اپوزیشن نے یہ قرارداد پیش کی تو حکومت نے کہا کہ ہم اس کا خیر مقدم کرتے ہیں تو اس کا مطلب ہے کہ اس وقت تک فیصلہ ہو چکا تھا تو ان کا جواب تھا:

”نہیں وہ اس سے پہلے جائیں ناں رابطہ عالمِ اسلامی کی طرف“

اس پر ہم نے کہا۔

”مطلب یہ کہ اس وقت Decide ہو چکا تھا“

اس پر صاحبزادہ فاروق علی خان صاحب نے کہا:

”Decide نہیں مطلب یہ ہے کہ They were planning like that، Decision اور ہوتا ہے planning اور ہوتی ہے۔

اب قارئین یہ بات صاف صاف دیکھ سکتے ہیں کہ اس وقت کے قومی اسمبلی کے سپیکر صاحب کے نزدیک جس وقت رابطہ عالمِ اسلامی کے اجلاس میں جماعتِ احمدیہ کے خلاف قرارداد منظور کی گئی اسی وقت اس چیز کا منصوبہ بن چکا تھا کہ پاکستان کے آئین میں احمدیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینا ہے۔ اب یہ محض اتفاق نہیں ہو سکتا کہ ڈیڑھ ماہ میں ربوہ کے سٹیشن پر واقعہ بھی ہو جائے اور اس کے نتیجہ میں ملک گیر فسادات بھی شروع ہو جائیں، جس کے نتیجہ میں یہ مطالبہ پورے زور و شور سے پیش کیا جائے کہ آئین میں ترمیم کر کے احمدیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا جائے۔ پڑھنے والے یہ خود دیکھ سکتے ہیں کہ ہمیں لازماً یہ ماننا پڑے گا کہ ان فسادات کو بھی ایک پلان کے تحت شروع کرایا گیا تھا۔

اگلے روز یکم جولائی کو اس سپیشل کمیٹی کا اجلاس شروع ہوا اور یہ اجلاس ڈیڑھ گھنٹہ جاری رہا۔ اس اجلاس میں یہ منظور کیا گیا کہ اس کمیٹی کی تمام کارروائی بصیغہ راز رکھی جائے گی۔ اور سوائے سرکاری اعلامیہ کے اس بارے میں کوئی خبر شائع نہیں کی جائے گی۔ اور یہ بھی قرار پایا کہ یہ کمیٹی پانچ جولائی تک تجاویز کو وصول کرے گی۔ اور اس کا اگلا اجلاس 3 / جولائی کو ہو گا جس میں مزید قواعد و ضوابط طے کیے جائیں گے۔ (33,32)

یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ آغاز سے ہی بڑے زور و شور سے اس بات کا اہتمام کیا جا رہا تھا کہ تمام کارروائی کو خفیہ رکھا جائے اور کسی کو کان و کان خبر نہ ہو کہ کارروائی کے دوران کیا ہوا۔ حالانکہ اس کمیٹی میں ملک کے دفاعی رازوں پر تو بات نہیں ہونی تھی کہ اس کو خفیہ رکھنے کی ضرورت ہو۔ اس کے دوران تو جماعت کی طرف سے اور جماعت کے مذہبی مخالفین کی طرف سے مذہبی دلائل پیش ہونے تھے اور دلائل کا یہ تبادلہ کوئی نوے سال سے جاری تھا۔ یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ ایسا اس لیے کیا جا رہا تھا تا کہ امنِ عامہ کی حالت خراب نہ ہو کیونکہ جہاں جہاں فسادات کی آگ بھڑکائی جا رہی تھی، ایسے اکثر مقامات پر تو قانون نافذ کرنے والے ادارے یا تو خاموش تماشائی بن کر کھڑے تھے یا پھر مفسدین کی اعانت کر رہے تھے۔ لیکن جب وزیرِ اعظم بھٹو صاحب نے اس مسئلہ پر 3 / جون کو ایوان میں تقریر کی تو اس بات کا اشارہ دیا کہ اس ضمن میں کارروائی In Camera کی جا سکتی ہے۔ جب وزیرِ قانون نے تمام ایوان کو سپیشل کمیٹی میں تبدیل کر کے کارروائی شروع کرنے کی تجویز

پیش کی تو ساتھ ہی یہ بھی واضح کر دیا کہ کارروائی In Camera ہو گی۔ تمام ایوان کا سپیشل کمیٹی کے طور پر اجلاس شروع ہوا تو پھر یہ قانون منظور کیا گیا کہ کارروائی In Camera ہو گی۔ آخر وزیر اعظم سے لے کر نیچے تک سب کورس میں اس بات کا ورد کیوں کر رہے تھے کہ کارروائی خفیہ ہو اور سرکاری اعلان کے علاوہ اس پر کوئی بات پبلک میں نہ آئے۔ یہ اس لیے تھا کہ نوے سال کا تجربہ انہیں یہ بات تو سکھا چکا تھا کہ وہ دلائل میں جماعت احمدیہ کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ ورنہ جماعت نے جن پر ہر قسم کے مظالم ہو رہے تھے کبھی اس بات کا مطالبہ پیش ہی نہیں کیا تھا کہ اس کارروائی کو منظر عام پر نہ لایا جائے۔

تین جولائی کو کارروائی پھر سے شروع ہوئی اور مزید قواعد بنائے گئے اور ایک بار پھر In Camera یعنی خفیہ کارروائی کے اصول کا سختی سے اعادہ کیا گیا۔ منظور شدہ قواعد میں قاعدہ نمبر 3 یہ تھا۔

Secret Sittings –The sittings of the committee shall be held in camera and no strangers shall be permitted to be present at the sittings except the secretary and secretary Ministry of law and parliamentary affairs, and such officers and staff as the chairman may direct.

یعنی کمیٹی کے اجلاسات خفیہ ہوں گے اور سوائے سیکریٹری اور سیکریٹری وزارت قانون اور پارلیمانی امور اور ان افسران کے علاوہ جن کی بابت صاحبِ صدر ہدایت جاری کریں کوئی شخص ان اجلاسات کو ملاحظہ نہیں کر سکے گا۔ ویسے تو اپوزیشن اور حکومت کے اراکین ہر معاملہ میں ایک دوسرے سے دست و گریبان رہتے تھے لیکن اس معاملہ میں اپوزیشن کی طرف سے بھی یہ نکتہ اعتراض نہیں اُٹھایا گیا کہ اس قدر خفیہ کارروائی کی ضرورت کیا ہے۔ انہیں بھی یہی منظور تھا کہ اس کارروائی کو منظرِ عام پر نہ لایا جائے۔ (34)

اس اجلاس میں بارہ رکنی ایک راہبر کمیٹی (Committee Steering) بھی قائم کی گئی جس میں اپوزیشن اور حکومت دونوں کے اراکین شامل تھے۔ بعد میں اس میں مزید اراکین کا اضافہ کر دیا گیا۔ اور یہ طے پایا کہ 6/ جولائی کی صبح کو راہبر کمیٹی کا اجلاس ہو اور اسی شام کو پوری قومی اسمبلی پر مشتمل سپیشل کمیٹی کا اجلاس ہو۔ وزیرِ قانون عبد الحفیظ پیرزادہ صاحب اس راہبر کمیٹی کے کنوینر مقرر ہوئے اور یہ فیصلہ ہوا کہ 6/ جولائی کی صبح کو اس راہبر کمیٹی کا اجلاس ہو گا اور شام کو پورے ایوان پر مشتمل سپیشل کمیٹی کا اجلاس ہو گا۔

یہاں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ 4/ جولائی 1974ء کو ناظر اعلیٰ صدر انجمن احمدیہ حضرت صاحبزادہ مرزا منصور احمد صاحب نے قومی اسمبلی کی کمیٹی کے صدر کو لکھا کہ

A delegation of the Ahmadiyya Movement in Islam comprising of the following members may kindly be allowed to present material with regard to our belief in Khatme Nabbuwat -finality of the prophet hood of the Holy Prophet Muhammad may peace and blessing of Allah be on him and to depose as witnesses

(1)Maulana Abul Ata (2) Sheikh Muhammad Ahmad Mazhar (3) Mirza Tahir Ahmad (4) Maulvi Dost Muhammad.

یعنی جماعت کی طرف سے چار اراکین نامزد کئے گئے جو کہ اس موقع پر جماعت کے وفد کے اراکین کی حیثیت سے جماعت کا مؤقف پیش کرنے کے لئے جائیں گے۔ یہ چاراراکین مکرم مولانا ابوالعطاء صاحب، مکرم شیخ محمد احمد مظہر صاحب، حضرت صاحبزادہ مرزا طاہر احمد صاحب اور مکرم مولوی دوست محمد شاہد صاحب تھے۔

8/ جولائی 1974ء کو قومی اسمبلی کے سیکریٹری کی طرف سے جواب موصول ہوا:۔

The special committee has permitted you to file a written statement of your views and produce documents etc. in support. Thereof, the committee has also agreed to hear your delegation provided it is headed by chief of your Jammat. Oral statement or speech will not be allowed and only the written statement may be read before the committee. After hearing the statement and examining the documents the committee will put question to the chief of the jamaat. Please file your statement along with documents etc. with the secretory National Assembly by six p.m. on eleventh July.

یعنی اس ٹیلیگرام میں کہا گیا تھا کہ سپیشل کمیٹی جماعت کی طرف سے تحریری بیان کو قبول کرے گی اور اس کے ساتھ دوسری دستاویزات بھیجی جاسکتی ہیں۔ جماعت کے وفد کا موقف اس شرط پر سنا جائے گا کہ اس کی قیادت جماعت کے امام کر رہے ہوں۔ کمیٹی کے سامنے تحریری بیان پڑھا جائے گا زبانی بیان یا تقریر کی اجازت نہیں ہوگی۔ اس بیان کے بعد سپیشل کمیٹی جماعت کے سربراہ سے سوالات کرے گی۔ براہ مہربانی اپنا بیان شام چھ بجے 11/ جولائی تک جمع کرا دیں۔

اب یہ عجیب صورت حال پیدا کی جارہی تھی کہ جماعت کا وفد اس کمیٹی کے سامنے پیش ہونا تھا تو یہ اختیار بھی جماعت کو ہی تھا کہ وہ جسے پسند کرے اس وفد کا رکن یا سربراہ مقرر کرے لیکن یہاں پر قومی اسمبلی کی کمیٹی بیٹھی یہ فیصلہ بھی کر رہی تھی کی کہ جماعت کے وفد میں کسے شامل ہونا چاہئے۔ لیکن اس اندھیر نگری میں عقل کو کون پوچھتا تھا۔

چنانچہ 13/ جولائی 1974ء کو ناظر اعلیٰ صدر انجمن احمدیہ صاحبزادہ مرزا منصور احمد صاحب نے سیکریٹری صاحب قومی اسمبلی کو ایک خط تحریر فرمایا جس کے آخر میں آپ نے لکھا

"I find it very strange that you propose to appoint the head of delegation. I think the delegation being ours the choice as to who should lead it should also be ours".

یعنی یہ بات میرے لئے حیرت کا باعث ہے کہ آپ ہمارے وفد کا سربراہ مقرر کر رہے ہیں۔ اگر یہ وفد ہمارا وفد ہے تو یہ فیصلہ بھی ہمارا ہونا چاہئے کہ اس کی قیادت کون کرے گا؟ لیکن یہ عقل کی بات منظور نہیں کی گئی۔

چنانچہ یہ تحریری موقف ایک محضر نامہ کی صورت میں تیار کیا گیا اور مکرم محمد شفیق قیصر صاحب مرحوم اس محضر نامہ کی ایک کاپی مکرم مجیب الرحمن صاحب کے پاس لے کر آئے کہ وہ اسے داخل کرائیں۔ چنانچہ مکرم مجیب الرحمان صاحب نے یہ کاپی قومی اسمبلی کے سیکریٹری جنرل الیاس صاحب کے حوالے کی۔ انہوں نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ کیا یہ ممکن ہے کہ اسمبلی کی کارروائی شروع ہونے سے قبل تمام ممبرانِ اسمبلی کو اس کی ایک ایک کاپی دی جائے۔ چنانچہ مجیب الرحمن صاحب نے فون پر حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ سے اس بابت عرض کیا۔ چنانچہ دو تین دن کے اندر مکرم شفیق قیصر صاحب ایک گاڑی میں اس کی شائع کردہ مطلوبہ کاپیاں لے کر آگئے۔ ابھی اس کی جلدیں گیلی تھیں کہ یہ کاپیاں سیکریٹری اسمبلی کے حوالہ کی گئیں (35)۔

اس محضر نامے کے ساتھ کچھ Annexures بھی اجازت لے کر جمع کرائے گئے تھے۔ ان کی فہرست یہ ہے:۔

(1) An extract from 'the Anatomy of Liberty' by William O. Douglas

(2) Muslims by Hazrat Khalifa tul Masih Third We are

(3) Fazaluddin Press release by Mr. Joshua

(4) فتاویٰ تکفیر

(5) مقربانِ الٰہی کی سرخروئی از مولوی دوست محمد شاہد صاحب

(6) القول المبین از مولانا ابو العطاء صاحب

(7) خاتم الانبیاءؐ

(8) مقامِ ختمِ نبوت از حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ

(9) ہم مسلمان ہیں از حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ

(10) ہمارا موقف

(11) عظیم روحانی تجلّیات از حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ

(12) حضرت بانیِ سلسلہ پر تحریفِ قرآن کے بہتان کی تردید

(13) مودودی شہ پارے

(حضرت مولانا دوست محمد شاہد صاحب کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ کچھ ضمیمہ جات ان کے بعد بھی جمع کرائے گئے تھے ان کی فہرست یہ ہے:۔

1۔ آزاد کشمیر اسمبلی کی قرارداد پر تبصرہ۔ خطبہ جمعہ حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ

2۔ تحریکِ پاکستان میں جماعتِ احمدیہ کا کردار از مکرم مولانا دوست محمد شاہد صاحب

پندرہ جولائی کو وزیرِ قانون نے ایک پریس کانفرنس میں ان کمیٹیوں کی کارگزاری بیان کی۔ انہوں نے پریس کو بتایا کہ راہبر کمیٹی میں حکومتی اراکین کے علاوہ جماعتِ اسلامی، جمعیت العلماء اسلام اور جمعیت العلماءِ پاکستان کے اراکینِ اسمبلی بھی شامل ہیں۔ لاہور اور ربوہ دونوں کی جماعتوں کو کہا گیا تھا کہ وہ اپنا تحریری موقف جمع کرائیں۔ ربوہ کی جماعت کی طرف سے 198 صفحات پر مشتمل ایک کاپی موصول ہوئی ہے اور انہیں کہا گیا ہے کہ وہ 15/ جولائی تک اس کی 250 کاپیاں جمع کرائیں۔ اور دونوں جماعتوں سے کہا گیا ہے کہ وہ ان پر اپنی جماعتوں کے سربراہوں کے دستخط کرائیں۔ مختلف افراد کی طرف سے 514 تحریری آراء موصول ہوئی ہیں جن میں سے 268 قادیانیوں کے خلاف اور 246 قادیانیوں کے حق میں ہیں۔ اس کے علاوہ مختلف تنظیموں کی طرف سے تحریری آراء موصول ہوئی ہیں۔ ان میں سے 11 قادیانیوں کے خلاف اور 4 قادیانیوں کے حق میں اور ایک غیر جانبدار ہے۔ پیرزادہ صاحب نے کہا کہ مختلف حکومتوں کی امداد یافتہ تنظیموں کی طرف سے بالواسطہ یا بلاواسطہ طور پر اظہارِ خیال کرنے کی درخواستیں موصول ہوئی ہیں۔ لیکن ابھی ان کی مدد کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ ایک دیرینہ اور پیچیدہ مسئلہ ہے اور سابقہ حکومتیں اسے حل نہیں کر سکی تھیں۔ راہبر کمیٹی نے اپنی تجاویز سپیشل کمیٹی میں بھجوائی تھیں اور سپیشل کمیٹی نے انہیں منظور کر لیا ہے۔ دونوں جماعتوں کے وفود کے موقف کو سنا جائے اور ان وفود میں ان جماعتوں کے سربراہان کو بھی شامل ہونا چاہیئے۔ اس کے بعد سپیشل کمیٹی کے اراکین اٹارنی جنرل کی وساطت سے ان وفود سے سوالات کر سکتے ہیں۔ (36)

جیسا کہ ابھی ہم نے ذکر کیا ہے کہ یہ فیصلہ ہوا تھا کہ قومی اسمبلی کے اراکین اٹارنی جنرل صاحب کی وساطت سے سوال کریں گے یعنی وہ سوال لکھ کر اٹارنی جنرل صاحب کو دیں گے اور اٹارنی جنرل صاحب وفد سے سوال کریں گے۔ یحیٰی بختیار صاحب نے اپنی عمر کے آخری سالوں میں 74ء کی کارروائی کے متعلق ایک انٹرویو دیا اور اس میں یہ دعویٰ کیا کہ یہ اس لئے کیا گیا تھا کہ احمدیوں کو خیال تھا کہ اگر مولوی ہم سے سوال کریں گے تو ہماری بے عزتی کریں گے اس لئے جے اے رحیم نے یہ تجویز دی کہ سوالات اٹارنی جنرل کی وساطت سے پوچھے جائیں۔

(تحریکِ ختم نبوت جلد سوم، ص 872، مصنفہ اللہ وسایا صاحب، ناشر عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت، حضوری باغ روڈ ملتان، جون 1995ء)

ان کے اس بیان سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حکومت اس وقت احمدیوں کے جذبات کا اس قدر خیال رکھ رہی تھی کہ انہیں اس بات کی بھی بہت پرواہ تھی کہ کہیں احمدیوں کی بے عزتی بھی نہ ہو جائے حالانکہ اس وقت صورتِ حال یہ تھی کہ احمدیوں کو قتل و غارت کا نشانہ بنایا جا رہا تھا اور حکومت فسادات کو روکنے کی بجائے خود احمدیوں کو موردِ الزام ٹھہرا رہی تھی۔ اس بیان کا سُقم اس بات سے ہی ظاہر ہو جاتا ہے کہ یحیٰ بختیار صاحب نے دعویٰ کیا ہے کہ احمدی اس بات سے پریشان تھے کہ مولوی ان کی بے عزتی کریں گے اور اس صورتِ حال میں جے اے رحیم صاحب نے یہ تجویز دی کہ اٹارنی جنرل صاحب سوالات کریں مگر یہ بیان دیتے ہوئے یحیٰ بختیار صاحب ایک بات چیک کرنا بھول گئے تھے۔ جے اے رحیم صاحب کو 3/ جولائی 1974ء کو وزیرِ اعظم بھٹو صاحب نے برطرف کر دیا تھا کیونکہ بقول ان کے، جے اے رحیم صاحب کا طرز عمل پارٹی ڈسپلن کے خلاف تھا (مشرق 4/ جولائی 1974ء ص 1) اور ظاہر ہے کہ یہ شدید اختلافات ایک رات پہلے نہیں شروع ہوئے تھے ان کا سلسلہ کافی پہلے سے چل رہا تھا۔ قومی اسمبلی کی کارروائی اس سے بہت بعد شروع ہوئی تھی اور اس کارروائی کے خط و خال تو سٹیرنگ کمیٹی میں طے ہوئے تھے اور اس کا قیام 3/ جولائی کو ہی عمل میں آیا تھا اور یہ فیصلہ کہ حضور جماعت کے وفد کی قیادت فرمائیں گے بھی اس تاریخ کے بعد کا ہے۔ بلکہ جے اے رحیم کے استعفیٰ کے وقت تک تو ابھی یہ فیصلہ بھی نہیں ہوا تھا کہ جماعت کا وفد قومی اسمبلی کی سپیشل کمیٹی میں اپنا موقف پیش کرے گا۔ چنانچہ جب یہ وقت آیا تو جے اے رحیم صاحب اس پوزیشن میں تھے ہی نہیں کہ کسی طرح اس قسم کے فیصلوں پر اثر انداز ہوتے۔

لیکن بہر حال جب ہم نے اس وقت قومی اسمبلی کے سپیکر مکرم صاحبزادہ فاروق علی خان صاحب سے انٹرویو لیا تو انہوں نے اس کے بارے میں ایک بالکل مختلف واقعہ بتایا۔ گو یہ فیصلہ پہلے ہو چکا تھا کہ سوالات اٹارنی جنرل صاحب کی وساطت سے کئے جائیں گے لیکن ایک اور واقعہ ہوا جس کے بعد حکومت نے اس بات کا مصمم ارادہ کر لیا کہ اگر مولوی حضرات کو براہِ راست سوالات کرنے کا زیادہ موقع نہ ہی دیا جائے تو بہتر ہو گا۔ صاحبزادہ فاروق علی خان صاحب نے ہمارے ساتھ اپنے انٹرویو میں کہا کہ مفتی محمود صاحب جو کہ اس وقت لیڈر آف اپوزیشن تھے، نے ایک سوال پوچھا کہ آپ نے یعنی جماعتِ

احمدیہ نے اس لفظ کی یہ Interpretation کیوں کی ہے۔ اس پر حضور نے فرمایا کہ اس لفظ کی اتنی Interpretations ہو چکی ہیں۔ ہم نے اس کی یہ Interpretation لی ہے۔ اور ہماری Interpretation درست ہے۔

صاحبزادہ فاروق علی خان صاحب کہتے ہیں کہ اس پر مفتی محمود صاحب کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ کہتے ہیں کہ اسی روز میں نے بھٹو صاحب کو اپنے چیمبر سے فون کیا اور کہا کہ آپ کے لیڈر آف اپوزیشن کا یہ حال ہے کہ انہیں ایک سوال پر ہی صفر کر دیا گیا ہے۔ اس پر بھٹو صاحب نے کہا کہ پھر آپ کیا مشورہ دیتے ہیں۔ اس پر میں نے کہا کہ جرح اٹارنی جنرل ہی کرتا رہے اور اس کے ساتھ پانچ سات افراد کی کمیٹی اعانت کرے۔

ان کی گواہی سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ایسا مولوی حضرات کو بے عزتی سے بچانے کے لئے کیا گیا تھا اور اسی انٹرویو میں صاحبزادہ فاروق علی خان صاحب نے ہم سے بیان کیا کہ آدھا گھنٹہ پہلے ہی سوال آجاتے تھے تو بسا اوقات یحیٰ بختیار صاحب سوال پڑھ کر اس کی نامعقولیت پر غصہ میں آجاتے اور کہتے یہ کس۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔(آگے ایک گالی ہے) نے بھیجا ہے اور اسے پھاڑ دیتے۔

یاد رہے کہ یہ روایت بیان کرنے والے صاحب اسمبلی کے سپیکر تھے اور اس سپیشل کمیٹی کی صدارت کر رہے تھے۔

جماعتِ احمدیہ کا محضر نامہ

اس مرحلہ پر مناسب ہو گا کہ جماعتِ احمدیہ کے محضر نامہ کا مختصراً جائزہ لیا جائے۔ یہ محضر نامہ حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ کی ہدایات کے تحت تیار کیا گیا تھا اور ایک ٹیم نے اس کی تیاری پر کام کیا تھا۔ ان میں حضرت صاحبزادہ مرزا طاہر احمد صاحب، حضرت مولانا ابو العطاء صاحب، حضرت شیخ محمد احمد صاحب مظہر اور حضرت مولانا دوست محمد شاہد صاحب شامل تھے۔ اور جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے اسے سپیشل کمیٹی کے مطالعہ کے لیے بھجوایا گیا تھا اور اس میں بہت سے بنیادی اہمیت کے حامل اور متنازعہ امور پر جماعتِ احمدیہ کا موقف بیان کیا گیا تھا۔ یہ جماعتِ احمدیہ کا وہ موقف تھا جو کہ حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ نے قومی اسمبلی کی سپیشل کمیٹی میں پڑھ کر سنایا۔ اس محضر نامے میں جماعتِ احمدیہ کا اصولی موقف بیان کیا گیا تھا اور یہ متنبہ بھی کیا گیا تھا کہ اگر پاکستان کی قومی اسمبلی، پاکستان کی حکومت اور پاکستانی قوم اس راستہ پر چلی تو اس کا انجام کیا ہو گا؟

اس کے پہلے باب میں قومی اسمبلی میں پیش ہونے والی مذکورہ قراردادوں پر ایک نظر ڈال کر یہ اصولی سوال اُٹھایا گیا تھا کہ آیا دنیا کی کوئی اسمبلی بھی فی ذاتہ اس بات کی مجاز ہے کہ

اوّل: کسی شخص کا یہ بنیادی حق چھین سکے کہ وہ جس مذہب کی طرف چاہے منسوب ہو۔

دوم: یا مذہبی امور میں دخل اندازی کرتے ہوئے اس بات کا فیصلہ کرے کہ کسی جماعت یا فرقے یا فرد کا کیا مذہب ہے؟

پھر اس محضر نامہ میں جماعتِ احمدیہ کی طرف سے اس اہم سوال کا جواب یہ دیا گیا تھا:۔

"ہم ان دونوں سوالات کا جواب نفی میں دیتے ہیں۔ ہمارے نزدیک رنگ و نسل اور جغرافیائی اور قومی تقسیمات سے قطع نظر ہر انسان کا یہ بنیادی حق ہے کہ وہ جس مذہب کی طرف چاہے منسوب ہو اور دنیا میں کوئی انسان یا انجمن یا اسمبلی اسے اس بنیادی حق سے محروم نہیں کر سکتے۔ اقوامِ متحدہ کے دستور العمل میں جہاں بنیادی انسانی حقوق کی ضمانت دی گئی ہے وہاں ہر انسان کا یہ حق بھی تسلیم کیا گیا ہے کہ وہ جس مذہب کی طرف چاہے منسوب ہو۔

اسی طرح پاکستان کے دستور اساسی میں بھی دفعہ نمبر 20 کے تحت ہر پاکستانی کا یہ بنیادی حق تسلیم کیا گیا ہے کہ وہ جس مذہب کی طرف چاہے منسوب ہو۔ اس لئے یہ امر اصولاً طے ہونا چاہیئے کہ کیا یہ کمیٹی پاکستان کے دستور اساسی کی رو سے زیرِ نظر قرارداد پر بحث کی مجاز بھی ہے یا نہیں؟“

اگر قوم یا اسمبلی اس راستہ پر چل نکلے تو اس کے نتیجہ میں کیا کیا ممکنہ خطرات پیدا ہو سکتے ہیں، ان کا مختصر جائزہ لے کر یہ انتباہ کیا گیا۔

”ظاہر ہے کہ مندرجہ بالا صورتیں عقلاً، قابلِ قبول نہیں ہو سکتیں اور بشمول پاکستان دنیا کے مختلف ممالک میں ان گنت فسادات اور خرابیوں کی راہ کھولنے کا موجب ہو جائیں گی۔

کوئی قومی اسمبلی اس لئے بھی ایسے سوالات پر بحث کی مجاز قرار نہیں دی جا سکتی کہ کسی بھی قومی اسمبلی کے ممبران کے بارے میں یہ ضمانت نہیں دی جا سکتی کہ وہ مذہبی امور پر فیصلے کے اہل بھی ہیں کہ نہیں؟

دنیا کی اکثر اسمبلیوں کے ممبران سیاسی منشور لے کر رائے دہندگان کے پاس جاتے ہیں اور ان کا انتخاب سیاسی اہلیت کی بناء پر ہی کیا جاتا ہے۔ خود پاکستان میں بھی ممبران کی بھاری اکثریت سیاسی منشور کی بناء اور علماء کے فتوے کے علی الرغم منتخب کی گئی ہے۔

پس ایسی اسمبلی کو یہ حق کیسے حاصل ہو سکتا ہے کہ وہ کسی فرقہ کے متعلق یہ فیصلہ کرے کہ فلاں عقیدہ کی رو سے فلاں شخص مسلمان رہ سکتا ہے کہ نہیں؟

اگر کسی اسمبلی کی اکثریت کو محض اس بناء پر کسی فرقہ یا جماعت کے مذہب کا فیصلہ کرنے کا مجاز قرار دیا جائے کہ وہ ملک کی اکثریت کی نمائندہ ہے تو یہ موقف بھی نہ عقلاً قابلِ قبول ہے نہ فطرتاً نہ مذہباً۔ اس قسم کے امور خود جمہوری اصولوں کے مطابق ہی دنیا بھر میں جمہوریت کے دائرہ اختیار سے باہر قرار دیئے جاتے ہیں۔ اسی طرح تاریخِ مذہب کی رو سے کسی عہد کی اکثریت کا یہ حق کبھی تسلیم نہیں کیا گیا کہ وہ کسی کے مذہب کے متعلق کوئی فیصلہ دے۔ اگر یہ اصول تسلیم کر لیا جائے تو نعوذُ باللہ دنیا کے تمام انبیاء علیہم السلام اور ان کی جماعتوں کے متعلق ان کے عہد کی اکثریت کے فیصلے قبول کرنے پڑیں گے۔ ظاہر ہے کہ یہ ظالمانہ تصوّر ہے جسے دنیا کے ہر مذہب کا پیرو کار بلا توقف ٹھکرا دے گا۔“

مختصراً یہ کہ اس اہم اور بنیادی سوال پر جماعتِ احمدیہ کا اصولی موقف یہ تھا

1۔ نہ صرف پاکستان بلکہ دنیا کی کوئی بھی قانون ساز اسمبلی اس بات کا اختیار نہیں رکھتی کہ وہ یہ فیصلہ کرے کسی شخص یا گروہ کا مذہب کیا ہے۔ یا اس قسم کا کوئی قانون بنائے جس سے کسی شخص یا گروہ کی مذہبی آزادی متاثر ہو۔

2۔ دنیا کی کوئی بھی سیاسی اسمبلی اس قسم کے معاملات کے بارے میں فیصلہ کرنے کا نہ صرف اختیار نہیں رکھتی بلکہ اس قسم کا فیصلہ کرنے یا اس پر غور کرنے کی اہلیت بھی نہیں رکھتی۔

3۔ کسی ملک کی اکثریت کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ کسی گروہ کے مذہبی معاملات کے بارے میں فیصلے کرے اور یہ فیصلہ کرے کہ وہ کس مذہب سے وابستہ ہے۔

4۔ قرآنِ کریم کی تعلیمات اور آنحضرتؐ کے ارشادات اس بات کی اجازت نہیں دیتے کہ کوئی شخص یا حکومت کسی شخص یا گروہ کے مذہب کے بارے میں اس قسم کے فیصلے کریں۔

5۔ اگر یہ راستہ اختیار کیا گیا تو اس سے نہ صرف پاکستان میں ان گنت فسادات کے راستے کھل جائیں گے بلکہ پوری دنیا میں خطرناک مسائل پیدا ہو جائیں گے۔

یہ ظاہر ہے کہ محضر نامہ کا یہ حصہ بہت اہم ہے۔ اس میں نہ صرف جماعتِ احمدیہ کا اصولی موقف بیان کیا گیا ہے بلکہ متنبہ بھی کیا گیا تھا کہ اگر یہ غلطی کی گئی تو پاکستان اور دنیا بھر میں کیا مسائل پیدا ہوں گے؟ کتاب کے آخر میں ہم اس بات کا جائزہ پیش کریں گے کہ اس غلطی کے اب تک کیا نتائج نکل رہے ہیں۔

اس محضر نامہ کا دوسرا باب بھی ایک بہت اہم اور بنیادی سوال کے بارے میں تھا۔ اگر یہ اس مسئلہ پر بحث ہو رہی ہے کہ کون مسلمان ہے تو پھر پہلے یہ طے کرنا ضروری ہے کہ مسلمان کی تعریف کیا ہے؟ مسلمان کسے کہتے ہیں؟ اور جہاں تک جماعت احمدیہ کی مخالفت کی تاریخ کا تعلق ہے تو اس سوال کا ایک پس منظر ہے۔ جب 1953ء میں جماعتِ احمدیہ کے خلاف فسادات پر عدالتی ٹریبونل نے کام شروع کیا تو اس کے سامنے جماعتِ احمدیہ کے مخالفین کا یہ مطالبہ تھا کہ آئین میں احمدیوں کو غیر مسلم قرار دیا جائے۔ طبعاً اس ٹریبونل کے ذہن میں بھی یہ سوال پیدا ہوا کہ اگر ایک فرقہ کو غیر مسلم قرار دینے کا مطالبہ ہے تو پہلے تو یہ طے کرنا ضروری ہے کہ آخر مسلم کی تعریف کیا ہے؟ مسلمان کسے کہتے ہیں؟ جب یہ سوال ان علماء کے سامنے رکھا گیا جو کہ اس ٹریبونل کے روبرو پیش ہو رہے تھے تو کسی ایک عالم کا جواب دوسرے عالم کے جواب سے نہیں ملتا تھا۔ اس

سے یہ صورتِ حال سامنے آرہی تھی کہ اگرچہ یہ گروہ احمدیوں کو غیر مسلم قرار دینے کے لئے تو فسادات برپا کررہا تھا لیکن ان کے ذہنوں میں خود یہ واضح نہیں تھا کہ مسلمان کی تعریف کیا ہے؟ اس پر تحقیقاتی عدالت کی رپورٹ میں یہ تبصرہ تھا:۔

"ان متعدد تعریفوں کو جو علماء نے پیش کی ہیں پیشِ نظر رکھ کر کیا ہماری طرف سے کسی تبصرے کی ضرورت ہے؟ بجز اس کے کہ دین کے کوئی دو عالم بھی اس بنیادی امر پر متفق نہیں ہیں اگر ہم اپنی طرف سے مسلم کی کوئی تعریف کر دیں جیسے ہر عالمِ دین نے کی ہے اور وہ تعریف ان تعریفوں سے مختلف ہو جو دوسروں نے پیش کی ہیں تو ہم کو متفقہ طور پر دائرہ اسلام سے خارج قرار دیا جائے گا اور اگر ہم علماء میں سے کسی ایک کی تعریف کو اختیار کر لیں تو ہم اس عالم کے نزدیک تو مسلمان رہیں گے لیکن دوسرے تمام علماء کی تعریف کی رو سے کافر ہو جائیں گے۔

(رپورٹ تحقیقاتی عدالت فساداتِ پنجاب 1953 (اردو) ص 235-236)

اس تحقیقاتی عدالت کی رپورٹ کا حوالہ دینے کے بعد جماعتِ احمدیہ کے محضر نامہ میں یہ مؤقف پیش کیا گیا کہ اگر مسلمان کی تعریف کا تعیّن کرنا ہے تو ہمیں لازماً حضرت محمد مصطفیٰؐ کی بیان کردہ تعریف کو تسلیم کرنا ہو گا ورنہ یہ بالکل لایعنی بات ہو گی کہ مسلمان کی تعریف کی جائے لیکن اس تعریف کو تسلیم نہ کیا جائے جو کہ آنحضرتؐ نے بیان فرمائی تھی اور اس ضمن میں صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی تین احادیث پیش کی گئیں۔

ان میں سے ایک حدیث میں آنحضرتؐ نے ارشاد فرمایا کہ اسلام یہ ہے کہ یہ گواہی دی جائے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمدؐ اللہ کے رسول ہیں اور نیز یہ کہ تم نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو اور رمضان کے روزے رکھو اور اگر راستہ کی توفیق ہو تو بیت اللہ کا حج کرو۔

(مسلم کتاب الایمان)

اور پھر صحیح بخاری میں یہ حدیث درج ہے

"جس شخص نے وہ نماز ادا کی جو ہم کرتے ہیں۔ اس قبلہ کی طرف رخ کیا جس کی طرف ہم رخ کرتے ہیں اور ہمارا ذبیحہ کھایا وہ مسلمان ہے جس کے لئے اللہ اور اس کے رسول کا ذمہ ہے۔ پس تم اللہ کے دیئے ہوئے ذمّے میں اس کے ساتھ دغا بازی نہ کرو۔"

(صحیح بخاری۔ باب استقبال القبلۃ)

یہ احادیث درج کر کے محضر نامہ میں جماعتِ احمدیہ کی طرف سے یہ اپیل کی گئی

”ہمارے مقدس آقا کا یہ احسانِ عظیم ہے کہ اس تعریف کے ذریعہ آنحضورؐ نے نہایت جامع و مانع الفاظ میں عالمِ اسلام کے اتحاد کی بین الاقوامی بنیاد رکھ دی ہے اور ہر مسلمان حکومت کا فرض ہے کہ اس بنیاد کو اپنے آئین میں نہایت واضح حیثیت سے تسلیم کرے ورنہ امتِ مسلمہ کا شیرازہ ہمیشہ ہمیشہ بکھرا رہے گا اور فتنوں کا دروازہ کبھی بند نہیں ہو سکے گا۔“

(محضر نامہ ص19)

اس معیار کو تسلیم کر لینے کے بعد ایک سوال باقی رہ جاتا ہے کہ مختلف فرقوں کے علماء ہمیشہ سے ایک دوسرے پر کفر کے فتاویٰ دیتے رہے ہیں اور مختلف اعمال کے مرتکب کو کافر اور دائرہ اسلام سے خارج قرار دیتے رہے ہیں، تو ان فتاویٰ کی کیا حیثیت ہو گی۔ محضر نامہ میں جماعتِ احمدیہ کا یہ موقف درج کیا گیا کہ ان فتاویٰ کی صرف یہ حیثیت ہے کہ ان علماء کے نزدیک یہ عقائد یا اعمال اس قدر اسلام کے منافی ہیں کہ قیامت کے روز ان کا حشر مسلمانوں میں نہیں ہو گا لیکن جہاں تک اس دنیا کا تعلق ہے ان فتاویٰ کی صرف ایک انتباہ کی حیثیت ہے اور اس دنیا میں کوئی فرقہ یا شخص اس بات کا مجاز، اس بات کا اہل نہیں ہے کہ وہ کسی شخص یا گروہ کو دائرہ اسلام سے خارج قرار دے۔ یہ معاملہ خدا اور بندے کے درمیان ہے اور اس کا فیصلہ جزا سزا کے دن ہی ہو گا۔ ورنہ ایک دوسرے کے خلاف کفر کے فتاویٰ اس کثرت سے موجود ہیں کہ کسی ایک صدی کے بزرگان دین کا اسلام ان کی زد سے نہیں بچ سکا اور کوئی بھی فرقہ ایسا نہیں پیش کیا جا سکتا جس کا کفر بعض دوسرے فرقوں کے نزدیک مسلّمہ نہ ہو۔

(محضر نامہ ص20-21)

اس سے اگلے باب کا عنوان تھا مقامِ خاتم النبیینؐ اور حضرت بانی سلسلہ احمدیہ کی عارفانہ تحریرات"۔ اس باب میں اس الزام کا تجزیہ پیش کیا گیا تھا کہ احمدی آنحضرتؐ کے مقامِ ختمِ نبوت کا انکار کرتے ہیں۔ اس باب میں مخالفین کے اس تضاد کی نشاندہی کی گئی تھی کہ جو مخالفین احمدیوں پر یہ الزام لگا رہے ہیں وہ در حقیقت خود آنحضرتؐ کے مقامِ خاتم النبیینؐ کا انکار کر رہے ہیں کیونکہ وہ آنحضرتؐ کے بعد امتِ مسلمہ کی اصلاح کے لئے ایک ایسے نبی کے منتظر ہیں جس کا تعلق آنحضرتؐ کی

امت سے نہیں ہے۔ وہ خود آنحضرتؐ کے بعد ایک اور نبی یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی آمد کا انتظار کر رہے ہیں اور اس طرح اس بات کے قائل ہیں کہ حضرت موسیٰؑ کی امت سے تعلق رکھنے والا ایک پیغمبر امتِ محمدیہ کا آخری روحانی محسن ہو گا۔

اس کے بعد کے ابواب میں ذاتِ باری تعالیٰ، قرآنِ کریم کی اَرفع شان کے بارے میں اور آنحضرتؐ کے اعلیٰ مقام کے بارے میں حضرت مسیح موعود علیہ اسلام کی معرفت سے پُر تحریرات درج کی گئی تھیں۔ ایک تفصیلی علیحدہ باب آیت خاتَم النبیین کی تفسیر کے بارے میں تھا۔ اس باب میں قرآن کریم کی آیات، احادیثِ نبویہؐ، لغتِ عربیہ اور بزرگانِ سلف کے اقوال اور تحریرات کی رو سے یہ ثابت کیا گیا تھا کہ آیت خاتم النبیین کی صحیح تفسیر وہی ہے جو جماعتِ احمدیہ کے لٹریچر میں کی گئی ہے۔

چونکہ اپوزیشن کی پیش کردہ قرارداد میں رابطہ عالمِ اسلامی کی قرارداد کو اپنی قرارداد کی بنیاد بنا کر پیش کیا گیا تھا اور اپوزیشن کی قرارداد میں بھی جماعت احمدیہ پر طرح طرح کے الزامات لگائے گئے تھے اس لئے اس محضر نامے میں ان دونوں قراردادوں میں شامل الزامات کی تردید پر مشتمل مواد بھی شامل کیا گیا تھا اور پھر اراکینِ اسمبلی کے نام اہم گزارش کے باب میں مختلف حوالے دے کر لکھا گیا تھا کہ مذہب کے نام پر پاکستان کے مسلمانوں کو باہم لڑانے اور صفحۂ ہستی سے مٹانے کی ایک دیرینہ سازش چل رہی ہے۔ اس پس منظر میں پاکستان کے گزشتہ دور اور موجودہ پیدا شدہ صورتِ حال پر نظر ڈالی جائے تو صاف معلوم ہو گا کہ اگرچہ موجودہ مرحلہ پر صرف جماعتِ احمدیہ کو غیر مسلم قرار دینے پر زور ڈالا جا رہا ہے مگر دشمنانِ پاکستان کی دیرینہ سکیم کے تحت امتِ مسلمہ کے دوسرے فرقوں کے خلاف بھی فتنوں کا دروازہ کھل چکا ہے اس محضر نامہ کے آخر پر حضرت مسیح موعود علیہ السلام کا یہ پُر درد انتباہ درج کیا گیا:۔

”میں نصیحتاً للہ مخالف علماء اور ان کے ہم خیال لوگوں کو کہتا ہوں کہ گالیاں دینا اور بد زبانی کرنا طریقِ شرافت نہیں ہے۔ اگر آپ لوگوں کی یہی طینت ہے تو خیر آپ کی مرضی لیکن اگر مجھے آپ لوگ کاذب سمجھتے ہیں تو آپ کو یہ بھی تو اختیار ہے کہ مساجد میں اکٹھے ہو کر یا الگ الگ میرے پر بد دعائیں کریں اور رو رو کر میرا استیصال چاہیں پھر اگر میں کاذب ہوں گا تو ضرور وہ دعائیں قبول ہو جائیں گی۔ اور آپ لوگ ہمیشہ دعائیں کرتے بھی ہیں۔

لیکن یاد رکھیں کہ اگر آپ اس قدر دعائیں کریں کہ زبانوں میں زخم پڑ جائیں اور اس قدر رو رو کر سجدوں میں گریں کہ ناک گھس جائیں اور آنسوؤں سے آنکھوں کے حلقے گل جائیں اور پلکیں جھڑ جائیں اور کثرتِ گریہ وزاری سے بینائی کم ہو جائے

اور آخر دماغ خالی ہو کر مرگی پڑنے لگے یا مالیخولیا ہو جائے تب بھی وہ دعائیں سنی نہیں جائیں گی کیونکہ میں خدا سے آیا ہوں ۔۔۔۔۔۔ کوئی زمین پر مر نہیں سکتا جب تک آسمان پر نہ مارا جائے۔ میری روح میں وہی سچائی ہے جو ابراہیم علیہ السلام کو دی گئی تھی۔ مجھے خدا سے ابراہیمی نسبت ہے۔ کوئی میرے بھید کو نہیں جانتا مگر میرا خدا۔ مخالف لوگ عبث اپنے تئیں تباہ کر رہے ہیں۔ میں وہ پودا نہیں ہوں کہ ان کے ہاتھ سے اکھڑ سکوں۔۔۔ اے خدا!! تو اس امت پر رحم کر۔ آمین“

(ضمیمہ اربعین نمبر 4 صفحہ 5 تا 7۔ روحانی خزائن جلد 17 ص 471 تا 473)

اس وقت پورے ملک میں جماعتِ احمدیہ کے خلاف پورے زور و شور سے ایک مہم چلائی جا رہی تھی اور احمدیوں پر ہر طرف سے ہر قسم کے الزامات کی بارش کی جا رہی تھی۔ اس محضر نامہ میں اس قسم کے کئی اعتراضات کے جوابات بھی دیئے گئے تھے تاکہ پڑھنے والوں پر ان اعتراضات کی حقیقت آشکار ہو۔

جب کئی دہائیوں کے انتظار کے بعد 1974ء میں ہونے والی سپیشل کمیٹی کی کارروائی شائع کی گئی تو اس میں جماعتِ احمدیہ کی طرف سے پیش کردہ محضر نامہ کو شائع نہیں کیا گیا حالانکہ اس محضر نامہ کو جماعتِ احمدیہ کے موقف کے طور پر دو روز میں سپیشل کمیٹی کے سامنے پڑھا گیا تھا اور یہ کارروائی کا اہم ترین حصہ تھا۔ جماعتِ احمدیہ کا اصل موقف تو یہ محضر نامہ ہی تھا اور نہ سپیشل کمیٹی میں کئے جانے والے سوالات تو اصل موضوع سے گریز کی کوشش کے علاوہ کوئی حقیقت نہیں رکھتے تھے۔ یہ تحریف کیوں کی گئی؟ فرار کا راستہ کیوں اختیار کیا گیا؟ اس لئے کہ اس کی اشاعت کے نتیجہ میں اصل حقیقت سب کے سامنے آ جاتی تھی اور جماعتِ احمدیہ کے مخالفین کو ایسی سبکی اُٹھانی پڑتی، جس کا تصور بھی ان کے لئے ناقابلِ برداشت ہو رہا تھا۔

یکم جولائی سے پندرہ جولائی تک کے حالات

ایک طرف تو ان کمیٹیوں میں کارروائی ان خطوط پر جاری تھی اور دوسری طرف ملک میں احمدیوں کی مخالفت اپنے عروج پر تھی۔ اور یہ سب کچھ علی الاعلان ہو رہا تھا۔ یہاں تک کہ اخبارات میں طالب علم لیڈروں کے بیانات شائع ہو رہے تھے کہ نہ صرف کسی قادیانی طالب علم کو تعلیمی اداروں میں داخل نہیں ہونے دیا جائے گا بلکہ جن قادیانی طالب علموں نے امتحان دینا ہے انہیں اس بات کی اجازت بھی نہیں دی جائے گی کہ وہ امتحانات دے سکیں۔ اور یہ بیانات شائع ہو رہے تھے کہ اہلِ پیغام میں سے کچھ لوگ کچھ گول مول اعلانات شائع کر کے اپنے کاروبار کو بائیکاٹ کی زد سے محفوظ رکھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ مسلمانوں کو چاہیے کہ ان کے اعلانات کو صرف اس وقت قبول کیا جائے گا جب وہ اپنے اعلانات میں واضح طور پر مرزا غلام احمد قادیانی کو کافر اور کاذب کہیں ورنہ ان کے کاروبار کا بائیکاٹ جاری رکھا جائے۔ اور اس کے ساتھ یہ مضحکہ خیز اپیل بھی کی جا رہی تھی کہ عوام پر امن رہیں۔ گویا ان لوگوں کے نزدیک یہ اعلانات ملک میں امن و امان کی فضا قائم کرنے کے لیے تھے۔ (37)

یکم جولائی سے پندرہ جولائی 1974ء تک کے عرصہ میں بھی ملک میں احمدیوں پر ہر قسم کے مظالم جاری رہے۔ اس دوران مخالفین احمدیوں کے خلاف بائیکاٹ کو شدید تر کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے تھے تا کہ اس طرح احمدیوں پر دباؤ ڈال کر انہیں عقائد کی تبدیلی پر مجبور کیا جا سکے۔ بہت سے شہروں میں غنڈے مقرر کیے گئے تھے کہ وہ احمدیوں کو روزمرہ کی اشیاء بھی نہ خریدنے دیں اور جہاں کوئی احمدی باہر نظر آئے تو اس کے ساتھ توہین آمیز رویہ روا رکھا جاتا۔ کئی مقامات پر احمدیوں کا منہ کالا کر کے انہیں سڑکوں پر پھرایا گیا اور یہ پولیس کے سامنے ہوا اور پولیس تماشہ دیکھتی رہی۔ احمدیوں کی دوکانوں کے باہر بھی غنڈے مقرر کر دیئے جاتے جو لوگوں کو احمدیوں کی دوکانوں سے خریداری کرنے سے روکتے۔ سرگودھا، دیپالپور اور بھیرہ میں احمدیوں کے مکانوں کے اردگرد محاصرہ کی صورت پیدا ہو گئی۔ اور 13 / جولائی کو تخت ہزارہ میں احمدیوں کے بارہ مکانوں کو نذرِ آتش کر دیا گیا۔ بائیکاٹ کی صورت کو شدید تر بنانے کے لیے یہ بھی کیا گیا کہ بھنگیوں کو مجبور کیا گیا کہ وہ احمدیوں کے مکانات کی صفائی نہ کریں اور بعض مقامات پر ڈاکٹروں نے احمدی مریضوں کا علاج کرنے سے بھی انکار کر دیا۔ لائلپور اور بوریوالہ میں بعض صنعتوں کے مالکان نے احمدیوں کو ملازمت سے فارغ کر دیا۔ ڈسکہ میں احمدیوں کے کارخانے

کے ملازمین کو وہاں پر کام کرنے سے روک دیا گیا، جس کے نتیجے میں یہ کارخانہ بند کرنا پڑا۔ دیہات میں احمدیوں کی زندگی کو اجیرن کرنے کے لیے یہ بھی کیا گیا کہ احمدیوں کو کنویں سے پانی نہیں لینے دیا جاتا اور چکی والوں کو مجبور کیا گیا کہ احمدیوں کو آٹا پیس کر نہ دیا جائے۔ احمدیوں کو تکلیف دینے کے لیے ان کی مساجد میں غلاظت پھینکی جاتی۔ اور پاکپتن میں جماعت کی مسجد پر قبضہ کر لیا گیا۔ ان کی سنگدلی سے مردہ بھی محفوظ نہیں تھے 7/ جولائی کو خوشاب میں ایک احمدی کی قبر کھود کر نعش کی بے حرمتی کی گئی اور کوٹلی اور گوجرانوالہ میں احمدیوں کی تدفین روک دی گئی۔ لائلپور میں اب مخالفین علی الاعلان یہ کہتے پھرتے تھے کہ پندرہ جولائی کے بعد ربوہ کے علاوہ کہیں پر احمدی نظر نہ آئے۔ نصیرہ ضلع گجرات میں یہ اعلان کیے گئے جو احمدی اپنے عقائد کو نہیں چھوڑے گا اس کے گھروں کو جلا دیا جائے گا۔ 2/ جولائی کو ایک احمدی سیٹھی مقبول احمد صاحب کو ان کے مکان پر گولی مار کر شہید کر دیا گیا۔ لاہور کی انجینیئرنگ یونیورسٹی میں احمدی طالب علم امتحان دینے گئے تو ان کے کمرہ کے اندر پٹرول چھڑک کر آگ لگا دی گئی۔ انہیں اپنی جانیں بچا کر وہاں سے نکلنا پڑا۔ (38)

کراچی میں جماعتِ اسلامی کے بعض لوگوں نے کچھ اور مولویوں کے ساتھ مل کر ایک سازش تیار کی کہ کسی طرح لوگوں کے جذبات کو احمدیوں کے خلاف بھڑکایا جائے۔ انہوں نے دستگیر کالونی کراچی کے ایک پرائمری پاس مولوی جس کا نام ابراہیم تھا کو چھپا دیا اور اس کے ساتھ یہ شور مچا دیا کہ قادیانیوں نے ہمارے عالمِ دین کو اغوا کر لیا ہے۔ یہ خبر اخباروں میں شائع کی گئی اور اس کے ساتھ عوام میں اسے مشتہر کر کے اشتعال پھیلایا گیا۔ جلوس نکلنے شروع ہوئے کہ اگر قادیانیوں نے ہمارے مولانا کو آزاد نہ کیا تو ان کے گھروں اور دوکانوں کو نذرِ آتش کر دیا جائے گا۔ اور اس کے ساتھ احمدیوں کے گھروں اور دوکانوں کی نشاندہی کے لئے ان پر سرخ روشنائی سے گول دائرہ بنا کر اس کے اندر کراس کا نشان لگا دیا گیا۔ مقامی ایس ایچ او نے شرافت کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان جلوسوں کو منتشر کیا۔ مخالفین کے جوش کو ٹھنڈا کرنے کے لئے پولیس نے پانچ احمدیوں کو اس نام نہاد اغوا کے الزام میں گرفتار کر لیا۔ مولوی لوگ حوالات میں آ کر پولیس سے کہتے کہ ان کی پٹائی کرو۔ ابھی یہ نامعقول سلسلہ جاری تھا کہ پولیس نے چھاپے مار کر 12/ اگست کو علاقہ شیر شاہ کے مکان سے ان چھپے ہوئے مولوی کو برآمد کر کے گرفتار کر لیا۔ اور پھر جا کر گرفتار مظلوم احمدیوں کی رہائی عمل میں آئی۔ (39)

پورے ملک میں احمدیوں کے خلاف جھوٹی خبریں پھیلا کر لوگوں کو احمدیوں کے خلاف بھڑکایا جا رہا تھا۔ یہاں تک کہ یہ خبریں مشہور ہونے لگیں کہ ربوہ کے ریلوے سٹیشن پر ہونے والے واقعہ میں بہت سے طالب علموں کی زبانیں اور دوسرے

اعضاء کاٹے گئے تھے۔ لیکن جب جسٹس صمدانی کی تحقیقات کی خبریں اخبارات میں شائع ہونے لگیں تو اس قسم کی خبر کا کوئی نام ونشان بھی نہیں تھا۔ اس پر جسٹس صمدانی کو اس مضمون کے خطوط ملنے لگے کہ یہ خبریں شائع کیوں نہیں ہونے دی جا رہیں کہ نشتر میڈیکل کالج کے طلباء کی زبانیں اور دوسرے اعضاء کاٹے گئے تھے۔ اس صورتِ حال میں جسٹس صمدانی کو دورانِ تحقیق ہی اس بات کا اعلان کرنا پڑا کہ حقیقتِ حال یہ ہے کہ ایسی کوئی شہادت سرے سے ریکارڈ پر آئی ہی نہیں جس میں یہ کہا گیا ہو کہ کسی طالب علم کی زبان کاٹی گئی یا کسی کے جسم کا کوئی عضو الگ کیا گیا یا مستقل طور پر ناکارہ کیا گیا۔ فاضل جج نے کہا کہ میڈیکل رپورٹوں سے بھی یہ افواہیں غلط ثابت ہوتی ہیں اس لیے ان کی تردید ضروری تھی۔ (40)

جس وقت سٹیشن کا واقعہ ہوا، اس وقت جو خبریں اخبارات میں شائع کی جا رہی تھیں وہ یہ تھیں:۔

چٹان نے لکھا:

"اتنا زخمی کیا گیا کہ ڈیڑھ درجن طلباء ہلاکان ہو گئے۔ ان کے زخموں کو دیکھنا مشکل تھا۔۔۔۔۔۔ جس قدر طلباء زخمی ہوئے ہیں ان کی حالت دیکھی نہیں جاتی۔" (41)

نوائے وقت نے 30 مئی 1974ء کی اشاعت میں خبر شائع کی تھی کہ ۳۰ طلباء شدید زخمی ہوئے ہیں۔ اسی اخبار نے یکم جون کو یہ خبر شائع کی تھی کہ 12 طلباء شدید زخمی ہوئے ہیں۔ اخبار مشرق نے 30/ مئی 1974ء کو خبر شائع کی تھی کہ 4 طلباء کی حالت نازک ہے۔ اور امروز نے 30/ مئی لکھا تھا کہ 2 کی حالت نازک ہے۔ ان خبروں کا آپس میں فرق ظاہر کر رہا ہے کہ بغیر مناسب تحقیق کے خبریں شائع کی جا رہی تھیں۔

اور جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے کہ نشتر میڈیکل کالج کے ان طلباء نے لائلپور میں اپنا علاج کرانا پسند نہیں کیا تھا اور کہا تھا کہ ہم ملتان جا کر اپنے تدریسی ہسپتال میں علاج کرائیں گے۔ حالانکہ اگر ان طلباء کی حالت اتنی ہی نازک تھی تو یہ خود طب کے پیشہ سے منسلک تھے اور جانتے تھے کہ علاج میں تاخیر کتنی خطرناک ہو سکتی ہے۔ بہرحال ملتان میں ان کے تدریسی ہسپتال جا کر علاج شروع ہوا۔ اور جو ڈاکٹر ان کے علاج میں شریک تھے انہوں نے ٹریبیونل کے سامنے ان زخمی طلباء کے زخموں کے متعلق گواہیاں دیں۔ ان ڈاکٹروں کے نام ڈاکٹر محمد زبیر اور ڈاکٹر محمد اقبال تھے۔ ان میں سے کچھ طلباء یقیناً زخمی تھے اور ان میں سے کچھ کو داخل بھی کیا گیا تھا۔ لیکن زخموں کی نوعیت کتنی شدید تھی اس کا اندازہ ان ڈاکٹروں کی گواہی سے ہونے والے انکشافات سے بخوبی ہو جاتا ہے۔

ڈاکٹر محمد زبیر صاحب نے گواہی دی

1) 29 مئی 1974ء کو جب زخمی طلباء کو ہسپتال لایا گیا تو ان کو ایمر جنسی کی بجائے براہِ راست وارڈ میں لے جایا گیا۔ میں نے ان کا معائنہ کیا اور ان میں سے ایک طالب علم آفتاب احمد کو کسی حد تک Serious کہا جاسکتا ہے۔ میں ان کی حالت کے متعلق یہ اس لیے کہہ رہا ہوں کہ اس کے سر پر ضرب لگی تھی اور وہ اس وقت بے ہوش تھا۔ اور باقی مضروب پوری طرح ہوش میں تھے۔

باقی آٹھ طلباء کی حالت کو Grievous نہیں کہا جاسکتا۔

2) اس ایک Serious طالب علم آفتاب احمد صاحب کو بھی 7 روز کے بعد 8/ جون کو ہسپتال سے فارغ کر دیا گیا تھا۔ ان کا سر کا ایکسرے کیا گیا تھا اور وہ بھی ٹھیک نکلا تھا اور کوئی فریکچر نہیں تھا۔

3) ڈاکٹر محمد زبیر صاحب نے کسی اور مریض کے ایکسرے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

4) کسی طالب علم کو خون لگانے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔

نشتر ہسپتال کے Causality Medical Officer ڈاکٹر اقبال احمد صاحب نے یہ گواہی دی

1) میں نے چار زخمی طلباء کا شعبہ حادثات میں معائنہ کیا، جن میں سے کوئی بھی شدید زخمی نہیں تھا۔

2) ان میں سے کسی کو بھی خون نہیں لگانا پڑا۔

3) ایک طالب علم کی آنکھ کے ارد گرد نیلا داغ نمودار ہوا تھا، ایکس رے کرایا گیا تو وہ ٹھیک نکلا کوئی فریکچر نہیں تھا۔

ان ڈاکٹر صاحبان نے بیان کیا کہ داخل ہونے والے طلباء میں سے بعض ایسے بھی تھے جو ڈسچارج ہونے کا انتظار کیے بغیر خود ہی ہسپتال سے چلے گئے تھے۔

یہ تھی ان شدید زخمیوں کی نازک حالت کی حقیقت جس کے متعلق پورے ملک میں افواہیں اڑائی جا رہی تھیں کہ زبانیں اور اعضاء کاٹ دیئے گئے اور اخبارات بھی لکھ رہے تھے کہ ان میں سے کئی کی حالت نازک ہے۔ اور سچ یہ تھا کہ کسی ایک کے بھی زخم اس نوعیت کے نہیں تھے کہ انہیں Grievous Injury کہا جا سکے۔ کوئی جان ضائع نہیں ہوئی۔ کسی کی ہڈی فریکچر نہیں ہوئی۔ کسی کو خون نہیں لگانا پڑا۔ صرف دو کے ایکسرے کرانے کی ضرورت پڑی اور وہ بھی ٹھیک تھے۔

افرادِ جماعت پر سرگودھا ریلوے اسٹیشن پر فائرنگ

اِن دو ہفتوں کے حالات مکمل کرنے سے قبل ایک اہم واقعہ درج کرنا ضروری ہے۔ اِس واقعہ کو پڑھ کر اندازہ ہو جاتا ہے کہ اُس وقت احمدیوں پر کس قسم کے مظالم روا رکھے جا رہے تھے۔ مکرم و محترم ہادی علی چوہدری صاحب نے جو کہ اِس واقعہ کے چشم دید گواہ تھے۔ اس واقعہ کو تحریر فرمایا ہے۔ آپ لکھتے ہیں:۔

”مؤرخہ 16 / جولائی کو سرگودھا ریلوے اسٹیشن پر احمدیوں کے قافلہ پر فائرنگ کی گئی اور دس نہتے احمدیوں کو گولیوں کا نشانہ بنایا گیا۔

جس روز فائرنگ ہوئی، اس سے ایک دو روز قبل ربوہ سے جو دوست اپنے عزیزوں سے ملاقات کے لئے سرگودھا جیل گئے تھے ان کو ملاقات کے بعد راستہ میں زدوکوب کیا گیا۔ اس واقعہ کے پیشِ نظر صدر صاحب عمومی نے 16 / جولائی کو ملاقات کے لئے جانے والے دوستوں کو منظم طریق پر جانے کی ہدایت فرمائی اور مکرم محمد احمد صاحب لائبریرین تعلیم الاسلام کالج ربوہ (حال جرمنی) کو امیرِ قافلہ بنایا۔

اس قافلہ کے چالیس سے زائد افراد میں خاکسار اور خاکسار کے نانا محترم ماسٹر راجہ ضیاء الدین ارشد شہید شامل تھے۔ خاکسار کے ماموں مکرم نعیم احمد صاحب ظفر اور خاکسار کے بڑے بھائی اشرف علی صاحب بھی جیل میں تھے۔ ہم دونوں ان سے ملاقات کی غرض سے گئے تھے۔

16 / جولائی کی شام کو جب ملاقات کے بعد ربوہ واپسی کے لئے اسٹیشن پہنچے تو ابھی گاڑی کی آمد میں کچھ دیر تھی۔ ہم سب اکٹھے تیسرے درجہ کے ٹکٹ گھر میں انتظار کرنے لگے۔ یہ ٹکٹ گھر اسٹیشن کی عمارت کے ساتھ مگر اس کے جنگلے سے باہر تھا۔ جب ٹکٹوں والی کھڑکی کھلی تو اکثر لوگ ٹکٹ لینے کے لئے قطاریں لگ گئے۔ بعض نے جب ٹکٹ لے لئے اور مختار احمد صاحب آف فیکٹری ایریا کی باری آئی تو ٹکٹ دینے والے نے کہا:

”ربوہ کے ٹکٹ ختم ہو گئے ہیں، آپ لالیاں یا چنیوٹ کا ٹکٹ لے لیں، ویسے پتہ نہیں آپ لوگوں نے ربوہ پہنچنا بھی ہے یا نہیں۔“

تھوڑی دیر میں ہم سب چنیوٹ وغیرہ کی ٹکٹیں لے چکے تھے۔ گاڑی کا وقت بھی قریب تھا چنانچہ دو دو چار چار افراد باتیں کرتے ہوئے اسٹیشن کی بائیں جانب جنگلے کے ایک دروازے سے پہلے پلیٹ فارم سے دوسرے پلیٹ فارم پر جانے کے لئے درمیانے پُل کی سیڑھیوں پر چڑھنے لگے۔ جب کچھ لوگ سیڑھیوں پر تھے اور کچھ پُل پر اور کچھ پُل سے دوسرے پلیٹ فارم کی سیڑھیوں پر اتر رہے تھے کہ اچانک پہلے پلیٹ فارم پر پولیس کے کمرہ کے سامنے سے چند غنڈوں نے سیڑھیوں سے اترنے والوں پر فائرنگ شروع کی۔ پولیس کے تین چار سپاہی ان حملہ آوروں کی پشت پر کھڑے تھے۔ اس فائرنگ سے ابتدا ہی میں ہمارے دس لوگ زخمی ہوگئے اور ان میں سے دو تین دوسرے پلیٹ فارم پر گر بھی گئے۔ باقی زخمی پلیٹ فارم سے نیچے عقب میں گاڑی کی پٹری پر یا پلیٹ فارم پر ستونوں اور پُل کی اوٹ میں ہو گئے۔ جب فائرنگ شروع ہوئی تو خاکسار اس وقت سیڑھیاں چڑھ کر پُل کے شروع میں تھا اور اس سارے منظر کو دیکھ رہا تھا۔ اس وقت ایک دیوانگی کے عالم میں خاکسار اور دو تین اور دوستوں نے بھاگ کر زخمیوں تک پہنچنے اور گرے ہوؤں کو گھسیٹ کر اِدھر اُدھر چھپانے کی کوشش کی۔

انہی لمحات میں ایک دد غنڈوں کو دونوں پلیٹ فارموں کی درمیانی پٹری کو پھلانگ کر ہاتھوں میں ہاکی اور خنجر لئے ادھر آتے دیکھا تو ہم نے فوراً پلیٹ فارم سے اُتر کر پٹری سے پتھر اُٹھا کر انہیں تاک کر مارے۔ ہمارے پتھر انہیں کاری لگے اور وہ واپس بھاگ گئے۔

ان حملہ آوروں میں سے جو اِس پلیٹ فارم پر آتا وہ ہمارے پتھروں کا نشانہ بنتا اور پسپا ہو جاتا۔ اس سارے وقت گولیاں مارنے والے ”مجاہد“ ہم پر گولیاں برساتے رہے جو ہمارے عقب میں کھڑی مال گاڑی پر لگ لگ کر آوازیں کرتی رہیں۔ ہم موت سے بے خبر ایک دیوانگی کے عالم میں ان پر پتھر برساتے رہے۔ اس اثنا میں ریاض صاحب کو گرنے کی وجہ سے گھٹنے پر چوٹ آگئی۔ کچھ دیر بعد راشد حسین صاحب کے سینے میں بھی گولی لگ گئی۔ اب ہم دو تھے جنھوں نے اس وقت تک ان میں سے ایک ایک پر پتھر برسائے جب تک کہ وہ بھاگ نہ گئے۔ اس وقت اگر یہ دفاع نہ ہو سکتا تو وہ یقیناً اِس پلیٹ فارم پر آکر ہمارے زخمیوں کو شہید کر دیتے۔

بہر حال جب گولیوں کی آواز ختم ہوئی تو ایک سنّاٹا چھا گیا۔ ہم بھی اور بعض دوسرے دوست بھی فوراً ہی پلیٹ فارم پر آگئے اور زخمیوں کو سنبھالنے لگے۔ اسی اثنا میں گاڑی بھی آگئی۔ ہم زخمیوں کو سہارے دے کر اس میں چڑھانے لگے کہ

اچانک ریلوے پولیس والے آگئے اور ہمیں رپورٹ لکھوانے پر زور دینے لگے۔ امیرِ قافلہ محمد احمد صاحب دو تین گولیاں لگنے کی وجہ سے زخمی تھے۔ چنانچہ خاکسار پولیس والوں سے نپٹ رہا تھا۔ ہم بضد تھے کہ گاڑی فوراً چلائیں تاکہ ربوہ جا کر زخمیوں کا علاج شروع ہو، رپورٹ ہم گاڑی کے اندر ہی لکھا دیں گے۔ وہ مصرّ تھے کہ پہلے وقوعہ پر رپورٹ درج ہوگی پھر گاڑی چلے گی۔

ایک بے بسی کا عالم تھا۔ اتنے میں سرگودھا کا ایک پولیس انسپکٹر عبد الکریم نامی بھی آگیا۔ اس نے سفید شلوار قمیص پہن رکھی تھی اور ہیئت اور فطرت کا خالص چودھویں صدی کا مولوی تھا۔ وہ بھی پولیس والوں کے ساتھ مل کر اصرار کرنے لگا کہ رپورٹ پہلے لکھواؤ۔ اس وقت صرف خاکسار تھا جو اُن سے بحث کر رہا تھا۔ اس تکرار کے دوران اچانک ایک جیپ پلیٹ فارم پر آکر رُکی۔ جس میں سے سفید پتلون شرٹ میں افسرانہ شان سے ایک شخص اُترا۔ اس نے ایک لمحے میں صورتحال کا اندازہ کیا اور خاکسار سے مخاطب ہو کر کہنے لگا کہ فکر نہ کرو، ہم یہاں سرگودھا میں ہی انہیں فوری طبّی امداد دیں گے۔ اس غرض کے لئے دو ایمبولینسیں پہنچ رہی ہیں۔ اس نے بتایا کہ وہ یہاں کا کمشنر ہے اور ہر قسم کے انتظامات ہو چکے ہیں۔ اس کی شرافت اور بردباری قابلِ تعریف تھی۔ اتنے میں دو ایمبولینسیں پلیٹ فارم پر پہنچ گئیں۔ اس وقت تک بکھرے ہوئے بہت سے احمدی دوست یہاں جمع ہو چکے تھے۔ ہم سب نے ایمبولینس والوں کے ساتھ فوری طور زخمیوں کو گاڑی سے اُتارا اور ایمبولینس میں سوار کیا۔ کمشنر صاحب نے خاکسار کو بھی زخمیوں کے ساتھ ایمبولینس میں جانے کا کہا۔ چنانچہ ہم سب ہسپتال چلے گئے۔ جہاں فوری طور پر زخمیوں کو خون دیا گیا اور مرہم پٹی وغیرہ کی گئی۔ خاکسار کو زخمیوں کے ساتھ ہسپتال میں ہی رکھا گیا۔

ہسپتال کے باہر اور ہمارے زخمیوں کے وارڈ کے باہر کمشنر سرگودھا کی طرف سے پولیس کا کڑا پہرہ لگا دیا تھا اور ہماری حفاظت کا خاص خیال رکھا گیا۔

بعد میں معلوم ہوا کہ ہسپتال کے CMO احمدی تھے۔ بہر حال اسی وقت ہر زخمی کے زخموں کا اندازہ بھی کیا گیا اور اس کے مطابق ان کے علاج بھی معیّن کئے گئے۔ ان میں خاکسار کے نانا مکرم ماسٹر ضیاء الدین ارشد صاحب کی حالت تشویشناک تھی کیونکہ گولی ان کے کان کے اوپر لگی تھی اور دماغ میں داخل ہوگئی تھی۔

ایک اور غریبانہ ہیئت کے نوجوان تھے جو سیالکوٹ کے کسی گاؤں سے اپنے کسی عزیز سے ملنے آئے تھے۔ ان کے پیٹ میں گولی لگی تھی جو چند انتڑیوں کو کاٹتی ہوئی معدے میں جا رُکی تھی۔ ان کا آپریشن پہلی رات ہی کیا گیا اور گولی نکال کے انتڑیاں سی دی گئیں اور وہ جلد صحت یاب ہو گئے۔

راشد حسین صاحب جنہیں دفاع کرتے ہوئے سینے میں گولی لگی تھی۔ ان کی حالت بھی ٹھیک نہ تھی کیونکہ گولی سینے سے پھیپھڑوں میں سے ہوتی ہوئی ریڑھ کی ہڈی کے ساتھ آکر ٹھہر گئی تھی۔ اس وجہ سے وہ نکالی نہ جاسکتی تھی۔ پھیپھڑوں کی حد تک تو ان کا علاج ہو گیا۔ مگر گولی ان کے اندر ہی رہی جو بعد میں جرمنی جا کر نکلوائی گئی۔

اسی طرح مختلف لوگوں کو جو گولیاں لگیں وہ نکال دی گئیں اور علاج کر دیئے گئے۔ خاکسار کے نانا کو لاہور وغیرہ بھی لے جایا گیا مگر ان کے سر سے گولی کا نکلنا ناممکن رہا۔ جس کی وجہ سے وہ تین ماہ بعد فضل عمر ہسپتال میں وفات پا کر شہدائے احمدیت میں داخل ہو گئے۔

بعد میں چند روز کے بعد ہمیں سرگودھا ملزموں کی شناخت کے لئے اور وقوعہ کی رپورٹ کے لئے طلب کیا گیا۔ شناخت پریڈ میں وہ تمام غنڈے موجود تھے جو ہمارے قافلوں پر زیادتی کرتے تھے اور ان میں سے ایک دو وہ بھی تھے جو فائرنگ میں شامل تھے اور خاکسار انہیں پہچانتا تھا۔ چنانچہ خاکسار نے مجسٹریٹ کو ان کی نشاندہی بھی کی۔ مگر جس طرح ایک پلان تھا ہماری شناخت کو تسلیم نہیں کیا گیا اور نتیجہ یہ نکالا گیا کہ کوئی ملزم بھی پہچانا نہیں گیا۔ اسی طرح وقوعہ کی تفصیلات کو بھی تسلیم نہیں کیا گیا۔

اس کے بعد پھر دو دفعہ ہمیں حاضری پر عدالت میں بلایا گیا۔ مگر معلوم ہوا کہ فیصلہ وہی ہوتا رہا جو صاحب اقتدار لوگ چاہتے تھے۔"

اس واقعہ میں زخمی ہونے والے دیگر دوستوں کے نام یہ ہیں:

1۔ مکرم لطف الرحمن صاحب (ٹھیکیدار پہاڑی) دارالنصر ربوہ

2۔ مکرم حاکم علی صاحب فیکٹری ایریا ربوہ

3۔ مکرم میاں عبدالسلام صاحب زرگر ربوہ

4۔ مکرم ڈاکٹر عبدالغفور صاحب سرگودھا

5۔ مکرم ملک فتح محمد صاحب ریلوے روڈ ربوہ

6۔ مکرم ہدایت اللہ چٹھہ صاحب ربوہ

17 / جولائی کو کارروائی شروع کرنے کی اطلاع اور صدر انجمن احمدیہ کا جواب

حکومت کی طرف سے جس عجیب رویہ کا اظہار کیا جا رہا تھا اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ 16 / جولائی 1974ء کی شام کو قومی اسمبلی کے سیکریٹری صاحب کا فون ربوہ آیا کہ جماعت کا وفد، امام جماعتِ احمدیہ کی سربراہی میں اسلام آباد آجائے۔ کل سے قومی اسمبلی کی سپیشل کمیٹی کارروائی کا آغاز کرے گی۔ یہ بات پیشِ نظر رہے کہ اس وقت ربوہ سے اسلام آباد جانے میں تقریباً چھ گھنٹے لگتے تھے اور اس وقت راستے میں امن و امان کی صورتِ حال نہایت مخدوش تھی۔ راستے میں سرگودھا تھا جہاں ایک ہی روز قبل احمدیوں کو بے دردی سے نشانہ بنایا گیا تھا اور اس امر کی تحریری اطلاع کوئی نہیں دی گئی تھی صرف زبانی اطلاع دی گئی تھی۔ ان حالات میں صدر انجمن احمدیہ یہ مناسب نہیں سمجھتی تھی کہ حضرت خلیفۃ المسیح کی خدمت میں درخواست کرے کہ وہ اسلام آباد تشریف لے جائیں۔ چنانچہ فون پر سیکریٹری صاحب کو اس بات سے مطلع کر دیا گیا اور سٹیرنگ کمیٹی کے سربراہ کو خط لکھ کر اطلاع دی گئی کہ ان حالات میں صدر انجمن احمدیہ حضرت خلیفۃ المسیح کو یہ مشورہ دینے کی ذمہ داری نہیں لے سکتی کہ وہ آج ہی اسلام آباد روانہ ہو جائیں اور ان سے یہ مطالبہ کیا کہ باقاعدہ تحریری نوٹس بھجوایا جائے۔ راستے کے لئے حکومت اپنی ذمہ داری پوری کرتے ہوئے ملٹری اسکورٹ مہیا کرے۔ اس کارروائی کے آغاز کی معیّن تاریخ کو خفیہ رکھا جائے۔ ہمارے پندرہ مسلح محافظ ساتھ ہوں گے اور آخر میں لکھا کہ ہم آپ کے جواب کے منتظر رہیں گے۔

اس کا جواب 17 / جولائی 1974ء کو قومی اسمبلی کے سیکریٹری اسلم اسد اللہ خان صاحب کی طرف سے یہ موصول ہوا کہ نئی تاریخ 22 / جولائی رکھی گئی ہے اور اسے خفیہ رکھا جائے گا۔ اسکورٹ مہیا کیا جائے گا لیکن پندرہ مسلح محافظ ساتھ رکھنے کے بارے میں اجازت اس لئے نہیں دی جا سکتی کہ راستے میں مختلف اضلاع کے مجسٹریٹ نے اپنے اضلاع میں اسلحہ لے کر جانے پر پابندی لگائی ہو گی اور قومی اسمبلی میں اسلحہ لے کر آنے کی اجازت نہیں ہوتی۔

اور حکومت کا یہ ارادہ کہ 17 جولائی 1974ء کو کارروائی شروع کر دی جائے اس لئے بھی عجیب تھا کہ 18 / جولائی کو توصدانی ٹریبونل کے سامنے لاہور میں حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ کا بیان قلمبند ہونا تھا۔ یہ کارروائی بند کمرے میں ہوئی لیکن

بعد میں اخبارات کو اس بیان کے مندرجات چھاپنے کی اجازت دے دی گئی۔ حضور کے بیان کے علاوہ کئی سرکاری افسران کے بیانات بھی بند کمرے میں ہوئے تھے۔ 20/ جولائی 1974ء جسٹس صمدانی نے ربوہ کا دورہ کیا اور ریلوے سٹیشن کا معائنہ کرنے کے علاوہ جماعتی دفاتر اور بہشتی مقبرہ بھی گئے۔

(مشرق 19 جولائی 1974ء ص 1، 21 جولائی 1974ء ص 1)

قومی اسمبلی کی خاص کمیٹی میں کارروائی

جیسا کہ پہلے ذکر آ چکا ہے کہ راہبر کمیٹی کے بعد یہ معاملہ قومی اسمبلی کی سپیشل کمیٹی میں پیش ہونا تھا اور اس کمیٹی کی صورت یہ تھی کہ پوری قومی اسمبلی کو ہی سپیشل کمیٹی میں تبدیل کر دیا گیا تھا اور یہ فیصلہ ہوا تھا کہ جماعت مبائعین اور غیر مبائعین دونوں کے وفود اس کمیٹی میں آئیں اور ان پر سوالات کیے جائیں۔ صدر انجمن احمدیہ کی طرف سے لکھا گیا کہ ہم اس بات میں آزاد ہیں جن ممبران پر مشتمل وفد چاہیں مقرر کریں کہ وہ اس کمیٹی میں اپنا موقف بیان کرے لیکن حکومت کی طرف سے اصرار تھا کہ حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ لازماً اس وفد میں شامل ہوں۔ اس صورت حال میں پانچ اراکین پر مشتمل وفد تشکیل دیا گیا جس میں حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ کے علاوہ حضرت صاحبزادہ مرزا طاہر احمد صاحب، حضرت شیخ محمد احمد صاحب مظہر، حضرت مولانا ابوالعطاء صاحب ، حضرت مولانا دوست محمد شاہد صاحب شامل تھے۔

اس اہم کارروائی کے لیے حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ نے سب سے زیادہ دعاؤں سے ہی تیاری کی تھی۔ خلافت لائبریری سے کچھ کتب منگوائی گئیں اور حضرت قاضی محمد یوسف صاحب مرحوم کے کتب خانہ کی کتب بھی منگوائی گئیں۔ لیکن حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ کی ہدایت تھی کہ حضور کی اجازت کے بغیر یہ کتب کسی کو نہ دی جائیں۔ وفد کے بقیہ اراکین میٹنگ کر کے اس مقصد کے لیے بڑی محنت سے تیاری کر رہے تھے اور جو اعتراضات عموماً کیے جاتے ہیں ان کے جوابات بھی تیار کیے گئے۔ چند میٹنگز میں حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ بھی شامل ہوئے۔ حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ نے اس بات کا اظہار بارہا فرمایا کہ اس کارروائی کے دوران نہ صرف اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ بتایا گیا تھا کہ کیا اور کس طرح جواب دینا ہے بلکہ یہ بھی بتایا گیا تھا کہ کب اس کا جواب

دینا ہے؟ حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ نے جب کارروائی میں شرکت کے لیے اسلام آباد جانا ہوتا تو حالات کے پیشِ نظر اس کا اعلان نہیں کیا جاتا تھا اور جس روز جانا ہوتا اس روز صبح کے وقت حضور ارشاد فرماتے اور پھر قافلہ روانہ ہوتا۔ اسلام آباد میں حضور کا قیام ونگ کمانڈر شفیق صاحب کے مکان میں ہوتا تھا۔

اس کارروائی کے آغاز سے قبل حضورؒ کو اس کے بارے میں تشویش تھی۔ اس فکرمندی کی حالت میں حضور کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے الہام ہوا:۔

”وَسِّعْ مَکَانَکَ اِنَّا کَفَیْنٰکَ الْمُسْتَھْزِئِیْنَ“

یعنی اپنے مکان کو وسیع کر، ہم استہزاء کرنے والوں کے لیے کافی ہیں۔

اس پُر آشوب دور میں اللہ تعالیٰ یہ خوش خبری عطا فرما رہا تھا کہ آج حکومت، طاقت اور اکثریت کے نشہ میں یہ لوگ جماعت کو ایک قابلِ استہزاء گروہ سمجھ رہے ہیں لیکن ان سے اللہ تعالیٰ خود نمٹ لے گا۔ جماعت احمدیہ کا یہ فرض ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا ہونے والی ترقیات کے لیے اپنے آپ کو تیار کرے۔ کوئی بھی غیر جانب دار شخص اگر بعد میں ظاہر ہونے والے واقعات کا جائزہ لے اور اس مختصر کتاب میں بھی ہم اس بات کا جائزہ پیش کریں گے کہ جن لوگوں نے بدنیّتی سے اس کارروائی کو شروع کیا اور پھر بزعمِ خود احمدیوں کو کافر قرار دیا یا کسی رنگ میں بھی استہزاء کی کوشش کی ان کا انجام کیا ہوا؟ حقیقت یہ ہے کہ صرف خدا کا ہاتھ تھا جس نے ان پر پکڑ کی اور ان کو دنیا کے لئے ایک عبرت کا سامان بنا دیا۔ یہ کسی دنیاوی کوشش کا نتیجہ نہیں تھا بلکہ خدا ان کی شرارتوں کے لئے کافی تھا۔

اس کے علاوہ 1974ء کے پُر آشوب دور میں حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ کو الہام ہوا فَدَمْدَمَ عَلَيْهِمْ رَبُّهُمْ بِذَنْبِهِمْ فَسَوّٰهَا (تب ان کے گناہ کے سبب ان کے ربّ نے ان پر پے در پے ضربیں لگائیں اور اس (بستی) کو ہموار کر دیا۔

حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ اسمبلی میں محضر نامہ پڑھتے ہیں

22اور 23 جولائی 1974ء کو حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ نے پوری قومی اسمبلی پر مشتمل خاص کمیٹی میں جماعت ِ احمدیہ کی طرف سے پیش کیا جانے والا محضر نامہ خود پڑھ کر سنایااور اس کے بعد کارروائی کچھ دنوں کے لیے ملتوی کر دی گئی۔ جیسا کہ پہلے ذکر آ چکا ہے کہ اس محضر نامہ کے آخر پر حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی ایک پر شوکت تحریر درج کی گئی تھی اور جب حضور نے کمیٹی میں یہ حوالہ پڑھ کر سنایا تو اس کا ایک خاص اثر ہوا اور بعد میں ایک ممبر اسمبلی نے اپنے ایک احمدی دوست کے ساتھ حیرت سے ذکر کیا کہ مرزا صاحب نے بڑے جلال سے یہ حوالہ پڑھ کر سنایا ہے اور جیسا کہ بعد میں ذکر آ ئے گا اس کارروائی کے آخر میں ممبرانِ قومی اسمبلی کے اصرار پر یہ سوال پوچھا گیا تھا کہ اس حوالہ کو درج کرنے کا مقصد کیا ہے؟ (7،6)

قومی اسمبلی اور صدر انجمن احمدیہ کے درمیان

22 /جولائی 1974ء کو قومی اسمبلی کے سیکریٹری نے ناظر صاحب اعلیٰ کے نام ایک خط لکھا۔ جس میں کچھ حوالے بھجوانے کا کہا گیا تھا۔ یہ خط جو کہ دراصل سیکریٹری صاحب قومی اسمبلی نے مولوی ظفر انصاری ایم این اے کے ایک خط پر کارروائی کرتے ہوئے لکھا تھا۔ اس خط سے یہ بخوبی ظاہر ہو جاتا تھا کہ خود قومی اسمبلی کو بھی نہیں معلوم کہ اس نے یہ کارروائی کس سمت میں کرنی ہے۔ اس خط میں لکھا گیا تھا جماعت ِ احمدیہ اس میمورنڈم کی کاپی بھجوائے جو کہ تقسیمِ ہند کے موقع پر جماعت ِ احمدیہ کی طرف سے پیش کیا گیا تھا۔ اور پروفیسر سپیٹ (Spate) جن کی خدمات حضرت خلیفۃ المسیح الثانی نے اس کمیشن میں کچھ امور پیش کرنے کے لئے حاصل کی تھیں، ان کے نوٹس اور تجاویز بھی کمیشن کو بھجوائی جائیں۔ اس کے علاوہ الفضل کے کچھ شماروں اور ریویو آف ریلیجنز کے تمام شمارے بھجوانے کا بھی لکھا گیا تھا۔ اب موضوع تو یہ تھا کہ جو شخص آنحضرت ﷺ کو آخری

نبی نہیں سمجھتا، اس کی اسلام میں کیا حیثیت ہے؟ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ اس موضوع کے متعلق سوالات ہوں۔ یا پھر اگر جماعت ِاحمدیہ کے محضر نامہ کے متعلق سوالات ہوتے تو بات کم ازکم سمجھ میں بھی آتی مگر اس فرمائش سے تو لگتا تھا کہ اس کارروائی کے کرتا دھرتا افراد کا ذہن کہیں اور ہی جا رہا تھا۔ لیکن ان کو صدر انجمن احمدیہ کی جانب سے یہ جواب دیا گیا کہ یہ میمورنڈم اور پروفیسر سپیٹ کی تجاویز تو حکومت کے پاس ہی ہوں گی کیونکہ ان کو مسلم لیگ کی طرف سے پیش کیا گیا تھا۔ یہ سب کاغذات حکومت کی تحویل میں ہی تھے اور جنرل ضیاء الحق صاحب کے دور میں ان کو شائع بھی کر دیا گیا تھا۔

اب جو بھی سوالات اُٹھنے تھے ان کے جوابات کے لئے حوالہ جات کی ضرورت ہونی تھی تاکہ صحیح اور مناسب حوالہ جات کے ساتھ جوابات سپیشل کمیٹی کے سامنے آئیں۔ اب کسی جرم کی تفتیش تو نہیں ہو رہی تھی کہ پہلے سے سوال بتا دینا مناسب نہ ہوتا۔ عقائد کے متعلق ہی کارروائی ہونی تھی۔ چنانچہ جماعت کی طرف سے یہی مطالبہ کیا گیا کہ جو سوالات سپیشل کمیٹی میں ہونے ہیں وہ اگر ہمیں مہیا کر دیئے جائیں تاکہ متعلقہ حوالہ جات بھی سوالات کے ساتھ پیش کئے جاسکیں کیونکہ وہاں پر جماعت کے وفد کے پاس نوے سال پر پھیلا ہوا لٹریچر تو مہیا نہیں ہونا تھا۔ بہر حال 25/ جولائی 1974ء کو قومی اسمبلی کے دفتر کی طرف سے ایڈیشنل ناظر اعلیٰ کو جواب موصول ہوا کہ سٹیرنگ کمیٹی نے اس پر غور کر کے یہ فیصلہ کیا ہے کہ سوالات قبل از وقت مہیا نہیں کئے جا سکتے البتہ اگر کسی سوال کی تیاری کے لئے وقت درکار ہوا تو وہ دے دیا جائے گا۔ اس خط سے یہ بھی اندازہ ہوتا تھا کہ قومی اسمبلی اور اس کے عملہ نے اس اہم کارروائی کی کوئی خاص تیاری نہیں کی ہوئی کیونکہ اس خط کے آغاز میں اور اس کے بعد بھی یہ لکھا ہوا تھا کہ اس موضوع پر انجمن احمدیہ کے ہیڈ سے زبانی بات ہوئی تھی اور اس خط سے یہ تاثر ملتا تھا کہ لکھنے والے کے ذہن میں ہے کہ جماعت کے وفد کی قیادت انجمن کے سربراہ کر رہے ہیں۔ حالانکہ ناظر اعلیٰ یا صدر صدر انجمن احمدیہ سے اس موضوع پر کوئی زبانی بات ہوئی ہی نہیں

تھی اور نہ ہی صدر صدر انجمن احمدیہ اس وفد کی قیادت کر رہے تھے۔ اس وفد کی قیادت تو حکومت کے اصرار کی وجہ سے حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ فرما رہے تھے۔ چنانچہ اس بات کو واضح کرنے کے لئے ایڈیشنل ناظر اعلیٰ صاحبزادہ مرزا خورشید احمد صاحب نے نیشنل اسمبلی کے سیکریٹری کو لکھا کہ اس وفد کی قیادت صدر انجمن احمدیہ کے سربراہ نہیں کر رہے بلکہ حضرت امام جماعتِ احمدیہ کر رہے ہیں۔ صدر انجمن احمدیہ کے سربراہ تو اس کے صدر کہلاتے ہیں۔ اب یہ ایک اہم قانونی غلطی تھی جس کو دور کر دیا گیا تھا لیکن آفرین ہے قومی اسمبلی کی ذہانت پر کہ اس کا بھی ایک غلط مطلب سمجھ کر دورانِ کارروائی اس پر اعتراض کر دیا۔ وہ اعتراض بھی کیا خوب اعتراض تھا، ہم اس کا جائزہ بعد میں لیں گے۔

قومی اسمبلی کی سپیشل کمیٹی میں محضر نامہ پڑھے جانے کے بعد 24/ جولائی کو ایڈیشنل ناظر اعلیٰ صدر انجمن احمدیہ صاحبزادہ مرزا خورشید احمد صاحب نے قومی اسمبلی کے سیکریٹری صاحب کے نام لکھا کہ قومی اسمبلی میں اس وقت دو موشن پیش کئے گئے ہیں جن میں سے ایک شاہ احمد نورانی صاحب کی طرف سے اور دوسری وزیرِ قانون عبد الحفیظ پیرزادہ صاحب کی طرف سے پیش کی گئی ہے۔ اگر اس مرحلہ پر کوئی اور موشن بھی ایوان کے سامنے پیش ہوئی ہے جس میں کچھ نئے نکات ہوں تو اس کے متعلق بھی ہمیں مطلع کر دیا جائے تاکہ ہم ان کے متعلق بھی اپنا نقطہ نظر پیش کر سکیں۔ اس کے جواب میں 25 /جولائی کو قومی اسمبلی کے سیکریٹری صاحب نے لکھا کہ قومی اسمبلی کی سٹیرنگ کمیٹی نے آپ کے اس خط کا جائزہ 25/جولائی کے اجلاس میں لیا اور یہ فیصلہ کیا کہ آپ کو ان دوسرے Motions سے ابھی مطلع نہیں کیا جا سکتا اگر بعد میں اس کی ضرورت ہوئی تو آپ کو اس سے مطلع کر دیا جائے گا۔

اسمبلی کی خاص کمیٹی میں سوالات کا سلسلہ تو 5/ اگست سے شروع ہونا تھا لیکن اس دوران پورے ملک میں احمدیوں کے خلاف پُر تشدد مہم کا سلسلہ جاری تھا اور حکومت اس کو روکنے کے لیے کوئی کوشش نہیں کر

رہی تھی۔ جگہ جگہ احمدیوں پر اپنے عقائد سے منحرف ہونے کے لیے دباؤ ڈالا جا رہا تھا۔ احمدیوں کا بائیکاٹ جاری تھا بہت سے مقامات پراحمدیوں کے گھروں اور دوکانوں پر حملے کر کے ان کے ساز و سامان کو نذرِ آتش کیا جا رہا تھا۔ بائیکاٹ اتنی مکروہ شکل اختیار کر گیا تھا کہ بعض جگہوں پر بچوں کے لیے دودھ لینا بھی ناممکن بنایا جا رہا تھا۔ خانیوال میں چکی والوں نے احمدیوں کا آٹا پیسنے سے بھی انکار کر دیا۔ 28/ جولائی کو بھوپال والا میں احمدیوں کی مسجد جلا دی گئی۔ ایک جگہ پر حجام احمدیوں کی حجامت تک نہیں بنا رہے تھے۔ احمدی باہر سے ایک حجام لے کر آئے تو فسادیوں نے اس کا منہ کالا کر کے اسے ذلیل کیا۔ یہ بات معمول بن چکی تھی کہ بس میں جہاں احمدی ملے اسے زدو کوب کیا جائے۔ 3/ اگست کو بھیرہ میں احمدی ایک فوت ہونے والی خاتون کی تدفین احمدیہ قبرستان میں کر رہے تھے کہ فسادیوں نے وہاں حملہ کر کے تدفین کو روکنے کی کوشش کی۔ 4/ اگست کو اوکاڑہ میں اعلان کیا گیا کہ ہم احمدیوں کو پاکستان میں نہیں رہنے دیں گے۔ اس سے قبل بھی اوکاڑہ میں مخالفت کا انداز یہ تھا کہ احمدیوں کی دوکانوں کا اور کاروباروں کا بائیکاٹ کیا جائے۔ نہ ان سے کسی کو چیز لینے دی جائے اور نہ ان کو کہیں سے سودا سلف لینے دیا جائے۔ احمدیوں کی دوکانوں کے باہر ملاں بیٹھ کر اس بات کی نگرانی کرتے رہتے کہ کوئی ان سے سودا نہ خرید لے۔ پھر دماغ کا یہ خلل اس حد تک پہنچ گیا کہ جو غیر احمدی عورتیں کسی احمدی کی دوکان سے کپڑا خریدنے لگتیں تو ان کو کہا جاتا کہ اگر تم نے ان سے کپڑا خریدا تو تمہارا نکاح ٹوٹ جائے گا۔ جس کسی بیچاری نے یہ غلطی کی اس سے سرِ عام توبہ کرائی گئی اور بعض کے نکاح دوبارہ پڑھائے گئے۔ اوکاڑہ میں مخالفین فسادات کی آگ بھڑکانے میں پیش پیش تھے ان میں سے کئی اسی دنیا میں خدا تعالیٰ کی گرفت میں آئے۔ کوئی پاگل ہوا۔ کوئی اب تک سڑکوں پر بھیک مانگ رہا ہے اور کبھی کسی احمدی کے پاس آکر بھیک کا طلبگار ہوتا ہے۔ کسی کی اولاد خدا تعالیٰ کے قہر کا نشانہ بنی۔ میرک ضلع اوکاڑہ میں تو مخالفین کا غیظ و غضب اس حد تک بڑھا کہ انہوں نے پہلے احمدیوں کے گھروں کے آگے چھاپے لگا کر انہیں اندر محصور کر دیا۔ جب پولیس نے آکر

چھاپے اتروائے تو مخالفین نے اینٹوں کی چنوائی کر کے احمدیوں کے دروازے بند کر دیئے اور ملاں لوگ طرح طرح کی دھمکیاں دیتے رہتے۔ کوئی احمدی بازار میں نکلتا تو اس کے پیچھے اوباش مخالفین لگ جاتے۔ اس ضلع کے احمدی صبر و استقامت سے ان مظالم کو برداشت کرتے رہے۔ ایک مولوی ایک احمدی کے گھر پر آیا اور خاتونِ خانہ سے کہنے لگا کہ مسلمان ہو جاؤ ورنہ رات کو مکینوں سمیت گھر کو آگ لگا دیں گے۔ اس بہادر خاتون نے کہا کہ میں اور بچے اس وقت گھر میں ہیں تم رات کی بجائے ابھی آگ لگا دو۔ یہ سن کر ملاں گالیاں دینے لگا۔ غلام محمد صاحب اوکاڑہ شہر سے جا کر ایک گاؤں کے پرائمری سکول میں پڑھاتے تھے۔ ان کو راستہ میں ایک شخص نے کلہاڑی مار کر شہید کر دیا۔ قاتل کو کچھ عرصہ گرفتاری کے بعد رہا کر دیا گیا۔ اس پس منظر میں جب 28/ جولائی کو وزیرِ اعلیٰ ساہیوال آئے تو احمدیوں کے ایک وفد نے ان سے ملنے کی درخواست کی تو انہوں نے ملنے سے انکار کر دیا۔ دوبارہ درخواست پر انہوں نے کہا کہ لاہور آکر ملیں۔ جب یہ لوگ لاہور گئے تو وہاں بھی وزیرِ اعلیٰ نے ملنے سے انکار کر دیا۔

5/ اگست کو کارروائی شروع ہوتی ہے

اب ہم اس کارروائی کا جائزہ لیں گے جو پوری قومی اسمبلی پر مشتمل سپیشل کمیٹی میں ہوئی اور اس میں حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ پر کئی روز تک سوالات کا سلسلہ چلا۔ یہ جائزہ قدرے تفصیل سے لیا جائے گا۔ جیسا کہ جلد ہی پڑھنے والے اندازہ لگا لیں گے کہ اکثر سوالات تو غیر متعلقہ تھے لیکن پھر بھی اس کارروائی کی ایک اہمیت ہے۔ وہ اس لئے کہ اس کے بعد دنیا کی تاریخ میں یہ پہلی مرتبہ ہوا کہ ایک سیاسی اسمبلی نے یہ فیصلہ کیا کہ ایک گروہ کے مذہب کا کیا نام ہونا چاہئے۔ اور اس لئے بھی کہ یہ ایک بین الاقوامی سازش کا ایک اہم حصہ تھا۔ اس کے علاوہ مخالفینِ جماعت کی طرف سے بارہا اس کارروائی کے متعلق غلط بیانی سے کام لے کر اپنے کارہائے نمایاں بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور ہر ایک نے اس نام نہاد کارنامے کا سہرا اپنے سر پرباندھنے کی کوشش کی ہے کہ یہ اصل میں مَیں ہی تھا جس کی ذہانت کی وجہ سے یہ فیصلہ سنایا گیا۔ سوالات اور ان کی حقیقت جب بیان کی جائے گی تو پڑھنے والوں کو خود اندازہ ہو جائے گا کہ ذہانت یا یوں کہنا چاہئے کہ اس کے فقدان کا کیا عالم تھا۔ اس کارروائی میں وہی گھسے پٹے سوالات کئے گئے تھے جو کہ عموماً جماعت کے مخالفین کی طرف سے کئے جاتے تھے۔ جب ان کا جواب درج کیا جائے گا تو پڑھنے والے ان کی حقیقت کے متعلق خود اپنی رائے قائم کر سکیں گے۔

5/ اگست کے روز جب کارروائی شروع ہوئی تو آغاز میں سپیکر اسمبلی صاحبزادہ فاروق علی صاحب نے کہا کہ اس وقت اٹارنی جنرل چیمبر میں مولوی ظفر احمد انصاری صاحب سے مشورہ کر رہے ہیں اور ان کے آنے پر چند منٹ میں ہم کارروائی کا آغاز کریں گے۔ پھر سپیکر اسمبلی نے اعلان کیا کہ کارروائی کا طریقہ کار یہ ہوگا کہ جس نے سوال کرنا ہے وہ اپنا سوال لکھ کر دے گا اور اٹارنی جنرل یہ سوال جماعت کے وفد سے کریں گے۔ کارروائی کے آغاز پر اٹارنی جنرل یحیٰی بختیار صاحب نے حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ کو حلف اُٹھانے کے لئے

کہا۔ حضرت صاحب کے حلف اُٹھانے کے بعد اٹارنی جنرل نے واضح کیا کہ آپ نے اُن سوالات کے جواب دینے ہیں جو پوچھے جائیں گے اور اگر آپ کسی سوال کا جواب دینا پسند نہ کریں تو آپ انکار کر سکتے ہیں۔ لیکن اس انکار سے سپیشل کمیٹی کوئی نتیجہ اخذ کر سکتی ہے جو آپ کے حق میں اور آپ کے خلاف بھی ہو سکتا ہے۔ اور اگر آپ کسی سوال کا فوراً جواب نہ دینا پسند کریں تو آپ اس کے لیے وقت مانگ سکتے ہیں۔

پیشتر اس کے کہ ہم ان سوالات کا جائزہ لیں جو پوچھے گئے اور ان جوابات کو دیکھیں جو دیئے گئے یہ امر پیشِ نظر رہے کہ اس سپیشل کمیٹی کے سپرد یہ کام تھا کہ یہ فیصلہ کرے کہ اسلام میں ان لوگوں کی کیا حیثیت ہے جو رسولِ کریم ﷺ کو آخری نبی نہیں مانتے۔ اور ان کے سپرد اس مسئلہ کے متعلق آراء جمع کرنا اور اس مسئلہ کو مدِ نظر رکھتے ہوئے تجاویز تیار کرنا تھا۔ یہ ایک مسلّمہ امر ہے کہ خواہ کسی کمیٹی کی تحقیقاتی کارروائی ہو یا کوئی عدالتی کارروائی ہو اور سوال پوچھے جائیں تو یہ سوالات پیشِ نظر مسئلہ کے بارے میں ہونے چاہئیں یا کم از کم ان سوالات کا اس مسئلہ کے متعلق تجاویز مرتب کرنے سے کوئی واضح تعلق ہونا چاہئے۔ اور کچھ نہیں تو سوالات کی اکثریت کا تعلق اس مسئلہ سے ہونا چاہئے۔ اگر کوئی ایک غیر متعلقہ سوال بھی پوچھے تو یہ بھی قابلِ اعتراض ہے کجا یہ کہ کوئی کئی روز غیر متعلقہ سوالات پوچھتا جائے۔

کارروائی کے آغاز سے یہ امر ظاہر تھا کہ اٹارنی جنرل صاحب غیر متعلقہ سوالات میں وقت ضائع کر رہے ہیں اور اصل موضوع پر آنے سے کترا رہے ہیں۔ ان کا پہلا سوال حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے بارے میں تھا۔ اگر یہ پیشِ نظر رہے کہ یہ کمیٹی کس مسئلہ پر غور کر رہی تھی تو یہی ذہن میں آتا ہے کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے دعاوی کیا تھے یا حضرت خاتم الانبیاء ﷺ کی شان میں آپ نے کیا فرمایا لیکن اٹارنی جنرل نے سوال کیا کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کب اور کہاں پیدا ہوئے ، آپ کا خاندانی پس منظر کیا تھا ، آپ کی تعلیم کیا تھی اور آپ نے کب اور کہاں وفات پائی۔ اس کے جواب میں حضرت خلیفۃ المسیح

الثالث ؒ نے فرمایا کہ اس کا تحریری جواب جمع کرا دیا جائے گا۔ اٹارنی جنرل صاحب نے شکریہ ادا کیا اور موضوع تبدیل کیا۔ پھر حضرت خلیفۃ المسیح الثالث ؒ سے دریافت کیا

”You are the grandson of Mirza Ghulam Ahmad?“

اس پر حضرت خلیفۃ المسیح الثالث ؒ نے فرمایا ”ہاں“۔ اس کے بعد حضرت خلیفۃ المسیح الثالث ؒ سے ان کے حالاتِ زندگی دریافت کئے گئے۔

پھر یہ تفصیلات دریافت کرتے رہے کہ کیا آپ خلیفۃ المسیح، امام جماعت احمدیہ اور امیر المؤمنین تینوں منصبوں پر فائز ہیں۔ جب اس کا جواب اثبات میں دیا گیا تو یہ سوال کیا گیا کہ آپ ان مختلف عہدوں کے تحت کیا کام کرتے ہیں اور یہ مختلف عہدے کن اختیارات کے حامل ہیں۔ اس پر انہیں بتایا گیا کہ یہ مختلف عہدے نہیں بلکہ امام جماعتِ احمدیہ، خلیفۃ المسیح اور امیر المومنین کے الفاظ ایک ہی شخص کے متعلق استعمال ہوتے ہیں۔ پھر اٹارنی جنرل صاحب نے ایک اور مہمل سوال کیا کہ کیا جماعتِ احمدیہ اور Ahmadiyya Movement مختلف تنظیمیں ہیں۔ اس تمہید کے بعد اب امید کی جارہی تھی کہ سوالات کا سلسلہ زیر بحث موضوع کی طرف آئے گا لیکن جو کچھ ہوا وہ اس کے برعکس تھا۔

اس کے بعد یہ کہ جماعتِ احمدیہ میں انتخابِ خلافت کے قوانین کیا ہیں؟ کیا حضرت بانی سلسلہ احمدیہ کی تمام اولاد جو اب موجود ہے مجلسِ انتخابِ خلافت کی رکن ہوتی ہے۔ اس پر جب انہیں یہ بتایا گیا کہ ایسا نہیں ہے تو وہ اس بحث کو لے بیٹھے کہ کیا جماعتِ احمدیہ میں خلیفہ کو معزول کیا جا سکتا ہے؟ جب ان کو بتایا گیا کہ ایسا نہیں ہو سکتا تو پھر اٹارنی جنرل صاحب نے یہ سوال اُٹھایا کہ کیا خلیفہ کے حکم کو Over rule کیا جاسکتا

ہے۔ یہ بالکل غیر متعلقہ سوالات تھے۔ جماعت ِ احمدیہ میں خلافت کا انتخاب کیسے ہوتا ہے؟ خلافت کا کیا مقام ہے؟ خلافت کے احکامات کا مقام کیا ہے ؟ یہ احمدیوں کا مسئلہ ہے۔ قومی اسمبلی کا اس سے کوئی سروکار نہیں تھا۔

واضح رہے کہ یہ قومی اسمبلی کی سپیشل کمیٹی کی کارروائی ہو رہی تھی اور قومی اسمبلی کی سپیشل کمیٹی کی کارروائی جس قاعدہ کے تحت ہوتی ہے ، اس کے الفاظ یہ ہیں۔

(B) Special Committees: The assembly may by motion appoint a special committee, which shall have such composition and functions as may be specified in the motion .

(National Assembly of Pakistan, Rules of procedures and conduct of business in the National Assembly 2007p84)

اس قاعدہ سے ظاہر ہے کہ سپیشل کمیٹی کی کارروائی اس کام کی حدود کی پابند ہوتی ہے جو کہ اس کے لئے قومی اسمبلی نے متعیّن کئے ہیں اور یہ کمیٹی اس کام کو سر انجام دے کر اپنی رپورٹ قومی اسمبلی میں پیش کرتی ہے اور اس سپیشل کمیٹی کے لئے یہ کام مقرر ہوا تھا کہ یہ فیصلہ کرے کہ جو شخص آنحضرت ﷺ کو آخری نبی نہیں تسلیم کرتا ، اس کی اسلام میں کیا حیثیت ہے؟ اب اس معاملہ پر جماعت ِ احمدیہ کا موقف محضر نامہ کی صورت میں اور جماعت ِ احمدیہ کے مخالف ممبران ِ اسمبلی کا موقف اور محضرنامہ کا جواب بھی تحریری صورت میں سامنے آ چکا تھا۔ اس پس منظر میں یہی توقع کی جا سکتی تھی کہ اب سپیشل کمیٹی میں سوالات اس متعلقہ موضوع پر ہوں گے لیکن اتنے دنوں کی کارروائی میں کچھ اور ہی منظر سامنے آتا رہا۔

اس کے بعد وہ اس تفصیلی بحث میں الجھ گئے کہ تاریخ کے مختلف ادوار میں احمدیوں کی تعداد کیا تھی؟ اور اب یہ تعداد کتنی ہے؟ انہوں نے دریافت کیا کہ 1921ء میں ہندوستان میں احمدیوں کی تعداد کیا تھی؟ 1936ء میں یہ تعداد کتنی ہو گئی تھی؟ اور اب پاکستان میں احمدیوں کی تعداد کتنی ہے ؟ انگریز حکومت کی مردم شماری کے مطابق یہ تعداد کتنی تھی ؟ اور حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی تحریر کے مطابق یہ تعداد کتنی تھی ؟ اور دونوں میں فرق کیوں ہے؟ یہ کارروائی پڑھتے ہوئے کچھ سمجھ نہیں آتی کہ صاحب موصوف یا ان کو سوال دینے والے کیا بحث لے بیٹھے تھے۔ ان کی یہ بحث اس لیے بھی زیادہ نامعقول معلوم ہو رہی تھی کہ شروع میں ہی حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ نے فرما دیا تھا کہ ہمارے پاس بیعت کنندگان کا کوئی صحیح ریکارڈ موجود نہیں ہے۔ اور مذکورہ معاملہ کا احمدیوں کی تعداد سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ اگر پاکستان میں صرف پانچ یا چھ احمدی تھے اور ان کا عقیدہ اسلامی تعلیمات کے مطابق تھا تو ان کی تعداد کی بنا پر ان کو غیر مسلم نہیں قرار دیا جا سکتا ۔ اگر بالفرض پاکستان میں چھ سات کروڑ احمدی بھی تھے مگر ان کا عقیدہ غلط تھا تو اپنی زیادہ تعداد کی بنا پر وہ راسخ العقیدہ نہیں بن سکتے تھے۔ اور نہ ہی ان کی تعداد سے ان کے مذہبی اظہار کے بنیادی حق پر کوئی فرق پڑتا تھا۔

اس کے بعد کارروائی آگے بڑھی تو اس کے پڑھنے سے یہی تاثر ملتا ہے کہ اٹارنی جنرل صاحب کا وقفہ سے کچھ دیر قبل یہ تاثر ابھرنا شروع ہوا کہ شاید اب زیر بحث معاملہ کے متعلق سوالات شروع ہوں۔ انہوں نے حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ کے خطبہ جمعہ کا حوالہ دیا جس میں حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ نے آئین کے آرٹیکل 8 اور 20 میں مذہبی آزادی کی ضمانت کا حوالہ دیا تھا۔ اور یہ سوال اٹھایا کہ اگرپارلیمنٹ چاہے تو دو تہائی کی اکثریت سے ان شقوں کو تبدیل کر سکتی ہے اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ پارلیمنٹ کوایسا نہیں کرنا چاہئے۔ کچھ سمجھ نہیں آتی کہ وہ کیا نتیجہ نکالنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ہر ملک کے آئین میں پارلیمنٹ کو یہ اختیار ہوتا ہے کہ

وہ اگر مطلوبہ تعداد میں اراکین اس کے حق میں رائے دیں تو ملک کے آئین میں تبدیلی کرسکتے ہیں۔ لیکن آئین کی ہر شق اور ہونے والی ہر ترمیم کو بعض مسلّمہ بنیادی انسانی حقوق کے متصادم نہیں ہوناچاہیۓ خاص طور پر اگر اسی آئین میں ان حقوق کی ضمانت دی گئی ہو۔ مثلاً جس زمانہ میں جنوبی افریقہ کے آئین میں مقامی باشندوں کو ان کے حقوق نہیں دیئے گئے تو آخر کار پوری دنیا نے ان کا بائیکاٹ کر دیا تھا اور یہ عذر قابلِ قبول نہیں سمجھا جاتا تھا کہ ان کے آئین میں ایسا ہی لکھا ہوا تھااور اگر کسی ملک کی پارلیمنٹ ایسی کوئی آئینی ترمیم کر بھی دے جو بنیادی انسانی حقوق سے متصادم ہو تو اسے قبول نہیں کیا جاتا بلکہ بسا اوقات تو عدالت ہی اسے ختم کر دیتی ہے اور اندرونی دباؤ کے علاوہ پوری دنیا کی طرف سے ان پر دباؤ ڈالا جاتا ہے کہ اس کو ختم کریں۔

حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ نے اس سوال کے جواب کے شروع میں ہی ان الفاظ میں یہ موقف واضح فرما دیا تھا۔

”... یہ پارلیمنٹ ہماری جو ہے ، یہ نیشنل اسمبلی یہ سپریم لیجسلیٹو باڈی ہے اور اس کے اوپر کوئی پابندی نہیں ، سوائے ان پابندیوں کے جو یہ خود اپنے اوپر عائد کرے۔“

اور اس سے پہلے یہ بھی واضح فرما دیا تھا کہ پاکستان کا جو آئین ہے اس کی دفعہ9 یہ کہتی ہے کہ اس ہاؤس کو یہ اختیار نہیں ہو گا جو حقوق اس نے دیئے ہیں ان میں کمی کی جائے یا ان کو منسوخ کیا جائے۔

اب یہاں صورت ِحال یہ تھی خود اس اسمبلی کا بنایا ہوا آئین یہ اعلان کر رہا تھا کہ انہیں اس قسم کا فیصلہ کرنے کا اختیار ہی نہیں تھا۔ آئین کا آرٹیکل 8، جس کا حوالہ حضور دے رہے تھے، اس کے الفاظ یہ ہیں:۔

Laws inconsistent with or in derogation of fundamental rights to be void.

(1) Any law, or any custom or usage having the force of law, in so far as it is inconsistent with the rights conferred by this Chapter, shall, to the extent of such inconsistency, be void.

(2) The State shall not make any law which takes away or abridges the rights so conferred and any law made in contravention of this clause shall, to the extent of such contravention, be void.

آئین کی اس شق کا مطلب واضح ہے کہ سٹیٹ کو یہ اختیار نہیں ہوگا کہ آئینِ پاکستان کے Chapter 1 میں مذکور انسانی حقوق سے متصادم کوئی قانون سازی کرے اور اس سے متصادم اگر قانون سازی کی جائے گی تو وہ کالعدم ہوگی اور اس آئین میں اس شق سے چند سطریں پہلے آرٹیکل 7 میں سٹیٹ کی تعریف بھی درج ہے اور اس تعریف کی رو سے پارلیمنٹ بھی سٹیٹ کا حصہ ہے اور اس طرح یہ پابندی پارلیمنٹ پر بھی عائد ہوتی ہے اور آئین کا آرٹیکل 20 یہ اعلان کر رہا تھا کہ ہر شخص کو اپنا مذہب profess کرنے practice کرنے اور propagate کرنے کی اجازت ہو گی۔

اب ملاحظہ کیجئے کہ اٹارنی جنرل صاحب نے اس دلیل کا کیا رد پیش کیا۔ انہوں نے فرمایا کہ لیکن پارلیمنٹ کو یہ اختیار ہے کہ وہ وہ دو تہائی کی اکثریت سے آئین کے آرٹیکل 8 اور آرٹیکل 20 میں ترمیم کر دے۔ اوّل تو معلوم ہوتا ہے کہ انہیں اندازہ ہی نہیں تھا کہ وہ کیا بات کہہ گئے ہیں۔ آئین تو واضح طور پر یہ کہہ رہا ہے کہ پارلیمنٹ Chapter 1 میں مذکور انسانی حقوق سے متصادم کوئی قانون نہیں بنا سکتی اور ایسا قانون کالعدم ہو گا اور اٹارنی جنرل صاحب اس کا حل کیا تجویز فرما رہے ہیں؟ پہلے انہوں نے یہ کہا کہ پارلیمنٹ ان شقوں میں ترمیم کا

اختیار رکھتی ہے پھر اس موقف کا معیار اور بھی گر گیا اور انہوں نے یہ کہا کہ پارلیمنٹ آرٹیکل 8 کو جس میں یہ پابندی لگائی گئی ہے مکمل طور پر ختم کرنے کا اختیار رکھتی ہے اور اس کے ساتھ یہ بھی کہتے جا رہے ہیں کہ ان کے نزدیک پارلیمنٹ کو ایسا نہیں کرنا چاہئیے۔ سیدھی سی بات ہے آئین کی رو سے پارلیمنٹ کو یہ اختیار حاصل ہی نہیں ا ور یہ بات کہتے ہوئے اٹارنی جنرل صاحب کیا خوفناک راستہ کھول رہے تھے؟ وہ یہ راستہ کھول رہے تھے کہ دنیا کی کوئی بھی پارلیمنٹ بنیادی انسانی حقوق میں سے کچھ یا تمام حقوق کو سلب کرنے کا اختیار رکھتی ہے۔ جب ایک سے زیادہ مرتبہ ان کی توجہ آرٹیکل 8 میں پارلیمنٹ پر لگائی گئی پابندی کی طرف مبذول کرائی گئی تو اٹارنی جنرل جناب یحيٰ بختیار صاحب کو اور کچھ نہیں سوجھی تو اس کا یہ جواب دیا

Those are of political nature, religious nature but not of constitutional nature .

یعنی آئین میں پارلیمنٹ پر لگائی گئی یہ پابندی سیاسی اور مذہبی نوعیت کی ہے مگر آئینی نوعیت کی نہیں ہے۔

یہ جواب مہمل اور غلط ہونے کے علاوہ مضحکہ خیز بھی تھا۔ یعنی آئین میں واضح طور پر یہ لکھا ہے اس باب میں لکھے ہوئے انسانی حقوق کو مکمل تحفظ حاصل ہے اور پارلیمنٹ یا کسی اور ادارہ کو یہ اختیار حاصل نہیں کہ وہ کسی قانون سازی کے ذریعہ ان میں کوئی کمی بھی کر سکے۔ اور اٹارنی جنرل صاحب یہ فرما رہے ہیں کہ یہ تو محض سیاسی اور مذہبی قسم کی پابندی ہے آئینی پابندی نہیں ہے۔ خدا جانے ان کے ذہن میں آئینی پابندی کا کیا تصور تھا۔

اس کے بعد اٹارنی جنرل صاحب نے اس موضوع کے بارے میں ایک اور نکتہ بیان کیا۔ انہوں نے حضرت خلیفة المسیح الثالث کے ایک خطبہ جمعہ کا حوالہ سنایا جس میں حضور نے آئین کے آرٹیکل 20 کا حوالہ دیا

تھا۔ اس پر انہوں نے یہ اعتراض پیش کیا کہ اس آرٹیکل میں جس میں مذہبی آزادی کی ضمانت دی گئی ہے پہلے یہ عبارت موجود ہے۔

Subject to law, public order and morality-:

یعنی یہ آزادی قانون ، امنِ عامہ اور اخلاقیات کی حدود کی پابند ہو گی۔ ہم اس کے متعلق کچھ عرض کرنے سے قبل اس آرٹیکل کی پوری عبارت درج کر دیتے ہیں:۔

20. Freedom to profess religion and to manage religious institution

Subject to law, public order and morality :

(a) Every citizen shall have the right to profess, practice and propagate his religion and

(b) Every religious denomination and every sect thereof shall have the right to establish, maintain and manage its religious institutions .

اٹارنی جنرل صاحب کا کہنا یہ تھا اس آرٹیکل کی رو سے اگر اس قسم کی کوئی قانون سازی کی جائے تو احمدیوں کی یا کسی اور گروہ کی مذہبی آزادی پر قدغن لگائی جا سکتی ہے۔ حالانکہ آئین کی رو سے یہ دعویٰ بالکل غلط تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ

1) 1974ء میں اس وقت ایسا کوئی قانون موجود نہیں تھا جس سے احمدیوں پر کسی قسم کی کوئی پابندی نہیں تھی کہ وہ اپنے آپ کو مسلمان نہیں کہہ سکتے، یا اس کا اظہار نہیں کر سکتے یا کسی قسم کے شعائرِ اسلامی نہیں بجا لا سکتے، یا اپنے عقائد کی تبلیغ نہیں کرسکتے۔ آئین اور قانون اس قسم کی کوئی قدغن نہیں لگا رہے تھے۔

2)۔ آئین کے آرٹیکل 8 میں اس بات پر پابندی تھی کہ اس قسم کی کوئی قدغن لگانے کا کوئی قانون بنایا جائے اور ایسی ممکنہ قانون سازی کو کالعدم قرار دیا گیا تھا۔

اس سے یہی نتیجہ نکل سکتا ہے کہ اس وقت پارلیمنٹ آئین میں مقرر کردہ حدود سے تجاوز کر رہی تھی اور آئین کی رو سے انہیں اس قسم کی کسی آئینی ترمیم کا کوئی اختیار نہیں تھا۔

حضرت خلیفة المسیح الثالثؒ نے ایک سوال کے جواب میں فرمایا کہ جو شخص یہ کہتا ہے کہ میں مسلمان ہوں اس کو ہمیں مسلمان کہنا پڑے گا۔ اٹارنی جنرل صاحب نے کہا کہ ان کے ذہن میں اس بارے میں کچھ پیچیدگیاں ہیں۔ وہ یہ بحث لے بیٹھے کہ آپ نے کہا ہے کہ قانون کی رو سے ہر فرد اور فرقہ کا مذہب وہی ہونا چاہئے جس کی طرف وہ اپنے آپ کو منسوب کرتا ہے۔ اس پر یحیٰی بختیار صاحب یہ دور کی کوڑی لائے کہ اگر ایک مسلمان طالب علم ڈاؤ میڈیکل کالج میں اقلیتوں کی سیٹ پر داخلے کے لیے اپنے آپ کو ہندو ظاہر کرتا ہے تو کیا اسے قبول کرنا چاہئے۔ اٹارنی جنرل صاحب یہاں بھی ایک غیر متعلقہ موازنہ پیش کر رہے تھے۔ یہ مثال ہے کہ ایک طالب علم اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہے لیکن داخلہ کے لیے جعلی اندراج کرتا ہے تا کہ اس جھوٹ سے ناجائز فائدہ اُٹھا سکے اور دوسری طرف ایک فرقہ ہے جو نوے سال سے دنیا کے بیسیوں ممالک میں اپنے آپ کو مسلمان کہتا رہا ہے اور ان کے عقائد اچھی طرح سے مشتہر ہیں کہ وہ ہمیشہ سے اپنے آپ کو مسلمان سمجھتے ہیں مسلمان کہتے ہیں مسلمان لکھتے ہیں اور اچانک ایک ملک کی اسمبلی زبردستی ان کی مرضی کے خلاف یہ فیصلہ کرتی

ہے کہ آج سے وہ قانون کی نظر میں مسلمان نہیں ہوں گے۔ دونوں مثالوں میں کوئی قدرِ مشترک نہیں۔ بہر حال کارروائی میں ہونے والے سوالات زیرِ بحث موضوع کے قریب بھی نہیں آئے تھے کہ کارروائی مختصر وقفہ کیلئے رکی۔ لیکن یہ پاکستان کی پارلیمانی تاریخ کا ایک سیاہ ترین دن تھا جب خود اٹارنی جنرل نے تمام ممبران اسمبلی کے سامنے بَرملا بڑے فخر سے یہ کہا تھا کہ پارلیمنٹ بنیادی انسانی حقوق کی ضمانت دینے والی شقوں کو منسوخ کر سکتی ہے اور اس طرح بنیادی انسانی حقوق تلف کرنے کا اختیار رکھتی ہے۔ حالانکہ آئین اعلان کر رہا ہے کہ سٹیٹ کو، حکومت کو پارلیمنٹ کو ہر گز یہ حق حاصل نہیں کہ وہ ان حقوق میں کمی بھی کر سکے۔ اسلام یہ سکھاتا ہے کہ کسی کو بنیادی انسانی حقوق سلب کرنے کی اجازت نہیں ہے لیکن اس اسمبلی کی اخلاقی حالت یہ تھی کہ کسی ایک ممبر نے بھی کھڑے ہو کر یہ نہیں کہا کہ آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں۔ یہ تو ہمارے آئین ، ہماری اخلاقی قدروں اور ہمارے مذہب کی بنیاد ہے کہ کسی کو بھی ظالمانہ طریق سے بنیادی انسانی حقوق سلب کرنے کی ہر گز اجازت نہیں ہے اور آپ یہ اعلان کر رہے ہیں کہ ہمیں یہ اختیار ہے اس شق کو ہی ختم کر دیں جو بنیادی انسانی حقوق کی ضمانت دے رہی ہے۔ یہی ایک پہلو اس بات کو واضح کر دیتا کہ یہ اسمبلی جو فیصلہ کرنے کا تہیّہ کئے بیٹھی تھی اس کا پہلا قدم ہی یہ تھا کہ بنیادی انسانی حقوق کو سلب کیا جائے اور اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے یہ ممبرانِ اسمبلی سب سے پہلے اپنے بنائے ہوئے آئین کو پامال کر رہے تھے۔

اب ہم ایک اور پہلو سے اس سوال کا جائزہ لیتے ہیں کہ کیا کسی پارلیمنٹ / اسمبلی کو کوئی ایسا قانون بنانے یا آئینی ترمیم کرنے کا اختیار ہے جو وہ کسی شخص یا گروہ کے مذہب کا فیصلہ کرسکے۔ اس کا جواب یقینا نہیں میں ہے۔

انسانی حقوق کی تمام دستاویزات سوچ اور مذہب کی آزادی کا خاص طور پر تحفظ کرتی ہیں۔ اقوام متحدہ کے "Universal Declaration of Human Rights" کے آرٹیکل نمبر18 کے مطابق ہر انسان کو یہ مکمل

آزادی ہے کہ وہ جو چاہے مذہب اختیار کرے اور اس پر عمل کرے۔ یہی حق "European Convention on Human Rights" کے آرٹیکل نمبر9 میں بھی دیا گیا ہے۔ اسی طرح دنیا بھر کے آئین بھی اس حق کو تسلیم کرتے ہیں۔ آئین پاکستان کے آرٹیکل نمبر20 کے تحت بھی ہر شہری کو مذہبی آزادی حاصل ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ کیاآئینی ترمیم کے ذریعے کسی کے مذہب کا فیصلہ کیا جاسکتا ہے یا نہیں۔ Article 20 آئین کے Chapter 2 کے پہلے حصہ میں شامل ہے اور بنیادی انسانی حقوق کا حصہ ہے۔ یہ وہ حقوق ہیں جن کو آئین میں خاص حیثیت حاصل ہے اور کوئی قانون جو ا ن کے خلاف ہو غیر قانونی اور غیر آئینی متصور ہوتا ہے۔ برصغیر کے کچھ ملکوں کی عدالتوں نے ایسی آئینی ترامیم کو بھی غیر آئینی قرار دیا ہے جو آئین کے بنیادی ڈھانچے سے متصادم ہوں۔ اس سلسلہ میں بھارتی اور بنگلہ دیش سپریم کورٹ نمایاں ہیں۔ بھارتی سپریم کورٹ نے اپنے 2007ء میں دیئے گئے فیصلہ میں آئین میں دیئے گئے بنیادی حقوق کو بھی آئین کے بنیادی ڈھانچے کا حصہ قرار دیا ہے۔

(Coehlo Versus State of Tamil Nado (2007) 2SCC1)

اسی طرح بنگلہ دیش سپریم کورٹ نے بھی آئین کے بنیادی ڈھانچے کے اصول پر آئینی ترمیم کو کالعدم قرار دیا ہے۔

(Anwar Hossain Chaudhury VS Bangla Desh 1989, 18CCC (AD)J)

آئین کا آرٹیکل 20 پہلے دن سے آئین کا حصہ ہے اور بنیادی حقوق کے Chapter میں شامل ہے۔ مذہبی آزادی عالمی طور پر ثابت شدہ حق ہے اور ان حقوق میں ہے جو ایمرجنسی کے دوران بھی معطل نہیں ہوتے۔ Article 233 & 233 Constitution of Pakistan یہ ان حقوق میں شامل ہیں جو آئین کے بنیادی

ڈھانچہ کا حصہ ہیں اور پارلیمنٹ کوئی ایسی آئینی ترمیم بھی نہیں کر سکتی جو اس بنیادی حقوق کے برخلاف ہو اور جو کسی کے مذہب کا فیصلہ اس کی منشا اور مرضی کے خلاف کرے۔ مذہب انسان کا سراسر ذاتی معاملہ ہے۔ سابقہ امریکی صدر تھامسن جیفرسن جو امریکہ کے Founding Fathers میں سے ایک تھے انہوں نے کہا تھا:۔

......."Religion is a matter which lies solely between man and his God, that he owes account to none other for his faith or his worship, that the legitimate powers of government reaches actions only, and not opinions, I contemplate with sovereign reverence that act of whole American people which declared that their legislature should "Make no law respecting an establishment of religion, or prohibiting the free exercise thereof." Thus building a wall of seperation between church and State.

وقفہ کے بعد کارروائی شروع ہوئی۔ اٹارنی جنرل صاحب کے سوالات تو بعد میں شروع ہوئے لیکن ایک ممبرِ اسمبلی نے ایک اور مسئلہ کے بارے میں سوال پیش کر دیا۔ انہوں نے یہ سوال کیا کہ اگر اسمبلی میں تقاریر ہوں تو رپورٹر ز اس کا متن تیار کر کے ممبران کو تصحیح کے لئے بھجوا دیتے ہیں، تو اب جو جماعت کا وفد ایک گواہ کی حیثیت سے بیان دے رہا ہے تو کیا اس کا ریکارڈ جماعت کے وفد کو تصحیح اور تصدیق کے لئے بھجوایا جائے گا؟ اس کے جواب میں سپیکر صاحب نے کہا کہ جماعت کے وفد کو جماعت کے وفد کا بیان تصحیح اور تصدیق کے لئے بالکل نہیں بھجوایا جائے گا بلکہ ممبران کو اس کا ریکارڈ بھجوایا جائے گا اور صاحبزادہ صفی اللہ صاحب نے بھی اس کی تائید کی۔ یہ ایک نہایت ہی قابلِ اعتراض فیصلہ تھا کیونکہ دنیا بھر میں کسی بھی سطح پر جب گواہ سے بیان لیا جاتا ہے تو پھر اس کا تحریری ریکارڈ اس کو دیا جاتا ہے جسے وہ گواہ تسلیم کر کے یا پھر تصحیح کر کے دستخط کر کے دیتا ہے اور پھر یہ اس کا تصدیق شدہ بیان سمجھا جاتا ہے لیکن یہاں یہ فیصلہ کیا گیا تھا کہ گواہ کو مکمل

اندھیرے میں رکھا جا رہا تھا کہ اس کا کیا بیان قلمبند کیا جا رہا ہے۔ اور اس صورتِ حال میں یہ ریکارڈ مکمل طور پر صحیح طرح محفوظ رکھا گیا کہ نہیں ؟ اس سوال پر کوئی حتمی رائے نہیں دی جا سکتی اور جماعتِ احمدیہ کو ایک فریق کی حیثیت سے اس ریکارڈ کی صحت کے متعلق سوال اُٹھانے کا پورا حق حاصل ہے۔

اٹارنی جنرل صاحب نے سوالات کا سلسلہ دوبارہ شروع کیا۔ ان سوالات کی طرز کا لُبِّ لُباب یہ تھا کہ کسی طرح یہ ثابت کیا جائے کہ حکومت کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ مذہبی معاملات میں مداخلت کرے یا اگر کوئی فرد یا گروہ اپنے آپ کو ایک مذہب کی طرف منسوب کرتا ہے تو حکومت کو یہ اختیار ہے کہ اس امر کا تجزیہ کرے کہ وہ اس مذہب کی طرف منسوب ہو سکتا ہے کہ نہیں۔

اس لایعنی بات کو ثابت کرنے کے لیے وہ ایسی مثالیں پیش کر رہے تھے جو یا تو غیر متعلقہ تھیں یا ایسی فرضی مثالیں تھیں جن کو سامنے رکھ کر کوئی نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا۔ مثلاً انہوں نے کہا کہ اگر کوئی شخص کہتا ہے کہ میں قرآنِ کریم پر ایمان نہیں لاتا لیکن وہ اس کے ساتھ یہ بھی کہتا ہے کہ میں مسلمان ہوں تو کیا اسے مسلمان سمجھا جائے گا۔ اب یہ ایک فرضی مثال تھی جب کہ ایسا کوئی مسلمان فرقہ موجود ہی نہیں جو اپنے آپ کو مسلمان بھی کہتا ہو اور یہ بھی کہتا ہو کہ ہم قرآن پر ایمان بھی نہیں لاتے اور ایسی فرضی اور انتہائی قسم کی مثال پر کوئی نتیجہ نہیں قائم کیا جا سکتا۔ پھر وہ یہ مثال لے بیٹھے کہ سعودی عرب میں مکہ اور مدینہ میں صرف مسلمان جا سکتے ہیں لیکن اگر کوئی یہودی اپنے فارم پر اپنا مذہب مسلمان لکھے اور اس بنا پر وہاں پر داخل ہو کر جاسوسی کرنے کی کوشش کرے تو کیا وہاں کی حکومت اسے گرفتار کرنے کی مجاز نہیں ہو گی۔ اس پر حضور نے یہ مختصر اور جامع جواب دیا کہ اسے اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کرنے کے الزام میں نہیں بلکہ ایک ملک میں جاسوسی کرنے کے الزام میں گرفتار کیا جائے گا اور یہ حقیقت تو سب دیکھ سکتے ہیں کہ اس مثال میں کسی مذہب کی طرف منسوب ہونا اتنا اہم نہیں، ایسے شخص پر تو جاسوسی کا الزام لگتا ہے۔ یہاں پر یحییٰ بختیار صاحب کو اپنی مثال

کے بودا ہونے کا احساس ہوا تو انہوں نے فوراً بات تبدیل کی اور کہا کہ فرض کریں کہ ایک عیسائی صحافی ہے اور وہ تجسس کی خاطر مکہ اور مدینہ دیکھنا چاہتا ہے اور فارم غلط اندراج (False declaration) کرتا ہے اور اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کرتا ہے تو کیا وہاں کی حکومت اسے روک نہیں سکتی۔ اس پر حضور نے جواب دیا کہ اسے تو False declaration کر دینے کی بنا پر گرفتار کیا جائے گا، غیر مسلم ہونے کی بنا پر گرفتار نہیں کیا جائے گا۔ اب یہ مثال بھی زیر بحث معاملہ سے کوئی تعلق نہیں رکھتی تھی۔ ایک شخص کسی اور مذہب کی طرف اپنے آپ کو منسوب کرتا ہے اور اس نے کبھی اسلام قبول ہی نہیں کیا۔ وہ کسی مقصد کی خاطر غلط بیان دیتا ہے اور اپنے آپ کو مسلمان لکھتا ہے۔ اس شخص سے کوئی بھی معاملہ کیا جائے لیکن دوسری طرف بالکل اور صورتِ حال ہے۔ ایک فرقہ ہے وہ اپنے آپ کو ہمیشہ سے مسلمان کہتا رہا ہے اور اس نے کبھی بھی اپنے آپ کو کسی اور مذہب کی طرف منسوب نہیں کیا۔ ایک سیاسی اسمبلی ایک روز یہ فیصلہ سنانے بیٹھ جاتی ہے کہ اسے اپنے آپ کو مسلمان کہنے کا کوئی حق نہیں۔ یہ دونوں بالکل مختلف نوعیت کی مثالیں ہیں۔

پھر اٹارنی جنرل صاحب نے یہ ثابت کرنے کی کوشش شروع کی کہ بنیادی حقوق پر بھی حکومت قد غن لگا سکتی ہے۔ اس سلسلہ میں انہوں نے یہ معرکۃ الآراء مثال پیش کی کہ لیور برادر ز کمپنی، لکس نام کا صابن بناتی ہے۔ اگر کوئی اور کمپنی اس نام سے صابن بنانے لگ جائے تو حکومت اسے روکے گی۔ یہ بھی ایک نہایت غیر متعلقہ اور لا یعنی مثال تھی۔ صنعتی مصنوعات کے متعلق Patent کرانے کا قانون موجود ہے اور اگر ایک کمپنی چاہے تو اپنی قابلِ فروخت مصنوعات کو اس قانون کے تحت Patent کرا سکتی ہے اور اس کے بعد کوئی اور کمپنی ان ناموں سے منسوب مصنوعات فروخت نہیں کر سکتی۔ اسلام یا کوئی اور مذہب قابلِ فروخت آئیٹم تو نہیں کہ کوئی اور گروہ یہ نام استعمال نہیں کر سکتا اور نہ ہی کسی ایک فرقہ نے یہ نام Patent کرا کے اس کے استعمال کی اجارہ داری حاصل کی ہے۔ چنانچہ حضور نے اٹارنی جنرل صاحب پر واضح فرمایا کہ لیور برادرز کے پاس

تو اس نام کو استعمال کرنے کی Monoply ہے اور عقیدہ پر کسی گروہ کی Monoply نہیں ہوتی۔ اس پر اٹارنی جنرل صاحب نے کہا فرض کریں کہ جہاں تک عقیدہ کا تعلق ہے کسی کے پاس اس کی Monoply نہیں ہے لیکن میں ابھی اس موضوع کی طرف نہیں آیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اٹارنی جنرل صاحب اس موضوع کی طرف آنا ہی نہیں چاہتے تھے اور نہ ہی اس کی طرف انہوں نے آنے کی کبھی کوشش کی۔ اس موقع پر حضور نے یہ مثال بیان فرمائی کہ اگر ایک گروہ کہے کہ عیسائیت کا نام صرف وہی گروہ استعمال کر سکتا ہے اور دوسرے گروہ یا فرقے یہ نام استعمال نہیں کر سکتے۔ یقیناً لکس صابن کی فروخت کی بجائے یہ مثال زیرِ بحث موضوع کے مطابق تھی۔ اس پر اٹارنی جنرل صاحب کافی جز بز ہوئے اور کہنے لگے کہ

I am not anticipating any thing please. I am just dealing with the restriction of the human rights.

ایک بار پھر یہ ظاہر ہو رہا تھا کہ اٹارنی جنرل صاحب اصل موضوع کی طرف آنے کی بجائے اِدھر اُدھر کی باتوں پر وقت ضائع کر رہے ہیں۔ ان کی پیش کردہ مثالیں اس قدر دور از حقیقت اور موضوع سے ہٹ کر تھیں کہ حضور کو سوال کر کے کوشش کرنی پڑتی تھی کہ اصل بات واضح ہو اور سوال و جواب کا سلسلہ اپنے اصل موضوع کی طرف واپس آئے اور اٹارنی جنرل صاحب غلط سوال کر کے خود الجھن میں پھنس جاتے تھے۔

لیکن اس مرحلہ پر معلوم ہوتا ہے کہ ان کی بیچارگی کچھ بوکھلاہٹ میں تبدیل ہو چکی تھی۔ انہوں نے یہ ثابت کرنے کے لئے کہ حکومت کو مذہبی آزادی پر قدغن لگانے کی اجازت ہے ایک بالکل لا یعنی سی مثال دے ڈالی۔ انہوں نے مثال دی کہ ہندوستان میں بعض صوبوں میں گائے کی قربانی کی اجازت نہیں۔ اس پر انہیں یاد دلایا گیا کہ اوّل تو اسلام میں ہر شخص پر بقر عید کے موقع پر قربانی کرنا لازم نہیں بلکہ صرف صاحب استطاعت

پر ہے اور گائے کی قربانی کرنا بھی فرض نہیں ہے بکرے کی قربانی بھی کی جا سکتی ہے۔ لیکن اپنے نکتے کو ثابت کرنے کے لئے اٹارنی جنرل صاحب نے ایک فرضی آدمی کی مثال پیش کی اور وہ مثال ہم ان کے الفاظ میں ہی درج کر دیتے ہیں۔

"... اگر ایک آدمی کے پاس صرف گائے ہے بقر عید پر اور وہ بیچارا اس کو قربان کرنا چاہتا ہے ... اور وہ کہتا ہے کہ میرے پاس پیسے ویسے ہیں اور گائے بھی میرے پاس ہے ..."

خدا جانے وہ اس گائے والے آدمی کی مثال پیش کر کے کیا ثابت کرنے کی کوشش کر رہے تھے لیکن جب حضور نے ان کی مضحکہ خیز مثال سن کر فرمایا کہ اگر اس شخص کے پاس پیسے ہیں تو وہ قربانی کے لئے دنبہ کیوں نہیں خرید لیتا۔ بیچارے اٹارنی جنرل صاحب کو اس کے بعد اس مثال کو ترک ہی کرنا پڑا۔ ہر پڑھنے والا اس بات کو دیکھ سکتا ہے کہ یہ کوئی متعلقہ مثال نہیں۔ معیّن طور پر گائے ذبح کرنے کا حکم نہیں۔ بکرا بھی ذبح کیا جا سکتا ہے اور اگر یہ شخص قربانی نہیں بھی کر سکے تو اس کو اپنے ضمیر کے خلاف کوئی اعلان نہیں کرنا پڑتا اور اس مثال کی اس بات سے کوئی مناسبت نہیں کہ ایک فرقہ اپنے آپ کو مسلمان سمجھتا ہے، مسلمان کہتا ہے اور کسی اور مذہب کی طرف اپنے آپ کو منسوب نہیں سمجھتا اور ایک دن کوئی اسمبلی یہ نا معقول فیصلہ کرے کہ آج سے قانون کی رو سے اس فرقہ کو مسلمان شمار نہیں کیا جائے گا۔

اس کے بعد انہوں نے پھر کچھ فرضی مثالیں دے کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ ریاست کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ مذہبی معاملات میں مداخلت کرے۔ پہلے انہوں نے اس غرض کے لئے یہ کوشش کی کہ آئین کے Preamble کا حوالہ دیا کہ اس میں لکھا ہے

Wherein the Muslims shall be enabled to order their lives in the collective and individual spheres in accordance with the teachings and requirements of Islam..........

اس بنیاد پر وہ یہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہے تھے کہ ریاست کو مذہبی معاملات میں مداخلت اور قانون سازی کا اختیار ہے۔ اس پر حضور نے یہ نشاندہی فرمائی کہ اس کا مطلب تو صرف یہ ہے کہ ہر فرقہ اور ہر گروہ کو اپنے اپنے نظریات اور ضمیر کے مطابق زندگی گزارنے کی آزادی اور سہولت دی جائے گی اور یحيٰ بختیار صاحب اگر صرف اس Preamble کو ہی پورا پڑھ لیتے تو انہیں احساس ہو جاتا کہ ان کی دلیل میں کوئی وزن نہیں ہے کیونکہ جس سطر کا وہ حوالہ دے رہے تھے، اس سے اگلی سطر ہے:۔

Wherein adequate provision shall be made for the minorities freely to profess and practice their religions and develop their cultures.

اب یحيٰ بختیار صاحب خواہ اپنے ذہن میں احمدیوں کو مسلمان سمجھتے تھے یا کوئی غیر مسلم اقلیت تصور کر رہے تھے، یہ Preamble یہی اعلان کر رہا تھا کہ احمدیوں کو جو بھی ان کا مذہب ہے اس کا اعلان کرنے، اس پر عمل کرنے کی مکمل اجازت ہے۔ اور احمدیوں کا ہمیشہ سے اعلان ہے کہ ان کا مذہب اسلام اور صرف اسلام ہے۔ اور اس Preamble کی رو سے بھی انہیں اس بات کی پوری آزادی ہے کہ وہ اپنے آپ کو مسلمان کہیں، اس کا اعلان کریں اور اس پر عمل کریں۔ پارلیمنٹ کو یا حکومت کو یا کسی اور کو یہ حق نہیں تھا کہ ان کو کسی اور مذہب کی طرف منسوب کرے۔ ابھی یحيٰ بختیار صاحب نے یہ دلیل ختم ہی کی تھی کہ انہوں نے اپنی ہی دلیل کا رد کر ڈالا اور خود فرمایا

Preamble is not enforceable......

یعنی Preamble آئین کا وہ حصہ ہے جس کی تعمیل ضروری نہیں۔

اگر ان کے نزدیک ایسا ہی تھا تو پھر اس Preamble کو بنیاد بنا کر یہ بحث اُٹھانے کی کیا ضرورت تھی کہ ریاست کے لئے ضروری ہو گیا ہے کہ وہ مذہبی معاملات میں مداخلت کرے۔

پھر انہوں نے آئین کے کچھ حصوں کو بنیاد بنا کر کچھ فرضی مثالیں پیش کر کے حضور سے دریافت کیا کہ کیا اس صورت میں ریاست کے لئے ضروری نہیں ہو گا کہ وہ کسی شخص کے مذہب کے بارے میں فیصلہ کرے ۔مثلاَ ایک شخص غیر مسلم ہے لیکن وہ صدر یا وزیرِ اعظم کے انتخاب میں حصہ لینے کے لئے کاغذات جمع کرادیتا ہے مگر فرضی مثالوں پر بنیاد بنا کر کوئی معنی خیز گفتگو آگے نہیں بڑھ سکتی۔ جب حضور نے دریافت فرمایا کہ اس وقت کیا قانون ہے یہ فیصلہ کون کرے گا کہ یہ شخص مسلمان ہے کہ نہیں؟ تو پہلے اٹارنی جنرل صاحب نے کہا کہ چیف الیکشن کمشنر کرے گا۔ پھر جب حضور نے دریافت فرمایا کہ کیا وہ اس مفروضے پر کاغذات مسترد کر سکتا ہے؟ تو اٹارنی جنرل صاحب نے خود کہا کہ نہیں ! فرض کریں کہ وہ نہیں کر سکتا لیکن اس پر اعتراض ہوتا ہے اور اسی گفتگو کے دوران اپنی مثال کو تبدیل کر کے کہا کہ یہ فرضی شخص جو صدر یا وزیر اعظم بننے کے لئے کاغذات جمع کراتا ہے وہ اسلام کے بنیادی اراکین میں سے کسی ایک مثلاَ زکوٰۃ کا انکار کردیتا ہے پھر کیاہو گا۔ پھر کہا کہ فرض کریں کہ ایک عیسائی مسلمان ہونے کااقرار نامہ جمع کرا کے ان انتخابات میں حصہ لینے کی کوشش کرتا ہے تو کیا ہو گا۔ ان کی مثالیں صرف فرضی ہی نہیں بلکہ کئی پہلوؤں سے افسانوی بھی تھیں۔ یہ حصہ پڑھتے ہوئے یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ اگر فرضی مثال ہی پیش کرنا مقصد تھا تو وہ واضح ذہن کے ساتھ ایک معین مثال

کیوں پیش نہیں کر رہے تھے۔ کبھی ایک مثال پیش کرتے تھے اور پھر کسی نتیجہ پر پہنچے بغیر بالکل مختلف مثال پیش کر دیتے تھے۔ دورانِ گفتگو انہیں خود بھی احساس ہو رہا تھا کہ وہ غلطی پر غلطی کر رہے ہیں اور انہیں خود کہنا پڑا

I am just giving you a ridiculous example

یعنی میں آپ کو صرف ایک نامعقول مثال پیش کر رہا ہوں

اب ہر پڑھنے والا یہ دیکھ سکتا ہے کہ نامعقول اور افسانوی مثالوں کو بنیاد بنا کر کوئی قانون سازی نہیں کی جا سکتی، کوئی سنجیدہ رائے نہیں دی جا سکتی اور نہ کسی نتیجہ پر پہنچا جا سکتا ہے۔

اس صورتِ حال کے پس منظر میں اس سیشن کے اختتام پر حضور نے فرمایا:۔

I have already humbly submitted so many times that these extreme examples, these imaginary examples, cannot solve the problem we are facing today. Let us face the facts .

یعنی میں پہلے بھی کئی مرتبہ عاجزی سے یہ کہہ چکا ہوں کہ یہ فرضی مثالیں اور یہ انتہائی نوعیت کی مثالیں ان مسائل کو حل نہیں کر سکتیں جن کا ہمیں آج سامنا ہے۔ ہمیں حقائق کا سامنا کرنا چاہیئے۔

اب تک جماعت کے مخالفین پر یہ امر واضح ہو چکا تھا کہ یہ بحث ان کی توقعات کے مطابق نہیں جا رہی اور جماعت احمدیہ پر گرفت کرنے کا موقع نہیں پا رہے۔ چنانچہ شاہ احمد نورانی صاحب نے سپیکر اسمبلی کو کہا کہ جو سوال کیے جاتے ہیں یہ ان کا معیّن جواب نہیں دیتے ، ان کو پابند کیا جائے کہ وہ معیّن جواب دیں۔ اور یہ

الٹا اٹارنی جنرل صاحب سے سوال کر کے ٹال دیتے ہیں۔ یہ طریق غلط ہے انہیں پابند کیا جائے کہ یہ جواب پورا دیں۔ ایک اور ممبر نے یہ شکوہ کیا کہ لگتا ہے کہ یہ جرح کر رہے ہیں۔ اس پر سپیکر اسمبلی نے کہا کہ

He has got his own methods

ان کا اپنا طریقہ ہے۔

اب یہ بات قابلِ غور ہے کہ اس سیشن کے اختتام پر ایسی فرضی مثالیں پیش کرکے سوال کئے گئے تھے جن مثالوں کے بارے میں خود اٹارنی جنرل صاحب کا کہنا تھا کہ وہ نامعقول مثالیں ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ نامعقول مثالوں کو سامنے رکھ کر تو کوئی معین جواب نہیں دیا جا سکتا۔

اس مرحلہ پرچھ بجے شام تک کے لیے کارروائی ملتوی کر دی گئی۔ چھ بجے شام کارروائی پھر شروع ہوئی تو اٹارنی جنرل صاحب نے موضوع کی طرف آنے کی بجائے ایک بار پھر یہ سوال چھیڑ دیا کہ پاکستان میں احمدیوں کی تعداد کیا ہے۔ اس پر آخر کار حضور نے فرمایا کہ میں کوئی بھی عدد وثوق سے نہیں کہہ سکتا۔ مختلف لوگوں نے جو پاکستان میں احمدیوں کی تعداد بیان کی ہے وہ صرف اندازے ہیں اور اس سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ اگر پانچ آدمیوں پر بھی ظلم کیا جائے تو وہ بھی اتنا ہی بُرا ہو گا۔

اس کے بعد اٹارنی جنرل صاحب نے اپنی گفتگو کا رخ ایک اور طرف پھیرا۔ اگرچہ بظاہر ابھی یہ فیصلہ نہیں ہوا تھا کہ احمدیوں کو آئین میں غیر مسلم اقلیت قرار دیا جائے بلکہ ابھی بحث اپنے اصل موضوع پر بھی نہیں آئی تھی لیکن یحيٰی بختیار صاحب نے یہ ثابت کرنے کی کوشش شروع کردی کہ اگر احمدیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دے دیا جائے تو اس سے ان کے حقوق پر کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ اوّل تو یہ بات ہی لایعنی تھی کہ ایک فرقہ اپنے آپ کو ایک مذہب کی طرف منسوب کرتا ہے اور ایک سیاسی اسمبلی یہ فیصلہ کر دیتی ہے کہ

وہ اپنی مرضی سے اپنے آپ کو اس مذہب کی طرف منسوب نہیں کر سکتا۔ اور اس کے ساتھ آپ کے آئین میں یہ بھی لکھا ہے کہ ہر شخص اپنے مذہب کو Profess کر سکتا ہے۔ اور پھر یہ بھی اصرار کیا جارہا ہے کہ اس سے آپ کا کوئی حق متاثر بھی نہیں ہوگا۔

یہ بحث کرتے ہوئے اٹارنی جنرل صاحب نے کہا

....I am just saying that your religion will not be affected because nobody is going to stop you from....

یعنی " میں صرف یہ کہہ رہا ہوں کہ آپ کا مذہب متاثر نہیں ہوگا کیونکہ کوئی آپ کو روکے گا نہیں۔ "

اس کے جواب میں حضور نے فرمایا

But my religion is affected; if my religious feelings and passions are affected, my religion is affected

یعنی " مگر میرا مذہب متاثر ہوتا ہے۔ اگر میرے مذہبی احساسات اور جذبات متاثر ہوتے ہیں تو میرا مذہب متاثر ہوتا ہے۔ "

اگر اٹارنی جنرل صاحب کو یا اس وقت وہاں پر موجود ممبرانِ قومی اسمبلی کو پاکستان کے آئین میں یا کسی اور ملک کے آئین میں جس میں وہ جائیں، ترمیم کر کے غیر مسلم قرار دیا جاتا تو کیا وہ یہی کہتے کہ اس سے مذہبی طور پر ہمیں کوئی فرق نہیں پڑتا، ہمارے حقوق محفوظ ہیں۔ یقیناً وہ ایسا نہ کہتے بلکہ وہ اس پر شدید احتجاج کرتے۔

لیکن اس کے بعد انہوں نے جو تفصیلی دلائل بیان کئے وقت نے ان دلائل کو غلط ثابت کیا۔ ان کا کہنا تھا کہ غیر مسلم قرار دیئے جانے کے بعد احمدیوں کے حقوق محفوظ ہو جائیں گے اور میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ اگر آپ کو غیر مسلم نہ قرار دیا گیا تو آپ کے حقوق محفوظ رہیں گے کہ نہیں۔ ان کے معین الفاظ یہ تھے:۔

No, once you are declared a minority, your rights are protected, Mirza Sahib...If you are not declared a minority then I am not sure if your rights will be protected .

یعنی مرزا صاحب ! ایک مرتبہ آپ کو اقلیت قرار دے دیا جائے تو آپ کے حقوق محفوظ ہو جائیں گے۔ اگر آپ کو اقلیت نہ قرار دیا گیا تو پھر میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ آپ کے حقوق محفوظ رہ سکیں گے۔

ایک ملک کے ممبرانِ پارلیمنٹ کے سامنے اٹارنی جنرل کے منہ سے یہ جملہ اس ملک کے آئین کی ہی توہین تھی یعنی اگر کوئی فرقہ اپنے عقیدہ کے مطابق ایک مذہب کی طرف اپنے آپ کو منسوب کرے تو پارلیمنٹ میں اٹارنی جنرل صاحب فرما رہے تھے کہ وہ یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ ان کے حقوق محفوظ رہیں گے کہ نہیں۔ اگر ایسا ہی ہے تو پھر ملک میں آئین اور قانون کا فائدہ ہی کیا ہے۔ پھر اس آئین میں مذہبی آزادی بلکہ کسی قسم کی آزادی کا ذکر ہی فضول ہے۔ یہ عجیب نامعقولیت تھی کہ ایک ملک کا اٹارنی جنرل ملک کی قانون ساز اسمبلی میں یہ کہہ رہا ہے کہ اگر آپ نے اپنے ضمیر کے مطابق اپنے مذہب کا اعلان کیا تو آپ کے حقوق کی کوئی ضمانت حکومت نہیں دے سکتی لیکن اگر آپ نے جھوٹ بولا اور اپنے ضمیر کے خلاف کسی اور نام سے اپنے مذہب کو منسوب کیا تو پھر ہم آپ کے حقوق کی حفاظت کریں گے۔ اس گفتگو کا ایک پس منظر ہے۔ جب قومی اسمبلی کی سپیشل کمیٹی میں یہ کارروائی ہو رہی تھی تو اس وقت کچھ ماہ سے پورے پاکستان میں احمدیوں کو قتل کیا جا رہا تھا، ان کے اموال لوٹے جا رہے تھے ، ان کے گھروں کو آگیں لگائی جا رہی تھیں اور اس وقت حکومت

کی مشینری فسادات کو روکنے کی بجائے نہ صرف خاموش تماشائی بنی ہوئی تھی بلکہ کئی مقامات پر مفسدین کی اعانت کر رہی تھی اور یہ سب ظلم کرنے کے بعد اب جب جماعت کا وفد اپنا موقف پیش کر رہا تھا تو اس وقت ان کے سامنے یہ پیشکش رکھی جا رہی تھی کہ تم اپنے ضمیر کے خلاف ملک کے آئین کے خلاف اسلام کی تعلیمات کے خلاف فیصلہ قبول کر لو تو ہم تمہیں تمہارے کچھ حقوق دے دیں گے اور اگر تم نے ایسا نہ کیا تو تمہارے حقوق محفوظ نہیں رہیں گے۔ کوئی بھی صاحبِ ضمیر اس قسم کے گئے گزرے ہتھکنڈوں کی تائید نہیں کر سکتا۔ ان کا موقف تو یہ ہونا چاہیے تھا کہ تم اس ملک کے شہری ہو۔ حکومت کی ذمہ داری ہے کہ ہر حال میں تمہارے حقوق کی حفاظت کی جائے۔ تمہارا عقیدہ جو بھی ہو اس سے تمہارے حقوق پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔

اس کے علاوہ انہوں نے تسلی دلائی کہ غیر مسلم قرار دیئے جانے کے بعد بھی آپ اپنے مذہب کو profess, practice اور propagate کر سکتے ہیں۔ یہ بھی صرف دکھانے کے دانت ہی تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب بھی ایک ملک یا ایک معاشرے میں مذہبی تنگ نظری کا سفر شروع ہو جائے تو یہ معاشرہ گرتے گرتے ایک مقام پر رکتا نہیں بلکہ تنگ نظری کی کھائی میں گرتا ہی چلا جاتا ہے۔ جب تک کہ وہ اپنی غلطیوں کا اعتراف کر کے واپسی کا سفر شروع نہ کرے۔ پاکستان بھی تنگ نظری کی کھائی میں گرتا چلا گیا۔ اور 1984ء کے آرڈیننس میں جماعت سے اپنا مذہب profess, practice اور propagate کرنے کے حقوق چھیننے کی کوشش بھی کی گئی اور یہ تعصب صرف جماعتِ احمدیہ تک محدود نہیں رہا بلکہ اس نے پورے معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اور اس وقت سے اب تک کی تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ پاکستان میں احمدیوں کے حقوق محفوظ نہیں رہے۔ جب اٹارنی جنرل صاحب نے اس بات پر زور دیا کہ اگر آپ کو غیر مسلم قرار دے دیا جائے تو اس سے آپ کے حقوق محفوظ ہو جائیں گے۔ اس پر حضور نے واضح طور پر فرمایا

Then we do not want our rights to be protecetd.

یعنی اس صورت میں ہم نہیں چاہتے کہ اس طرح ہمارے حقوق محفوظ کئے جائیں۔

اس پیشکش کے مسترد ہونے پر اٹارنی جنرل صاحب نے کہا

It is upto you

یعنی: ”آپ کی مرضی“

اس پر حضور نے فرمایا

”ہاں بالکل“

قومی اسمبلی کی سپیشل کمیٹی میں ان الفاظ میں یہ پیشکش کی گئی اور حضرت امام جماعت ِ احمدیہ نے واضح الفاظ میں اس پیشکش کو مسترد فرمادیا۔ ہر پڑھنے والا خود رائے قائم کر سکتا ہے کہ کس کا موقف اصولوں پر قائم تھا۔ اس موضوع پر مزید کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں۔ اس دو ٹوک جواب کے بعد یحیٰی بختیار صاحب کے سوالات کی ڈولتی ہوئی ناؤ نے کسی اور سمت کا رخ کیا۔ انہوں نے حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ نے 21جون1974کے خطبہ جمعہ کا یہ حوالہ پڑھا

”خدا تعالیٰ اپنے فعل سے ثابت کرے گا کون مومن ہے اور کون کافر ہے۔“

وہ محض ایک فقرہ پڑھ رہے تھے۔ ہم پورا اقتباس درج کر دیتے ہیں

”پس تم وہ بات کیوں کرتے ہو جس کا تمہیں تمہارے اس دستور نے حق نہیں دیا جس دستور کو تم نے ہاتھ میں پکڑ کر دنیا میں یہ اعلان کیا تھا کہ دیکھو کتنا اچھا اور کتنا حسین دستور ہے۔ آج اس دستور کی مٹی پلید کرنے کی کوشش نہ کرو اور اس جھگڑے میں نہ پڑو اوراسے خدا پر چھوڑ دو کیونکہ مذہب دل کا معاملہ ہے۔ خدا تعالیٰ اپنے

فعل سے ثابت کرے گا کہ کون مومن اور کون کافر ہے۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانے میں بھی جب اس قسم کے شور پڑتے تھے تو آپ نے ایک جگہ لکھا ہے کہ یہاں کیوں شور مچاتے ہو امن سے آشتی سے اور صلح سے زندگی گذارو۔ جب ہم اس دنیا سے گزر جائیں گے اور خدا تعالیٰ کے حضور پیش ہوں گے تو خود پتہ چل جائے گا کہ کون مومن ؟ اور کون کافر؟“

(خطباتِ ناصر جلد 5 ص574)

بہر حال اس خطبہ جمعہ کا یہ فقرہ پڑھ کر اٹارنی جنرل صاحب نے کہا کہ اگر اس کے باوجود کہ آپ اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں ، اگر میں یا کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ آپ مسلمان نہیں تو کیا یہ آپ کے بنیادی حقوق کی خلاف ورزی ہو گی؟

اس کے بعد خدا جانے وہ کیا سوال اُٹھانے لگے تھے ؟ اس پر حضور نے ایک بنیادی فرق کی نشاندہی فرمائی اور فرمایا:۔

”یہاں یہ سوال نہیں زید بکر کو مسلمان کہتا ہے یا نہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا یہ حکومت کا حق ہے کہ کسی کو دنیاوی لحاظ سے ، سیاسی لحاظ سے ، غیر مسلم قرار دے دے اور اس کا اعلان کر دے؟“

غالباَ یحيٰ بختیار صاحب یہ نکتہ اُٹھانے کی کوشش کر رہے تھے کہ صدیوں سے علماء کفر کے فتاویٰ دیتے چلے آ رہے ہیں تو اب یہ کیسے ناجائز ہو گیا؟ اس موقع پر ان کا ذکر کرکے کفر کے فتاویٰ کے بارے میں حضرت خلیفۃ المسیح الثالث ؒ نے فرمایا:۔

” ... ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ ان فتاویٰ کا یہ مطلب ہے کہ ان کے نزدیک جن پر کفر کا فتویٰ لگایا گیا ہے ان کے اعتقادات یا اعمال اللہ کو پسند نہیں اور قیامت کے دن ان سے مواخذہ کیا جائے گا۔ ہمارے نزدیک فتاویٰ

کا اس سے زیادہ اور مطلب نہیں۔ اور سیاسی طور پر کسی کا یہ حق نہیں کہ ان تین احادیث کی روشنی میں جو محضر نامے میں ہیں، سیاسی طور پر کسی حکومت کو حق نہیں ہے کہ کسی فرقے کو کافر قرار دے ...“

اس موقع پر اٹارنی جنرل صاحب کسی نامعلوم وجہ سے یہ دور کی کوڑی لائے کہ علماء نے جو ایک دوسرے کے خلاف کفر کے فتوے دیئے ہیں وہ جذبات میں الیکشن کے جوش میں ایک دوسرے کو کافر کہہ دیا تھا۔ یہ بالکل لا یعنی دعویٰ تھا اس پر حضور نے فرمایا کہ الیکشن تو اب شروع ہوئے ہیں اور یہ فتوے صدیوں سے دیئے جا رہے ہیں۔

پھر اٹارنی جنرل صاحب نے سوالات پوچھے کہ کیا احمدی مرزا صاحب کو نبی سمجھتے ہیں۔ اس پر حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ نے یہ پُر معارف جواب دیا کہ نہیں، ہم انہیں امتی نبی سمجھتے ہیں۔

اور پھر فرمایا کہ نبی ہونے اور امتی نبی ہونے میں بہت فرق ہے۔ جب اٹارنی جنرل صاحب نے وضاحت کرنے کے لیے کہا تو اس پر حضور نے فرمایا:۔

”امتی نبی کے یہ معنی ہیں کہ وہ شخص نبی اکرم ﷺ کے عشق و محبت میں اپنی ... زندگی گزار رہا ہے۔ اس کو ہم امتی کہیں گے۔ قرآن کریم نے فرمایا ہے کہ ... میری اتباع کرو گے تو اللہ تعالیٰ کی محبت کو پاؤ گے۔ امتی کے معنی یہ ہیں کہ حضرت بانی سلسلہ احمدیہ نبی اکرم ﷺ کے کامل متبع تھے اور ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ کوئی روحانی برکت اور فیض نبی اکرم ﷺ کی اتباع کے بغیر حاصل ہو نہیں سکتا۔“

اس کے بعد یہ بات شروع ہوئی کہ احمدیوں کے نزدیک جو حضرت مسیح موعود علیہ السلام کا انکار کرے اس سے کیا نتیجہ نکلتا ہے اور کفر کے کیا کیا مطالب ہو سکتے ہیں، شرعی اور غیر شرعی نبی میں کیا فرق ہوتا ہے۔

اب یہ امید پیدا ہو چلی تھی کہ اب سارا دن گزار کر شاید اٹارنی جنرل صاحب موضوع پر آئیں اور کچھ علمی اور پر معرفت باتیں سننے کو ملیں لیکن چند منٹ ہی گزرے تھے کہ یحیٰ بختیار صاحب اچانک بغیر کسی تمہید کے پٹری سے اترے اور ایسا اترے کہ بہت دور نکل گئے۔ انہوں نے اچانک سوال کیا آپ اپنے لیے تو تواضع پسند کرتے ہیں لیکن دوسروں کے لیے تواضع نہیں ظاہر کرتے اور اس الزام کے حق میں اٹارنی جنرل صاحب نے اپنی طرف سے جو دلیل پیش فرمائی وہ یہ تھی کہ آپ نے یہ تقاضا کیا تھا کہ آپ کے نام جو خط آئے وہ امام جماعتِ احمدیہ کے نام آئے، جب کہ آپ نے اپنے انگریزی میں لکھے گئے ضمیمہ میں مودودی صاحب کا نام مسٹر مودودی لکھا ہے ، جب کہ ان کے پیروکار انہیں مولانا مودودی کہتے ہیں۔ ان کا اصرار تھا کہ اس طرح مودودی صاحب کی تحقیر ہوتی ہے اور ان کی جماعت کے لوگوں کے جذبات مجروح ہوتے ہیں۔

جہاں تک پہلی بات کا تعلق ہے تو جیسا کہ ہم ذکر کر چکے ہیں حکومت کی طرف سے ایک خط ملا جس میں حضرت خلیفۃ المسیح کا ذکر کرنا تھا لیکن قومی اسمبلی کے سیکریٹری نے ان کے لئے انجمن احمدیہ کے ہیڈ کے الفاظ استعمال کئے۔ حقیقت یہ ہے کہ صدر انجمن احمدیہ کا صدر صرف جماعت کی اس تنظیم کا سربراہ ہوتا ہے اور وہ امام جماعتِ احمدیہ نہیں ہوتا۔ یہ بات نہ صرف احمدیوں میں بلکہ غیر احمدیوں میں بھی معروف ہے۔ اس غلطی کی ضروری تصحیح کی گئی تھی اور وہ تصحیح بھی حضرت خلیفۃ المسیح الثالث کی طرف سے نہیں بلکہ ایڈیشنل ناظر اعلیٰ صاحبزادہ مرزا خورشید احمد صاحب کی طرف سے بھجوائی گئی تھی لیکن اٹارنی جنرل صاحب باوجود وکیل ہونے کے اس موٹی بات کو سمجھنے سے بھی قاصر تھے اور اس غلطی کو بنیاد بنا کر ایک لایعنی اور غیر متعلقہ اعتراض کر رہے تھے۔ اس کے جواب میں حضرت صاحب نے مذکورہ وضاحت بیان فرمائی اور کہا کہ میں اپنے لیے کسی ادب کا مطالبہ نہیں کرتا۔ آپ مجھے مسٹر بھی نہ کہیں۔ میرا نام مرزا ناصر احمد ہے، آپ مجھے خالی ناصر کہیں۔

جہاں تک اٹارنی جنرل صاحب کی دوسری بات کا تعلق تھا تو اس کا پس منظر یہ تھی کہ جماعتِ احمدیہ کے محضر نامہ کے ضمیمہ میں مودودی صاحب کا نام انگریزی میں مسٹر مودودی کر کے لکھا ہوا تھا۔ اسی ضمیمہ میں مسٹر مودودی کے الفاظ سے پانچ لفظ پہلے مسٹر بھٹو کے الفاظ استعمال کیے گئے تھے۔ حضور نے فرمایا کہ جو چیز میں نہیں سمجھ سکا وہ یہ ہے کہ اسی جگہ پانچ لفظ پہلے مسٹر بھٹو سے تو تحقیر ظاہر نہیں ہوتی اور مسٹر مودودی سے تحقیر ظاہر ہوتی ہے۔ یہ بات میں نہیں سمجھ سکا۔ تحقیر کا کوئی پہلو نہیں نکلتا۔ لیکن اٹارنی جنرل صاحب اسی بات کو دہراتے رہے کہ اس طرح مودودی صاحب کے بارے میں تواضع کا رویہ نہیں دکھایا گیا۔ انہوں نے ایسی کج بحثی کا مظاہرہ کیا کہ خود سپیکر اسمبلی کو کہنا پڑا کہ یہ مناظرہ ختم کر کے وہ معیّن سوال کریں۔

یعنی اٹارنی جنرل صاحب یا اسمبلی کو تو یہ اختیار ہے کہ وہ جس کے متعلق پسند کریں اسے غیر مسلم کہہ دیں لیکن اگر انگریزی میں مودودی صاحب کو مسٹر مودودی کرکے لکھا جائے اور ان کو مولانا نہ کہا جائے تو یہ ایسی تحقیر ہے کہ اس کا سوال خود اسمبلی میں اٹھایا جائے جب کہ بحث کا مقصد یہ ہو کہ ختمِ نبوت کو نہ ماننے والوں کا اسلام میں کیا مقام ہے اور سوال یہ اٹھایا جائے کہ مودودی صاحب مسٹر ہیں یا مولانا ہیں اور ٹارنی جنرل صاحب یہ نامعقول بحث کرتے ہوئے یہ کس طرح فراموش کر گئے کہ اس وقت قومی اسمبلی کے سامنے اپوزیشن کی قرارداد تھی جس میں حضرت مسیح موعود کا نام نہایت گستاخی سے لیا گیا تھا۔ کیا اس پر اٹارنی جنرل صاحب نے اعتراض کیا تھا کہ یہ اخلاق سے گری ہوئی حرکت ہے؟ بلکہ پیپلز پارٹی کے وزیر عبدالحفیظ پیرزادہ صاحب نے کہا تھا حکومت اس قرارداد کی مخالفت نہیں کرتی بلکہ اصولی طور پر اس سے متفق ہے اور اٹارنی جنرل صاحب یہ کس طرح بھول گئے کہ 4/جون 1974ء کو جب قومی اسمبلی کی کارروائی کے دوران مفتی محمود صاحب نے حضرت خلیفة المسیح الثالث کا نام لیا تھا تو ساتھ صاحب کا لفظ لگانے کا تکلف بھی نہیں کیا تھا اور آج اٹارنی جنرل

صاحب ایک طویل بحث کر کے یہ ثابت کر رہے تھے کہ اگر آپ نے انگریزی کی تحریر میں مسٹر مودودی لکھ دیا ہے تو اس سے شدید تحقیر ظاہر ہوتی ہے۔

ابھی یحییٰ بختیار صاحب اس جنجال سے باہر نہیں نکلے تھے کہ انہوں نے اپنے دلائل کی زنبیل میں سے ایک اور دلیل باہر نکالی۔ اور کہا کہ انگلستان میں جماعتِ احمدیہ نے ایک ریزولیشن پاس کیا ہے جس میں Non Ahmadiyya Pakistani کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ مطلب یہ تھا کہ غیر احمدیوں کو مسلمان نہیں کہا گیا۔ اور یہ دعویٰ کیا کہ یہ خبر وہاں کے اخباروں میں آئی ہے آپ بے شک Verify کر لیں۔ اور کہا کہ اس کی ایک کاپی حضور کو دی جائے۔ یہ حوالہ دکھا کر یحیٰی بختیار صاحب نے یہ اعتراض کیا

”آپ ریفر کر رہے ہیں مسلمانوں کو عام طور پر as non-Muslims“

یہ ان کا ایک بے جان اعتراض تھا۔ ان الفاظ سے کہیں یہ ظاہر نہیں ہوتا تھا کہ غیر احمدی مسلمانوں کو غیر مسلم کہا جا رہا ہے۔ اس کا صرف یہ مطلب تھا کہ وہ پاکستانی جو کہ جماعتِ احمدیہ سے تعلق نہیں رکھتے اور پاکستان میں صرف مسلمان نہیں رہتے بلکہ عیسائی بھی رہتے ہیں، ہندو اور پارسی بھی رہتے ہیں۔

مغرب کی نماز کے بعد حضرت صاحب نے وضاحت کے لیے کہا کہ اس کاپی پر تو کسی اخبار کا نام نہیں، یہ کس اخبار کا حوالہ ہے۔ تو اٹارنی جنرل صاحب کو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ یہ کس اخبار میں خبر آئی تھی جس کا وہ حوالہ دے رہے تھے، انہوں نے صرف یہ کہہ کر اپنی جان چھڑائی کہ یہ مجھے ڈائرکٹ ملا ہے۔ میں معلوم کروں گا کہ کس اخبار میں خبر آئی تھی۔ اس سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ انہوں نے کارروائی سے قبل کوئی سنجیدہ تیاری نہیں کی تھی۔

اس کے بعد کفر کی تعریف پر سوالات اور جوابات کا ایک طویل سلسلہ چلا۔ چونکہ اس قسم کے سوالات دورانِ کارروائی بار بار پیش کئے گئے تھے، اس لئے ہم ان کا جائزہ ایک ساتھ پیش کر دیں گے۔

معلوم ہوتا ہے کہ ممبرانِ اسمبلی خاص طور پر جماعت کے مخالفین کا صبر کا پیمانہ لبریز ہو رہا تھا۔ بحث ان کی امیدوں کے بر عکس جا رہی تھی۔ وہ غالباً اس امید میں مبتلا تھے کہ جماعت کا وفد خدانخواستہ ایک ملزم کی طرح کٹہرے میں کھڑا ہو گا اور ان کے ہر نامعقول تبصرہ کو تسلیم کرے گا اور اس پس منظر میں جب کہ ملک میں احمدیوں کے خون کی ہولی کھیلی جا رہی تھی، جماعت کا وفد ان سے رحم کے لیے درخواست کرے گا۔ مگر ایسا نہیں ہو رہا تھا۔ اٹارنی جنرل صاحب ممبرانِ اسمبلی کے دیئے ہوئے جو سوالات کر رہے تھے وہ نہ صرف غیر متعلقہ تھے بلکہ جب بحث آگے بڑھتی تھی تو ان سوالات کا سقم خود ہی ظاہر ہوجاتا تھا۔ جب 5/ اگست کی کارروائی ختم ہوئی اور حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ جماعتی وفد کے دیگر اراکین کے ہمراہ جب ہال سے تشریف لے گئے تو ممبرانِ اسمبلی کا غیظ و غضب دیکھنے والا تھا۔ اس وقت ان کے بغض کا لاوا پھٹ پڑا۔ ایک ممبر میاں عطاء اللہ صاحب نے بات شروع کی اور کہا

I have another point some of the witnesses who were here, for instances, Mirza Tahir, they were unnecessarily ....

اس جملہ کی اٹھان سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ حضرت صاحبزادہ مرزا طاہر احمد صاحب کے متعلق کچھ زہر اگلنا چاہتے ہیں لیکن ان کا تبصرہ سپیکر کے Just a minute کہنے سے ادھورا ہی رہ گیا۔ اس کے فوراً بعد شاہ احمد نورانی صاحب نے جھٹ اعتراض کیا

”وہ لوگ ہنستے بھی ہیں۔ باتیں بھی کرتے ہیں اس طرف دیکھ کر مذاق بھی کرتے ہیں اور سر بھی ہلاتے ہیں۔ آپ ان کو بھی چیک فرمائیں۔“

پہلی بات تو یہ ہے کہ اگر جماعت کے وفد کی طرف سے کوئی نا مناسب رویہ ظاہر ہوتا تو یہ کارروائی سپیکر کے زیر صدارت ہو رہی تھی اور وہ اسی وقت اس کا نوٹس لے سکتے تھے اور اٹارنی جنرل صاحب جو سوالات کر رہے تھے اس پر اعتراض کر سکتے تھے لیکن ساری کارروائی میں ایک مرتبہ بھی انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ اصل میں نورانی صاحب اور ان جیسے دوسرے احباب کو یہ بات کھٹک رہی تھی کہ وہ اس خیال سے آئے تھے کہ آج ان کی فتح کا دن ہے اور خدانخواستہ جماعتِ احمدیہ کا وفد اس سیاسی اسمبلی میں ایک مجرم کی طرح پیش ہو گا لیکن جو کچھ ہو رہا تھا وہ ان کی توقعات کے بالکل برعکس تھا۔ کارروائی کے دوران جماعت کا وفد حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ کی اعانت کر رہا تھا اور اس عمل میں ظاہر ہے آپس میں بات بھی کرنی پڑتی ہے اور اس عمل میں چہرے پر کچھ تاثرات بھی آتے ہیں۔ اور اسمبلی میں مسکرانا اور سر کو ہلانا کوئی جرم تو نہیں کہ اس کو دیکھ کر نورانی صاحب طیش میں آ گئے۔ آخر اسمبلیوں میں انسان شامل ہوتے ہیں کوئی مجسمے تو اسمبلیوں کی زینت نہیں بنتے۔

یہ واویلا صرف نورانی صاحب تک محدود نہیں تھا۔ ایک اور ممبر عبدالعزیز بھٹی صاحب نے بھی کھڑے ہو کر کہا کہ گواہ یعنی حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ سوال کو Avoid کرتے ہیں اور تکرار کرتے ہیں۔ چیئر کا یعنی سپیکر صاحب کا فرض ہے کہ انہیں اس بات سے روکا جائے۔ جہاں تک تکرار کا سوال ہے تو اس کا جواب پہلے آ چکا ہے کہ اگر سوال دہرایا جائے گا تو اس کا جواب بھی دہرایا جائے گا۔ سپیکر صاحب نے انہیں جواب دیا کہ اگر اٹارنی جنرل صاحب یہ بات محسوس کریں کہ سوالات کے جواب نہیں دیئے جارہے تو وہ چیئر سے اس بات کی بابت استدعا کر سکتے ہیں۔ اس پر اٹارنی جنرل صاحب نے کہا کہ ان کے لئے ضروری ہی نہیں ہے کہ وہ سوال

کا جواب دیں۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اٹارنی جنرل صاحب نے سپیکر صاحب سے کبھی یہ استدعا کی ہی نہیں کہ ان کے سوال کا جواب نہیں دیا جا رہا کیونکہ جوابات تو مل رہے تھے لیکن سننے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔

عبد العزیز صاحب نے کہا:

"The conduct of the witness is not coming before the house as to how he is behaving "........

یہ تبصرہ غالباََ اسی ذہنی الجھن کی غمازی کر رہا تھا کہ ہم تو امید لگا کر بیٹھے تھے کہ یہ مجرم کی طرح پیش ہوں گے اور یہ الٹ معاملہ ہو رہا ہے ہمیں ہی خفت اُٹھانی پڑ رہی ہے۔ اس کے بعد مولا بخش سومرو اور اتالیق شاہ صاحب نے بھی یہی اعتراض کیا کہ جوابات Evasive دیئے جا رہے ہیں۔ جب تک وہ ایک سوال کا جواب نہ دے دیں دوسری بحث میں نہ پڑا جائے۔ ان سے رو رعایت نہ کی جائے۔ اس پر سپیکر صاحب نے جواب دیا کہ اس معاملے میں اسی وقت ہی مداخلت کی جائے گی جب اٹارنی جنرل صاحب اس بارے میں استدعا کریں گے۔

آئینہ صداقت اور انوارِ خلافت

جیسا کہ ہم پہلے عرض کر چکے ہیں کہ پہلے روز کی کارروائی کے اختتام پر یہ طویل بحث ہوئی تھی کہ کفر کے کیا کیا معانی بیان ہوئے ہیں؟ چودہ سو برس پر محیط عالمِ اسلام کے لٹریچر میں یہ لفظ کن مختلف معانی میں استعمال ہوا ہے؟ جماعتِ احمدیہ کے لٹریچر میں یہ لفظ کن مطالب میں بیان ہوا ہے؟ کفر کے مختلف فتاویٰ کا کیا

مطلب ہے؟ دائرہ اسلام سے خارج ہونے کی اصطلاح کا کیا مطلب ہے ؟ وغیرہ۔ اسمبلی کی سپیشل کمیٹی میں کئی روز یہ اعتراض بار بار پیش کیا گیا کہ جماعت کی بعض کتب میں حضرت مسیح موعود علیہ السلام کو نہ ماننے والوں کے متعلق کفر کا لفظ استعمال کیا گیا ہے یا انہیں کافر کہا گیا ہے۔ اس اعتراض کا مقصد یہ تھا کہ چونکہ احمدیوں کی بعض تحریروں میں حضرت مسیح موعود علیہ السلام کا انکار کرنے والوں کے متعلق کفر کے الفاظ استعال کئے گئے ہیں اس لئے ، اب قومی اسمبلی کا یہ حق ہے کہ وہ احمدیوں کو آئین میں ترمیم کر کے غیر مسلم قرار دے دے۔ چونکہ یہ اعتراض بار بار پیش کیا گیا۔ اس لئے مناسب ہو گا کہ اس جگہ یہ ذکر ایک جگہ پر کر دیا جائے اور یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ یہ اعتراض 1953ء کی تحقیقاتی عدالت میں بھی کیا گیا تھا۔

سب سے پہلے یہ جائزہ لیتے ہیں کہ کفر کے لُغوی معنی کیا ہیں۔ اس کے اصل معنی کسی چیز کو چھپانے کے ہیں۔ رات کو بھی کافر کہا جاتا ہے۔ کاشتکار چونکہ زمین کے اندر بیج چھپاتا ہے اس لیے اسے بھی کافر کہا جاتا ہے۔ کفر کے معنی نعمت کی نا شکری کر کے اسے چھپانے کے بھی ہیں۔ اور سب سے بڑا کفر اللہ تعالیٰ کی وحدانیت ، شریعت یا نبوت کا انکار ہے۔ (مفرداتِ امام راغب)

مسیح موعود علیہ السلام کا انکار کرنے والوں کے متعلق حضرت مسیح موعود علیہ السلام اور حضرت خلیفة المسیح الثانی کی تحریروں کے بعض حوالے درج ذیل ہیں۔ اگر سرسری نظر سے دیکھا جائے تو ان میں تضاد دکھائی دے گا لیکن اگر احادیثِ نبویہ ﷺ کی روشنی میں اس مفہوم کو سمجھا جائے تو یہ درحقیقت تضاد نہیں۔ ان میں وہ حوالہ جات بھی شامل ہیں جن پر اعتراض کیا جاتا ہے اور یہ حوالے اس کارروائی کے دوران بھی پیش کئے گئے تھے۔

حضرت مسیح موعود علیہ السلام تریاق القلوب میں تحریر فرماتے ہیں

”کیونکہ ابتدا سے میرا یہی مذہب ہے کہ میرے دعوے کے انکار کی وجہ سے کوئی شخص کافر یا دجال نہیں ہو سکتا۔ ہاں ضال اور جادہ صواب سے منحرف ضرور ہو گا۔ اور میں اس کا نام بے ایمان نہیں رکھتا۔ ہاں میں ایسے سب لوگوں کو ضال اور جادہ صدق و صواب سے دور سمجھتا ہوں جو اُن سچائیوں سے انکار کرتے ہیں جو خدا تعالیٰ نے میرے پر کھولی ہیں۔ میں بلا شبہ ایسے ہر ایک آدمی کو ضلالت کی آلودگی سے مبتلا سمجھتا ہوں جو حق اور راستی سے منحرف ہے۔ لیکن میں کسی کلمہ گو کا نام کافر نہیں رکھتا جب تک وہ میری تکفیر اور تکذیب کر کے اپنے تئیں خود کافر نہ بنا لیوے۔ سو اس معاملہ میں ہمیشہ سے سبقت میرے مخالفوں کی طرف سے ہے کہ انہوں نے مجھ کو کافر کہا۔ میرے لئے فتویٰ طیار کیا۔ میں نے سبقت کر کے ان کے لئے کوئی فتویٰ طیار نہیں کیا۔ اور اس بات کا وہ خود اقرار کر سکتے ہیں کہ اگر میں اللہ تعالیٰ کے نزدیک مسلمان ہوں تو مجھ کو کافر بنانے سے رسول اللہ ﷺ کا فتویٰ ان پر یہی ہے کہ وہ خود کافر ہیں۔ سو میں ان کو کافر نہیں کہتا بلکہ وہ مجھ کو کافر کہہ کر خود فتویٰ نبوی کے نیچے آتے ہیں۔“ (8)

تریاق القلوب میں اسی عبارت کے نیچے حاشیہ میں حضرت مسیح موعود علیہ السلام تحریر فرماتے ہیں:۔

”یہ نکتہ یاد رکھنے کے لائق ہے کہ اپنے دعوے کے انکار کرنے والے کو کافر کہنا یہ صرف ان نبیوں کی شان ہے جو خدا تعالیٰ کی طرف سے شریعت اور احکامِ جدیدہ لاتے ہیں۔ لیکن صاحب الشریعت کے ماسوا جس قدر ملہم اور محدَّث ہیں گو وہ کیسی ہی جنابِ الٰہی میں اعلیٰ شان رکھتے ہوں اور خلعتِ مکالمہ الٰہیہ سے سرفراز ہوں۔ ان کے انکار سے کوئی کافر نہیں بن جاتا۔ ہاں بد قسمت منکر جو ان مقربانِ الٰہی کا انکار کرتا ہے وہ اپنے انکار کی شامت سے دن بدن سخت دل ہوتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ نورِ ایمان اس کے اندر سے مفقود ہو جاتا ہے اور یہی احادیثِ نبویّہ سے مستنبط ہوتا ہے کہ انکارِ اولیاء اور ان سے دشمنی رکھنا اوّل انسان کو غفلت اور دنیا پرستی میں ڈالتا ہے اور پھر اعمالِ حسنہ اور افعالِ صدق اور اخلاص کی ان سے توفیق چھین لیتا ہے۔“(8)

پھر حضرت مسیح موعود علیہ السلام سے سوال کیا گیا کہ آپؑ نے تریاق القلوب میں تحریر فرمایا ہے کہ آپ کے انکار سے کوئی شخص کافر نہیں بنتا علاوہ ان لوگوں کے جو آپ کی تکفیر کر کے کافر بن جائیں۔ لیکن عبدالحکیم خان کے نام مکتوب میں آپ تحریر فرماتے ہیں کہ ہر شخص جس کو میری دعوت پہنچی ہے اور اس نے مجھے قبول نہیں کیا وہ مسلمان نہیں ہے۔ اس بیان اور پہلی کتابوں کے بیان میں تناقض ہے۔ اس کا جواب آپ نے حقیقۃ الوحی میں یہ تحریر فرمایا:۔

”یہ عجیب بات ہے کہ آپ کافر کہنے والے اور نہ ماننے والے کو دو قسم کے انسان ٹھہراتے ہیں حالانکہ خدا کے نزدیک ایک ہی قسم ہے کیونکہ جو شخص مجھے نہیں مانتا وہ اسی وجہ سے نہیں مانتا کہ وہ مجھے مفتری قرار دیتا ہے ...

... جو کھلے کھلے طور پر خدا کے کلام کی تکذیب کرتے ہیں اور خدا تعالیٰ کے ہزارہا نشان دیکھ کر جو زمین اور آسمان میں ظاہر ہوئے پھر بھی میری تکذیب سے باز نہیں آتے۔ وہ خود اس بات کا اقرار رکھتے ہیں کہ اگر میں مفتری نہیں اور مومن ہوں تو اس صورت میں وہ میری تکذیب اور تکفیر کے بعد کافر ہوئے اور مجھے کافر ٹھہرا کر اپنے کفر پر مہر لگا دی۔ یہ ایک شریعت کا مسئلہ ہے کہ مومن کو کافر کہنے والا کافر ہو جاتا ہے ... “ (9)

حضرت مسیح موعود علیہ السلام حقیقۃالوحی میں تحریر فرماتے ہیں:۔

”... کیونکہ کافر کا لفظ مومن کے مقابل پر ہے اور کفر دو قسم پر ہے

(اوّل) ایک یہ کفر کہ ایک شخص اسلام سے ہی انکار کرتا ہے اور آنحضرت ﷺ کو خدا کا رسول نہیں مانتا

(دوم) دوسرے یہ کفر کہ مثلاً وہ مسیح موعود کو نہیں مانتا اور اس کو باوجود اتمام حجت کے جھوٹا جانتا ہے جس کے ماننے اور سچا جاننے کے بارے میں خدا اور رسول نے تاکید کی ہے اور پہلے نبیوں کی کتابوں میں بھی تاکید پائی جاتی ہے۔ پس اس لئے کہ وہ خدا اور رسول کے فرمان کا منکر ہے کافر ہے اور اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ

دونوں قسم کے کفر ایک ہی قسم میں داخل ہیں کیونکہ جو شخص باوجود شناخت کر لینے کے خدا اور رسول کے حکم کو نہیں مانتا وہ بموجب نصوص صریحہ قرآن اور حدیث کے خدا اور رسول کو بھی نہیں مانتا اور اس میں شک نہیں کہ جس پر خدا تعالیٰ کے نزدیک اوّل قسم کفر یا دوسری قسم کفر کی نسبت اتمام حجت ہو چکا ہے وہ قیامت کے دن مواخذہ کے لائق ہوگا۔ اور جس پر خدا کے نزدیک اتمام حجت نہیں ہوا اور وہ مکذّب اور منکر ہے تو گو شریعت نے (جس کی بناء ظاہر پر ہے) اس کا نام بھی کافر ہی رکھا ہے اور ہم بھی اس کو باتباعِ شریعت کافر کے نام سے ہی پکارتے ہیں پھر بھی وہ خدا کے نزدیک بموجب آیت لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَہَا قابلِ مواخذہ نہیں ہو گا۔ ہاں ہم اس بات کے مجاز نہیں ہیں کہ ہم اُس کی نسبت نجات کا حکم دیں اس کا معاملہ خدا کے ساتھ ہے ہمیں اس میں دخل نہیں اور جیسا کہ میں ابھی بیان کر چکا ہوں۔ یہ علم محض خدا تعالیٰ کو ہے کہ اس کے نزدیک باوجود دلائلِ عقلیہ اور نقلیہ اور عمدہ تعلیم اور آسمانی نشانوں کے کس پر ابھی تک اتمام حجت نہیں ہوا ۔ ہمیں دعوے سے کہنا نہیں چاہئے کہ فلاں شخص پر اتمام حجت نہیں ہوا ہمیں کسی کے باطن کا علم نہیں ہے۔ “

(10)

حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی زندگی کے آخری دنوں میں مشہور سیاسی لیڈر سر فضل حسین آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کچھ سوالات آپ کی خدمت میں پیش کئے۔ اس گفتگو کے دوران آپ نے فرمایا:۔

”ہم کسی کلمہ گو کو اسلام سے خارج نہیں کہتے جب تک وہ ہمیں کافر کہہ کر خود کافر نہ بن جائے۔ “

(ملفوظات جلد 5ص635)

اسی مضمون کے متعلق حضرت خلیفۃ المسیح الثانی اپنی تصنیف آئینہ صداقت میں تحریر فرماتے ہیں

”میرا عقیدہ ہے کہ کفر درحقیقت خدا تعالیٰ کے انکار کی وجہ سے ہوتا ہے اور جب بھی کوئی وحی خدا تعالیٰ کی طرف سے ایسی نازل ہو کہ اس کا ماننا لوگوں کے لئے حجت ہو اس کا انکار کفر ہے اور چونکہ وحی کو انسان تب ہی مان سکتا ہے کہ جب وحی لانے والے پر ایمان لائے۔ اس لئے وحی لانے والے پر ایمان بھی ضروری ہے۔ اور جو نہ مانے وہ کافر ہے۔ اس وجہ سے نہیں کہ وہ زید یا بکر کو نہیں مانتا بلکہ اس وجہ سے کہ اس کے نہ ماننے کے نتیجہ میں اسے خدا تعالیٰ کے کلام کا بھی انکار کرنا پڑے گا ... اور چونکہ میرے نزدیک ایسی وحی جس کا ماننا تمام بنی نوع انسان پر فرض کیا گیا ہے حضرت مسیح موعودؑ پر ہوئی ہے اس لئے میرے نزدیک بموجب تعلیم قرآن کریم کے ان کے نہ ماننے والے کافر ہیں خواہ وہ باقی سب صداقتوں کو مانتے ہوں۔“ (11)

سرسری نظر سے ان حوالہ جات کو پڑھنے سے ایک نا واقف شخص شاید یہ نتیجہ نکالے کہ ان حوالہ جات میں تضاد ہے کہ ایک جگہ لکھا ہے کہ ایسا شخص کافر ہے اور ایک اور جگہ پر لکھا ہے کہ ایسا شخص کافر نہیں ہے۔ لیکن درحقیقت یہاں پر کوئی تضاد نہیں۔ اس قسم کے مضامین احادیث نبویہ ﷺ میں بھی بیان ہوئے ہیں۔

مثلاً صحیح مسلم کی کتاب الایمان میں روایات ہیں کہ جو اپنے آپ کو کسی کا بیٹا کہے اور وہ جانتا ہو کہ وہ اس کا بیٹا نہیں ہے اس نے کفر کیا (بَابٌ مَنِ ادَّعَیٰ اِلٰی غَیْرِ اَبِیْهِ) اور ایک اور روایت میں ہے کہ جو اپنے باپ سے بیزار ہوا وہ کافر ہو گیا (بَابُ بَیَانِ حَالِ اِیْمَانِ مَنْ رَغِبَ عَنْ اَبِیْهِ) اسی طرح رسولِ کریم ﷺ نے فرمایا کہ لوگوں میں دو چیزیں ہیں جو کفر ہیں۔ ایک نسب پر طعن کرنا اور دوسرے میت پر چلا کر رونا (اِطْلَاقُ اسْمِ الْکُفْرِ عَلٰی طَعْنٍ فِی النَّسَبِ وَا لنِّیَاحَةِ)۔ اسی طرح ارشاد نبوی ہے کہ جس نے کہا کہ فلاں ستارے کی وجہ سے بارش پڑی اس نے کفر کیا (بَیَانُ کُفْرِ مَنْ قَالَ مُطِرْنَا بِالنَّوْءِ) پھر ارشادِ نبوی ﷺ ہے کہ آدمی اور شرک اور کفر کے درمیان نماز کا ترک کرنا ہی ہے اور اس پر امام مسلمؒ نے باب ہی یہ باندھا ہے بَیَانُ اِطْلَاقِ

اَسْمَاءِ الْكُفْرِ عَلٰى مَنْ تَرَكَ الصَّلٰوةَ یعنی جس نے نماز ترک کی اس پر کفر کے نام کے اطلاق کا بیان۔ اسی طرح سنن ابی داوٗد میں حدیث بیان ہوئی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ قرآن کریم کے بارے میں جھگڑا کرنا کفر ہے۔ (باب 391 نَهْيٌ عَنِ الْجِدَالِ فِي الْقُرْآنِ)۔ جامع ترمذی ابواب الطہارۃ میں روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جو کاہن کے پاس گیا اس نے اس کا جو محمد ﷺ پر نازل ہوا انکار کیا۔ (بَابُ مَا جَآءَ فِي كَرَاهِيَةِ اِتْيَانِ الْحَآئِضِ)۔ جامع ترمذی میں حضرت ابنِ عمرؓ سے روایت ہے کہ جس نے اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی قسم کھائی اس نے کفر کیا یا شرک کیا۔ (بَابٌ فِي كَرَاهِيَةِ الْحَلْفِ بِغَيْرِ اللهِ)۔ اسی طرح ترمذی میں بیان ہوا ہے کہ جس کو کوئی عطا دی گئی اور اس نے تعریف کی تو اس نے شکر کیا اور جس نے چھپایا اس نے کفر کیا۔ (بَابُ مَا جَاءَ فِي الْمُتَشَبِّعِ بِمَا لَمْ يُعْطِهِ) اور رسول کریم ﷺ نے فرمایا ہے کہ جو شخص کسی ظالم کے ساتھ چلا کہ اس کی تائید کرے اور وہ جانتا ہے کہ وہ ظالم ہے تو وہ شخص اسلام سے نکل گیا (مِشْكٰوة شریف بَابُ الظُّلْمِ)۔ ان احادیث میں بہت سے امور ایسے بیان ہوئے ہیں جن کا مرتکب جب تک کہ ان کو ترک نہیں کرتا وہ بموجب ارشادِ نبوی کفر کرتا ہے۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ رسول کریم ﷺ کے زمانہ مبارک میں جو لوگ ان افعال کے مرتکب ہوتے تھے اس وقت کیا قانون کی رو سے وہ غیر مسلم شمار ہوتے تھے کہ نہیں۔ مثلاً اس وقت کے اسلامی قانون کے مطابق مسلمانوں سے زکوٰۃ وصول کی جاتی تھی اور غیر مسلموں سے جزیہ وصول کیا جاتا تھا۔ اور زمانہ نبوی میں ایسے لوگ موجود تھے جو نماز ادا نہیں کرتے تھے یا میّت پر چیخ کر نوحہ کرتے تھے یا اپنے باپوں سے بیزار تھے، یا غلطی سے غیر اللہ کی قسم کھا جاتے تھے تو کیا ایسے لوگوں کو اس وقت کے قانون کی رو سے غیر مسلم شمار کر کے ان سے جزیہ وصول کیا جاتا تھا، یا ان پر ممانعت تھی کہ وہ اپنے آپ کو مسلمان کہہ سکیں یا ان پر ممانعت تھی کہ وہ مسجد میں آکر مسلمانوں کے ساتھ نماز ادا کر سکیں۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ یقیناً ایسا نہیں تھا ان پر اس قسم کی کوئی پابندی نہیں تھی۔ ان افعال کے مرتکب جب

تک کہ اپنے افعال سے توبہ کر کے انہیں ترک نہ کر دیں کفر تو کرتے تھے لیکن یہ ان کا اور خدا تعالیٰ کے درمیان معاملہ تھا۔ گو ان احادیث کی رو سے ان افعال کے مرتکب افراد خدا کی نظر میں دائرہ اسلام سے تو خارج ہو جاتے تھے لیکن اس دنیا میں ملتِ اسلامیہ میں شامل رہتے ہیں اور انہیں غیر مسلموں میں ہرگز شمار نہیں کیا جاتا اور سب سے بڑھ کر یہ ہے کہ رسولِ کریم ﷺ نے خود اس امر کو اچھی طرح واضح فرمایا ہے۔ آپ نے فرمایا:۔

”جس نے ہماری نماز پڑھی اور ہمارے قبلہ کو اپنا قبلہ بنایا اور ہمارا ذبیحہ کھایا وہ مسلمان ہے جس کے لئے اللہ اور رسول کی امان ہے پس تم اللہ کے ساتھ اس کی دی ہوئی امان میں بے وفائی نہ کرو۔“ (صحیح بخاری، کِتَابُ الصَّلٰوۃِ۔ باب 269)

اور اس سے اگلی حدیث میں ہے کہ جس نے لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کہا، ہماری طرح نماز پڑھی ہمارے قبلہ کو اپنایا، ہمارا ذبیحہ کھایا تو ان کا خون ہمارے لئے حرام ہے اور ان کا حساب لینا اللہ تعالیٰ پر ہے۔ اس مضمون کی احادیث دوسری معتبر کتبِ احادیث میں بھی بیان ہوئی ہیں مثلاً سنن ابی داؤد کتاب الجہاد میں اسی مضمون کی ایک حدیث حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ جس نے لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ پڑھا، ہمارے قبلہ کو اپنا قبلہ بنایا، ہمارا ذبیحہ کھایا اور ہماری نماز پڑھی اس کا خون ہم پر حرام ہے، جو مسلمانوں کا حق ہے وہ ان کا حق ہے اور ان پر وہ حق ہے جو مسلمانوں پر ہے۔ ان احادیث سے یہ صاف طور پر ظاہر ہے کہ قانونی طور پر جو مذکورہ بالا معیار پر پورا اترے وہ مسلمان شمار ہو گا اور اس کو عرف عام میں مسلمان ہی کہا جائے گا اور وہ ملتِ اسلامیہ کا ہی حصہ سمجھا جائے گا اور ان کے باقی اعمال کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد ہے۔ اگرچہ پہلے بیان شدہ احادیث میں بہت سے ایسے اشخاص کے متعلق کہا گیا تھا کہ انہوں نے اپنے اعمال کے نتیجے میں کفر کیا ہے۔ یہ امر قرآن کریم کے الفاظ کی معروف ترین لغت مفرداتِ امام راغب میں بھی بیان ہوا ہے۔ مفرداتِ امام راغب میں لفظ

اسلام کی وضاحت میں لکھا ہے کہ شرعاً اسلام کی دو قسمیں ہیں۔ اگر کوئی شخص زبان سے اقرار کر لے۔ دل سے معتقد ہو یا نہ ہو اس سے انسان کی جان مال عزت محفوظ ہو جاتی ہے مگر اس کا درجہ ایمان سے کم ہے اور دوسرا درجہ اسلام کا وہ ہے جو ایمان سے بڑھ کر ہے اور وہ یہ ہے کہ زبان کے اعتراف کے ساتھ دلی اعتقاد بھی ہو اور عملاً اس کے تقاضوں کو پورا بھی کرے۔

جماعتِ احمدیہ کا یہی مسلک رہا ہے جو شخص اس قسم کی صورتوں میں ، احادیثِ نبویہ کی روشنی میں جن کی چند مثالیں اوپر دی گئی ہیں ، غلط افعال یا عقائد کی وجہ سے، دائرہ اسلام سے خارج بھی ہو لیکن وہ کلمہ پڑھتا ہو اور اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہو تو اسے بھی عرفِ عام میں مسلمان ہی کہا جائے گا اور وہ ملتِ اسلامیہ میں ہی شمار ہو گا اور قانون کی رو سے اسے مسلمان ہی سمجھا جائے گا۔ اس کا حساب اللہ تعالیٰ لے گا۔ حکومتوں یا انسانوں کا یہ کام نہیں ہے کہ اس سے یہ حق چھینیں۔ ورنہ تو یہ بھی ماننا پڑے گا جو شخص تین جمع عمداً ترک کرے وہ قانون کی رو سے مسلمان نہیں ہے اور اپنے آپ کو مسلمان نہیں کہہ سکتا، جو میّت پر چیخ کر روئے وہ قانون کی رو سے مسلمان نہیں ہے اور اپنے آپ کو مسلمان نہیں کہہ سکتا، جو نماز ترک کرے وہ قانون کی رو سے مسلمان نہیں ہے اور اپنے آپ کو مسلمان نہیں کہہ سکتا ، جو غیر اللہ کی قسم کھائے وہ قانون کی رو سے مسلمان نہیں ہے اور اپنے آپ کو مسلمان نہیں کہہ سکتا۔ ظاہر ہے مندرجہ بالا صورت محض فتنہ کا دروازہ کھولنے و الی بات ہو گی اور زمانہ نبوی ﷺ میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ اسی طرح جماعت کے لٹریچر میں جن چند جگہوں کے حوالے 1953ء کی تحقیقاتی عدالت میں بھی دیئے گئے تھے اور اب بھی دیئے جا رہے تھے کہ ان میں حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی تکذیب کو کفر لکھا گیا ہے یا حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی تکذیب کو دائرہ اسلام سے نکلنے کا مترادف لکھا گیا ہے، اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ ملتِ اسلامیہ سے خارج ہیں یا انہیں یہ حق نہیں کہ اپنے آپ کو مسلمان کہیں۔ اس کی وضاحت بارہا جماعتی لٹریچر میں دی گئی ہے۔

جب 1953ء کی تحقیقاتی عدالت میں حضرت خلیفۃ المسیح الثانی سے یہ سوال کیا گیا کہ اگر کوئی شخص مرزا غلام احمد صاحب کے دعاوی پر غور کرنے کے بعد اس دیانتدارانہ نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ یہ دعاوی غلط ہیں تو کیا ایسا شخص مسلمان رہے گا ؟تو اس پر حضور نے جواب دیا کہ ہاں عمومی طور پر اس کو مسلمان ہی سمجھا جائے گا۔

اور اسی کارروائی کے دوران جب جماعتِ اسلامی کے وکیل چوہدری نذیر احمد صاحب نے حضرت خلیفۃ المسیح الثانی سے سوال کیا:۔

”کیا آپ اب بھی یہ عقیدہ رکھتے ہیں جو آپ نے کتاب آئینہ صداقت کے پہلے باب میں صفحہ 35 پر ظاہر کیا تھا ۔ یعنی یہ کہ تمام وہ مسلمان جنہوں نے مرزا غلام احمد صاحب کی بیعت نہیں کی خواہ انہوں نے مرزا صاحب کا نام بھی نہ سنا ہو وہ کافر ہیں اور دائرہ اسلام سے خارج ہیں۔“

اس کے جواب میں حضرت خلیفۃ المسیح الثانی نے فرمایا:

”یہ بات خود اس بیان سے ظاہر ہے کہ میں ان لوگوں کو جو میرے ذہن میں ہیں مسلمان سمجھتا ہوں۔ پس جب میں کافر کا لفظ استعمال کرتا ہوں تو میرے ذہن میں دوسری قسم کے کافر ہوتے ہیں جن کی میں پہلے ہی وضاحت کر چکا ہوں یعنی وہ جو ملت سے خارج نہیں۔ جب میں کہتا ہوں کہ وہ دائرہ اسلام سے خارج ہیں تو میرے ذہن میں وہ نظریہ ہوتا ہے جس کا اظہار کتاب مفرداتِ راغب کے صفحہ 240 پر کیا گیا ہے۔ جہاں اسلام کی دو قسمیں بیان کی گئی ہیں۔ ایک دُوْنَ الْاِیْمَانِ اور دوسرے فَوْقَ الْاِیْمَانِ۔ دُوْنَ الْاِیْمَانِ میں وہ مسلمان شامل ہیں جن کے اسلام کا درجہ ایمان سے کم ہے۔ فَوْقَ الْاِیْمَانِ میں ایسے مسلمانوں کا ذکر ہے جو ایمان میں اس درجہ ممتاز ہوتے ہیں کہ وہ معمولی ایمان سے بلند تر ہوتے ہیں۔ اس لئے میں نے جب یہ کہا تھا کہ بعض لوگ دائرہ اسلام سے خارج ہیں تو میرے ذہن میں وہ مسلمان تھے جو فوق الایمان کی تعریف کے ماتحت آتے ہیں۔ مشکوٰۃ

میں بھی ایک روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ جو شخص کسی ظالم کی مدد کرتا ہے اور اس کی حمایت کرتا ہے وہ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔“

(تحقیقاتی عدالت میں حضرت امام جماعتِ احمدیہ کا بیان ،ناشر احمدیہ کتابستان حیدر آباد۔ص19، 20)

آئینہ صداقت کا جو حوالہ پیش کر کے یہ اعتراض اُٹھایا جاتا ہے کہ اس میں غیر احمدی مسلمانوں کو غیر مسلم کہا گیا ہے خود اُس عبارت میں غیر احمدی مسلمانوں کو مسلمان قرار دیا گیا ہے۔ اس حقیقت سے یہ اعتراض بالکل باطل ہو جاتا ہے۔

اور اس کارروائی کے دوران 6/ اگست کو جب حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ سے سوال کیا گیا کہ ایسی صورت میں اگر کسی شخص کے متعلق یہ کہا جائے کہ وہ دائرہ اسلام سے خارج ہو گیا ہے تو کیا پھر بھی مسلمان ہو گا۔ اس پر حضور نے فرمایا کہ ہاں وہ ملتِ اسلامیہ کا فرد ہو گا۔ اور وہ بعض جہت سے مسلمان ہے اور بعض جہت سے کافر ہے۔

اور7/ اگست کو جب دوپہر کے سیشن کی کارروائی ہوئی ہے تو اس میں حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ نے اس موقع پر بھی یہ فرمایا تھا کہ آنحضرت ﷺ کے زمانہ سے اب تک دو مختلف گروہ پیدا ہوتے رہے ہیں ایک وہ مخلصین جنہوں نے اسلام کو اچھی طرح قبول کیا اور ان لوگوں نے رضاکارانہ طور پر اپنی مرضی اور اختیار سے اپنی گردنیں خدا تعالیٰ کے حضور میں پیش کر دیں۔ اپنے اخلاص کے مطابق خدا کی راہ میں قربانی کرنے والا اور تمام احکامات پر عمل کرنے والا یہ ایک گروہ ہے۔ اس کے ساتھ ایک دوسرا گروہ بھی ہے جو اس مقام کا نہیں ہے۔ حضور نے حدیث کا حوالہ دے کر فرمایا کہ رسولِ کریم ﷺ کے زمانہ سے بعض گناہوں کے متعلق کفر کا لفظ استعمال ہوتا تھا اور ساتھ ہی ان کو مسلمان بھی کہا جاتا تھا اور حضور نے یہ آیت کریمہ پڑھی:۔

وَقَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا قُلْ لَمْ تُؤْمِنُواوَلٰكِنْ قُوْلُوْا اَسْلَمْنَا(الحجرات : 15)

یعنی اعراب کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے کہو کہ تم ایمان نہیں لائے بلکہ کہو کہ ہم اسلام لے آئے ہیں یا ہم نے اطاعت کر لی ہے۔

اس پر اٹارنی جنرل صاحب نے سوال کیا کہ کیا احمدیوں میں بھی اس قسم کے مسلمان ہیں؟ اس پر حضور نے جواب دیا کہ احمدیوں میں بھی ایک ایسا گروہ ہے جو کہ مخلص ہے اور دوسرا گروہ بھی ہے۔ اس پر پھر اٹارنی جنرل صاحب نے سوال کیا کہ پھر وہ بھی کافر ہوئے اس حد تک۔ اس پر حضور نے جواب دیا ”اس حد تک وہ بھی کافر“۔

اس کے بعد اٹارنی جنرل صاحب نے سوال کیا کہ اگر ایک شخص حضرت مسیح موعود علیہ السلام کا اپنی طرف سے نیک نیتی سے انکار کرتا ہے تو اس کی کیا حیثیت ہے؟ اس پر حضور نے فرمایا

”ہاں وہ گنہگار ہے۔“

اٹارنی جنرل صاحب نے پھر سوال کیا کہ وہ شخص کس Category میں کافر ہے؟ اس پر حضور نے فرمایا ”جس طرح نماز نہ پڑھنے والا۔“

اس پر اٹارنی جنرل صاحب نے کہا ”بس اتنا ہی؟ یہ مسلمان رہتا ہے؟“

اس پر حضور نے پھر فرمایا کہ

”مسلمان رہتا ہے۔ اس واسطے میں نے اس کی وضاحت کی ہے۔“

اس وضاحت کے بعد بھی اٹارنی جنرل صاحب یہ گفتگو چلاتے رہے اور ان لوگوں کے متعلق سوال کیا جو حضرت مسیح موعود علیہ السلام کو اتمامِ حجت کے بعد نبی نہیں مانتے۔ اس پر حضور نے پھر جواب دیا کہ

”جو شخص حضرت مرزا غلام احمد صاحبؑ کو نبی نہیں مانتا لیکن وہ حضرت نبی اکرم خاتم الانبیاء ﷺ کی طرف خود کو منسوب کرتا ہے اس کو کوئی شخص غیر مسلم کہہ ہی نہیں سکتا۔“

پھر حضور نے فرمایا:۔

”ہر وہ شخص جو محمد ﷺ کی طرف خود کو منسوب کرتا ہے وہ مسلمان ہے ... اور کسی دوسرے کا حق نہیں ہے کہ اس کو غیر مسلم قرار دے۔“

5/ اگست کی کارروائی کے اختتام پر بھی اس موضوع پر سوالات ہوئے۔ اٹارنی جنرل صاحب کی کوشش تھی کہ جماعتِ احمدیہ کا وفد اس موقف کا اظہار کرے کہ جماعتِ احمدیہ کے نزدیک جو مسلمان حضرت مسیح موعود علیہ السلام کا انکار کرتے ہیں وہ ملتِ اسلامیہ میں شمار نہیں ہوتے اور وہ آنحضرت ﷺ کی امت کا حصہ نہیں ہیں اور غیر مسلم ہیں اور اسی طرح کی کوشش اس وقت بھی کی گئی تھی جب 1953ء کی انکوائری میں حضرت خلیفۃ المسیح الثانی پر سوالات کئے گئے تھے۔ ایسے لوگوں کا ذکر کرتے ہوئے جن کے متعلق چودہ سو سال سے کفر کے فتوے دیئے جا رہے ہیں حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ نے فرمایا:۔

” اس کا مطلب اس کے علاوہ کچھ نہیں کہ ان کے بعض کام ہمارے نزدیک ایسے ہیں جو اللہ تعالیٰ کو پیارے نہیں ... “

یحیٰی بختیار : یعنی وہ مسلمان پھر بھی رہتے ہیں؟

حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ: وہ قابلِ مواخذہ ہیں اللہ کے نزدیک۔

یحیٰ بختیار: نہیں، پھر بھی وہ مسلمان رہتے ہیں یا نہیں؟

حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ: اگر پانچ ارکانِ اسلام کے علاوہ باقی جو تعلیم ہے اور احکامِ قرآنی ہیں، ان کو چھوڑ کے یا خود ان پانچ پر عمل نہ کر کے بھی مسلمان رہتا ہے، ... پھر وہ ایک sense میں مسلمان رہتے ہیں ایک میں نہیں۔

پھر اٹارنی جنرل صاحب نے سوال کیا کہ علماء جن کے متعلق یہ فتویٰ دیتے ہیں کہ وہ دائرہ اسلام سے خارج ہے، ان کی کیا حیثیت ہے۔ اس پر حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ نے فرمایا:

"میرے نزدیک صرف یہ ہے کہ وہ قیامت والے دن مرنے کے بعد قابلِ مواخذہ ہوں گے۔"

پھر 5/ اگست کی کارروائی کے دوران اس موضوع پر سوالات آگے بڑھے تو حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ نے فرمایا:۔

"کلمہ طیبہ کا انکار کرے کوئی شخص تو وہ ملتِ اسلامیہ سے خارج ہو جاتا ہے، امتِ مسلمہ میں نہیں رہتا لیکن جو بد عقیدگیاں ہیں، دوسری کمزوریاں ہیں، گنہگار ہے، انسان بڑا کمزور ہے، میں بھی آپ بھی، اللہ محفوظ رکھے ہمیں، تو اس کو ابنِ تیمیہ یہ کہتے ہیں:۔

ایک کفر ہے جو ملت سے خارج کردیتا ہے اور دوسرا کفر ہے جو ملت سے خارج نہیں کرتا۔ جو کلمہ طیبہ کا انکار ہے وہ ملت سے خارج کر دیتا ہے۔"

اس کے علاوہ حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ نے اس اصولی موقف کا اظہار فرمایا:۔

”جو شخص اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہے، وہ مسلمان رہتا ہے۔“

پھر یحیٰی بختیار صاحب نے ان دو سو مولویوں کی بابت سوال کیا جنہوں نے حضرت اقدس مسیح موعود علیہ السلام پر کفر کا فتویٰ لگایا تھا۔ حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ نے فرمایا کہ وہ بھی ملت ِاسلامیہ سے خارج نہیں سمجھے جا سکتے۔

اور یہ بات صرف احمدیوں کے لٹریچر تک محدود نہیں کہ ایسے افراد بھی ہوتے ہیں جن پر ایک لحاظ سے کفر کا لفظ تو آتا ہے لیکن وہ پھر بھی ملت ِاسلامیہ میں ہی رہتے ہیں اور ان کو عرف ِعام میں مسلمان ہی کہا جاتا ہے۔ حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ نے اس کارروائی کے دوران پرانے علماء میں سے مشہور علّامہ ابنِ تیمیہ کا حوالہ دیا۔ وہ اپنی تصنیف کتاب الایمان میں لکھتے ہیں:۔

”۔۔فَقَالَتِ الْعُلَمَاءُ فِیْ تَفْسِیْرِ الْفُسُوْقِ هَاهُنَا هِیَ الْمَعَاصِیْ قَالُوْا فَلَمَّا کَانَ الظُّلْمُ ظُلْمَیْنِ وَالْفِسْقُ فِسْقَیْنِ کَذَالِكَ الْکُفْرُ کُفْرَانِ اَحَدُهُمَا یَنْقُلُ عَنِ الْمِلَّةِ وَالْاٰخَرُ لَا یَنْقُلُ عَنِ الْمِلَّةِ“

(کتاب الایمان، تصنیف احمد ابن تیمیہ ،ناشر مطبع الانصاری، دہلی ص 171)

یعنی جس طرح ظلم دو قسم کا ہوتا ہے، فسق دو قسم کا ہوتا ہے کفر بھی دو قسم کا ہوتا ہے۔ ایک کفر ملت سے نکالنے کا باعث بنتا ہے اور دوسرا کفر ملت سے نکالنے کا باعث نہیں بنتا۔

اس کے علاوہ اس دور میں جماعت کے اشد مخالف مولوی شبیر عثمانی صاحب کا کہنا تھا:۔

”... حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما سے کُفْرٌ دُوْنَ کُفْرٍ کے الفاظ بعینہ مروی نہیں ہیں بلکہ ان سے ”وَمَنْ لَّمْ یَحْکُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰئِكَ هُمُ الْکٰفِرُوْنَ“ کی تفسیر میں ”اَیْ اَلْکُفْرُ لَا یَنْقُلُ عَنِ الْمِلَّةِ“ منقول ہے جس کا

مطلب یہ ہے کہ کفر چھوٹا بڑا ہوتا ہے، بڑا کفر تو ملت سے ہی نکال دیتا ہے جب کہ چھوٹا ملت سے نہیں نکالتا۔ معلوم ہوا کہ کفر کے انواع و مراتب ہیں ... "

(کشف الباری عمافی صحیح البخاری جلد دوم ،افادات شیخ الحدیث مولانا سلیم اللہ خان ناشر مکتبہ فاروقیہ کراچی ،ص200)

اب ہم اس فلسفہ کا جائزہ لیتے ہیں چونکہ احمدیوں کی بعض تحریروں میں حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے انکار کو کفر قرار دیا گیا ہے ، اس لئے انہیں آئین میں غیر مسلم قرار دینا چاہئے۔ تو پھر ہمیں یہ اصول تسلیم کرنا پڑے گا کہ جس فرقہ کی تحریروں میں دوسرے فرقہ کے لوگوں کو غیر مسلم قرار دیا گیا ہو اسے آئین میں تبدیلی کر کے غیر مسلم قرار دینا چاہئے۔ اس اصول کے مضمرات کا جائزہ لینے کے لیے ہم دیکھتے ہیں کہ صدیوں سے مختلف علماء دوسرے فرقوں کے متعلق اور ان کے ایمان کے بارے میں کیا فتاویٰ دیتے رہے ہیں۔ حنفیوں کی کتاب عرفانِ شریعت میں لکھا ہے کہ غیر مقلدین کی بدعت بہت وجہ سے کفر تک پہنچی ہوئی ہے کیونکہ وہ اجماع ،تقلید اور قیاس کے منکر ہیں اور بقول ان کے انہوں نے انبیاء کی شان میں گستاخی کی ہے۔ اور اسی کتاب میں یہ فتویٰ ہے کہ حنفیوں کی نماز غیر مقلدین کے پیچھے درست نہیں اور وجوہات میں سے یہ وجوہات بھی لکھی ہیں کہ اگر کٹورہ پانی میں چھ ماشہ پیشاب پڑ جائے تو وہ اسے پاک سمجھتے ہیں۔ اسی طرح شافعی اگر فرائض و شرائط حنفی کی رعایت نہ رکھیں تو ان کے پیچھے بھی نماز درست نہیں (48)۔ خدا تعالیٰ کے مامور کی تکذیب و تکفیر تو ایک طرف رہی فتاویٰ عثمانی مصنّفہ تقی عثمانی صاحب میں لکھا ہے کہ اگر کوئی علماء کو بُرا بھلا کہے اور سبّ و شتم کرے تو یہ نہ صرف بد ترین اور فسق ہے بلکہ ان کلمات کا کلماتِ کفر ہونے کا اندیشہ ہے اور اگر ایک شخص مؤذن کو بُرا بھلا کہے کہ وہ اذان کیوں دیتا ہے یہ کلماتِ کفر ہوں گے اور اگر کوئی شخص منکرِ حدیث ہو تو یہ کفر ہے اور تجدیدِ ایمان اور تجدیدِ نکاح ضروری ہے ،نہ صرف یہ بلکہ اگر کوئی یہ عقیدہ رکھے کہ جہنم دائمی نہیں ہے تو اس

کلمہ پر بھی کفر کا اندیشہ ہے(49)۔ بعض علماء تو اس طرف گئے ہیں کہ اگر کوئی شخص یہ عقیدہ رکھے کہ قرآن شریف مخلوق ہے یا اگر یہ عقیدہ رکھے کہ اللہ تعالیٰ کی رؤیت محال ہے تو یہ بھی ان لوگوں میں شامل ہے جنہیں کافر کہنا چاہئے (50)۔ دیوبندی مسلک کی کتاب عزیز الفتاویٰ میں لکھا ہے اگر نکاحِ ثانی کو معیوب سمجھا جائے تو اس سے کفر کا اندیشہ ہے اور یہ بھی لکھا کہ ایک مرد صالح کو ڈانٹنے اورذلیل کرنے سے آدمی فاسق اور بے دین ہو جاتا ہے (48)۔ اسی طرح دیوبندیوں کی طرف سے ان کے نمایاں عالم رشید احمد گنگوہی صاحب نے فتویٰ دیا تھا کہ شیعہ حضرات جو تعزیہ نکالتے ہیں وہ بُت ہے اور تعزیہ پرستی کفر ہے۔ جب ایک شخص نے ان سے میلاد میں شرکت کرنے والوں کے متعلق جو یہ مانتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ حاضر ہوتے ہیں اور بریلوی عالم احمد رضا خان صاحب کے بعض معتقدات کا ذکر کر کے ان کے متعلق سوال کیا تو رشیداحمد گنگوہی صاحب نے جواب دیا جو شخص اللہ جَلّ شَانہ کے سوا عالم غیب کسی دوسرے کو ثابت کرے اور اللہ تعالیٰ کے برابر کسی دوسرے کا علم جانے وہ بے شک کافر ہے اس کی امامت اور اس سے میل جول محبت مودّت سب حرام ہیں۔

روافض کے متعلق سوال کیا گیا تو گنگوہی صاحب نے فتویٰ دیا کہ علماء میں سے بعض نے ان کے متعلق کافر کا حکم دیا ہے اور بعض نے ان کو مرتد قرار دیا ہے (51)۔ فرنگی محل کے عالم مولوی عبد الحي صاحب نے فتوے دیئے کہ بعض شیعہ فرقے کافر ہیں (52)۔ حسام الحرمین علی منحر الکفر والمین جو کہ بریلوی قائد احمد رضا خان صاحب کی تصنیف ہے اس میں لکھا ہے کہ:۔

”ہر وہ شخص کہ دعویٰ اسلام کے ساتھ ضروریاتِ دین میں سے کسی چیز کا منکر ہو یقیناً کافر ہے اس کے پیچھے نماز پڑھنے اور اس کی جنازے کی نماز پڑھنے اور اس کے ساتھ شادی بیاہ کرنے اور اس کے ہاتھ کا ذبیحہ کھانے اور اس کے پاس بیٹھنے اور اس سے بات چیت کرنے اور تمام معاملات میں اس کا حکم وہی ہے جو مرتدوں کا حکم ہے۔(53)

بریلوی مسلک کے قائد احمد رضا خان صاحب نے مسلمانوں کے کئی فرقوں کو یہودیوں اور عیسائیوں سے بھی بدتر قرار دیا ہے اور واضح طور پر مرتد قرار دیا ہے۔ یہاں تک کہ ان کا فتویٰ تھا کہ یہودیوں کے ہاتھ کا ذبیحہ تو حلال ہے لیکن مسلمانوں کے کئی فرقوں کے ہاتھ کا ذبیحہ حرام اور نجس ہے۔ ان کے فتوے کے الفاظ ہیں:۔

"یہودی کا ذبیحہ حلال ہے جب کہ نام الٰہی عَزَّ جَلَالُہ لے کر ذبح کرے۔ یونہی اگر کوئی واقعی نصرانی ہو نہ نیچری دہریہ جیسے آج کل کے عام نصاریٰ ہیں کہ نیچری کلمہ گو مدعی اسلام کا ذبیحہ تو مردار ہے نہ کہ مدعی نصرانیت کا رافضی تبرّائی ، وہابی دیوبندی ، وہابی غیر مقلد ، قادیانی ، چکڑالوی، نیچری، ان سب کے ذبیحے محض نجس و مردار حرام قطعی ہیں۔ اگرچہ لاکھ بار نام الٰہی لیں اور کیسے ہی متقی پرہیز گار بنتے ہوں کہ یہ سب مرتدین ہیں۔ وَلَا ذَبِیْحَۃَ لِمُرْتَدّ ..."

(احکامِ شریعت۔ ص138۔ تصنیف احمد رضا خان بریلوی صاحب۔ ناشر ممتاز اکیڈمی لاہور)

پھر احمد رضا خان بریلوی صاحب مسلمانوں کے کئی فرقوں پر مرتد اور کافر ہونے کا فتویٰ ان الفاظ میں لگاتے ہیں۔

"... مرتدوں میں سب سے خبیث تر مرتد منافق ، رافضی ، وہابی ، قادیانی ، نیچری چکڑالوی کہ کلمہ پڑھتے ہیں اور اپنے آپ کو مسلمان کہتے ، نماز وغیرہ افعال اسلام بظاہر بجا لاتے بلکہ وہابی وغیرہ قرآن و حدیث کا درس دیتے لیتے اور دیو بندی کتبِ فقہ کو ماننے بھی شریک ہوتے بلکہ چشتی، نقشبندی وغیرہ بن کر پیری مریدی کرتے اور علماء و مشائخ کی نقل اتارتے اور بایں ہمہ محمد رسول اللہ ﷺ کی توہین کرتے یا ضروریاتِ دین سے کسی شَے کا

انکار رکھتے ہیں۔ ان کی اس کلمہ گوئی و ادعائے اسلام نے اور افعال و اقوال میں مسلمانوں کی نقل اتارنے ہی نے ان کو اَخْبَث وَ اَضَر اور ہر کافر اصلی یہودی ، نصرانی ، بت پرست ، مجوسی سب سے بد تر کر دیا ... ”

(احکامِ شریعت۔ ص 139۔ مصنّفہ احمد رضا خان صاحب)

احمد رضا خان صاحب بریلوی کا فتویٰ جو رَدّ الرفضہ کے نام سے شائع ہوا تھا اس میں لکھا ہے۔

” بالجملہ ان رافضیوں تبرّائیوں کے باب میں حکمِ یقینی قطعی اجماعی یہ ہے کہ وہ علی العموم کفار مرتدین ہیں۔ ان کے ہاتھ کا ذبیحہ مردار ہے۔ ان کے ساتھ مناکحت نہ صرف حرام بلکہ خاص زنا ہے۔ معاذاللہ مرد رافضی اور عورت مسلمان ہو تو یہ سخت قہرِ الٰہی ہے۔ اگر مرد سنی اور عورت ان خبیثوں میں کی ہو جب بھی ہر گز نکاح نہ ہو گا محض زنا ہو گا۔ اولاد ولد الزنا ہو گی۔ باپ کا ترکہ نہ پائے گی۔ اگرچہ اولاد بھی سنی ہو کہ شرعًا ولد الزنا کا باپ کوئی نہیں ...۔

جو ان ملعون عقیدوں پر آگاہ ہو کر بھی انہیں مسلمان جانے یا ان کے کافر ہونے میں شک کرے خود کافر بے دین ہے اور اس کے لئے بھی یہ سب احکام ہیں جو ان کے لئے مذکور ہوئے۔“

(رَدّالرَّفْضَةِ ص 30 و 31۔ مصنفہ احمد رضا خان بریلوی صاحب۔ ناشر کتب خانہ حاجی مشتاق اندرون بوہڑ گیٹ ملتان)

فتاوٰی الحَرمین بِرجْفِ نَدْوَةِ المَین، مطبع گلزار حسنی بمبئی میں درج چند فتاویٰ ملاحظہ ہوں۔ اس کتاب میں مختلف نمایاں علماء کے فتاویٰ درج ہیں۔ اور حرمین کے علماء کے فتاویٰ بھی شامل ہیں۔

”اہلسنت کے سوا سب کلمہ گو اہلِ قبلہ گمراہ فاسق بدعتی ناری ہیں۔“ (صفحہ 29)

نیچری زندیق ہیں دشمنانِ دین ہیں، فاسق ہیں انہیں اسلام سے اصلًا لگاؤ نہیں۔ وہ سخت خبیث کافر مرتد ہیں ان کی کلمہ گوئی اور نماز بقبلہ محض بے سود اور ان کی تاویلین سراسر مردود جو ان کے کفر میں شک کرے خود کافر ہے۔ وہ دین سے نکل گئے نرے ملحد ہیں۔ (صفحہ 31)

رافضی دین سے خارج ہیں۔ نرے ملحد۔ اسلام و ملت سے باہر ہیں۔ (صفحہ 32)

وہابی فاجر ہیں۔ دین و سنت کے دشمن ہیں ... یہ شیطان کا گروہ ہیں۔ (صفحہ 32)

"سرورِ غریزی فتاویٰ عزیزی" میں لکھا ہے کہ جب مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب دہلوی سے ایک سوال پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا:۔

"بلاشبہ فرقہ امامیہ حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافت سے منکر ہیں اور کتب فقہ میں مذکور ہے کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافت سے جس نے انکار کیا تو وہ اجماعِ قطعی کا منکر ہوا اور وہ کافر ہوگیا..."

(سرورِ غریزی۔ فتاویٰ عزیزی جلد اول اردو ترجمہ۔ ص440۔ باہتمام محمد فخرالدین۔ فخرالمطابع لکھنو)

صرف دوسرے فرقوں کی طرف سے شیعہ حضرات پر کفر کے فتوے نہیں لگائے جا رہے تھے بلکہ شیعہ حضرات نے بھی فتویٰ دیا کہ صرف شیعہ جنت میں جائیں گے اور باقی جہنم میں جائیں گے۔ چنانچہ ممتاز شیعہ عالم سید علی حائری صاحب کا فتویٰ تھا:۔

”یقیناجانیئے وہ ایک فرقہ ناجیہ صرف امامیہ اثنا عشریہ ہے اس کے سوا کوئی نہیں ... کیونکہ حدیث میں امت محمدی صلعم کو تہتر فرقوں میں محدود کیا گیا ہے۔ حضور علیہ السلام نے ان میں سے بہتر فرقوں کو تو جہنمی قرار دیا ہے صرف ایک فرقہ کو ان میں سے علیحدہ کر دیا ہے۔“

(فتاویٰ حائری حصہ دویم۔ مطبع اسلامیہ سٹیم لاہور۔ پہلا سوال)

صرف اپنے فقہ کے امام کے قیاس کو نہ تسلیم کرنے والے کو بھی کافر قرار دیا گیا۔ فقہ کی کتاب عرفانِ شریعت میں لکھا ہے اور ”فتاویٰ عالمگیری“ کا حوالہ دے کر لکھا ہے کہ:۔

”جو شخص امام ابو حنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے قیاس کو حق نہ مانے وہ کافر ہے۔“

(عرفانِ شریعت۔ حصہ سوم۔ ص75)

مولویوں کے طبقہ نے ہمیشہ امت مسلمہ کے اولیاء اور مجددین کو اپنی تکفیر بازی کا نشانہ بنایا ہے۔ چنانچہ مسعود عالم ندوی حضرت سید احمد شہید صاحبؒ کے ساتھ ہونے والے سلوک کے بارے میں لکھتے ہیں۔

” علماء سوء اور قبر پرستوں نے مجاہدینِ امت پر کفر کے فتوے لگائے۔ سرحد کے خوانین نے اپنے مرشد و محسن سے غداری کی ... سید احمد شہید اور اسماعیل شہید جیسے مجاہدینِ امت پر کفر کے فتوے لگائیں۔ مسلمانانِ ہند پر اس سے زیادہ منحوس گھڑی کوئی نہیں آئی ... “

(ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک۔ ص39 و40۔ مصنفہ مسعود عالم ندوی۔ ناشر مکتبہ ملّیہ راولپنڈی)

اور کفر کے فتووں کا یہ سلسلہ ایک صدی پہلے شروع نہیں ہوا بلکہ صدیوں سے یہ عالم چلا آرہا ہے۔ مثلاً فتاویٰ عالمگیری میں مختلف مآخذ کے حوالہ سے مختلف صورتیں درج ہیں جن میں ایک شخص پر کفر کا فتویٰ لگتا ہے ۔ صرف چند مثالیں پیشِ خدمت ہیں۔

اس میں لکھا ہے کہ اگر کسی نے اپنے ایمان میں شک کیا اور کہا میں ایماندار ہوں انشاء اللہ تو وہ کافر ہے۔

جس شخص نے قرآن یعنی کلام اللہ کی نسبت کہا کہ اللہ کا کلام مخلوق ہے تو وہ کافر ہے۔

اگر کسی نے ایمان کو مخلوق کہا تو وہ کافر ہے۔

اگر کسی نے کہا کہ اللہ تعالیٰ انصاف کے واسطے بیٹھا ہے یا کھڑا ہے تو اس کی تکفیر کی جائے گی۔ اور اگر کہا کہ میرا آسمان پر خدا اور زمین پر فلاں تو اس کی تکفیر کی جائے گی۔

اگر کسی سے کہا گیا کہ بہت نہ کھایا کر خدا تجھے دوست نہیں رکھے گا اور اس نے کہا میں تو کھاؤں گا خواہ مجھے دوست رکھے یا دشمن تو اس کو کافر کہا جائے گا۔ اور اسی طرح اگر کہا کہ بہت مت ہنس یا بہت مت سو یا بہت مت کھا اور اس نے کہا کہ اتنا کھاؤں گا اور اتنا ہنسوں گا اور اتنا سوؤں گا جتنا میرا جی چاہے تو اس کی تکفیر کی جائے۔

اگر کسی سے کہا گیا کہ خدائے تعالیٰ نے چار بیویاں حلال کی ہیں اور وہ کہے کہ میں اس حکم کو پسند نہیں کرتا تو یہ کفر ہے۔

اگر کسی نے امامت ابو بکرؓ سے انکار کیا تو وہ کافر ہے

اور اگر کسی نے خلافت حضرت عمرؓ سے انکار کیا تو وہ بھی اَصَحّ قول کے مطابق کافر ہے۔

اگر کسی نے کہا کہ کاش حضرت آدمؑ گیہوں نہ کھاتے تو ہم لوگ شقی نہ ہوتے تو اس کی تکفیر کی جائے۔

ایک نے ایک عورت سے نکاح کیا اور اگر گواہ حاضر نہ ہوئے اور اس نے کہا خدا اور فرشتوں کو گواہ کیا تو اس کی تکفیر کی جائے گی۔

اور اگر کسی نے رمضان کی آمد کے وقت کہا بھاری مہینہ آیا تو یہ کفر ہے۔

اگر ایک شخص مجلس علم سے آتا ہے اور کسی نے کہا کہ تو بت خانہ سے آتا ہے تو یہ کفر ہے۔

اگر کسی نے کہا کہ مجھے جیب میں روپیہ چاہیے میں علم کو کیا کروں تو تکفیر کیا جائے گا۔

اگر کسی نے فقیر کو مالِ حرام میں سے کچھ دے کر ثواب کی امید رکھی تو اس کی تکفیر کی جائے گی۔

اور اگر فقیر نے یہ بات جان کر دینے والے کو دعا دی اور دینے والے نے اس پر آمین کہی تو کافر ہوا۔(54)

اس دور میں تو علماء نے تکفیر کے دائرہ کو اور بھی وسیع کر دیا ہے۔ چنانچہ 1978ء میں جمعیت العلماء پاکستان کے ایک لیڈر مفتی مختار احمد گجراتی نے ہندوستان اور پاکستان کے درمیان کرکٹ میچ دیکھنے والوں کو دائرہ اسلام سے خارج قرار دے دیا تھا (55) اور اس پارٹی کے اراکین اسمبلی کے اس اجلاس میں بھی موجود تھے بلکہ جمعیت العلماء پاکستان کے قائد شاہ احمد نورانی صاحب نے تو جماعت احمدیہ کو غیر مسلم قرار دینے کے لئے قرارداد پیش بھی کی تھی۔ اس موقع پر قومی اسمبلی کی سپیشل کمیٹی میں جماعتِ اسلامی کے اراکین اس بات کے لئے بہت کوشاں تھے کہ احمدیوں کو آئین میں ترمیم کر کے غیر مسلم قرار دیا جائے خود مودودی صاحب کے بارے میں کئی علماء یہ فتویٰ دیتے آئے تھے کہ وہ ان تیس دجّالوں میں سے ایک ہیں جن کے بارے میں آنحضرت ﷺ نے پیشگوئی فرمائی تھی۔ مولوی محمد صادق صاحب یہ فتویٰ دیتے ہیں۔

” ... حضور اکرم ﷺ نے فرمایا ہے کہ اصلی دجال سے پہلے تیس دجال اور پیدا ہوں گے جو اس اس دجّالِ اصلی کا راستہ صاف کریں گے۔ میری سمجھ میں ان تیس دجّالوں میں سے ایک مودودی ہیں۔“

(حق پرست علماء کی مودودیت سے ناراضگی کے اسباب ، ص 97، مرتبہ مولانا احمد علی بار اوّل، ناشر نوائے پاکستان لاہور)

تو اگر یہ اصول تسلیم کیاجائے کہ جس فرقہ کی تحریر میں دوسرے فرقہ یا کسی گروہ کے متعلق کفر کا فتویٰ موجود ہے تو اسے آئین میں ترمیم کر کے قانونی طور پر غیر مسلم قرار دینا چاہئے تو پھر اس زد سے کوئی فرقہ نہیں بچ سکے گا۔ اور پاکستان کے آئین کے مطابق یہاں پر صرف غیر مسلم اکثریت ہی بس رہی ہو گی۔

6/ اگست کی کارروائی

6/ اگست کو اسمبلی کی کارروائی دوبارہ شروع ہوئی۔ ابھی جماعت کا وفد اسمبلی میں نہیں آیا تھا۔ مگر معلوم ہو رہا تھا کہ آج کچھ حوالے پیش کر کے جماعت کے وفد کو لاجواب کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ سپیکر صاحب نے اٹارنی جنرل سے کہا کہ میرا خیال ہے کہ آپ کی سہولت کے لئے کتابیں سامنے ہی رکھ دی جائیں۔ اس پر اٹارنی جنرل صاحب نے کہا کہ وہ موجود ہیں۔ سپیکر صاحب نے پھر تاکید کی کہ اٹارنی جنرل صاحب کے آس پاس Least Disturbance ہونی چاہیے۔ ان کے اردگرد کوئی سرگوشی نہیں ہونی چاہیے۔ یہ اہتمام غالباً اس لئے کیا جا رہا تھا کہ اٹارنی جنرل صاحب پوری یکسوئی سے سوال کر سکیں۔

اس سے قبل کہ حضور وفد کے ہمراہ ہال میں تشریف لاتے ایک ممبر جہانگیر علی صاحب نے سپیکر صاحبزادہ فاروق علی صاحب سے کہا:۔

Mr. Chairman interpretation of document or a writting is not the job of witness. I would therefore request that the witness should not be allowed to interpret; it is the job of the presiding officer or the judge.

یعنی وہ یہ کہہ رہے تھے کہ ایک تحریر یا دستاویز سے استدلال کرنا گواہ کا کام نہیں ہوتا۔ یہ کارروائی کے چیئرمین یا ججوں کا کام ہوتا ہے۔ لہٰذا گواہوں کو یعنی جماعت کے وفد کو اس بات سے روکا جائے کہ وہ استدلال کریں۔ جہانگیر علی صاحب کی طرف سے یہ ایک لایعنی فرمائش تھی۔ سوالات کرنے والوں کی طرف سے جماعت کی تعلیمات پر اعتراض کیے جا رہے تھے اور سیاق و سباق اور پس منظر سے الگ کر کے جماعتی تحریرات کے حوالے پیش کیے جا رہے تھے۔ لیکن ان صاحب کے نزدیک جماعتی وفد کو اس بات کی اجازت نہیں ہونی چاہیے

تھی کہ وہ ان کے متعلق جماعتی موقف کے مطابق استدلال پیش کرے۔ اگر سپیشل کمیٹی میں جماعتی وفد کو بلانے کا مقصد صرف یہی تھا کہ وہ ممبرانِ اسمبلی کے غیر متعلقہ سوالات سنے ان کے تبصرے سنے لیکن ان کے جواب میں اپنا استدلال نہ پیش کرے تو اس لغو عمل کو کوئی بھی ذی ہوش قبول نہیں کر سکتا اور یہ بات اس لئے بھی ناقابلِ فہم معلوم ہوتی ہے کہ اب تک کی کارروائی میں خود کئی تحریریں پیش کر کے اٹارنی جنرل صاحب نے یہ دریافت کیا تھا کہ اس کے بارے میں جماعت کے وفد کا نقطہ نظر کیا ہے۔ اس کے جواب میں سپیکر صاحب نے صرف یہ کہا کہ جج تو آپ ہی لوگ ہیں اور اٹارنی جنرل صاحب جب چاہیں اس ضمن میں درخواست کر سکتے ہیں۔ کچھ دیر کے بعد جماعت کا وفد داخل ہوا۔ سپیکر صاحب نے اظہار کیا کہ سوالات کا یہ سلسلہ دو تین دن جاری رہ سکتا ہے پوری کارروائی کے لئے حلف ہو چکا ہے یعنی نئے سرے سے گواہ سے حلف لینے کی ضرورت نہیں۔

اس کارروائی کے آغاز میں حضرت خلیفة المسیح الثالثؒ نے گزشتہ روز کی بحث کے تسلسل میں سلفِ صالحین کے حوالے سے یہ بات فرمائی کہ کفر دو قسم کا ہے ایک کفر وہ ہے جو ملتِ اسلامیہ سے نکالنے کا باعث ہو گا اور دوسرا وہ جو ملتِ اسلامیہ سے باہر نکالنے کا باعث نہیں ہو گا۔ اور یہ بھی فرمایا کہ جماعتِ احمدیہ کی طرف سے یہ کبھی نہیں کہا گیا کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کا انکار ملتِ اسلامیہ سے خارج کر دیتا ہے۔

اس کے بعد اٹارنی جنرل صاحب نے وہی پرانے اعتراضات دہرائے جو عموماً جماعت کے مخالفین کی طرف سے کیے جاتے ہیں۔ یعنی احمدی غیر احمدیوں کا جنازہ نہیں پڑھتے، ان سے شادیاں نہیں کرتے۔ ان کے پیچھے نماز نہیں پڑھتے۔ چوہدری ظفراللہ خان صاحب نے قائدِ اعظم کا جنازہ کیوں نہیں پڑھا۔ اب ذرا تصور کریں کہ یہ کارروائی 1974ء کے فسادات کے دوران ہو رہی تھی جبکہ خود اخبارات لکھ رہے تھے کہ علماء کی تحریک کے نتیجہ میں پاکستان بھر میں احمدیوں کا بائیکاٹ شروع ہو گیا ہے اور ان دنوں میں احمدیوں کا جنازہ پڑھنا تو دور

کی بات ہے، احمدیوں کی تدفین میں بھی رکاوٹیں ڈالی جا رہی تھیں۔ بعض مقامات پر احمدیوں کی قبروں کو اکھیڑ کر ان کی نعشوں کی بے حرمتی کی جا رہی تھی۔ جگہ جگہ احمدیوں کو شہید کیا جا رہا تھا اور حکومت اور قانون نافذ کرنے والے ادارے تماشائی بنے کھڑے تھے۔ لیکن اسمبلی میں اعتراض احمدیوں پر ہورہا تھا کہ وہ غیر احمدیوں کے جنازے کیوں نہیں پڑھتے اور ان سے شادیاں کیوں نہیں کرتے۔ یہ سوال تو پہلے غیر احمدی مسلمانوں سے ہونا چاہئے تھا۔ کیا وہ احمدیوں کا جنازہ پڑھتے ہیں ؟ اس کا جواب یقیناً نفی میں ہے تو اس اعتراض کا حق انہیں نہیں ہو سکتا کہ احمدی غیر احمدیوں کا جنازہ کیوں نہیں پڑھتے۔ بلکہ جب 1953ء میں تحقیقاتی عدالت میں حضرت خلیفة المسیح الثانی پر سوالات کئے گئے تو سوالات کرنے والوں میں ایک مولانا میکش بھی تھے۔ انہوں نے حضور سے سوال کیا:۔

"عام مسلمان تو احمدیوں کا اس لئے جنازہ نہیں پڑھتے کہ وہ احمدیوں کو کافر سمجھتے ہیں۔ آپ بتائیں کہ احمدی جو غیر احمدیوں کا جنازہ نہیں پڑھتے اس کی اس کے علاوہ کیا وجہ ہے جس کا آپ قبل ازیں اظہار کر چکے ہیں۔"

(تحقیقاتی عدالت میں امام جماعتِ احمدیہ کا بیان۔ ص39۔ ناشر احمدیہ کتابستان سندھ)

اب ایک عدالتی کارروائی میں کتنا واضح اقرار ہیں کہ مولانا جن کی نمائندگی کر رہے ہیں وہ احمدیوں کو نہ مسلمان سمجھتے ہیں اور نہ ان کا جنازہ پڑھتے ہیں، مگر اس کے باوجود مولانا کا یہ خیال تھا کہ ان کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ احمدیوں کو سرزنش فرمائیں کہ وہ غیر احمدیوں کا جنازہ کیوں نہیں پڑھتے۔

اور تو اور یہ اعتراض اُٹھاتے ہوئے اٹارنی جنرل صاحب نے ریویو آف ریلیجنز میں شائع ہونے والی ایک تحریر پڑھی اور یہ دعویٰ کیا کہ یہ تحریر حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمد خلیفة المسیح الثانی کی ہے اور اس طویل

بحث کی بنیاد انہوں نے اس تحریر سے اُٹھائی۔ حقیقت یہ تھی کہ یہ تحریر حضرت خلیفة المسیح الثانی کی نہیں تھی بلکہ حضرت صاحبزادہ مرزا بشیر احمد صاحب کی تھی۔

(ملاحظہ کیجئے ریویو آف ریلجنز جلد 14 ص169)

یہ بات قابل غور ہے کہ 6/ اگست کی کارروائی کے بالکل شروع میں اٹارنی جنرل صاحب نے حوالہ جات کی کتب کو اٹارنی جنرل صاحب کے پاس رکھنے کا کہا تھا تو اس پر اٹارنی جنرل صاحب نے کہا تھا ”They are available“۔ اس پر سپیکر صاحب نے کہا

”All are available?“۔ اس پر اٹارنی جنرل صاحب نے پھر کہا ”They are available“۔ اس پر سپیکر صاحب نے کہا جو ریفرنس آپ پیش کریں وہ ان کو دکھا دیئے جائیں کہ یہ ریفرنس ہے۔ اس گفتگو سے یہ ظاہر ہوجاتا ہے کہ جو ریفرنس پیش کئے جانے تھے وہاں پر موجود تھے۔ اس کے باوجود اٹارنی جنرل صاحب نے جو پہلا حوالہ پیش کیا اس میں تحریر غلط شخصیت کی طرف منسوب کی۔ اگر یہ غلط حوالہ دینے کا واقعہ ایک دو مرتبہ ہوتا تو قابلِ درگزر تھا لیکن مختلف طریق پر غلط حوالے دینے کا سلسلہ اس کارروائی میں بہت تواتر سے جاری رہا۔ اس صورت حال میں دو ممکنہ صورتیں ہو سکتی ہیں۔

1)۔ اپنے موقف کی کمزوری کو محسوس کرتے ہوئے جماعتِ احمدیہ کے مخالفین اس بات پر مجبور تھے کہ غلط حوالے پیش کریں۔

2)۔ اٹارنی جنرل اور اس اسمبلی میں سوالات کرنے والوں کی ذہنی حالت ایسی تھی کہ وہ اگر سامنے حوالہ تحریری طور پر بھی موجود ہو تو صحیح طرح پڑھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے تھے۔ ایسی صورت میں ان پر سے اس پہلو سے بد دیانتی کا الزام تو ہٹ جاتا ہے لیکن ان کی ذہانت کے بارے میں کافی شکوک و شبہات جنم لیتے ہیں۔

اب زیر بحث موضوع کی طرف آتے ہیں۔ اسلام کے باقی فرقوں سے وابستہ اراکین جو یہ اعتراضات احمدیت پر کر رہے تھے ان کا حال یہ تھا کہ ہر فرقہ نے دوسرے فرقوں پر وہ وہ اعتراضات کیے تھے اور ایسے فتوے لگائے تھے کہ خدا کی پناہ۔ اس مرحلہ پر یہ ضروری تھا کہ ان کو کسی قدر آئینہ دکھایا جائے۔

چنانچہ جب یہ بحث کچھ دیر چلی تو حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ نے غیر احمدی علماء کا ایک فتویٰ پڑھ کر سنایا۔ اس فتویٰ سے صرف ہندوستان کے علماء نے ہی نہیں بلکہ بلادِ عرب کے بہت سے علماء نے بھی اتفاق کیا تھا۔ حضور نے اس کے یہ الفاظ پڑھ کر سنائے:۔

”وہابیہ دیوبندیہ اپنی تمام عبارتوں میں تمام اولیاء انبیاء حتیٰ کہ حضرت سید الاوّلین والآخرین ﷺ کی اور خاص ذات باری تعالیٰ شانہ کی اہانت اور ہتک کرنے کی وجہ سے قطعاً مرتد و کافر ہیں اور ان کا ارتداد کفر میں سخت سخت درجہ تک پہنچ چکا ہے ایسا کہ جو ان مرتدوں اور کافروں کے ارتداد و کفر میں ذرا بھی شک کرے وہ بھی انہی جیسا مرتد و کافر ہے اور جو اس شک کرنے والے کے کفر میں شک کرے وہ بھی مرتد و کافر ہے ۔مسلمانوں کو چاہیے کہ ان سے بالکل محترز و مجتنب رہیں۔ ان کے پیچھے نماز پڑھنے کا تو ذکر ہی کیا اپنے پیچھے بھی ان کو نماز نہ پڑھنے دیں اور نہ اپنی مسجدوں میں انہیں گھسنے دیں۔ نہ ان کا ذبیحہ کھائیں اور نہ ان کی شادی غمی میں شریک ہوں اور نہ اپنے ہاں ان کو آنے دیں۔ یہ بیمار ہوں تو عیادت کو نہ جائیں، مریں تو گاڑنے توپنے میں شرکت نہ کریں۔ مسلمانوں کے قبرستان میں کہیں جگہ نہ دیں غرض ان سے بالکل احتیاط و اجتناب رکھیں ...“

ابھی یہ باغ وبہار قسم کا فتویٰ جاری تھا کہ اٹارنی جنرل صاحب نے کہا کہ یہ تو محضر نامہ میں بھی شامل ہے اس لیے اسے پڑھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس سے ان کی بے چینی ظاہر ہوتی تھی۔ اس پر حضور نے فرمایا کہ مجھے یہاں پر دہرانے کی اجازت دی جائے کیونکہ اگر سوال دہرایا جائے گا تو جواب بھی دہرایا جائے گا۔ اس

پر اٹارنی جنرل صاحب نے کہا کہ انہیں اس پر کوئی اعتراض نہیں۔ اس پر حضور نے اس فتوے کا باقی حصہ پڑھ کر سنایا۔

"پس دیوبندیہ سخت سخت اشد مرتد وکافر ہیں۔ ایسے کہ جو ان کو کافر نہ کہے خود کافر ہو جائے گا۔ اس کی عورت اس کے عقد سے باہر ہو جائے گی اور جو اولاد ہو گی وہ حرامی ہو گی اور از روئے شریعت ترکہ نہ پائے گی۔"

حضور نے فرمایا کہ

" اس اشتہار میں جن علماء کے نام ہیں، ان میں چند ایک یہ ہیں سید جماعت علی شاہ ، حامد رضا خان صاحب قادری غوری رضوی بریلوی ، محمد کرم دین ، محمد جمیل احمد وغیرہ بہت سے علماء کے نام ہیں۔ ایک رخ یہ بھی ہے تصویر کا۔ ان کے بچوں کے متعلق بھی وہی فتویٰ ہے جس کے متعلق آپ مجھ سے وضاحت کروانا چاہتے ہیں۔ اور یہ اس سے کہیں زیادہ سخت ہے۔ یہ بہت سارے حوالے ہیں۔ میں ساروں کو چھوڑتا ہوں تاکہ وقت ضائع نہ ہو۔ اہلِ حدیث کے پیچھے نماز نہ پڑھیں تو اس کے متعلق بریلوی ائمہ ہمیں غیر مبہم الفاظ میں خبردار کرتے ہیں کہ وہابیہ وغیرہ مقلدینِ زمانہ بالاتفاق علماءِ حرمین شریفین کافر مرتد ہیں ایسے کہ جو ان کے اقوالِ لغویہ پر اطلاع پا کر کافر نہ مانے یا شک کرے وہ کافر ہے۔ ان کے پیچھے نماز ہوتی ہی نہیں۔ ان کے ہاتھ کا ذبیحہ حرام ہے۔ ان کی بیویاں نکاح سے نکل گئیں۔ ان کا نکاح کسی مسلمان کافر یا مرتد سے نہیں ہو سکتا۔ اس کے ساتھ میل جول ، کھانا پینا ، اٹھنا بیٹھنا، سلام کلام سب حرام ہیں۔ ان کے مفصل احکام کتاب مستطاب حسام الحرمین شریف میں موجود ہیں۔ یہ اہلحدیث کے پیچھے نماز پڑھنے کا ذکر ہو رہا ہے۔ باقی اس کے حوالے میں چھوڑتا ہوں۔ بریلوی کے متعلق جہاں تک نماز پڑھنے کا تعلق ہے دیوبندی علماء یہ شرعی حکم ہمیں سناتے ہیں:۔

”جو شخص اللہ جلّ شانہٗ کے سوا علمِ غیب کسی دوسرے کا ثابت کرے اور اللہ تعالیٰ کے برابر کسی دوسرے کا علم جانے وہ بے شک کافر ہے۔ اس کی اعانت اس سے میل جول محبت و مودّت سب حرام ہیں۔“

یہ فتویٰ رشیدیہ میں رشید احمد صاحب گنگوہی کا ہے جو ان کے مرشد ہیں۔ میں ایک ایک فتوے کو صرف بتا رہا ہوں تا کہ معاملہ صاف کر سکوں۔ پرویزیوں اور چکڑالویوں کے متعلق نماز پڑھنے کے سلسلہ میں یہ فتویٰ ہے:۔

”چکڑالویت حضور سرورِ کائنات علیہ التسلیمات کے منصب و مقام اور آپ کی تشریعی حیثیت کے منکر اور آپ کی افادیت مبارکہ کے جانی دشمن۔ رسولِ کریم کے کھلے باغیوں نے رسول کے خلاف ایک مضبوط محاذ قائم کر دیا ہے۔ جانتے ہو باغی کی سزا کیا ہے صرف گولی۔“

شیعہ حضرات کے متعلق کہ ان کے پیچھے نماز ہوتی ہے یا نہیں:۔

”بالجملہ ان رافضیوں تبرّائیوں کے باب میں حکمِ یقینی قطعی اجماعی یہ ہے کہ وہ علی العموم کفّارمرتدین ہیں ان کے ہاتھ کا ذبیحہ مردار ہے۔ ان کے ساتھ مناکحت نہ صرف حرام بلکہ خاص زنا ہے۔ معاذاللہ مرد رافضی اورعورت مسلمان ہو تو یہ سخت قہرِ الٰہی ہے۔ اگر مرد سنی اورعورت ان خبیثوں کی ہو جب بھی نکاح ہر گز نہ ہو گا محض زناہوگا۔ اولاد ولد الزنا ہو گی۔ باپ کا ترکہ نہ پائے گی اگرچہ اولاد بھی سنی ہو کہ شرعاً ولد الزنا کا باپ کوئی نہیں۔ عورت نہ ترکہ کی مستحق ہو گی نہ مہر کی کہ زانیہ کے لیے مہر نہیں۔ رافضی اپنے کسی قریب حتی کہ باپ بیٹے ماں بیٹی کا ترکہ نہیں پا سکتا۔ سنی تو سنی کسی مسلمان بلکہ کسی کافر کے بھی یہاں تک کہ خود اپنے ہم مذہب رافضی کے ترکہ میں اس کا اصلاً کچھ حق نہیں۔ ان کے مرد عورت عالم جاہل کسی سے میل جول، سلام کلام سخت کبیرہ اشد حرام۔ جو ان کے ملعون عقیدہ پر آگاہ ہو کر بھی انہیں مسلمان جانے یا ان کے کافر ہونے

میں شک کرے ... کافر بے دین ہے اور اس کے لئے بھی یہی سب احکام ہیں جو ان کے لئے مذکور ہوئے ۔مسلمان پر فرض ہے کہ اس فتویٰ کو بگوشِ ہوش سنیں اوراس پر عمل کرکے سچے پکے سنی بنیں۔“

(فتویٰ مولانا شاہ مصطفےٰ رضا خان بحوالہ رسالہ ردُ الرافضۃ)

یہ اس میں آ گیا ہے۔ یہاں یہ سوال نہیں کہ احمدی ، وہابیوں ،دیوبندیوں وغیرہ کے پیچھے نماز کیوں نہیں پڑھتے یا ان کی شادیوں کو کیوں مکروہ سمجھا جاتا ہے۔ اس سے کہیں زیادہ فتویٰ موجود ہے۔ ہمیں ساروں کو اکٹھا لے کر کوئی فیصلہ کرنا چاہیئے۔“

حضور نے یہ صرف چند مثالیں ممبرانِ قومی اسمبلی کی خدمت میں پیش کی تھیں ورنہ یہ فتاویٰ تو سینکڑوں ہزاروں ہیں اور مختلف فرقوں نے ایک دوسرے پر کفر کے فتوے لگائے ہوئے ہیں اور دوسرے فرقوں میں شادی کی ممانعت کے فتوے دیئے ہیں۔ چند مزید مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

شادی کے معاملہ میں دیوبند کا ایک فتویٰ پیش کرتے ہیں۔ مولوی رشید گنگوہی صاحب دیوبند کے ایک نہایت نمایاں عالم تھے اور جماعتِ احمدیہ کی مخالفت میں بھی بہت پیش پیش تھے۔ ان سے سوال پوچھا گیا کہ اگر ایک سنی عورت شیعہ مرد سے شادی کرے اور اسے معلوم ہو کہ یہ مرد شیعہ ہے اور پھر وہ عقائد کو حیلہ بنا کر بغیر طلاق کے سنی سے دوسری شادی کرلے تو اس نکاح کی کیا حیثیت ہے؟ اور اگر کسی سنی کی اولاد شیعہ ہو جائے تو کیا وہ اس سنی کا ترکہ پائے گی۔ اس سوال کے جواب میں رشید گنگوہی صاحب کا فتویٰ یہ تھا:

”جس کے نزدیک رافضی کافر ہے وہ فتویٰ اوّل ہی سے بطلانِ نکاح کا دیتا ہے۔ اس میں اختیار زوجہ کا کیا اعتبار ہے پس جب چاہے علیحدہ ہو عدّت کر کے نکاح دوسرے سے کر سکتی ہے اور جو فاسق کہتے ہیں ان کے نزدیک

یہ امر ہر گز درست نہیں کہ نکاحِ اوّل صحیح ہو چکا ہے اور بندہ اوّل مذہب رکھتا ہے ... رافضی اولاد سنی کو ترکہ سنی نہ ملے گا۔"

(فتاویٰ رشیدیہ۔ ص225۔ مُبوَّب۔ ناشر ادب منزل کراچی)

عبدالعزیز صاحب دہلوی کا فتویٰ ملاحظہ ہو:۔

"مرد سنی اور عورت شیعہ میں نکاح کا حکم اس پر موقوف ہے کہ شیعہ کافر ہیں یا نہیں۔ مذہب حنفی میں اس پر فتویٰ ہے کہ فرقہ شیعہ میں مرتد کا حکم ہے۔ ایسے ہی فتاویٰ عالمگیری میں لکھا ہے تو اہلِ سنت و جماعت کے لئے یہ درست نہیں کہ شیعہ عورت سے نکاح کریں۔

اور مذہبِ شافعی میں دو قول ہیں۔ ایک قول کی بناء پر شیعہ کافر ہیں اور دوسرا قول یہ ہے کہ یہ لوگ فاسق ہیں۔ ایسا ہی صواعقِ محرقہ میں مذکور ہو۔ لیکن قطع نظر اس سے اس فرقہ کے ساتھ نکاح کرنے میں طرح طرح کا بہت فساد ہوتا ہے۔ مثلاً بد مذہب ہونا۔ اہلِ خانہ اور اولاد کا اور ایک ساتھ بسر کرنے وغیرہ میں باہمی اتفاق نہ ہونا تو اس سے پرہیز کرنا واجب ہے۔"

(فتاویٰ عزیزیہ۔ ص508۔ باہتمام حاجی محمد ذکی۔ ناشر سعید کمپنی)

اب تک ممبرانِ اسمبلی اٹارنی جنرل صاحب کے ذریعہ جو سوالات کر رہے تھے ان کی طرز یہ جارہی تھی کہ چونکہ احمدی غیر احمدیوں کے پیچھے نماز نہیں پڑھتے، ان کی نمازِ جنازہ نہیں پڑھتے، ان کی عورتیں ان کے مردوں سے شادی نہیں کرتیں، اس لیے یہ خود اپنے آپ کو مسلمانوں سے علیحدہ رکھنا چاہتے ہیں لہٰذا دوسرے مسلمان اگر ان کو غیر مسلم قرار دے دیں تو کچھ مضائقہ نہیں لیکن جب حضور نے غیر احمدی جید علماء کی طرف سے دیئے گئے صرف چند فتاویٰ پڑھ کر سنائے تو یہ واضح ہو گیا کہ وہ ایک دوسرے کے متعلق کیا خیالات

رکھتے ہیں۔ نماز پڑھنا یا جنازہ پڑھنا تو درکنار انہوں نے تو یہ بھی لکھا ہوا تھا کہ نہ صرف دوسرے فرقہ سے وابستہ افراد کافر ہیں بلکہ اگر ان سے شادی کرلی جائے تو اولاد ولدالزنا ہو گی۔ اگر اسی امر کو معیار بنا کر آئین میں غیر مسلم بنانے کا عمل شروع کیا جائے تو تمام فرقے غیر مسلم قرار دے دیئے جائیں گے اور اسلامی جمہوریہ پاکستان میں ایسا کوئی شخص دیکھنے کو بھی نہ ملے گا جسے آئینی طور پر مسلمان کہا جا سکے۔ جنازہ کے متعلق حضور نے فرمایا کہ یہ فرضِ کفایہ ہے۔ اگر کہیں پر جنازہ پڑھنے والا کوئی مسلمان نہ ہو تو احمدیوں کو یہ ہدایت دی جاتی ہے کہ وہ ضرور اس غیر احمدی مسلمان کا جنازہ پڑھیں بلکہ ایک مرتبہ جب ڈنمارک میں ایک مسلمان عورت کے جنازہ کی صورت میں ایسا نہیں کیا گیا تو اس پر حضور نے اس جماعت پر سخت ناراضگی کا اظہار فرمایا۔

جب یہ حوالے پڑھے گئے تو جو اثر اٹارنی جنرل صاحب اپنے سوالات سے قائم کرنا چاہتے تھے وہ زائل ہو گیا۔ نہ معلوم اس بات کی پریشانی تھی یا اس بد حواسی کا کچھ اور سبب تھا، اٹارنی جنرل صاحب نے اس مرحلے پر کچھ نا قابلِ فہم سوالات کا سلسلہ شروع کیا۔ انہوں نے غیر احمدی علماء کے فتاویٰ کے بارے میں حضور سے دریافت کرنا شروع کیا کہ کیا اس سے مراد ہے کہ ان فتاویٰ کی وسیع زد میں آنے والے دائرہ اسلام سے خارج ہیں یا ملتِ اسلامیہ سے خارج ہیں۔ اس پر حضور نے فرمایا کہ یہ تو فتاویٰ دینے والے خود بتائیں کہ ان کی مراد کیا تھی میں کس طرح بتا سکتا ہوں؟ اور سادہ سی بات تھی کہ جن مسالک کے فتاویٰ تھے ان کے بڑے بڑے مولوی صاحبان سامنے بیٹھے تھے، ان سے پوچھنا چاہیے تھا کہ انہوں نے ایک دوسرے کو کافر قرار دینے کے جو فتاویٰ دیئے ہیں ان سے کیا مراد تھی۔ جماعتِ احمدیہ کا وفد اس کا جواب کیسے دے سکتا تھا؟ پھر انہوں نے ایک اور نا قابلِ فہم سوال کیا کہ جو فتاویٰ احمدیوں کے خلاف ہیں ان سے کیا مراد ہے؟ یعنی کیا ان سے مراد دائرہ اسلام سے خارج ہونا ہے یا ملتِ اسلامیہ سے خارج ہونا؟ یہ ایک اور عجیب سوال تھا؟ حضور نے فرمایا کہ جو علماء

سامنے بیٹھے ہیں یہ تو ان سے پوچھا جائے لیکن اٹارنی جنرل صاحب اس بات کو دہراتے رہے۔ پھر حضور نے ایک بار اور واضح فرمایا کہ ان کے متعلق میں کیسے بتا سکتا ہوں کہ ان کی مراد کیا ہے؟

اٹارنی جنرل صاحب نے پھر مطلوبہ تاثر کو قائم کرنے کے لیے یہ ذکر چھیڑا کہ احمدی غیر احمدی بچوں کا جنازہ کیوں نہیں پڑھتے۔ اس پر حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ نے انہیں یاد دلایا کہ کئی مرتبہ ایسا ہو چکا ہے کہ ایک احمدی بچہ کی تدفین کی گئی اور غیر احمدیوں نے اس بنا پر کہ یہ ایک احمدی بچہ تھا اس کی قبر اکھیڑ کر لاش کو باہر نکلوایا اور یہ یاد دلایا کہ انہی دنوں میں فسادات کے دوران گوجرانوالہ میں ایک احمدی بچے کی تدفین کو روکا گیا اور قائد آباد میں ایک احمدی کی قبر اکھیڑ کر اس کی لاش کو قبر سے باہر نکالا گیا۔ اس پس منظر میں یہ ایک مضحکہ خیز سوال تھا کہ احمدی، غیر احمدیوں یا ان کے بچوں کا جنازہ کیوں نہیں پڑھتے؟ اور یہ سوال احمدیوں سے کیوں کیا جا رہا تھا۔ خود غیر احمدی مسلمانوں نے تواتر سے یہ فتاویٰ دیئے ہیں کہ احمدی بچوں کا جنازہ پڑھنا بالکل نا جائز ہے۔ سینکڑوں میں سے صرف چند مثالیں پیش کی جاتی ہے۔ ”فتاویٰ محمدیہ“ جو کہ مفتی عبید اللہ خان صاحب کے فتاویٰ پر مشتمل ہے اور مکتبہ قدوسیہ سے شائع ہوئی تھی، اس کا ایک فتویٰ ملاحظہ ہو:۔

”جن لوگوں نے قادیانی عورت کو مسلمان سمجھ کر اس کی نام نہاد نمازِ جنازہ میں شرکت کی ہے اور دعائے استغفار پڑھی ہے وہ بلا شبہ دائرہ اسلام سے خارج ہو کر شرعاً کافر ہو گئے ہیں یعنی وہ مرتد ہیں اور ان کی بیویاں ان کے حبالہ عقد سے آزاد ہو چکی ہیں ... “ (صفحہ 123)

اور احمدی بچوں کی نمازِ جنازہ کے بارے میں اس کتاب میں فتویٰ ہے

”جس طرح کسی بالغ قادیانی مرد کا جنازہ پڑھنا کفر ہے اور اسی طرح نا بالغ قادیانی کا جنازہ پڑھنا بھی کفر ہے ... “ (صفحہ 119)

”... پس جس نے دیدہ دانستہ مرزائی کے جنازہ کی نماز پڑھی ہے اس کو علانیہ توبہ کرنی چاہیئے اور مناسب ہے کہ وہ اپنا تجدیدِ نکاح کرے ... “

(فتویٰ شریعتِ لاثانی بر عقائدِ نبوت قادیانی ،براہمن سٹیم پریس ، ص19)

حیرت ہے کہ جن مسالک کی طرف سے یہ فتوے دیئے گئے ہوں ،وہ احمدیوں پر اعتراض کریں کہ احمدی ان کے بالغ یا نابالغ افراد کی نمازِ جنازہ کیوں نہیں پڑھتے؟ ہر ذی ہوش اس اعتراض کو خلافِ عقل قرار دے گا۔

یہاں ذرا رک کر ایک اور پہلو سے اس الزام کا جائزہ لیتے ہیں کہ احمدی غیر احمدیوں کا جنازہ نہیں پڑھتے۔ بعض فرقے ایسے بھی ہیں کہ جو یہ تو کہتے ہیں کہ اپنے مذہبی مخالف کا جنازہ تو پڑھ لو مگر کس طرح؟ یہ بات تو واضح ہے کہ کوئی بھی فرقہ غیر مسلم کا جنازہ نہیں پڑھتا۔ اس لئے نیچے درج کئے گئے حوالے کا اطلاق اس مسلمان کی نمازِ جنازہ پر ہی ہو سکتا ہے جو اس فرقہ سے وابستہ نہ ہو۔ چنانچہ شیعہ فقہ کی کتاب فروعِ کافی کی کتاب الجنائز میں لکھا ہے کہ علی بن ابراہیم سے روایت ہے کہ اگر حق سے انکار کرنے والے کی نمازِ جنازہ پڑھو تو یہ دعا کرو

”اگر وہ حق سے انکار کرنے والا ہے تو اس کے لئے کہہ کہ اے اللہ اس کے پیٹ کو آگ سے بھر دے اور اس کی قبر کو بھی اور اس پر سانپ اور بچھو مسلط کر دے اور یہ ابو جعفر نے بنوامیہ کی ایک بد کار عورت کے لئے کہا جس کی نمازِ جنازہ اس کے باپ نے ادا کی اور یہ بھی کہا کہ شیطان کو اس کا ساتھی بنا دے۔ محمد بن مسلم

کہتے ہیں کہ اس کے لئے کہا کہ اس کی قبر میں سانپ اور بچھو بھر دے۔ تو اس نے کہا کہ سانپ اس کو کاٹے گا اور بچھو اسے ڈسے گا۔ اور شیطان اس کے ساتھ اس کی قبر کا ساتھی ہو گا ...“

(فروع کافی۔ کتاب الجنائز۔ باب الصلوٰۃ علی الناصب، ص99)

اس کے بعد بھی یہ عبارت اسی طرز پر جاری رہتی ہے۔ اگر اپنے مخالف عقیدہ رکھنے والے مسلمان کا جنازہ پڑھ کر یہی دعا خدا سے مانگنی ہے تو اس سے بہتر ہے کہ نمازِ جنازہ پڑھنے کا تکلف نہ ہی کیا جائے۔ اس پس منظر میں احمدیوں پر یہ اعتراض کسی طور پر بھی معقول اعتراض نہیں کہلا سکتا۔

یہاں ذرا رک کر جائزہ لیتے ہیں کہ اس سپیشل کمیٹی کے سپرد یہ کام تھا کہ یہ فیصلہ کرے کہ جو ختمِ نبوت کا منکر ہے اس کا اسلام میں کیا Status ہے۔ بحث کا دوسرا دن جا رہا تھا اور سوالات اپنے موضوع کو چھو کر بھی نہیں گزر رہے تھے۔ احمدیوں کی تعداد کتنی ہے؟ احمدی غیر احمدیوں کا جنازہ کیوں نہیں پڑھتے، ان کے پیچھے نماز کیوں نہیں پڑھتے؟ ان سے شادیاں کیوں نہیں کرتے؟ جب انہیں غیر احمدی علماء کے فتاویٰ سنائے گئے جس میں یہاں تک لکھا تھا کہ دوسرے فرقہ کے لوگ نہ صرف غیر مسلم بلکہ مرتد ہیں۔ ان سے سلام بھی نہیں کیا جاسکتا۔ اگر ان سے شادی کر کے اولاد ہو تو وہ ولد الزنا ہو گی۔ تو ان کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ جب یہ راگ الاپا گیا کہ احمدی غیر احمدی بچوں کا جنازہ کیوں نہیں پڑھتے تو انہیں یاد دلایا گیا کہ انہی دنوں میں احمدیوں کو شہید کیا جا رہا ہے، ان کی قبریں اکھیڑی جا رہی ہیں، ان کی تدفین میں رکاوٹیں ڈالی جا رہی ہیں، ان کے مکانات اور دوکانیں اور فیکٹریاں نذرِ آتش کی جا رہی ہیں، آخر یہ تو بتائیں کہ ان کے خلاف آواز کس نے اُٹھائی اور آخر کیوں نہیں اُٹھائی؟ حکومت نے تو ان کے دفاع کے لیے کچھ نہیں کیا بلکہ بہت سے مقامات پر قانون نافذ

کرنے والے ادارے مفسدین کی اعانت کر رہے تھے اور احمدیوں کو ہی گرفتار کر رہے تھے۔ کیا حکومت کا فرض نہیں تھا کہ ان مظالم کو روکے یا کم از کم ان کے خلاف آواز ہی اُٹھائے۔

یہ ذکر دلچسپی کا باعث ہو گا کہ جب اٹارنی جنرل صاحب نے علماء کے یہ فتاویٰ سنے جن میں نہ صرف ایک دوسرے کو مرتد اور کافر ٹھہرایا گیا تھا بلکہ اس امر کی بھی سختی سے وضاحت کی گئی تھی کہ ان لوگوں سے سلام کرنا بھی ممنوع ہے اور اگر آدمی ان کے کفر پر شک بھی کرے تو خود کافر ہو جاتا ہے، تو معلوم ہوتا ہے کہ اٹارنی جنرل صاحب کی قوتِ استدلال رخصت ہو گئی کیونکہ ان علماء کے دفاع میں انہوں نے کہا کہ

”وہ کہتے ہیں کہ کسی ایک نے فتوے دیئے الیکشن کے زور میں۔ یا کسی ایک نے

Who take it seriously“۔

اس غیر مربوط وضاحت سے یہ لگتا ہے کہ ان کا خیال تھا کہ یہ فتوے صرف الیکشن کے دوران دیئے گئے تھے۔ حالانکہ اس قسم کے فتاویٰ کا سلسلہ اس وقت سے شروع ہو جاتا ہے جب ابھی الیکشنوں کا نام و نشان بھی نہیں تھا اور الیکشن کے دنوں میں ہر قسم کے اَنٹ شَنٹ فتاویٰ دینے کی کھلی آزادی تو نہیں ہو جاتی۔ اس لایعنی جواب کو سن کر حضور نے انہیں یاد دلایا:۔

” یہ فتاویٰ رشیدیہ الیکشن سے کہیں پہلے کے ہیں“

اس پر شاید اٹارنی جنرل صاحب کو اپنی غلطی کا احساس ہوا اور انہوں نے کہا

” نہیں میں بات کرتا ہوں، مثال کے طور پر“

اس صورت حال کے بارے میں پڑھنے والے اپنی رائے خود قائم کر سکتے ہیں۔ حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ نے فرمایا کہ مَیں ایک طویل عرصہ پرنسپل رہا ہوں اور نہ صرف غیر از جماعت طلباء کو وظائف دیئے جاتے تھے بلکہ ان طلباء کو بھی وظائف دیئے جاتے تھے جو کہ جماعتِ احمدیہ کے خلاف جلوسوں میں شامل ہوتے تھے۔ اس پر یحیٰی بختیار صاحب نے فرمایا کہ وہ تو Humanity ہے جو کہ ہندو ، یہودی اور عیسائی طلباء سے بھی دکھائی جاتی ہے۔ اس پر حضور نے فرمایا:۔

"اور وہ Humanity کہاں گئی جنھوں نے سینکڑوں مکانوں اور دوکانوں کو جلا دیا ... اور آدمیوں کو مار دیا"

یحیٰی بختیار صاحب :ان کو کوئی defend نہیں کرتا

حضور: کس نے آواز اُٹھائی

یحیٰی بختیار صاحب: نہیں جی ، کوئی نہیں

حضور: ان کے خلاف آواز کس نے اُ ٹھائی ؟

یحیٰی بختیار صاحب:Nobody is defending them

حضور:But nobody condemned them

یحیٰی بختیارصاحب: Nobody condemned the Rabwah incident

حضور: What was Rabwah incident?

یحیٰی بختیار صاحب :All right so we don't go to that

حضور : نہیں تیرہ بچوں کو ضرباتِ خفیفہ۔ کیا اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ سینکڑوں مکانوں اور دوکانوں کو جلا دیا۔

یحیٰی بختیار: نہیں جی بالکل نہیں I agree with you they should be punished اس کا سوال نہیں ہے۔

اس مرحلہ پر ہونے والی گفتگو درج کردی گئی ہے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اٹارنی جنرل صاحب میں حقائق کا سامنا کرنے کا حوصلہ نہیں تھا۔ وہ یہ فرما رہے تھے کہ ربوہ کے سٹیشن کے واقعہ کی کسی نے مذمت نہیں کی تھی۔ بالکل خلافِ واقعہ بیان تھا۔ جہاں تک جماعتِ احمدیہ کا تعلق ہے تو اس واقعہ سے اگلے خطبہ جمعہ میں ہی حضور نے اس کی مذمت فرمائی تھی اور ان نوجوانوں کی حرکت کو خلافِ تعلیماتِ سلسلہ قرار دیا تھا اور پورے ملک کے سیاستدانوں اور مولویوں نے تو اس واقعہ کو مبالغہ کی انتہا کرتے ہوئے بڑھا چڑھا کر بیان کیا تھا اور جماعتِ احمدیہ کے خلاف ہر قسم کی زہر فشانی کی تھی۔ اخبارات ان بیانات سے بھرے پڑے تھے اور ان حقائق کے باوجود اٹارنی جنرل صاحب فرما رہے تھے کہ ربوہ میں ہونے والے واقعہ کو کسی نے Condemn ہی نہیں کیا اور جیسا کہ حضور نے فرمایا کہ کیا تیرہ لڑکوں کو لگنے والی خفیف ضربوں کا یہ نتیجہ نکلنا چاہئیے تھا کہ کئی احمدیوں کو شہید کر دیا جائے، سینکڑوں مکانوں اور دوکانوں کو لوٹ لیا جائے یا جلا دیا جائے۔

پہلے یہ طے ہو چکا تھا کہ جو بھی سوال کرنے ہوں وہ یا تو پہلے اٹارنی جنرل یا سوالات کیلئے بنائی گئی کمیٹی کے سپرد کئے جائیں گے یا پھر دورانِ کارروائی کاغذ پر لکھ کر اٹارنی جنرل صاحب کے حوالہ کئے جائیں گے تا کہ وہ یہ سوال کریں لیکن اس مرحلہ پر جماعت کے مخالف مذہبی جماعتوں کے لیے یہ صورتِ حال برداشت سے باہر ہو رہی تھی کیونکہ کارروائی کی نہج ان کی امیدوں کے برعکس جا رہی تھی۔ وہ یہ سوال اُٹھا رہے تھے کہ احمدی غیر احمدیوں کی نمازِ جنازہ کیوں نہیں پڑھتے یا ان سے شادیاں کیوں نہیں کرتے لیکن اب ایسے حوالے سامنے پیش کئے جا رہے تھے جن سے ہوتا واضح طور پر یہ معلوم ہو تا تھا کہ اعتراض کرنے والے ممبرانِ اسمبلی

جن مختلف فرقوں سے تعلق رکھتے تھے ان کے علماء نے ایک دوسرے کو کافر مرتد اور بے دین قرار دیا ہے۔ اور ان کے ساتھ نکاح کرنے یا ان کے پیچھے نماز پڑھنے یا ان کا جنازہ پڑھنے سے سختی سے منع کیا ہے اور اس سیشن کے آخر میں جب آئینہ دیکھنا پڑا کہ پورے ملک میں اس وقت احمدیوں کو شہید کیا جا رہا تھا، ان پر ہر قسم کے مظالم کئے جارہے تھے تو یہ صورتِ حال جماعتِ احمدیہ کے مخالفین کے لئے نا قابلِ برداشت ہو گئی۔ ان کو نظر آرہا تھا کہ وہ دلائل سے کامیابی نہیں حاصل کر سکتے۔ وہ کسی صورت برداشت نہیں کر سکتے تھے کہ احمدیوں پر ہونے والے مظالم اس طرح سامنے آئیں۔ آئینہ دیکھنے کی ہمت نہیں تھی۔

سب سے پہلے چوہدری جہانگیر علی صاحب کھڑے ہوئے اور کہا:۔

Mr. Chairman Sir, may I draw your attention? No discussion should take place between question and their answers.

اس مبہم جملے سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ صاحب اب گھبراہٹ محسوس کر رہے تھے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ یہ سلسلہ مزید چلے۔ غالباً اٹارنی جنرل صاحب بھی منتظر تھے کہ کوئی مداخلت کر کے سوال و جواب کے سلسلے کو روکے۔ انہوں نے فوراً کہا:۔

Shall we adjourn?

یعنی کیا ہم کار روائی کو روک دیں؟

سپیکر صاحب نے فرمایا

Yes. we adjourn to meet again at 12

یعنی ہم وقفہ کر دیتے ہیں اور بارہ بجے کارروائی دوبارہ شروع ہو گی۔ پھر جماعت کا وفد رخصت ہوا۔ اس کے بعد کئی ممبرانِ اسمبلی کے شکووں کا سلسلہ شروع ہوا۔

جماعتِ اسلامی کے پروفیسر غفور صاحب کھڑے ہوئے اور یہ اعتراض کیا کہ یہ (یعنی جماعت کا وفد) سوالات کو Avoid کرتے ہیں اور Side Track کرتے ہیں۔ جب کوئی سوال پوچھا جاتا ہے تو بہت سے پوائنٹ(Point) بیان کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ یہاں یہ بات قابلِ غور ہے کہ جب کوئی سوال اُٹھتا تھا تو جماعتِ احمدیہ کی طرف سے حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ اپنا موقف بیان فرماتے تھے۔ کسی ایک مقام پر بھی غیر متعلقہ بات نہیں پیش کی گئی تھی۔ اگر یہ سوال اُٹھایا جائے اور بار بار اُٹھایا جائے کہ احمدی غیر احمدیوں کے پیچھے نماز کیوں نہیں پڑھتے؟ ان کی نمازِ جنازہ کیوں نہیں پڑھتے احمدی لڑکیاں غیر احمدی لڑکوں سے شادی کیوں نہیں کرتیں؟ تو اگر اس کے جواب میں غیر احمدی علماء کے فتاویٰ جو ان فرقوں سے تعلق رکھتے تھے جن سے تعلق رکھنے والے ممبران یہ اعتراضات اُٹھا رہے تھے، پیش کیے جائیں جنہوں نے دوسرے فرقوں کو مسلمان سمجھنے پر بھی کفر کا فتویٰ لگایا ہے ان کے ساتھ شادی کرنا تو درکنار ان سے سلام کرنے کو بھی ممنوع قرار دیا ہے۔ ان کی نمازِ جنازہ میں شرکت کو قطعاً حرام قرار دیا ہے۔ دوسرے فرقہ سے شادی کو زنا قرار دیا ہے، کوئی بھی ذی ہوش اس بیان کو غیر متعلقہ نہیں قرار دے سکتا۔

سوال یہ اُٹھتا ہے کہ اس پس منظر میں احمدیوں پر اعتراض ایک بے معنی بات نظر آتی ہے۔ موضوع کے مطابق حوالہ جات پیش کئے جارہے تھے۔ ان کو کسی طرح بھی Avoid کرنا اور Side Track کرنا نہیں کہا جا سکتا۔ یہ تلملاہٹ اس لئے ظاہر ہو رہی تھی کہ ان علماء کو اور دوسرے ممبران کو آئینہ دیکھنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ ہاں یہ سوال ضرور اُٹھتا ہے کہ اصل موضوع سے گریز کیا جا رہا تھا جب کہ ممبران محضر نامہ پڑھ چکے تھے تو یہ ہمت کیوں نہیں ہو رہی تھی کہ زیر بحث موضوع کے متعلق سوالات کیے جائیں۔ اٹارنی جنرل

صاحب اور ممبرانِ اسمبلی خود اصل موضوع کو Avoid اور Side track کر رہے تھے۔ اس کے بعد پروفیسر غفور صاحب نے اپنی بات کے حق میں کوئی دلیل پیش کرنے کی بجائے یہ دعویٰ کیا کہ انہوں نے ڈنمارک کا جو واقعہ بیان کیا ہے وہ بالکل غلط ہے۔ کوئی ایسا واقعہ نہیں ہوا اور عجلت میں پروفیسر غفور صاحب یہاں تک کہہ گئے۔

”ڈنمارک کا واقعہ مجھے معلوم ہے کہ بالکل غلط ہے۔“

حقیقت یہ ہے کہ حضور نے یہ بیان فرمایا تھا کہ ڈنمارک میں ایک مسلمان کا اچانک انتقال ہو گیا تھا۔ اس موقع پر سوائے احمدیوں کے کوئی اور جنازہ پڑھنے والا موجود نہیں تھا لیکن احمدیوں نے غلطی کی اور اس صورتِ حال میں یہ جنازہ نہیں پڑھا۔ جب حضور کے علم میں یہ واقعہ آیا تو اس پر حضور نے اظہارِ ناراضگی فرمایا کہ اس خاص صورت میں یہ جنازہ پڑھنا چاہئیے تھا۔ سوچنے والی بات یہ ہے کہ پروفیسر غفور صاحب کو کیسے یہ علم ہو سکتا ہے کہ حضور نے کب، کس احمدی سے اظہارِ ناراضگی فرمایا کہ نہیں۔ عقل ان کے اس دعوے کو قبول نہیں کر سکتی۔

پروفیسر غفور صاحب اپنی بات کے حق میں وہ یہ دلیل لائے کہ ڈنمارک میں احمدیوں کی نسبت دوسرے مسلمانوں کی تعداد زیادہ ہے بلکہ وہ تو جوش میں یہ کہہ گئے کہ ڈنمارک میں دوسرے مسلمان بے حساب تعداد میں ہیں۔ اب یہ سوچنے والی بات ہے کہ نہ یہ بیان کیا گیا تھا اور نہ ہی انہوں نے یہ سوال اُٹھایا تھا کہ یہ واقعہ کب ہوا تھا، کہاں پر ہوا تھا یا اس کی دیگر تفصیلات کیا تھیں۔ یہ سب کچھ جانے بغیر وہ کس طرح کہہ سکتے تھے کہ یہ واقعہ ہوا ہی نہیں تھا۔ کیا ڈنمارک میں ہونے والا ہر واقعہ ان کے علم میں آتا تھا اور یہ بھی کوئی دلیل نہیں کہ ڈنمارک میں غیر احمدی مسلمانوں کی تعداد احمدیوں سے زیادہ ہے۔ ڈنمارک میں اب بھی احمدیوں اور غیر

احمدی مسلمانوں دونوں کی تعداد بہت کم ہے اور کئی مقامات پر ان میں سے کوئی بھی نہیں رہتا اور ایسا واقعہ ہونا کسی طور پر بھی نا ممکن نہیں کہلا سکتا۔ اس پر اٹارنی جنرل نے پروفیسر غفور صاحب کی اس بات سے اتفاق کیا کہ ان کے سوالات کو Avoid کیا جا رہا ہے لیکن اس کے ساتھ ان کا یہ بھی کہنا تھا کہ اس مرحلہ پر اس وفد کو کچھ کہنے سے روکا گیا تو انہیں یہ عذر مل جائے گا کہ اسمبلی نے ان کو صحیح طرح سنا ہی نہیں۔ اٹارنی جنرل صاحب نے بھی فوراً کہا

Again and again he avoided the reply because he has got no reply .

پڑھنے والے خود یہ بات محسوس کر سکتے ہیں کہ خود اٹارنی جنرل صاحب اور سپیشل کمیٹی کے اراکین سپیشل کمیٹی کے سامنے پیش کئے گئے اصل موضوع پر آنے سے کترا رہے تھے۔ اور غیر متعلقہ سوالات کر کے وقت گزار رہے تھے۔ جو سوالات پوچھے گئے تھے حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ نے ان کے بارے میں جماعت کا موقف بیان فرمایا تھا لیکن اگر اس قسم کے ناقابلِ فہم سوال جماعت کے وفد سے کئے جائیں کہ جب دوسرے فرقوں کے علماء نے ایک دوسرے کو کافر اور مرتد قرار دیا تو اس کا کیا مطلب تھا؟ تو ظاہر ہے کہ جماعت کا وفد اس کا جواب کیسے دے سکتا ہے۔ جن مسالک کی طرف سے یہ فتاویٰ جاری ہوئے تھے، ان کے جید علماء سامنے بیٹھے تھے، ان سے دریافت کرنا چاہیئے تھا۔

ایک اور ممبر مولوی نعمت اللہ صاحب نے یہ سوال اُٹھایا کہ اس بات کا صحیح جواب نہیں دیا گیا کہ چوہدری ظفراللہ خان نے قائدِ اعظم کا جنازہ کیوں نہیں پڑھا۔ یہ بات بھی قابلِ حیرت ہے کہ آج مولویوں کے گروہ کی طرف سے یہ سوال اُٹھایا جارہا تھا کہ کتنا بڑا ظلم ہو گیا کہ حضرت چوہدری ظفراللہ خان صاحب نے قائدِ اعظم کا جنازہ کیوں نہیں پڑھا۔ انہی مولویوں نے تو قائدِ اعظم کو کافرِ اعظم کا نام دیا تھا اور جب عدالتی

تحقیقات میں ان سے اس بابت سوال کیا گیا تو انہوں نے کہا کہ وہ آج تک اپنے خیالات پر قائم ہیں(56)۔ اس اسمبلی میں جماعتِ اسلامی سے تعلق رکھنے والے چند ممبران بھی موجود تھے کیا وہ بھول گئے تھے کہ ان کے راہبر اور ان کی پارٹی کے بانی نے کس دھڑلے سے لکھا تھا:۔

"مگر افسوس کہ لیگ کے قائد اعظم سے لے کر چھوٹے مقتدیوں تک ایک بھی ایسا نہیں جو اسلامی ذہنیت اور اسلامی طرزِ فکر رکھتا ہواور معاملات کو اسلامی نقطہ نظر سے دیکھتا ہو۔ یہ لوگ مسلمان کے معنی و مفہوم اور اس کی مخصوص حیثیت کو بالکل نہیں جانتے۔" (57)

گویا قائدِ اعظم کو تو یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ مسلمان لفظ کا مفہوم ہے کیا اور اب ان کو یہ فکر بہت تھی کہ قائدِ اعظم کا جنازہ کیوں نہیں پڑھا گیا۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ اس وقت جماعتِ احمدیہ پر اعتراض کرنے میں پروفیسر غفور صاحب پیش پیش تھے اور انہوں نے خود بیان دیا تھا کہ انہوں نے اور ان کی جماعت کے امیر میاں طفیل محمد صاحب نے قائدِ اعظم کا جنازہ نہیں پڑھا تھا اور اس کی وجہ یہ بیان کی تھی کہ یہ ضروری نہیں تھا۔(روزنامہ مساوات 27/فروری1978ء) اور آج یہ اعتراض اُٹھایا جا رہا تھا کہ حضرت چوہدری ظفراللہ خان صاحب نے قائدِ اعظم کا جنازہ کیوں نہیں پڑھا تھا؟

اور یہ امر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ احمدیوں پر یہ اعتراض ہے کہ انہوں نے شبیر عثمانی صاحب کی اقتداء میں قائدِ اعظم کی نمازِ جنازہ کیوں نہیں ادا کی؟ یہ امر کس طرح فراموش کیا جا سکتا ہے کہ شبیر عثمانی صاحب نے نہ صرف یہ اعلان کیا تھا کہ احمدی مرتد ہیں بلکہ اس وجہ سے احمدیوں کے واجب القتل ہونے کا تحریر ی فتویٰ بھی دیا تھا اور اس امر کا ذکر 1953ء میں فسادات پر ہونے والی عدالتی تحقیقات کی رپورٹ میں

بھی ہے لیکن شبیر عثمانی صاحب پر کوئی اعتراض نہیں اگر اعتراض ہے تو احمدیوں پر ہے جنہوں نے ان کی اقتدا میں نمازِ جنازہ نہیں پڑھی۔

اس کے بعد اٹارنی جنرل صاحب نے اس موضوع پر گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا کہ چوہدری ظفراللہ خان صاحب کے قائدِ اعظم کے جنازہ میں شامل نہ ہونے کے بارے میں الفضل 28/اکتوبر 1952ء کی اشاعت میں یہ explanation شائع ہوئی تھی۔

”ابو طالب بھی قائدِ اعظم کی طرح مسلمانوں کے بہت بڑے محسن تھے مگر نہ مسلمانوں نے ان کا جنازہ پڑھا نہ رسولِ خدا ﷺ نے“

حقیقت یہ ہے کہ یہ فقرہ الفضل کی اس اشاعت کے صفحہ 4 پر موجود ہے اور اٹارنی جنرل صاحب بالکل غلط کہہ رہے تھے کہ یہاں پر اس بات کی explanation دی گئی ہے کہ چوہدری ظفراللہ خان صاحب نے قائدِ اعظم کا جنازہ کیوں نہیں پڑھا؟ یہاں اس موضوع کا کوئی ذکر نہیں۔ مذکورہ تحریر میں یہ ذکر ہو رہا ہے کہ پاکستان میں کچھ لوگ قائدِ اعظم کی شان میں گستاخی کرتے ہیں یہاں تک کہ آپ کے متعلق کافرِ اعظم کے الفاظ استعمال کرتے ہیں اور اگر انہیں روکا جائے تو کہتے ہیں کہ ہم نے قائدِ اعظم کا جنازہ پڑھ دیا تھا لہٰذا ہماری وفاداری رجسٹرڈ ہو چکی ہے۔ پھر یہ لکھا ہے کہ کیا جنازہ پڑھ لینا اور بعد میں گند اچھالنا اور برا بھلا کہتے رہنا کیا یہ محبت کی علامت ؟ اس کے بعد وہ جملہ درج ہے جس کا حوالہ اٹارنی جنرل صاحب پڑھ رہے۔ ایک مرتبہ پھر اٹارنی جنرل صاحب حوالے کے بارے میں غلط بیانی کر رہے تھے۔

معلوم ہوتا ہے کہ حضور نے علماء کے جو چند فتوے پڑھ کر سنائے تھے وہ اسمبلی میں موجود مولوی حضرات کے لئے خاص طور پر پریشانی کا باعث بنے ہوئے تھے۔ ان فتاویٰ سے یہ ثابت ہوتا تھا کہ دیوبندی،

بریلوی، اہلحدیث، شیعہ وغیرہ کثیر تعداد میں ایک دوسرے پر کفر کے فتاویٰ لگاتے رہے ہیں اور اس بات کو حرام قرار دیتے رہے ہیں کہ ایک دوسرے کے پیچھے نماز پڑھی جائے یا دوسرے مسلک سے وابستہ افراد سے شادی کی جائے۔ حتیٰ کہ ایک دوسرے سے میل جول کو بھی حرام قرار دیا گیا تھا۔ مفتی محمود صاحب نے ان الفاظ میں اپنی پریشانی کا اظہار کیا "... اس کے بعد انہوں نے مختلف عبارتیں پڑھیں اور مسلمانوں کے فرقوں کے درمیان میں جو تکفیر کا مسئلہ تھا وہ ساری عبارتیں پڑھتا گیا۔ وہ بالکل سوال سے متعلق بات نہیں تھی تو وہ جو سوال سے بالکل غیر متعلق بات کہے روکنا چاہیے ..." ایک اور مولانا غلام غوث ہزاروی صاحب نے کہا

"علماءِ دیوبند پر جھوٹے الزامات لگے ..."

حقیقت تو یہ ہے کہ اس وقت یہ بحث ہو رہی تھی کہ اُمّت مسلمہ کی تاریخ میں کفر کا لفظ یا دائرہ اسلام سے خارج ہونے کے الفاظ کن کن معانی میں استعمال ہوئے ہیں۔ اور اس کی مثالیں سپیشل کمیٹی کے سامنے رکھی گئی تھیں۔ یہ غیر متعلقہ کس طرح ہو گئیں۔ اور غلام غوث ہزاروی صاحب کیا کہہ رہے تھے؟ یہ کفر کے فتاویٰ علماء نے نہیں دیئے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ فتاویٰ محضر نامہ میں بھی شامل تھے اور ان کے ساتھ مکمل حوالے بھی دے دیئے گئے تھے۔ اگر کوئی حوالہ غلط تھا تو ممبران جو جج بن کر بیٹھے تھے یہ سوال اُٹھا سکتے تھے لیکن کس طرح اُٹھاتے اس طرح کے فتوے دینا تو علماء کا معمول تھا۔ آج تک یہ سارے حضرات مل کر یہ ثابت نہیں کر سکے کہ اس وقت جو کفر کے فتاویٰ پڑھے گئے تھے ان میں سے کوئی ایک بھی غلط تھا اور نہ ہی محضر نامہ میں درج کفر کے فتاویٰ کے بارے میں کبھی کوئی ثبوت دیا گیا کہ یہ صحیح نہیں تھے، اگر آج بھی کسی کو شک ہے تو ان کے حوالے چیک کر کے حقیقت معلوم کر سکتا ہے۔

جب کچھ ممبران کی طرف سے بار بار اس بات کا اظہار کیا گیا کہ فلاں فلاں سوال کا جواب نہیں دیا گیا۔ تو سپیکر کو ان باتوں کی تصحیح کرنی پڑی۔ چنانچہ جب مولوی نعمت اللہ صاحب نے یہ اعتراض اُٹھایا کہ قائد اعظم کے جنازے کے بارے میں سوال کا جواب نہیں دیا گیا تو سپیکر نے انہیں یاد کرایا کہ اس کا جواب آگیا ہے۔ اسی طرح کا سوال جب مولوی غلام غوث ہزاروی صاحب کی طرف سے اُٹھایا گیا تو ان کو بھی سپیکر صاحب نے یاد کرایا کہ اس سوال کا جواب آچکا ہے۔

اس موقع پر ایک ممبر عبد الحمید جتوئی صاحب نے جو کہا ہم اُسے من و عن درج کر دیتے ہیں۔

"جنابِ چیئر مین ! ہمیں کل سے پتہ لگا ہے کہ ہم اس ہاؤس میں جج بنے ہیں اور ہم فیصلہ کریں گے۔ میں سمجھتا ہوں ہماری پوزیشن وہی ہے جیسے کہ کسی نان ایڈووکیٹ کو ہائی کورٹ کا جج بنا دیا جائے اور وہ فتویٰ دے اس جج کا جو فتویٰ ہے جج کی حیثیت سے ... میری تو عرض یہ ہے کہ یا تو ہم اسلام کے ماہر ہوں، اسلامیات پڑھے ہوں یا پروفیسر ہوں اسلامیات کے تو پھر ہم سے فتویٰ کی امید رکھی جا سکتی ہے۔ لیکن ایسے حالات میں ہمارے لئے as a lay man بڑا مشکل ہے کہ ہم جج بنیں "

سپیکر: آپ نے فتویٰ نہیں دینا آپ نے فیصلہ کرنا ہے۔

عبدالحمید جتوئی صاحب: فیصلہ کرنا ہے؟

سپیکر: فیصلہ کرنا ہے۔

عبد الحمید جتوئی صاحب : فیصلہ کرنے کا اس آدمی کو کیسے حق آپ دیتے ہیں جس کو فیصلہ کے قانون کا پتہ نہ ہو؟ انتہائی زیادتی ہے ہمارے ساتھ۔

سپیکر: پھر بعد میں فیصلہ کریں گے۔

اس کے بعد 12 بجے تک کے لئے اجلاس ملتوی کر دیا گیا۔

اس اظہارِ رائے سے اندازہ ہوتا تھا کہ جس طرز پر کارروائی جاری تھی اس پر اندر سے خود کئی ممبران کا ضمیر مطمئن نہیں تھا۔ وہ جانتے تھے کہ اسمبلی اپنی حدود سے تجاوز کر رہی ہے۔ سپیکر یہ کہہ کر بات کو ٹال گئے کہ اس مسئلہ پر پھر بات کریں گے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس مسئلہ پر پھر کبھی بات نہیں کی گئی۔

12 بجے کارروائی دوبارہ شروع ہوئی۔ قبل ازیں غیر احمدی علماء کے جو فتاویٰ پڑھے گئے تھے ان کا کئی ممبران کے دل پر کیا اثر تھا اس کا اندازہ ایک اور ممبر چوہدری غلام رسول تارڑ صاحب کے اس تبصرہ سے ہوتا ہے جو انہوں نے سپیکر اسمبلی کو مخاطب کر کے کیا۔ انہوں نے کہا کہ جو فتوے یہاں مرزا صاحب نے پڑھے ہیں ، ان کا اچھا اثر نہیں ہو گا۔ اگر کسی ممبر یا مولانا صاحب کے پاس ان کی تردید ہو تو وہ دے دیں۔ عبدالعزیز بھٹی صاحب نے کہا کہ مفتی محمود صاحب نے کہا ہے کہ تردید ہوئی ہے اور ان کی Citations بھی دی ہیں۔ جب اٹارنی جنرل صاحب مناسب سمجھیں گے تو ان کے بارے میں سوال پوچھ لیں گے لیکن اس کے بعد اٹارنی جنرل صاحب نے ان کی تردید کا سوال نہیں اُٹھایا۔ اس سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ ان فتاویٰ کا کوئی جواب ان کے پاس نہیں تھا اور نہ ہی ان کی کبھی کوئی تردید ہوئی تھی۔ اگر مذکورہ فتاویٰ دینے والوں نے کبھی ان کی کوئی تردید کی تھی تو چاہئیے کہ اب بھی ان کو پیش کیا جائے تاکہ ان مولوی حضرات پر لگا ہوا یہ الزام دور ہو۔

یہ فتوے تو علماء کئی صدیوں سے دوسرے فرقوں کے خلاف دیتے آرہے تھے۔ اگر ان کو تسلیم کر کے پاکستان کے آئین میں ترمیم کی جاتی تو پاکستان میں مسلمان دیکھنے کو نہ ملتا۔ یہ کوئی ایک مثال تو نہیں تھی کہ

تردید ہو جاتی۔ ایسے فتوے تو سینکڑوں کی تعداد میں موجود تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ آخر تک اٹارنی جنرل صاحب نے اس تردید کو منظرِ عام پر لانے کی ضرورت محسوس نہ کی جو مفتی محمود صاحب کے سینے میں ہی دفن رہی۔

اس سیشن کے آغاز میں اٹارنی جنرل صاحب نے ایک بارپھر یہ سوال اُٹھایا کہ چوہدری ظفراللہ خان صاحب نے قائدِ اعظم کا جنازہ کیوں نہیں پڑھا تھا؟ اس کے جواب میں حضرت خلیفة المسیح الثالثؒ نے حضرت چوہدری ظفراللہ خان صاحب کا ایک بیان پڑھ کر سنایا جو کہ انہوں نے 1953ء کی تحقیقاتی عدالت میں دیا تھا اور وہ یہ تھا کہ ”قائدِ اعظم کا جنازہ شبیر احمد عثمانی صاحب نے پڑھایا تھا اور وہ چوہدری ظفراللہ خان صاحب کو احمدی ہونے کی وجہ سے مرتد سمجھتے تھے۔ اس وجہ سے چوہدری ظفر اللہ خان صاحب نے ان کی اقتداء میں نمازِ جنازہ نہیں پڑھی۔“ اس کے بعد پھر کفر و اسلام ، دائرہ اسلام سے خارج کون ہے ؟ اور ملتِ اسلامیہ کا فرد کون ہے؟ جیسے موضوعات پر پرانی بحث کا اعادہ ہوا۔

شام چھ بجے تک جو کارروائی ہوئی اس کے متعلق جیسا کہ بعد میں سپیکر صاحب نے کہا کہ جنرل اگزامینیشن ختم ہو گیا ہے اور حوالہ جات دینے کا سلسلہ شروع ہو گیا ہے۔ یہ ایک نہایت اہم مرحلہ کا آغاز ہو رہا تھا لیکن اس مرحلہ پر پہنچ کر اٹارنی جنرل صاحب نے جو سوالات کیے یا یوں کہنا چاہئے کہ ممبران میں سے جو جماعت کے مخالف مولوی حضرات تھے انہوں نے جو سوالات انہیں لکھ کر دیئے تا کہ وہ یہ سوالات حضرت خلیفة المسیح الثالثؒ کے سامنے رکھیں، ان کے حوالہ جات میں عجیب افراتفری کا عالم تھا۔ جماعتِ احمدیہ کے وفد کو تو یہ علم نہیں تھا کہ کیا سوالات کیے جائیں گے۔ دوسرا فریق سوالات کر رہا تھا۔ یہ ایک مسلّمہ اصول ہے کہ اگر سوال کرنے والا کسی کتاب کا حوالہ پیش کرے تو یہ اس کا فرض ہے کہ وہ کتاب کا صحیح نام ، مصنف کا نام صفحہ نمبر اور مطبع خانہ کا نام سنِ اشاعت وغیرہ بتائے تا کہ جواب دینے والا اصل حوالہ دیکھ کر جواب دے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اٹارنی جنرل صاحب اور ان کی اعانت کرنے والے مولوی حضرات نے اس تاریخی کارروائی

کے لیے بنیادی تیاری کا تکلّف بھی نہیں کیا تھا۔ بعض مرتبہ تو متعلقہ بحث کے لیے ان کے پاس بنیادی معلومات بھی نہیں مہیا ہوتی تھیں۔ پہلے تو جب حضور نے آیت ِ کریمہ کا یہ ٹکڑا پڑھا۔ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ(البقرۃ:286) تو اٹارنی جنرل صاحب کو یہ مغالطہ ہو گیا کہ یہ صرف شرعی نبیوں کے بارے میں ہے۔ حالانکہ اس آیت میں کہیں پر صرف شرعی نبیوں کا ذکر نہیں ہے بلکہ سورۃ بقرۃ میں اس مضمون کی جو دوسری آیت یعنی آیت نمبر 137 ہے اس میں اس مضمون کے بیان سے قبل حضرت اسحٰقؑ، حضرت اسماعیلؑ اور حضرت یعقوبؑ جیسے غیر شرعی نبیوں کا ذکر بھی ہے۔ بہر حال پھر بحث شروع ہوئی کہ کون ملت ِ اسلامیہ میں رہتا ہے اور کون اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔

اس کے بعد اٹارنی جنرل صاحب نے کسی ممبر کی طرف سے کیا گیا سوال اُٹھایا کہ ”مرزا غلام احمد صاحب نے عبد الحکیم کو جو پہلے مرزا غلام احمد کا مرید تھا۔ پھر اس سے شدید اختلاف کیا۔ یا اس کی حیثیت نبوی ماننے سے انکار کیا تو مرزا غلام احمد نے اسے مرتد قرار دیا؟ (حقیقۃ الوحی صفحہ 163)۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سوال کرنے والے نے سطحی معلومات بھی حاصل کیے بغیر حوالہ دے کر سوال کردیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ ڈاکٹر عبد الحکیم نے اس عقیدہ کا اظہار کیا تھا کہ نجات کے لیے آنحضرت ﷺ پر ایمان لانا ضروری نہیں جب کہ جماعت ِ احمدیہ کا بنیادی عقیدہ یہ ہے کہ حضرت محمد مصطفےٰ ﷺ پر ایمان لائے بغیر نہ تو نجات حاصل ہو سکتی ہے اور نہ کوئی روحانی مدارج حاصل ہو سکتے ہیں۔ چونکہ اس کا یہ عقیدہ جماعت احمدیہ کے بنیادی عقیدہ سے ہی مختلف تھا اس لیے حضرت مسیح موعودؑ نے اس کا اخراج فرمایا تھااور اس معاملہ کا حضرت مسیح موعود علیہ السلام کو نبی ماننے یا نہ ماننے سے کوئی تعلق ہی نہیں تھا اور حقیقۃ الوحی کے جس مقام کا حوالہ دیا جا رہا تھا وہاں پر عبد الحکیم کے اخراج کا ذکر نہیں تھا ایک بالکل اور مضمون بیان ہو رہا تھا۔ البتہ عبدالحکیم کو لکھے گئے ایک خط کا ذکر تھا۔

اسی کتاب میں حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے عبد الحکیم کے ارتداد کی جو وجہ تحریر فرمائی تھی وہ یہ تھی:

”وہ امر لکھنے کے لائق ہے جس کی وجہ سے عبد الحکیم خان ہماری جماعت سے علیحدہ ہوا ہے اور وہ یہ ہے کہ اس کا یہ عقیدہ ہے کہ نجاتِ اخروی حاصل کرنے کے لئے آنحضرت ﷺ پر ایمان لانے کی ضرورت نہیں بلکہ ہر ایک جو خدا کو واحد لا شریک جانتا ہے (گو آنحضرت ﷺ کا مکذب ہے) وہ نجات پائے گا۔“

(حقیقۃ الوحی۔ روحانی خزائن جلد22 ص112)

معلوم ہوتا ہے کہ اس مرحلہ تک اٹارنی جنرل صاحب کا ذہن اس کشمکش میں تھا کہ مولویوں کے ایک دوسرے پر جو کفر کے فتاویٰ جو پڑھے گئے ہیں ، ان کے اثر کو زائل کرنے کی کوئی صورت نکالی جائے۔ چنانچہ انہوں نے اس کے لئے ایک نہایت عجیب راستہ ڈھونڈا۔ پہلے انہوں نے کہا کہ کیا وجہ ہے کہ جیسا کہ آپ کہتے ہیں ان علماء نے پہلے ایک دوسرے کے خلاف کفر کے فتوے دیئے اور پھر جنوری 53ء میں اس کے باوجود انہوں نے متفقہ طور پر احمدیوں کو غیر مسلم قرار دیا۔ یہ منظر کشی کرنے کے بعد یحیٰی بختیار صاحب نے حضور سے دریافت فرمایا

”... وہ کیوں اکٹھے ہوئے؟ ...“

یہ حصہ پڑھتے ہوئے سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ یہ سوال جماعت احمدیہ کے وفد سے کیوں کر رہے تھے۔ جماعتِ احمدیہ کا وفد اس بات کے لئے جوابدہ نہیں تھا کہ کیوں ان کے مخالف مولوی حضرات کبھی ایک دوسرے پر کفر اور ارتداد کے فتوے لگاتے ہیں اور پھر مل کر احمدیوں کے خلاف فتوے دینے لگ جاتے

ہیں۔ اس عجیب سوال کا جواب جماعتِ احمدیہ کا وفد کیا دے سکتا تھا ؟یہ سوال تو ان مولوی حضرات سے ہونا چاہیئے تھا جو کہ سامنے بیٹھے تھے۔ اس پر حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ نے فرمایا:۔

”یہ سوال جو مجھ سے کر رہے ہیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ میں کوئی وجہ سوچوں اپنے دماغ سے؟“اس پر اٹارنی جنرل صاحب نے ایک بار پھر یہ عجیب سوال ان الفاظ میں دہرایا۔

”آپس میں تو انہوں نے ایک دوسرے کو کافر کہہ دیا مگر اکٹھے ہو کے صرف آپ کو انہوں نے غیر مسلم قرار دیا۔ “

اس پر حضور نے فرمایا” اس کی وجہ موجود ہے۔ میں حوالہ نکالتا ہوں۔ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم صاحب نے، یہ حوالہ ان کا ہے۔ انہوں نے لکھا ہے۔

”پاکستان کی ایک یونیورسٹی کے وائس چانسلر نے مجھ سے حال ہی میں بیان کیا کہ ایک ملاءِ اعظم اور عالمِ مقتدر سے جوکچھ عرصہ ہو ابہت تذبذب اور سوچ بچار کے بعد ہجرت کر کے پاکستان آگئے ہیں میں نے ایک اسلامی فرقے کے متعلق دریافت کیا۔ انہوں نے فتویٰ دیا کہ ان میں جو غالی ہیں وہ واجب القتل ہیں اور جو غالی نہیں وہ واجب التعزیر ہیں۔ ایک اور فرقے کے متعلق پوچھا جس میں کروڑ پتی تاجر بہت ہیں۔ فرمایا وہ سب واجب القتل ہیں۔ یہی عالم ان تیس بتیس علماء میں پیش پیش اور کرتا دھرتا تھے جنہوں نے اپنے اسلامی مجوزہ دستور میں یہ لازمی قرار دیا کہ ہر اسلامی فرقہ کو تسلیم کر لیا جائے سوائے ایک کے جس کو اسلام سے خارج سمجھا جائے۔ ہیں تو وہ بھی واجب القتل مگر اس وقت علی الاعلان کہنے کی بات نہیں۔ موقع آئے گا تو دیکھا جائے گا۔ انہیں میں سے ایک دوسرے سربراہ عالم دین نے فرمایا کہ ابھی تو ہم نے جہاد فی سبیل اللہ ایک فرقہ کے خلاف شروع کیا ہے۔ اس میں کامیابی کے بعد انشاء اللہ دوسروں کی خبر لی جائے گی۔ “

(اقبال اور ملّا ، مصنفہ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم ، ص 19، ناشر بزم اقبال لاہور)

واضح رہے کہ مصنف کوئی احمدی نہیں تھا بلکہ کتاب کا سرسری مطالعہ ہی یہ واضح کر دیتا ہے کہ مصنف جماعتِ احمدیہ کے عقائد سے شدید اختلاف رکھتا تھا لیکن ملا کے عزائم کوئی ایسے ڈھکے چھپے نہیں تھے کہ ملک کے پڑھے لکھے لوگوں کو اس کی خبر ہی نہ ہو۔ جس طرح اب وطنِ عزیز میں مسلمانوں کو واجب القتل قرار دے کر خون کی ہولی کھیلی جا رہی ہے اور جس طرح تنگ نظر طبقہ ہر ذریعہ استعمال کر کے ملک کے کسی نہ کسی حصہ پر اپنا تسلط جمانا چاہ رہا ہے اس سے یہ صاف ثابت ہو جاتا ہے کہ یہ خیالات محض وہم نہیں تھے۔

اس کے بعد اٹارنی جنرل صاحب نے کہا ”مرزا غلام احمد نے آئینہ صداقت میں۔ یہ ان کی تصنیف ہے؟“ اس پر حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ نے فرمایا کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی کسی تصنیف کا نام آئینہ صداقت نہیں ہے تو پھر یحیٰی بختیار صاحب نے کچھ بے یقینی کے عالم میں کہا کہ پھر مرزا بشیر الدین کی ہوگی۔ یہ عجیب غیر ذمہ داری ہے کہ آپ خود ایک کتاب کا حوالہ پیش کر رہے ہیں اور اس کے مصنف کا نام تک آپ کو معلوم نہیں اور کبھی ایک نام لیتے ہیں اور کبھی دوسرا نام لیتے ہیں اور یقین سے کہہ نہیں سکتے کہ کس کی لکھی ہوئی کتاب ہے۔ اس طرح سے تو کوئی سنجیدہ کارروائی یا بحث نہیں ہو سکتی اور نہ اس قسم کے انداز کو کوئی قابلِ توجہ سمجھ سکتا ہے۔

پھر انہوں نے کسی کتاب نہجِ مصلّٰی کا حوالہ پڑھنے کی کوشش کی جس کا انہیں خود علم نہیں تھا کہ کس کی لکھی ہوئی ہے اور یقیناً کتب حضرت مسیح موعودعلیہ السلام اور خلفاء یا سلسلہ کے کسی جانے پہچانے مصنف کی تحریر کردہ کتب میں اس نام کی کوئی کتاب نہیں۔ جب حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ نے دریافت فرمایا کہ یہ کس کی لکھی ہوئی ہے تو اٹارنی جنرل صاحب نے اس کے جواب میں بجائے مصنف کا نام بتانے کے، کہا ”سوال کرنے

والے نے کہا ہے کہ مرزاصاحب نے یہ کہا ہے اور یہ کتاب جو ہے ... " اس کے بعد اور بات شروع ہو گئی اور حضرت خلیفة المسیح نے واضح فرمایا کہ یہ کتاب (جس کے مصنف کا نام بھی بتایا نہیں جا رہا تھا)ہمارے لیے اتھارٹی نہیں ہو سکتی۔ یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ اٹارنی جنرل صاحب قومی اسمبلی کی سپیشل کمیٹی میں ایک کتاب کے حوالے کو بطور دلیل پیش کر رہے تھے اور انہیں خود بھی معلوم نہیں تھا کہ یہ کس کی تصنیف ہے اور اس سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ کتاب ان کے پاس نہیں تھی ورنہ اس کو دیکھ کر مصنف کا نام بتا دیتے۔ یہ شواہد یہی ظاہر کرتے ہیں کہ اس موقع پر ایک جعلی حوالہ پیش کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔

یحیٰ بختیار صاحب بہر حال وکیل تھے۔ وہ جانتے تھے کہ اوپر تلے کی غلطیوں نے ان کی پوزیشن کمزور کر دی ہے۔ اب انہوں نے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی دو کتب کے حوالہ جات پیش کیے تا کہ اپنی طرف سے ایک مضبوط دلیل پیش کی جائے۔ چنانچہ انہوں نے کہا کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی کتاب تحفہ گولڑویہ کے صفحہ 382 کے حاشیہ میں حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے تحریر فرمایا ہے"پھر دوسرے فرقوں کو جو دعویٰ اسلام کرتے ہیں بالکل ترک کرنا پڑے گا۔" یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ تحفہ گولڑویہ کے تو 382 صفحات ہی نہیں ہیں۔ نہ معلوم اٹارنی جنرل صاحب نے اس کتاب کے صفحہ نمبر382کا حوالہ کیسے دریافت کر لیا۔ البتہ اس کتاب کے ایک مقام پر جو اس قسم کا فقرہ آتا ہے وہاں پر یہ بحث ہی نہیں ہو رہی کہ کس کو مسلمان کہلانے کا حق ہے کہ نہیں، وہاں تو یہ مضمون بیان ہو رہا ہے کہ احمدیوں کا امام احمدیوں میں ہی سے ہونا چاہئے۔ انہیں حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے مکذّبین کے پیچھے نماز نہیں پڑھنی چاہئے۔

یہاں پر یہ دلچسپ بات قابلِ ذکر ہے کہ جب ہم نے صاحبزادہ فاروق علی خان صاحب سے انٹرویو کیا تو انہوں نے کہا کہ یحیٰ بختیار صاحب نے کتابیں پڑھ کر سوال کئے تھے اور اس ضمن میں انہوں نے خاص طور پر حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی کتاب تحفہ گولڑویہ کا نام لیا کہ یحیٰ بختیار صاحب نے اس کتاب کو پڑھ کر

سوال اُٹھائے تھے۔ اس سے سوالات کرنے والوں کی حالت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ایک کتاب کا ہی نام لیا جا رہا ہے کہ اس کو پڑھ کر سوال کئے گئے تھے اور اس کا جو ایک ہی حوالہ پڑھا گیا وہ بھی غلط نکلا۔

پھر اس کے بعد یہ دلیل لائے کہ حقیقۃ الوحی کے صفحہ 185 پر حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے تحریر فرمایا ہے کہ "کفر کی دو قسمیں ہیں ایک آنحضرت سے انکار، دوسرے مسیح موعود سے انکار۔ دونوں کا نتیجہ و ماحصل ایک ہے۔" یہاں پر اٹارنی جنرل صاحب صحیح الفاظ پڑھنے کی بجائے کوئی اور الفاظ پڑھ رہے تھے اور یہ دیانتدارانہ طریق نہیں تھا۔ وہ نہ صرف عبارت صحیح نہیں پڑھ رہے تھے بلکہ نامکمل پڑھ رہے تھے۔ جب اٹارنی جنرل صاحب نے کہا کہ "کیا یہ درست ہے کہ مرزا غلام احمد نے اپنی کسی تحریر میں یہ کہا ہے کہ کفر کی دو قسمیں ہیں ایک آنحضرت کا انکار اور دوسرے مسیح موعود کا انکار۔ دونوں کا نتیجہ و ماحصل ایک ہے۔" چونکہ اٹارنی جنرل صاحب معین الفاظ نہیں پڑھ رہے تھے اور عبارت مکمل بھی نہیں پڑ ھ رہے تھے اس لئے حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ نے فرمایا "کسی کتاب میں یہ نہیں لکھا۔" اس پر انہوں نے حوالہ پڑھا حقیقۃ الوحی صفحہ 185۔ اس پر حضور نے فرمایا "جو الفاظ اصل تھے چھوڑ گئے۔ اس لئے میں کہتا ہوں کہ کسی کتاب میں نہیں لکھا۔" اس پر اٹارنی جنرل صاحب بس اتنا ہی کہہ سکے "وہ تو verify کرلیں گے۔" اور پھر یہ عجیب و غریب جملہ ادا فرمایا، "پوزیشن clarify کرنی ہے۔ یہ پڑھیں یا وہ پڑھیں۔"

اب پڑھنے والے دیکھ سکتے ہیں کہ یہ کوئی معقول جواب نہیں تھا۔ یہ اعتراض کرنے والے کا کام ہوتا ہے کہ وہ اصل حوالہ اور صحیح عبارت پیش کرے نہ کہ اعتراض کرنے کے بعد حوالہ تلاش کرتا رہے۔ یا غلط حوالہ پکڑے جانے پر یہ کہے کہ اس سے فرق کیا پڑتا ہے۔ اس طرح تو کوئی معقول گفتگو نہیں ہو سکتی۔

یہاں پر اٹارنی جنرل صاحب صحیح الفاظ پڑھنے کی بجائے کوئی اور الفاظ پڑھ رہے تھے۔ وہ نہ صرف یہ کہ صحیح عبارت نہیں پڑھ رہے تھے بلکہ ایک نامکمل عبارت پڑھ رہے تھے۔ اصل عبارت کو پڑھنے سے بات واضح ہو جاتی ہے۔ ”حقیقۃ الوحی“ کا متعلقہ حوالہ پیش ہے۔

” اتمام حجت کا علم محض خدا تعالیٰ کو ہے۔ ہاں عقل اس بات کو چاہتی ہے کہ چونکہ لوگ مختلف استعدا د اور مختلف فہم پر مجبول ہیں اسلئے اتمام حجت بھی صرف ایک ہی طرز سے نہیں ہو گا۔ پس جو لوگ بوجہ علمی استعداد کے خدا کی براہین اور نشانوں اور دین کی خوبیوں کو بہت آسانی سے سمجھ سکتے ہیں اور شناخت کر سکتے ہیں وہ اگر خدا کے رسول سے انکار کریں تو وہ کفر کے اول درجہ پر ہونگے اورجو لوگ اس قدر فہم اور علم نہیں رکھتے مگر خدا کے نزدیک اُن پر بھی اُن کے فہم کے مطابق حجت پوری ہو چکی ہے اُن سے بھی رسول کے انکار کا مواخذہ ہو گا مگر بہ نسبت پہلے منکرین کے کم۔ بہر حال کسی کے کفر اور اس پر اتمام حجت کے بارے میں فرد فرد کا حال دریافت کرنا ہمارا کام نہیں ہے یہ اُس کا کام ہے جو عالم الغیب ہے۔ ہم اس قدر کہہ سکتے ہیں کہ خدا کے نزدیک جس پر اتمام حجت ہو چکا ہے اور خدا کے نزدیک جو منکر ٹھہر چکا ہے وہ مواخذہ کے لائق ہو گا۔ ہاں چونکہ شریعت کی بنیاد ظاہر پر ہے اس لئے ہم منکر کو مومن نہیں کہہ سکتے اور نہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ مواخذہ سے بَری ہے اور کافر منکر کو ہی کہتے ہیں کیونکہ کافر کا لفظ مومن کے مقابل پر ہے اور کفر دو قسم پر ہے۔

(اوّل) ایک یہ کفر کہ ایک شخص اسلام سے ہی انکار کرتا ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا کا رسول نہیں مانتا۔ (دوم) دوسرے یہ کفر کہ مثلاً وہ مسیح موعود کو نہیں مانتا اور اُس کو باوجود اتمام حجت کے جھوٹا جانتا ہے جس کے ماننے اور سچا جاننے کے بارے میں خدا اور رسول نے تاکید کی ہے اور پہلے نبیوں کے کتابوں میں بھی تاکید پائی جاتی ہے۔ پس اس لئے کہ وہ خدا اور رسول کے فرمان کا منکر ہے، کافر ہے اور اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ دونوں قسم کے کفر ایک ہی قسم میں داخل ہیں کیونکہ جو شخص باوجود شناخت کر لینے کے خدا اور

رسول کے حکم کو نہیں مانتا وہ بموجب نصوص صریحہ قرآن اور حدیث کے خدا اور رسول کو بھی نہیں مانتا اور اس میں شک نہیں کہ جس پر خدا تعالیٰ کے نزدیک اوّل قسم کفر یا دوسری قسم کفر کی نسبت اتمام حجت ہو چکا ہے وہ قیامت کے دن مواخذہ کے لائق ہوگا اور جس پر خدا کے نزدیک اتمام حجت نہیں ہوا اور وہ مکذب اور منکر ہے تو گو شریعت نے (جس کی بنا ظاہر پر ہے) اُسکا نام بھی کافر ہی رکھا ہے اور ہم بھی اُس کو باتباع شریعت کافر کے نام سے ہی پکارتے ہیں مگر پھر بھی وہ خدا کے نزدیک بموجب آیت لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفۡسًا اِلَّا وُسۡعَھَا (البقرۃ : 287) قابل مواخذہ نہیں ہوگا۔ ہاں ہم اس بات کے مجاز نہیں ہیں کہ ہم اُس کی نسبت نجات کا حکم دیں۔ اس کا معاملہ خدا کے ساتھ ہے ہمیں اس میں دخل نہیں۔"

("حقیقۃالوحی" صفحہ 180-179 اشاعت 20 اپریل 1907ء)

یہاں اس شخص کا ذکر ہے جو کہ خدا تعالیٰ کے ایک مامور کو پہچان لیتا ہے کہ وہ سچا ہے اور یہ بھی جانتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس کو ماننے کا حکم فرمایا ہے لیکن پھر بھی وہ تکبر سے دیدہ دانستہ انکار کرتا ہے۔ اب ایسے شخص کو کیا خدا اور اس کے رسول کے فرمان کا انکار کرنے والا کہیں گے یا اس کو پکا مومن قرار دیں گے؟

اب ان کے حوالہ جات کی غلطیاں ایک عجیب و غریب صورت حال اختیار کر چکی تھیں۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی تحریر کا حوالہ اس کتاب سے دیا جا رہا تھا جو حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے تحریر نہیں فرمائی تھی۔ ایسی نامعلوم کتابوں کے حوالے پیش کئے جا رہے تھے جن کے متعلق خود انہیں معلوم نہیں تھا کہ لکھی کس نے تھی۔ حضرت مسیح موعود کی کتب کے حوالہ جات بمعہ صفحہ نمبر پیش کئے گئے تو نہ صرف ان صفحات پر یہ عبارت موجود نہیں تھی بلکہ وہاں پر کسی اور موضوع کا ذکر ہو رہا تھا۔ یا پھر صحیح الفاظ پڑھنے کی

بجائے بدل کر الفاظ پڑھے جا رہے تھے۔ اس کے باوجود وہ غلط حوالہ پیش کر کے غیر متعلقہ سوالات کا بے ربط اور طویل سلسلہ شروع کر دیتے۔ جب کارروائی شروع ہوئی تھی تو سپیکر صاحب نے اسی وقت کہا تھا کہ کتب اٹارنی جنرل صاحب کے قریب کردی جائیں تاکہ وہ حوالہ اٹارنی جنرل صاحب گواہوں کو یعنی جماعت احمدیہ کے وفد کے اراکین کو دکھا سکیں۔ لیکن یہاں یہ ہو رہا تھا کہ اٹارنی جنرل صاحب ایک حوالہ بھی دکھانے کی زحمت نہیں کر رہے تھے۔

اس مرحلہ پر شام کی کارروائی میں وقفہ کا اعلان ہوا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب سپیکر صاحبزادہ فاروق صاحب بھی یحیٰ بختیار صاحب اور ان کی ٹیم کی تیاری کے اس عالم سے تنگ آ چکے تھے۔ جب حضرت خلیفة المسیح الثالثؒ جماعت کے وفد کے ہمراہ ہال سے تشریف لے گئے تو سپیکر صاحب نے کہا

The honourable members may keep sitting

پھر انہوں نے ان کتب کو قرینے سے لگانے کے متعلق ہدایات دیں جن کے حوالے پیش کیے جا رہے تھے اور لائبریرین کو اس کے قریب کرسیاں رکھنے کی ہدایت دی اور حوالہ جات میں نشانیاں رکھنے کی ہدایت دی اور کہا کہ جن لوگوں نے مخصوص حوالہ جات دیئے ہیں باقاعدہ کتابوں میں نشان لگا کر رکھیں اور اگر گواہ کسی چیز سے انکار کریں تو کتاب فوراً پیش کی جائے اور پھر ان الفاظ میں سپیکر صاحب نے اظہارِ برہمی کیا۔

”یہ طریقہ کار بالکل غلط ہے کہ ایک حوالہ کو تلاش کرنے میں آدھا گھنٹہ لگتا ہے۔ میں کل سے کہہ رہا ہوں کہ کتابیں اس طرح رکھیں یعنی چار پانچ کرسیاں ساتھ رکھ دیں۔ جن ممبر صاحبان نے حوالہ جات تلاش کرنے ہیں ان کرسیوں پر بیٹھ کر تلاش کر سکتے ہیں اور وہ حضرات جنہوں نے حوالہ جات دیئے ہیں اِدھر آکر بیٹھیں لہٰذا وہ کتابیں Ready ہونی چاہئیں تاکہ اٹارنی جنرل کو کوئی تکلیف نہ ہو اور ٹائم ضائع نہ ہو۔“

ابھی سپیکر صاحب کے یہ الفاظ ختم ہی ہوئے تھے کہ مفتی محمود صاحب نے جو عذر پیش کیا وہ بھی خوب تھا۔ انہوں نے یہ دقیق نکتہ بیان فرمایا:۔

”جنابِ والا ان کا یہ ہے کہ جلدیں مختلف ہوتی ہیں۔ ہم صفحہ اور لکھتے ہیں اور کتاب ہمارے پاس دوسری قسم کی آجاتی ہے۔ ہمارے پاس تین حوالے تھے اب وہ ٹٹول رہے ہیں ... “

جو لوگ کتابوں کو دیکھنے سے کچھ بھی تعارف رکھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ ایک کتاب کے کئی ایڈیشن چھپتے ہیں، حوالہ دینے والے کا فرض یہ ہے کہ وہ حوالہ دیتے ہوئے ایڈیشن کا نمبر اور سن، اس کے پریس اور ناشر کا نام وغیرہ بتائے اور جس ایڈیشن سے صفحہ نمبر نوٹ کر کے بیان کرے اُسی ایڈیشن کی کتاب کارروائی کے دوران پیش کرے۔ اگر ایک ایڈیشن سے حوالہ کا صفحہ نمبر نوٹ کیا جائے گا اور کتاب دوسرے ایڈیشن کی نکال لی جائے تو پھر ظاہر ہے کہ پیش کردہ عبارت اس طرح نہیں ملے گی اور اگر اصل الفاظ پیش کرنے کی بجائے الفاظ بدل کر پیش کیے جائیں یا پھر محض ایک مخالف کی کتاب سے جماعت کی کتاب کا فرضی حوالہ نقل کر کے پیش کر دیا جائے تو پھر خفت تو اُٹھانی پڑے گی۔ ایسے بزرجمہروں کی عقل پر ماتم ہی کیا جا سکتا ہے۔ مفتی محمود صاحب کے تبصرے سے تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ شاید انہیں کتابوں کو دیکھنے کا زیادہ تجربہ نہیں ہے۔ ان کے ان جملوں سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے جماعتِ احمدیہ کے خلاف تین حوالے ڈھونڈے تھے اور پھر دوران کارروائی یہ حوالے نہ مل سکے۔ لیکن یہ بات ناقابلِ فہم ہے کہ وہ کتابوں کو ٹٹول کر حوالہ ڈھونڈنے کی کوشش کیوں کر رہے تھے۔ اگر ایک کتاب سے کوئی عبارت تلاش کرنی ہو تو اسے پڑھ کر تلاش کی جاتی ہے۔

لیکن شاید سپیکر صاحب مفتی محمود صاحب کا دقیق نکتہ سمجھ نہیں پائے تھے۔ انہوں نے کہا کہ اب جنرل ایگزامیشن ختم ہو چکا ہے۔ اب زیادہ تر حوالہ جات کی بات شروع ہو چکی ہے دو تین حوالہ جات نہیں مل

سکے۔ جن صاحب نے جو حوالہ پیش کیا ہے وہ اس کو flag کر کے رکھے اور جب اٹارنی جنرل سوال کریں تو اسمبلی کے عملہ کا آدمی یہ حوالہ وفد کو پیش کرے۔

اس مرحلہ پر مولوی غلام غوث ہزاروی کو خیال آیا کہ وہ بھی کوئی نکتہ بیان فرمائیں۔ چنانچہ وہ کہنے لگے:۔

”جناب والا میں ایک چیز کے متعلق عرض کروں کہ ہم حوالہ جات اس وقت تیار رکھیں گے جب ہم کو اٹارنی جنرل کی طرف سے علم ہو کہ اب وہ کون سے سوالات کریں گے ...“

یہ نکتہ بھی خوب تھا۔ مولوی غلام غوث ہزاروی صاحب جیسے ممبران سوالات حوالہ جات سمیت پیش کر رہے تھے اور چند حوالے ابھی پیش کئے گئے تھے اور وہ بھی غلط نکلے۔ جس نے سوال کیا تھا وہ حوالہ نکال کر اپنے پاس رکھ سکتا تھا تاکہ عند الطلب پیش کر سکے یا پھر کتاب سے نکال کر اٹارنی جنرل کو دے سکتا تھا تا کہ جماعت کے وفد کو دکھایا جا سکے۔

اس کے بعد شاہ احمد نورانی صاحب نے خفت مٹانے کی کوشش کی اور سپیکر صاحب کو کہا کہ انہوں نے یعنی حضورؒ نے حقیقۃ الوحی والے حوالے کا انکار کیا ہے جب کہ یہ حوالہ یہاں پر موجود ہے اور سپیکر صاحب کو کہا کہ آپ ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔ آفرین ہے نورانی صاحب پر۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ کارروائی کے دوران ذہنی طور پر غیر حاضر تھے۔ حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ نے فرمایا تھا کہ اصل الفاظ چھوڑ دیئے گئے ہیں یعنی معیّن عبارت نہیں پڑھی گئی اور اس کا علاج بہت آسان تھا اور وہ یہ کہ اصل عبارت پڑھ دی جاتی اور بس۔ مگر ایسا نہیں کیا گیا اور جو الفاظ اٹارنی جنرل صاحب نے پڑھے تھے وہ معیّن الفاظ اس کتاب میں موجود نہیں ہیں۔ صحیح طریق تو یہی ہے کہ حوالہ کی معین عبارت پڑھی جائے۔ کتاب سامنے موجود تھی، سادہ سی بات تھی کتاب اُ

ٹھاتے اور معیّن عبارت پڑھ دیتے۔ لیکن اٹارنی جنرل پوری عبارت اس لئے نہیں پڑھ سکتے تھے کہ پوری عبارت کے سامنے آنے پر وہ اعتراض اُٹھ ہی نہیں سکتا تھا جو وہ اُٹھانے کی کوشش کر رہے تھے۔

مغرب کی نماز کے بعد جب کارروائی شروع ہوئی تو حقیقۃ الوحی کے اسی حوالہ سے بات شروع ہوئی جس کا حوالہ وقفہ سے پہلے دیا جا رہا تھا۔ لیکن اٹارنی جنرل صاحب اب بھی پرانی غلطی پر مصر تھے۔ انہوں نے ایک بار پھر معین عبارت پڑھنے کی بجائے اپنی طرف سے اس کا خلاصہ پڑھا البتہ اس مرتبہ یہ نہیں کہا کہ یہ حقیقۃ الوحی کے اس صفحہ پر لکھا ہے بلکہ یہ کہنے پر اکتفا کی کہ کسی تحریر میں لکھا ہے۔ اٹارنی جنرل صاحب نے کہا:۔

”کیا یہ درست ہے کہ مرزا غلام احمد نے اپنی کسی تحریر میں لکھا ہے کہ کفر کی دو قسمیں ہیں۔ ایک آنحضرت ﷺ سے انکار اور دوسرا مسیح موعود سے انکار۔“

حضور نے ان کی غلطی سے صرفِ نظر کرتے ہوئے فرمایا کہ اس سے آگے کی عبارت خود اس کا مطلب واضح کر دیتی کیونکہ آگے لکھا ہے کہ جو با وجود اتمامِ حجت کے اس کو جھوٹا جانتا ہے۔ حالانکہ خدا اور رسول نے اس کے ماننے کی تاکید کی ہے۔ کیونکہ وہ خدا اور رسول کے فرمان کا منکر ہے۔

کچھ دیر بعد پھر اٹارنی جنرل صاحب کے سوالات نے ایک عجیب رخ اختیار کر لیا۔ اور یہ بحث اٹھا دی کہ جماعتِ احمدیہ کا کلمہ کیا ہے، یہ کوئی خفیہ امر نہیں۔ جماعت کا وسیع لٹریچر بیسیوں زبانوں میں دنیا کے سو سے زائد ممالک میں اچھی طرح معروف ہے۔ ہر کتاب میں، ہر تحریر میں کوئی ایک صدی سے یہی لکھا ہوا ملے گا کہ جماعتِ احمدیہ کا کلمہ لا الہ الّا اللہ محمّدٌ رّسول اللہ ہے۔ دنیا بھر کے دو سو کے قریب ممالک میں کسی احمدی بچے سے بھی پوچھ لیں تو وہ یہی جواب دے گا کہ ہمارا کلمہ لا الہ الا اللہ محمّد رسول اللہ ہے۔ لیکن اس کارروائی میں اٹارنی جنرل صاحب ایک تصویر اٹھا لائے جو کہ نائیجیریا کے ایک شہر اجیبو اوڈے میں جماعت کی

مسجد کی تھی۔ اس کے اوپر کوفی رسم الخط میں کلمہ طیبہ لکھا ہوا تھا اور اس رسم الخط میں محمد کی پہلی میم کو لمبا کرکے لکھا گیا تھا۔ اور اس کو دکھا کر اٹارنی جنرل صاحب یہ باور کروانے کی کوشش فرما رہے تھے یہ محمد رسول اللہ نہیں لکھا تھا بلکہ احمد رسول اللہ لکھا تھا یعنی کہنا یہ چاہ رہے تھے کہ احمدیوں کا تو کلمہ ہی مسلمانوں سے علیحدہ ہے۔ حضور نے اس امر پر گفتگو کرتے ہوئے فرمایا کہ ہمارا کلمہ اگر دوسرا تھا تو ہر جگہ پر دوسرا ہونا چاہئے تھا، یہ ممکن نہیں تھا کہ ہمارا کلمہ دوسرا تھا اور یہ صرف ایک جگہ پر لکھا ہے، باقی مقامات پر وہ کلمہ لکھا ہے جس پر ہمارا ایمان نہیں ہے۔ یہ الزام ہی بچگانہ تھا اور اٹارنی جنرل صاحب خود بھی اس سوال کو کر کے ایک مخمصے میں پھنس گئے تھے۔ آغاز میں ہی انہوں نے کچھ بے یقینی سے کہا کہ یہ Impression پڑتا ہے کہ احمد رسول اللہ لکھا ہے۔ May be it is محمد رسول اللہ۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کیا کہہ رہے تھے انہیں تو خود یقین نہیں تھا کہ یہ الزام معقول بھی ہے کہ نہیں۔ کبھی وہ کہتے تھے کہ محمد لکھا ہوا ہے پھر کہتے کہ احمد لکھا ہوا لگ رہا ہے۔ حضور نے فرمایا کہ ہماری سینکڑوں مساجد دنیا کے مختلف ممالک میں ہیں ان میں سے صرف ایک مسجد کو منتخب کر کے شور مچایا گیا ہے کہ ان کا کلمہ مختلف ہے۔ اس مرحلہ پر حضرت خلیفة المسیح الثالثؒ نے فرمایا کہ اس لفظ کی دوسری میم پر تشدید نظر آ رہی ہے، احمد کے اوپر تشدید کہاں ہوتی ہے۔ اب بیچارے اٹارنی جنرل صاحب کسی کے کہنے پر یہ نا معقول سوال تو اُٹھا چکے تھے لیکن اب اس تشدید کا کیا کرتے جس سے یہ صاف ظاہر ہوتا تھا کہ یہ محمد لکھا ہوا ہے احمد ہو ہی نہیں سکتا۔ انہوں نے عاجز آکر کہا میں یہ چاہتا ہوں کہ آپ یہ Verify کردیں کہ یہ صرف لا الہ الا اللہ محمّد رسول اللہ لکھا ہے۔ اس پر حضور نے ارشاد فرمایا کہ "ہے ہی یہ جب سے ہم پیدا ہوئے، ہوش نہیں سنبھالی تھی تو لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ ہمیں سکھایا گیا۔ اب یہ اعتراض ہو گیا عجیب بات ہے۔" اس مثال سے یہ بخوبی ظاہر ہوتا ہے کہ قومی اسمبلی میں جو سوالات اُٹھائے جا

رہے تھے وہ عقلِ سلیم سے عاری تھے ورنہ یہ تشدید اس وقت بھی موجود تھی جب کہ یہ نامعقول سوال اُٹھانے کی تیاری کی جا رہی تھی۔

جہاں تک اس الزام کا تعلق ہے تو جماعتِ احمدیہ نے توہر گز مسلمانوں سے اپنا علیحدہ کلمہ نہیں بنایا لیکن مسلمانوں میں ایسا مسلک بھی موجود ہے جو کہ نہ صرف اپنا علیحدہ کلمہ رکھنے کا دعویٰ پیش کرتے رہے ہیں بلکہ اسے اپنے جنتی ہونے کی دلیل کے طور پر بھی بیان کرتے رہے ہیں۔ چنانچہ مشہور شیعہ عالم علی حائری صاحب ایک فتویٰ میں یہ بیان کرتے ہوئے کہ صرف شیعہ فرقہ جنتی اور باقی تمام فرقے جہنمی ہیں لکھتے ہیں کہ صرف شیعہ فرقہ ہے جو کہ اصول و فروع میں باقی تمام مسلمان فرقوں سے علیحدہ ہے اور اس کی پہلی دلیل یہ دیتے ہیں

”سب سے پہلے کلمہ طیبہ ہے جس کو بہتر فرقے لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ صرف پڑھتے ہیں مگر امامیہ عَلِیٌّ وَلِیُّ اللہ اس کے ہمراہ پڑھتے ہیں۔“

(فتاویٰ حائری۔ حصہ دوئم ماہ صفر 1324ھ مطبع اسلامیہ سٹیم پریس لاہور ص4)

اس کے بعد پھر انہی پرانے سوالات پر بات شروع ہوئی کہ احمدیوں نے خود اپنے آپ کو باقی مسلمانوں سے علیحدہ کیا کہ نہیں ؟ یا پھر قومی اسمبلی کو ایسا فیصلہ کرنے کا حق ہے کہ نہیں؟ جب بات آگے چلتی اور سوالات کی حقیقت کو ظاہر کرنے کے لیے سوالات کیے جاتے تو ان کا سُقم خود ہی ظاہر ہو جاتا۔ اب اٹارنی جنرل صاحب نے رابطہ عالمِ اسلامی کی قرارداد کو دلیل کے طور پر پیش کرنے کی کوشش کی۔ ایک بار پھر یہ معلوم ہوتا تھا کہ انہوں نے اس سوال کے لئے بھی کوئی تیاری نہیں کی۔ انہوں رابطہ عالمِ اسلامی کی بجائے ” مُؤتمَر عالمِ اسلامی “ کا نام استعمال کیا جو کہ اس تنظیم کی ابتدائی شکل کا نام تھا اور اب کئی دہائیوں سے تبدیل ہو چکا تھا۔ اس

پر حضور نے درستگی فرمائی کہ وہ مُؤتمرَ عالمِ اسلامی کی نہیں بلکہ رابطہ عالمِ اسلامی کی بات کر رہے ہیں۔ اس سے پہلے وہ اس بات پر زور دے رہے تھے کہ احمدیوں نے خود اپنے آپ کو باقی مسلمانوں سے علیحدہ کیا ہے۔ جب رابطہ کی قرارداد کی بات شروع ہوئی تو حضور نے انہیں یاد دلایا کہ اس قرارداد میں تو یہ لکھا ہے کہ قادیانی سارے مسلمانوں والے کام کرتے ہیں اور ساتھ یہ کہا گیا کہ اندر سے کافر ہیں اور حدیث کے حوالے سے فرمایا کہ دنیا کی کون سی طاقت ہے جو دل چیر دیکھے اور فیصلہ کرے۔ اس مرحلہ پر اٹارنی جنرل نے زچ ہو کر کہا کہ

”میں Reasoning میں نہیں جا رہا۔

اس پر حضور نے فرمایا:۔

”Well اگر reasoning میں نہیں جا رہے تو میں بغیر reasoning کے بات نہیں کرتا۔“

اب کون سا ہوشمند ہو گا جو کہ یہ کہے گا کہ جب اس قسم کی کارروائی جاری ہو تو Reasoning میں نہیں جانا چاہئے۔ ظاہر ہے جماعتِ احمدیہ پر اعتراضات کئے جا رہے تھے اور مختلف علمی بحثیں اُٹھانے کی کوشش کی جا رہی تھی، یہ بات تو Reasoning کے بغیر ہو ہی نہیں سکتی۔ اگر اٹارنی جنرل صاحب اور ممبرانِ اسمبلی Reasoning میں نہیں جانا چاہتے تھے تو پھر یہ کارروائی نہیں محض ڈرامہ کیا جا رہا تھا۔

اس پر حضور نے فرمایا:۔

”اور وہ جو بیس فتوے، ان کے متعلق ہیں، شیعہ کے متعلق، اور جو حرمین شریف کے فتاویٰ محمد بن عبدالوہاب اور ان کے متبعین کے خلاف، بارہ سال انہوں نے حج نہیں کرنے دیا وہابیوں کو۔ ساری اپنی تاریخ بھول جائیں گے ہم؟ اب جلدی میں ایک فیصلہ کرنے کے لئے تاریخ کے اوراق بھول جائیں گے ہم۔“

لیکن بعد کی کارروائی سے یہی واضح ہوتا ہے کہ اٹارنی جنرل صاحب یا یہ کہنا زیادہ مناسب ہو گا کہ سوالات کرنے والی ٹیم Reasoning کا طریقہ کار نہیں اپنانا چاہتی تھی۔ اس سے پہلے بھی یہ ذکر آ چکا ہے کہ خود سپیکر اسمبلی نے اس بات کی نشاندہی کی تھی کہ جو حوالہ جات پیش کیے جاتے ہیں، ان کو ڈھونڈنے میں آدھا آدھا گھنٹہ لگ جاتا ہے۔ لیکن اب بھی یہی حال تھا کہ یا تو حوالے صحیح پیش ہی نہیں ہوتے تھے یا جب ان پر بات شروع ہوتی تو یہ صاف نظر آ جاتا کہ یا تو اس حوالہ کا سیاق و سباق بھی پڑھنے کی کوشش نہیں کی گئی یا پھر اس سوال کو اُٹھانے والوں میں یہ مضمون سمجھنے کی صلاحیت ہی نہیں پائی جاتی تھی۔ چند مثالیں پیش ہیں۔

بحث کے دوران اٹارنی جنرل صاحب نے فرمایا کہ الفضل 26/ جنوری 1915ء کا حوالہ ہے مرزابشیر الدین محمود کا ہے:

> ”مسیح موعودؑ کو احمد نبی اللہ تسلیم نہ کرنا۔ آپ کو امتی قرار دینا۔ امتی گروہ سمجھنا۔ گویا آنحضرت ﷺ سید المرسلین خاتم النبیین ہیں کو امتی قرار دینا امتوں میں داخل کرنا ہے کفر عظیم ہے اور کفر در کفر ہے۔“

اس حوالہ کو پڑھتے یا یوں کہنا چاہئے کہ ایجاد کرتے ہوئے اٹارنی جنرل صاحب کو یہ بھی خیال نہیں آیا کہ ساری عبارت مہمل ہے اس کا مطلب ہی کچھ نہیں بنتا۔ بہر حال اس کے جواب میں حضور نے اس بات کی نشاندہی فرمائی کہ یہ فقرہ تو بظاہر ٹوٹا پھوٹا لگتا ہے۔ لیکن یحییٰ بختیار صاحب پھر بھی نہیں سمجھ پائے اور کہا کہ میں پھر پڑھ دیتا ہوں۔ اس پر حضور نے ارشاد فرمایا کہ میں چیک کروں گا۔ یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اس حوالہ کے متعلق کچھ گو مگو کی کیفیت میں رہے۔ کبھی یہ حوالہ 26 تاریخ کا بن جاتا اور کبھی 29/ جنوری کا۔ اس کا ذکر تو بعد میں آئے گا لیکن یہاں پر یہ بتاتے چلیں کہ یہ حوالہ بھی جعلی اور خود ساختہ تھا۔

جعلی حوالے تو پہلے ہی پیش کئے جا رہے تھے۔ اس مرحلہ پر پہنچ کر ایک اور طریقہ کار اختیار کیا گیا۔ ایک ایسا حوالہ پیش کیا گیا جس کی آدھی عبارت صحیح تھی اور آدھی خود ساختہ تھی۔ اٹارنی جنرل صاحب نے حضرت خلیفۃ المسیح الثانی کی تقریر ”ملائکۃ اللہ “ کے صفحہ46و47کی یہ عبارت پڑھی۔

”کیا مسیح ناصری نے اپنے پیروؤں کو یہودیوں سے الگ نہیں کیا۔ کیا وہ انبیاء جن کے زمانے کا علم ہم تک پہنچا ہے اور ہمیں ان کے ساتھ جماعتیں بھی نظر آتی ہیں انہوں نے اپنی جماعتوں کو غیروں سے الگ نہیں کیا ۔ ہر شخص کو ماننا پڑے گا کہ بے شک کیا ہے پس اگر حضرت مرزا صاحب نے جوایک نبی اور رسول ہیں اپنی جماعت کو منہاج نبوت کے مطابق اپنی جماعت کوغیروں سے علیحدہ کردیا ہے تو نئ اور انوکھی بات کون سی ہے ... جس دن سے کہ تم احمدی ہوئے تو تمہاری قوم تو احمدیت ہوگئی شناخت اور امتیاز کے لئے اگر کوئی پوچھے تو اپنی ذات یا قوم بتا سکتے ہو ورنہ اب تو تمہاری قوم، تمہاری گوت ، تمہاری ذات احمدی ہی ہے پھر احمدیوں کو چھوڑ کر غیراحمدیوں میں کیوں قوم تلاش کرتے ہو۔“

(ملائکۃ اللہ صفحہ 46-47)

”ملائکۃ اللہ“ میں ” کیا مسیح ناصری “کے الفاظ سے لے کر”انوکھی بات کون سی ہے“ تک والی تحریر موجود ہی نہیں ہے اور اس کے بعد کے الفاظ واضح ہیں

(”ملائکۃ اللہ “ صفحہ نمبر 47-46۔ شائع کردہ الشرکۃ الاسلامیہ۔ انوارالعلوم جلد5 ص441)

ہر صاحبِ ضمیر اس بات سے اتفاق کرے گا کہ یہ ایک شرمناک حرکت تھی کہ اس طرح کے جعلی حوالے بنا کر پیش کئے جائیں۔

اٹارنی جنرل صاحب نے ایک سوال یہ اٹھایا کہ

”صفحہ 344 پر آئینہ کمالاتِ اسلام ہے تو اس میں ہے کہ جو شخص نبوت کا دعویٰ کرے گا۔ وہ ضروری ہے کہ خدا تعالیٰ کی ہستی کا اقرار کرے۔ اور نیز یہ بھی کہے کہ خدا تعالیٰ کی طرف سے میرے پر وحی نازل ہوتی ہے اور نیز خلق اللہ کو وہ کلام سناوے جو اس پر خدا تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوا ہے اور ایک امت بنائے جو اس کو نبی سمجھتی ہو اور اس کی کتاب کو کتاب اللہ جانتی ہو۔“

اس کے بعد انہوں یہ سوال اُٹھایا کہ اس عبارت کا ریفرنس ان کا (یعنی حضرت مسیح موعود علیہ السلام کا) Reference کس کی طرف ہے۔ اپنی طرف یا آنحضرت ﷺ کی طرف؟

حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ نے یہ اہم سوال اُٹھایا کہ اس کی ضمیر کس طرف جاتی ہے۔ اشارہ واضح تھا لیکن آفرین ہے کہ سننے والوں کو سمجھ نہیں آیا۔

یہ حوالہ پڑھنے کے بعد پاکستان کی قابل اسمبلی میں نہایت قابل اٹارنی جنرل صاحب نے یہ اہم سوال اُٹھایا کہ

”تو یہ Reference آنحضرت کی طرف ہے ان کا یا اپنے سے مراد ہے؟“

حضور نے فرمایا کہ اسے چیک کریں گے۔

اب ہم پورا حوالہ پیش کرتے ہیں:۔

”اور یہ جو حدیثوں میں آیا ہے کہ دجّال اوّل نبوت کا دعویٰ کریگا پھر خدائی کا۔ اگر اس کے یہ معنی لئے جائیں کہ چند روز نبوت کا دعویٰ کر کے پھر خدا بننے کا دعویٰ کرے گا تو یہ معنی صریح باطل ہیں کیونکہ جو شخص نبوت کا دعویٰ کرے گا اس دعویٰ میں ضرور ہے کہ وہ خدا تعالیٰ کی ہستی کا اقرار کرے اور نیز یہ بھی کہے کہ خدا

تعالیٰ کی طرف سے میرے پر وحی نازل ہوتی ہے۔ اور نیز خلق اللہ کو وہ کلام سناوے جو اس پر خدا تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوا ہے اور ایک امت بناوے جو اس کو نبی سمجھتی اور اس کی کتاب کو کتاب اللہ جانتی ہے۔ اب سمجھنا چاہئے کہ ایسا دعویٰ کرنے والا اسی امت کے روبرو خدائی کا دعویٰ کیونکر کر سکتا ہے کیونکہ وہ لوگ کہہ سکتے ہیں کہ تو بڑا مفتری ہے پہلے تو خدائے تعالیٰ کا اقرار کرتا تھا اور خدا تعالیٰ کا کلام ہم کو سناتا تھا اور اب اس سے انکار ہے اور اب آپ خدا بنتا ہے ...

صحیح معنے یہی ہیں کہ نبوت کے دعویٰ سے مراد دخل در امورِ نبوت اور خدائی کے دعویٰ سے مراد دخل در امورِ خدائی ہے جیسا کہ آج کل عیسائیوں سے یہ حرکات ظہور میں آرہی ہیں۔ ایک فرقہ ان میں سے انجیل کو ایسا توڑ مروڑ رہا ہے کہ گویا وہ نبی ہے اور اس پر آیتیں نازل ہو رہی ہیں اور ایک فرقہ خدائی کے کاموں میں اس قدر دخل دے رہا ہے کہ گویا وہ خدائی کو اپنے قبضہ میں کرنا چاہتا ہے۔“ (85)

حضرت مسیح موعود علیہ السلام پر تو یہ لوگ ایمان نہیں لائے تھے لیکن اس حوالہ کا ایک حصہ پڑھ کر بغیر سوچے سمجھے یہ سوال اُٹھانا کہ کیا اس کی ضمیر آنحضرت ﷺ کی طرف جاتی ہے؟ اور پھر اس سوال کو دہرانا یا پرلے درجہ کی بے عقلی ہے یا ایک ایسی خوفناک گستاخی کہ کوئی مسلمان اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ ایک بات تو ظاہر ہے کہ ان سوالات کو پیش کرنے سے قبل کوئی تیاری نہیں کی گئی تھی۔ ان احادیث میں ایک اہم پیشگوئی بیان ہوئی ہے اور بعد میں رونما ہونے والے واقعات اس عظیم پیشگوئی کی واضح تصدیق کرتے ہیں اور حضرت مسیح موعود علیہ السلام اس پیشگوئی کی ایک لطیف تشریح بیان فرما رہے ہیں لیکن پاکستان کے ممبرانِ اسمبلی میں سے اس سوال کو اُٹھانے والے سمجھے بھی تو کیا سمجھے۔

ان احادیثِ نبویہ میں اور مذکورہ عبارت میں ایک لطیف مضمون بیان کیا گیا ہے جو اس دور میں اعجازی طور پر پورا ہو کر آنحضرت ﷺ کا ایک زندہ نشان بن چکا ہے۔ لیکن یہ علمی مضمون پاکستان کی قابل قومی اسمبلی میں سوالات مہیا کرنے والوں کی عقل سے بالاتر تھا۔

اس کے بعد کچھ دیر تک اٹارنی جنرل صاحب نے یہ بحث اُٹھائی کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کا دعویٰ شرعی نبوت کا تھا یا غیر شرعی نبوت کا تھا۔ اس معاملہ میں حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے دعاوی اور تحریرات بالکل واضح ہیں۔ آپؑ کا دعویٰ امتی نبی کا تھا۔ آپ نے بارہا واضح الفاظ میں اس بات کا اعلان فرمایا تھا کہ اب آنحضرت ﷺ کی لائی ہوئی شریعت اور آپ کے احکامات کا ایک شوشہ بھی منسوخ نہیں ہو سکتا اور اب جو بھی کوئی روحانی مدارج حاصل کرے گا وہ آنحضرت ﷺ کی اتباع اور فیض سے ہی حاصل کر سکتا ہے۔ اس بات کو بحث بلکہ کج بحثی کا موضوع بنانا ایک لایعنی بات تھی اور حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ نے اس موضوع پر حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی تحریرات پڑھ کر سنائیں جن سے اُٹھائے گئے اعتراضات باطل ہو جاتے تھے۔ ابھی بحث جاری تھی کہ اٹارنی جنرل صاحب یا ان کو سوالات مہیا کرنے والے قابل احباب اپنی طرف سے ایک برہانِ قاطع یہ لائے اور اٹارنی جنرل صاحب نے یہ حوالہ پیش کیا۔

”پس شریعتِ اسلامی نبی کے جو معنی کرتی ہے اس کے معنی سے حضرت غلام احمد صاحب ہرگز مجازی نہیں بلکہ حقیقی نبی ہیں۔“

حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ نے ارشاد فرمایا ”یہ کہاں کا حوالہ ہے؟“ اس پر اٹارنی جنرل صاحب نے لب کشائی فرمائی ”شریعت نبوت صفحہ 172 “۔ ایک منٹ میں یہ ان کا دوسرا کارنامہ تھا۔ اس نام کی جماعت کی کوئی تصنیف نہیں تھی۔ یہ حوالہ بھی جعلی تھا۔ بقیہ کارروائی میں وہ اس نام نہاد کتاب کو پیش کرنے کا حوصلہ نہ کر سکے۔ پیشتر

اس کے کہ یحیٰی بختیار صاحب حوالہ جات پیش کرنے کے میدان میں کچھ اور جوہر دکھاتے کہ سپیکر صاحب نے انہیں اس مخمصے سے نجات دلائی اور کہا کہ کل کارروائی جاری رہے گی اب وفد جا سکتا ہے۔ کل دس بجے کارروائی شروع ہو گی۔

یعنی سپیکر صاحب نے تو یہ متنبہ کیا تھا کہ آپ کو حوالے وقت پر نہیں ملتے اور آدھا آدھاگھنٹہ حوالہ ڈھونڈنے میں لگ جاتا ہے اور اس کے بعد سوال اُٹھانے والوں نے یہ اصلاح کی کہ ان کتابوں کے حوالے پیش کرنے شروع کر دیئے جو کبھی لکھی ہی نہیں گئیں تھیں۔ اسی افراتفری کے عالم میں 6/ اگست کی کارروائی ختم ہوئی۔

7/ اگست کی کارروائی

جب 7/ اگست کی کارروائی شروع ہوئی تو بات ان حوالہ جات سے شروع ہوئی تھی جو گزشتہ روز پڑھے گئے تھے۔ سوالات کرتے ہوئے جو حوالہ جات پیش کیے جا رہے تھے یا یوں کہنا مناسب ہو گا کہ جن کو پیش کرنے کی کوشش کی جارہی تھی وہ عجیب افراتفری کا شکار تھے۔ اٹارنی جنرل صاحب نے حضور سے کہا کہ جو حوالے میں نے کل پڑھے تھے آپ نے ان کی تصدیق کر لی ہے؟ اس پر حضرت خلیفۃ المسیح الثالث ؒ نے فرمایا ”ایک ایک کولے لیتے ہیں جو 29/ جنوری 1915ء کا آچکا ہے یہ پڑھ کر سنا دیجیئے۔ میں Verify کر دیتا ہوں۔“ اٹارنی جنرل صاحب نے فرمایا کہ کل جو آخر میں پڑھا تھا وہ پہلے پڑھتا ہوں۔ ایک روز پہلے انہوں نے ایک حوالہ پیش کیا تھا اور کتاب کا نام ”شریعتِ نبوت“ بیان فرمایا تھا۔ آج اس حوالہ کی کتاب کا نام اور صفحہ نمبر سب نیا جنم لے چکے تھے۔ اب انہوں نے یہ عبارت پڑھی ”اسلامی شریعت نبی کے جو معنی کرتی ہے اس کے معنی سے حضرت مرزا غلام احمد ہرگز مجازی نہیں بلکہ حقیقی نبی ہیں۔ (حقیقۃ النبوّت صفحہ 174)۔ اب اس بحث سے ان کا مقصد یہ تھا کہ چونکہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کو حقیقی نبی لکھا گیا ہے اس لیے اس سے مراد یہ ہے کہ انہوں نے صاحبِ شریعت ہونے کا دعویٰ کیا ہے۔ کیونکہ جب ایک روز قبل یہ حوالہ پیش کیا گیا تھا تو اس وقت شرعی اور غیر شرعی انبیاء کا تذکرہ چل رہا تھا۔ پہلی تو یہ بات قابلِ غور ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام، حضرت سلیمانؑ ، حضرت ایوبؑ، حضرت یعقوبؑ اور بہت سے دوسرے انبیاء شریعت نہیں لائے تھے۔ تو کیا یہ سب حقیقی نبی نہیں تھے، کیا ان کو غیر حقیقی انبیاء کہہ کر ان کی شان میں گستاخی کی جائے گی یا اگر کسی بھی لحاظ سے یہ کہا جائے کہ یہ حقیقی انبیاء تھے تو اس کا یہ مطلب لیا جائے گا کہ ان کو شرعی نبی سمجھا جا رہا ہے؟ اور اسی کتاب میں جو حضرت خلیفۃ المسیح الثانی کی تصنیف ہے اس بات کی وضاحت بار بار کی گئی ہے۔ اس کا صرف ایک حوالہ پیش ہے۔

”حقیقی اور مجازی کی اس تشریح کو سمجھنے کے بعد حضرت صاحب کے اس فقرہ کو لو کہ میں مجازی طور پر نبی ہوں اور حقیقی طور پر نبی نہیں ہوں۔ اور شریعت اسلام کو دیکھو کہ وہ نبی کسے کہتی ہے اور چونکہ شریعت اسلام قرآن کریم ہی ہے اسے جب ہم دیکھتے ہیں تو اس میں نبی کی تعریف یہی معلوم ہوتی ہے کہ جس شخص پر کثرت سے اظہار غیب ہو اور انذاری اور تبشیری رنگ اس کی پیشگوئیوں میں پایا جائے۔ اب یہ دونوں باتیں حضرت مسیح موعود میں پائی جاتی ہیں۔ اور تیسری یہ بات بھی موجود ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپکا نام نبی رکھا۔ پس شریعت اسلام نبی کے جو معنے کرتی ہے، اسکے معنے سے حضرت صاحب ہر گز مجازی نبی نہیں ہیں بلکہ حقیقی نبی ہیں۔ ہاں حضرت مسیح موعود نے لوگوں کو اپنی نبوت کی قسم سمجھانے کیلئے اصطلاحی طور پر نبوت کی جو حقیقت قرار دی ہے جس کے یہ معنے ہیں کہ وہ شریعت جدیدہ لائے۔ اس اصطلاح کے رُو سے حضرت مسیح موعود ہر گز حقیقی نبی نہیں ہیں بلکہ مجازی نبی ہیں یعنی کوئی جدید شریعت نہیں لائے۔“

(”حقیقۃالنبوت حصہ اوّل“ از حضرت مصلح موعود۔ اشاعت 1925 ء۔ صفحہ 174-173)

حضرت خلیفۃ المسیح الثالث نے فرمایا کہ اس کتاب میں اصل عبارت یہ لکھی ہے کہ اگر حقیقہ کے معنی شرعی نبی کئے جائیں تو میں آپ کو حقیقی نبی نہیں مانتا لیکن اگر حقیقی کے مقابلہ پر بناوٹی رکھا جائے تو میں آپ کو بناوٹی نبی نہیں مانتا۔ اس جواب سے یہ صاف ظاہر تھا کہ اس حوالہ کو پیش کر کے مخالفین جو مطلب نکالنا چاہتے تھے وہ مطلب اس عبارت سے اخذ نہیں کیا جاسکتا۔

اس کے بعد بھی سوالات کرنے والے احباب کا ستارہ گردش میں ہی رہا۔ اٹارنی جنرل صاحب نے یہ ثابت کرنے کے لئے کہ احمدیوں کے نزدیک نعوذُ باللہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام قرآنِ کریم سے علیحدہ ایک نئی شریعت لے کر آئے ہیں، ایک حوالہ پڑھنا شروع کیا اور اس حوالہ میں یہ عبارت پڑھ گئے۔

”… ہمارا ایمان ہے کہ آنحضرت ﷺ خاتم الانبیاء ہیں اور قرآن ربّانی کتابوں کا خاتم ہے۔ تاہم خدا تعالیٰ نے اپنے نفس حرام نہیں کیا کہ تجدید کے طور پر کسی اور معمول کے ذریعہ یہ احکام صادر کرے کہ جھوٹ نہ بولو جھوٹی گواہی نہ دو زنا نہ کرو خون نہ کرو ظاہر ہے ایسا بیان شریعت ہے جو مسیح موعود کا بھی کام ہے…“

اب اس عبارت میں واضح طور پر نئ شریعت کی تردید تھی، یہ صرف تجدیدِ احکام کا ذکر تھا۔ اس پر حضور نے فرمایا کہ یہ تو بہت واضح ہو گیا ہے۔ اس پر اٹارنی جنرل صاحب کو اس دلیل کو ترک کر کے دوسرا موضوع شروع کرنا پڑا۔

اس کے بعد 29/ جنوری یا 26/ جنوری کے اُس پُر اسرار حوالہ کا ذکر شروع ہوا جس کی فرضی ٹوٹی پھوٹی عبارت ایک روز قبل پڑھی گئی تھی۔ 7/ اگست کی کارروائی میں یہ حوالہ 29/ جنوری 1915ء کا بنا ہوا تھا۔ اٹارنی جنرل صاحب نے ایک مرتبہ پھر اس حوالے کی عبارت دہرائی۔ حضور نے فرمایا کہ اس روز تو الفضل شائع ہی نہیں ہوا تھا۔ اصولاً تو سوال پیش کرنے والوں کے پاس حوالہ یا ثبوت ہونا چاہئے تھا لیکن اب ان کے لیے عجیب صورتِ حال پیدا ہوئی تھی کہ جس روز کے الفضل کا وہ حوالہ اتنے فخر سے پیش کر رہے تھے، اس روز تو الفضل شائع ہی نہیں ہوا تھا۔ کیونکہ اس دور میں الفضل روزانہ شائع نہیں ہوتا تھا۔ اب اپنی خفت کو چھپانے کے لیے اٹارنی جنرل صاحب نے ایک اور ذہنی قلابازی کھائی اور فرمایا کہ 19/ جنوری میں یا کسی اور شمارہ میں یہ چھپا ہو گا۔ ان کی یہ عجیب و غریب دلیل پڑھ کر تو ہنسی آتی ہے۔ یہ صاحب قومی اسمبلی کی ایک اہم کمیٹی میں ایک حوالہ پیش کر رہے تھے اور دو روز میں ایک سے زائد مرتبہ پیش کر چکے تھے۔ اور علماء کی ایک ٹیم اس کام میں ان کی اعانت کر رہی تھی اور اس حوالہ کی بنا پر وہ اپنے زعم میں جماعت احمدیہ کے خلاف کیس مضبوط کر رہے تھے اور ابھی انہیں یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ یہ حوالہ کس تاریخ کا تھا۔ اس پر حضور نے واضح الفاظ میں فرمایا” نہیں نہیں، یہ کسی Issue میں نہیں ہے۔ کسی حوالہ میں نہیں ہے۔ یہ بنایا گیا ہے۔“ اس تاریخ

کے قریب ترین الفضل جو شائع ہوئے تھے ان کے نمبر ہی اس بات کو واضح کر دیتے ہیں کہ اس روز الفضل شائع نہیں ہوا تھا اور وہ نمبر یہ تھے۔

28/ جنوری 1915ء جلد نمبر 2 نمبر 97

31/ جنوری 1915ء جلد نمبر 2 نمبر 98

اور یہ عبارت الفضل میں شائع ہی نہیں ہوئی۔

اس پر اٹارنی جنرل صاحب نے یہ بات ختم کی۔ اب اٹارنی جنرل صاحب بلکہ یوں کہنا چاہئیے کہ ممبرانِ قومی اسمبلی ایک عجیب صورتِ حال سے دوچار ہو چکے تھے۔ انہوں نے بہت سے حوالے جمع کر کے ایک کیس تیار کیا تھا لیکن اب یہ ہو رہا تھا کہ وہ ایک کتاب کا حوالہ پیش کرتے تھے تو معلوم ہوتا تھا کہ اس کتاب کا کوئی وجود ہی نہیں۔ کبھی وہ ایک کتاب کا صفحہ نمبر بتاتے تو حقیقت یہ سامنے آتی کہ اس کتاب کے اتنے صفحات ہی نہیں۔ اگر کتاب کا نام مصنف کے نام سمیت بتایا جاتا تو عقدہ یہ کھلتا اس مصنف نے کبھی کوئی کتاب اس نام سے نہیں لکھی۔ اگر یحییٰ بختیار صاحب قسمت سے کوئی معین عبارت پڑھتے تو آخر کار یہ انجام ہمارے سامنے ہے کہ اصل میں اس کتاب میں یہ معین عبارت موجود ہی نہیں۔ کسی اخبار کا حوالہ پڑھا تو انجام یہ ہوا کہ یہ ثابت ہو گیا کہ اس روز تو یہ اخبار شائع ہی نہیں ہوا۔ اٹارنی جنرل صاحب جانتے تھے کہ ان کی بہت سی غلطیاں تو ابھی سے سامنے آ چکی ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ انہیں یہ بھی پتہ تھا کہ ابھی جب تحقیق ہو گی تو بہت سی مزید غلطیاں سامنے آئیں گی۔ اس کا جواز پیدا کرنے کی انہوں نے جو کوشش کی وہ انہی کا حصہ ہے۔ حضرت خلیفة المسیح الثالثؒ نے ابن تیمیہ کی ایک کتاب ' کتاب الایمان " کا حوالہ دیا اور اپنے ممبرانِ وفد کو کتاب دینے کا

ارشاد فرمایا تو اس کے ساتھ اس کتاب کے ایڈیشن کے متعلق استفسار فرمایا کہ یہ مطبوعہ مصر ہے؟ اس پر یحییٰ بختیار صاحب نے اپنی خفت مٹانے کے لئے فرمایا:۔

”کیونکہ بعض مرزا صاحب کی کتابوں کے مختلف ایڈیشن ہیں اس سے بھی تصدیق ہوتی ہے۔“

کسی نے یہ نہیں کہا تھا کہ حضرت مسیح موعودؑ کی کتابوں کا ایک ہی ایڈیشن شائع ہوا تھا۔ یقیناً حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی سب کتابوں کے کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں لیکن اگر ایک حوالہ نہ مل رہا ہو تو یہ حوالہ پیش کرنے والے کا فرض ہے کہ جس ایڈیشن سے حوالہ پیش کیا جا رہا ہے اس کی وضاحت کرے اور ان دو دنوں میں ان کی غلطیوں کا دائرہ صرف غلط ایڈیشن بتانے تک محدود نہیں تھا بلکہ بہت وسیع ہو چکا تھا۔

اب انہوں نے حوالہ جات کے علم سے باہر نکل کر علم تاریخ کا رُخ کیا اور انہوں نے کہا کہ وہ ایک جریدہ کا حوالہ پڑھنا چاہتے ہیں۔ جریدہ کا نام Impact تھا اور یہ 27/ جون 1974ء کے شمارے کا حوالہ تھا۔ ابھی یہ بھی واضح نہیں ہوا تھا کہ وہ کیا فرمانا چاہ رہے ہیں کہ حضور نے اس جریدہ کی اس تحریر کے متعلق ان سے استفسار فرمایا Who is the writer? یعنی اس تحریر کو لکھنے والا کون ہے؟ اس پر اٹارنی جنرل صاحب نے کمال قولِ سدید سے فرمایا I really do not know یعنی حقیقت یہ ہے کہ مجھے اس کا علم نہیں ہے۔ حضور نے اگلا سوال یہ فرمایا What is the standing of this publication? یعنی اس اشاعت یا جریدہ کی حیثیت کیا ہے؟ یعنی کیا یہ کوئی معیاری جریدہ ہے یا کوئی غیر معیاری جریدہ ہے۔ اس کی حیثیت ایسی ہے بھی کہ نہیں کہ اس کے لکھے کو ایک دلیل کے طور پر پیش کیا جائے۔ چونکہ یہ ایک غیر معروف نام تھا اس لیے اس سوال کی ضرورت پیش آئی۔ اس سوال کے جواب میں اٹارنی جنرل صاحب نے ایک بار پھر نہایت بے نفسی سے فرمایا May be nothing at all, Sir یعنی جناب شاید اس کی وقعت کچھ بھی نہیں ہے۔ خیر اس کے بعد حضرت

خلیفة المسیح الثالثؒ نے دریافت فرمایا: Have we any thing to do with this یعنی کیا ہمارا اس تحریر سے کوئی تعلق ہے؟ اس کا جواب یہ موصول ہوا No! No! You have got nothing to do with it. I do not know یعنی ” نہیں ! نہیں! آپ کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ مجھے نہیں علم ....

اب یہ ایک عجیب مضحکہ خیز منظر تھا کہ اٹارنی جنرل آف پاکستان پوری قومی اسمبلی پر مشتمل سپیشل کمیٹی میں ایک جریدہ کی ایک تحریر بطور دلیل کے پیش کر رہا ہے اور اسے یہ بھی علم نہیں کہ یہ تحریر لکھی کس کی ہوئی ہے ، اسے یہ بھی خبر نہیں کہ اس جریدہ کی کوئی حیثیت بھی ہے کہ نہیں۔ بہر حال انہوں نے حوالہ پڑھنے کا شوق جاری رکھا اور ایک طویل اقتباس پڑھا۔ اس کی تحریر اور ایک موضوع سے دوسرے موضوع پر بھٹکتے چلے جانا ہی بتا رہا تھا کہ یہ ایک غیر معیاری تحریر ہے لیکن اس کا لُبِ لُباب یہ تھا کہ احمدیوں نے خود اپنے آپ کو باقی مسلمانوں سے علیحدہ کیا ہے اور بعض وہ اعتراضات دہرائے جن کا جواب پہلے ہی گزر چکا ہے۔ لیکن جس حصہ کو اٹارنی جنرل صاحب نے بہت زور دے کر پڑھا اس میں دو اعتراضات تھے جن کا مختصراً ذکر کرنا مناسب ہو گا۔

ایک اعتراض تو اس تحریر میں یہ کیا گیا تھا کہ جب پنجاب کے باؤنڈری کمیشن میں پاکستان کا مقدمہ پیش ہو رہا تھاتو

At the time of independance and demarcation of boundries the Qadianis submitted a representation as a group seperate from Muslims. This had the effect of decreasing the proportion of the Muslims population in some marginal areas in the Punjab and on consequent award Gurdaspur was given to India to enable her to have link with Kashmir .

یعنی آزادی کے وقت جب سرحدوں کے خطوط کھینچے جا رہے تھے، اس وقت قادیانیوں نے مسلمانوں سے ایک علیحدہ گروہ کے طور پر اپنا موقف پیش کیااور اس کے نتیجہ میں پنجاب کے بعض سرحدی علاقوں میں مسلمانوں کی تعداد کم ہو گئی اور بعد میں گورداسپور کو بھارت کو دے دیا گیا اور اس طرح وہ اس قابل ہو گیا کہ وہ کشمیر سے رابطہ پیدا کر سکے۔

یہ الزام بالکل غلط تھا۔ احمدیوں نے مسلم لیگ کی اعانت کے لیے اپنا میمورنڈم پیش کیا تھا۔ مسلم لیگ نے خود اپنے وقت میں سے جماعت کو اپنا موقف پیش کرنے کا کہا تھااور احمدیوں نے اپنے آپ کو مسلمانوں کا حصہ قرار دے کر کے استدعا کی تھی کہ گورداسپور کا ضلع پاکستان کے ساتھ شامل کیا جائے۔ سکھوں نے اپنا موقف پیش کیا تھا کہ ہمارے مقدس مقامات جن اضلاع میں ہیں ان کو بھارت میں شامل کیا جائے کیونکہ ہم بھارت میں شامل ہونا چاہتے ہیں۔ اس کے جواب میں جماعتِ احمدیہ نے یہ میمورنڈم پیش کیا تھا کہ قادیان میں ہمارے مقدس مقامات ہیں اور ہم مسلمان ہیں اور پاکستان میں شامل ہونا چاہتے ہیں اور قائد اعظم نے مسلم لیگ کا مقدمہ پیش کرنے کے لیے حضرت چوہدری ظفراللہ خان صاحب کا انتخاب کیا تھا اور جتنی جد وجہد کی تھی حضرت چوہدری صاحب اور جماعتِ احمدیہ نے کی تھی ورنہ پنجاب کی مسلم لیگ تو فقط ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھی رہی تھی لیکن یہاں ذکر ضروری ہے کہ خود حکومتِ پاکستان نے یہ سب کارروائی مع جماعت کے میمورنڈم کے 1983ء میں حرف بحرف شائع کی اور یہ دور جماعتِ احمدیہ کے اشد ترین مخالف جنرل ضیاء صاحب کے دورِ صدارت کا تھا۔ اس کتاب کا نام The partition of the Punjab ہے اور اس کی پہلی جلد میں صفحہ 428 سے

469 تک جماعت کا میمورنڈم حرف بحرف نقل کیا گیا ہے۔ اس کے چند حوالے پیشِ خدمت ہیں۔ قادیان کے بارے میں اس کا پہلا نکتہ ہی یہ تھا

It is the living centre of the world wide Ahmadiyya movement in Islam.

پھر لکھا ہے:۔

The Headquarters of the Ahmadiyya Community, an important religious section of Muslims having branches all over the world, is situated in the district of Gurdaspur.

احمدیہ جماعت کا مرکز، جو کہ مسلمانوں کا ایک اہم حصہ ہیں اور ان کی شاخیں پوری دنیا میں ہیں، ضلع گورداسپور میں ہے۔

اس میمورنڈم کے آغاز میں ہی یہ صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ جماعتِ احمدیہ نے قطعاً اپنے آپ کو مسلمانوں سے علیحدہ گروہ کے طور پر پیش نہیں کیا تھا بلکہ اپنے آپ کو مسلمانوں کے حصہ کے طور پر پیش کیا تھا اور اس وقت مسلم لیگ نے قطعًا اس کی تردید نہیں کی تھی۔ اس وقت کانگرس کی طرف سے یہ موقف پیش کیا جا رہا تھا کہ گو بعض اضلاع میں مسلمان اکثریت میں ہیں مگر یہاں پر ہندوؤں اور سکھوں کے پاس جائیداد زیادہ ہے اس لیے ان اضلاع کو ہندوستان میں شامل کرنا چاہیے۔ اس کے متعلق جماعتِ احمدیہ نے اپنے میمورنڈم میں یہ موقف بیان کیا

If the idea of Pakistan was to give Muslims a chance to make up their losses in political and economic life and if this idea of division (which has been accepted by the British Government and the congress) is legitimate, then any attempt to partition the Muslims areas on the basis of property or superior economic status is to nullify the very idea of Pakistan, and will have to be rejected as fundamentally wrong.

اب کتنا صاف ظاہر ہے کہ جماعتِ احمدیہ تو ہر طرح مسلم لیگ کے موقف کی تائید کر رہی ہے۔

اور جب اس کمیشن کے ایک جج جسٹس تیجا سنگھ صاحب نے سوال پوچھا

What is the position of the Ahmadiyya community as regards Islam .

احمدیہ جماعت کا اسلام سے کیا تعلق ہے یا ان کی مسلمان ہونے کے بارے میں کیا پوزیشن ہے؟

تواس پر جماعتِ احمدیہ کے نمائندہ مکرم شیخ بشیر احمد صاحب نے اس کا جو جواب دیا اس کا پہلا جملہ یہ تھا

They claim to be Mussalmans first and Mussalmans last. They are part of Islam.

یعنی وہ شروع سے لے کر آخر تک مسلمان ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں اور وہ اسلام کا حصہ ہیں۔

ان چندمثالوں سے یہ صاف نظر آتا ہے کہ یہ الزام بالکل غلط ہے کہ باؤنڈری کمیشن میں احمدیوں نے اپنے آپ کو مسلمانوں سے علیحدہ گروہ کے طور پر پیش کیا تھا۔ نہ صرف جماعتِ احمدیہ نے مسلم لیگ کے موقف کو مضبوط کرنے کے لئے یہ میمورنڈم پیش کیا تھا بلکہ اس وقت مسلم لیگ بھی اس کمیشن کے روبرو بہت زور دے کر یہ موقف پیش کر رہی تھی کہ وہ احمدی مسلمانوں کا ایک فرقہ ہیں اور انہوں نے مکمل طور پر پاکستان کی حمایت کا اعلان کیا ہے اور قادیان ان کا مقدس مقام ہے۔ اس لئے ضلع گورداسپور کو پاکستان میں ہی شامل ہونا چاہئیے۔ مسلم لیگ بٹالہ نے جو میمورنڈم پیش کیا تھا اس میں بہت زور دے کر یہ نکتہ بیان کیا گیا تھا۔

(The Partition of the Punjab, Vol 1, published by Sang e Meel Publication p472)

اور دلچسپ بات یہ ہے کہ باؤنڈری کمیشن کی کارروائی کا مکمل ریکارڈ تو حکومتِ پاکستان کی اپنی تحویل میں تھا اور بعد میں جب حکومتِ پاکستان نے یہ کارروائی شائع کی تو یہ بات روزِ روشن کی طرح ثابت ہو گئی کہ 1974ء کی کارروائی میں اٹارنی جنرل صاحب نے ایک انگریزی جریدہ کے حوالہ سے جو الزام لگایا تھا وہ بالکل غلط تھا۔ اور انہیں اس بات کی ضرورت کیوں پیش آئی تھی کہ وہ اس مسئلہ پر ایک غیر معروف انگریزی جریدہ کا حوالہ پیش کریں، اصل کارروائی تو ان کی حکومت کی اپنی تحویل میں تھی جس کا سرسری مطالعہ ہی اس بات کو ظاہر کر دیتا کہ یہ الزام غلط ہے۔ یا تو اٹارنی جنرل صاحب اور ان کی ٹیم قومی اسمبلی اور قوم کو غلط حقائق پیش کر کے عمداً دھوکہ دے رہے تھے یا پھر انہیں حقائق کی کچھ خبر نہ تھی اور شاید اس سے کوئی دلچسپی بھی نہیں تھی۔

ایک اور دلچسپ بات جو یہاں درج کرنی مناسب ہو گی وہ یہ ہے کہ جب ہم نے صاحبزادہ فاروق علی خان صاحب سے انٹرویو کیا تو انہوں نے کہا کہ باؤنڈری کمیشن میں چوہدری ظفراللہ خان صاحب سے پوچھا گیا کہ کیا آپ اپنے آپ کو مسلمان سمجھتے ہیں؟ تو چوہدری صاحب نے کہا کہ باقی مسلمان ہمیں مسلمان نہیں سمجھتے قادیانی کہتے ہیں اور گورداسپور اسی لئے گیا تھا۔

یہاں ہم بڑے ادب سے یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ اب یہ تمام کارروائی شائع ہو چکی ہے اور ایک ایک لفظ شائع ہوا ہے۔ اس طرح کا کوئی واقعہ سرے سے ہوا ہی نہیں تھا اور یہ سوال حضرت چوہدری ظفراللہ خان صاحب سے ہونا ہی کیوں تھا۔ وہ تو مسلم لیگ کا کیس پیش کر رہے تھے۔ جماعتِ احمدیہ کی طرف سے مسلم لیگ کے ایماء پر تو شیخ بشیر احمد صاحب پیش ہوئے تھے اور ان سے اس قسم کا سوال جسٹس تیجا سنگھ صاحب نے کیا تھا اور اس کا جو جواب انہوں نے دیا تھا وہ ہم نقل کر چکے ہیں۔ اس مثال سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس کارروائی کے دوران اربابِ حل و عقد ان موضوعات کے متعلق بنیادی حقائق سے بھی بے خبر تھے جن کے متعلق سوالات کئے جا رہے تھے اور یہ صورتِ حال اس لئے بھی زیادہ افسوسناک ہوجاتی ہے کہ یہ ریکارڈ حکومت کی

تحویل میں تھا اور کسی نے حقائق جاننے کی کوشش بھی نہیں کی۔ اس لئے یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ صرف غیر سنجیدہ انداز میں سوالات کئے جا رہے تھے۔

اب ایک سوال باقی رہ جاتا ہے۔ کیا اس وقت اٹارنی جنرل صاحب اور ان کے ساتھی ممبرانِ اسمبلی نے محض عام پروپیگنڈا سے متاثر ہو کر اس جریدے کے حوالے سے یہ غلط الزام جماعتِ احمدیہ پر لگایا تھا یا پھر انہوں نے عمداً غلط بیانی سے کام لیتے ہوئے اپنے کمزور موقف میں جان پیدا کرنے کی کوشش کی تھی۔ جیسا کہ ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ 1947ء میں احمدیوں کی تعداد کے بارے میں بحث کرتے ہوئے جماعتِ احمدیہ کا وہ میمورنڈم جو کہ باؤنڈری کمیشن کے سامنے پیش کیا گیا تھا ہاتھ میں پکڑ کر حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ کو دکھایا بھی تھا کہ یہ اس میمورنڈم کی کاپی ہے۔ اس سے یہ واضح طور پر ظاہر ہو تا ہے کہ اٹارنی جنرل صاحب اور ان کی ٹیم یہ میمورنڈم ریکارڈ سے نکلوا چکے تھے اور اس کے مندرجات ان کے علم میں تھے۔ اس کے باوجود انہوں نے سپیشل کمیٹی کے روبرو دانستہ طور پر غلط الزامات پیش کئے تھے۔ یہ ایک تلخ حقیقت ہے اور یہ پہلو پاکستان کی پارلیمانی تاریخ کا ایک شرمناک باب ہے۔

اب ہم اُس دوسرے الزام کا جائزہ لیتے ہیں جو Impact کے اس شمارے میں جماعت پر لگایا گیا تھا اور وہ یہ تھا:۔

Many allege a Qadiani role in the breakup of Pakistan. Suggestion to this effect were made even in the correspondence column of Bangladesh observer.Given this background the recent eruption of widespread disturbance should come as no surprise but it is deplorable too .

یعنی اٹارنی جنرل صاحب جس جریدہ کی بیساکھیوں کا سہارا لے کر جماعتِ احمدیہ کے خلاف یہ الزامات پڑھ رہے تھے، اس کے مطابق بہت سے لوگوں کے نزدیک چند سال پہلے پاکستان ٹوٹا تھا اور مشرقی پاکستان علیحدہ ہو کر بنگلہ دیش بن گیا تھا تو اس کے ذمہ دار بھی احمدی تھے اور اس پس منظر میں اگر احمدیوں کے خلاف موجودہ فسادات شروع ہو گئے ہیں تو یہ بات قابلِ حیرت نہیں اگرچہ قابلِ مذمت ضرور ہے۔

ہم یقیناً اس بات سے متفق ہیں کہ سقوطِ ڈھاکہ کا سانحہ اور پاکستان کا دو لخت ہو جانا ایک بہت بڑا سانحہ تھا۔ اور جو گروہ بھی اس کا ذمہ دار تھا اس کو سزا ملنی چاہئے تھی۔ لیکن ہم ایک بات سمجھنے سے قاصر ہیں کہ جب سانحہ ہو چکا تھا تو اس کے معاً بعد ملک میں پاکستان پیپلز پارٹی کی حکومت قائم ہو گئی تھی۔ اور اٹارنی جنرل صاحب اسی پارٹی کی حکومت کی نمائندگی کر رہے تھے اور اسمبلی کی اکثریت کا تعلق بھی اس پارٹی سے تھا۔ جیسا کہ توقع تھی حکومت نے 26/ دسمبر 1971ء کو جب کہ ابھی مشرقی پاکستان میں شکست کو ایک ماہ بھی نہیں ہوا تھا ایک کمیشن قائم کیا تاکہ وہ اس سانحہ کے ذمہ دار افراد کا تعیّن کرے۔ اس کمیشن کی سربراہی پاکستان کے چیف جسٹس جناب جسٹس حمود الرحمن صاحب کر رہے تھے۔ حمود الرحمن صاحب کا تعلق بنگال سے تھا۔ پنجاب اور سندھ کے چیف جسٹس صاحبان اس کمیشن کے ممبر تھے اور عسکری پہلوؤں کے بارے میں مدد دینے کے لیے مکرم لیفٹیننٹ جنرل الطاف قادر صاحب مقرر کئے گئے۔ اس کمیشن نے تمام واقعات کی تحقیق کر کے 8/ جولائی 1972ء کو اپنی رپورٹ حکومت کے حوالے کر دی تھی۔ یعنی اسمبلی کی اس کمیٹی کے کام شروع کرنے سے دو سال قبل حکومت کے پاس یہ رپورٹ پہنچ چکی تھی کہ سانحہ مشرقی پاکستان کا ذمہ دار کون تھا۔ اور اٹارنی جنرل صاحب جس حکومت کی نمائندگی کر رہے تھے وہ بخوبی جانتی تھی کہ مجرم کون کون تھا۔ مگر نامعلوم وجوہات کی بناء پر حکومت نے یہ رپورٹ شائع نہیں کی اور 1974ء میں یہ رپورٹ منظرِ عام پر نہیں آئی

تھی۔ اور چند دہائیوں بعد یہ رپورٹ جو کہ خفیہ رکھی گئی تھی پاکستان کی حکومت کی مستعدی کے باعث بھارت پہنچ گئی اور وہاں شائع ہو گئی اور اس کے بعد پھر حکومتِ پاکستان بھی اس رپورٹ کو منظر عام پر لے آئی۔

اب ہم رپورٹ کا جائزہ لیتے ہیں کہ کیا اس میں یہ لکھا ہے کہ احمدی اس ملک کو دو لخت کرنے کے ذمہ دار تھے؟ ہر گز نہیں۔ اس رپورٹ میں کہیں جماعتِ احمدیہ پر یہ مضحکہ خیز الزام نہیں لگایا گیا۔ اس رپورٹ میں اس سانحہ کا سب سے زیادہ ذمہ دار اس وقت کی حکومتِ پاکستان اور افواجِ پاکستان کے سربراہ جنرل یحیٰی خان صاحب اور ان کے ساتھی جرنیلوں کو قرار دیا تھا اور یہ سفارش کی تھی ان پر مقدمہ چلایا جائے۔ اور اس رپورٹ میں یہ بھی لکھا گیا تھا کہ پاکستان کی افواج کی ہائی کمان نہ حالات کا صحیح تجزیہ کر پا رہی تھی اور نہ انہیں صحیح طرح ملک کو درپیش خطرات کا کوئی اندازہ تھا اور نہ افواج جنگ کرنے کے لیے کسی طور پر تیار تھیں۔ مالی بد عنوانی کے الزامات اور غیر آئینی طریقوں سے اقتدار حاصل کرنے کے شواہد سامنے آئے تھے۔ دورانِ جنگ مجرمانہ غفلت کی نشاندہی کی گئی۔ آپریشن کے دوران مشرقی پاکستان میں قتل و غارت اور دیگر مظالم کی نشاندہی کی گئی۔ اور حکومت سے کمیشن نے یہ بھی کہا کہ ان امور پر تفصیلی تحقیقات بلکہ کھلا مقدمہ چلایا جائے اور قصوروار افراد کو سزا دی جائے اور اس کمیشن نے اس رپورٹ میں پاکستان پیپلز پارٹی کے چیئر مین پر بھی تنقید کی تھی کہ انہوں نے کیوں اسمبلی کے اجلاس سے بائیکاٹ کیا اور کہا کہ وہ مغربی پاکستان سے کسی کو ڈھاکہ میں اسمبلی کے اجلاس میں شامل نہیں ہونے دیں گے اور اس بات پر تحفظات کا اظہار کیا گیا تھا کہ پیپلز پارٹی کے چیئرمین نے اُدھر تم اِدھر ہم کا نعرہ کیوں لگایا تھا۔ ان عوامل کی وجہ سے آئینی طریقوں کے راستے بند ہو گئے اور حالات بگڑتے گئے۔

یہ رپورٹ حکومت کے حوالے کی گئی لیکن حکومت نے اس رپورٹ کو خفیہ رکھا اور عوام کو ان حقائق سے لا علم رکھا۔ اور اس رپورٹ کی سفارشات کے مطابق ذمہ دار افراد کے خلاف مقدمات بھی نہیں چلائے گئے

اور نہ ہی انہیں کوئی سزا دی گئی۔ بلکہ اس رپورٹ میں جن افراد کو ذمہ دار قرار دیا گیا تھا کہ انہوں نے اقتدار حاصل کرنے اور اسے دوام بخشنے کے لیے غیر قانونی ذرائع اختیار کیے اور رشوت ستانی سے بھی کام لیا، ان میں سے ایک کو پیپلز پارٹی کی حکومت نے فوج کا نیا سربراہ مقرر کر دیا جیسا کہ کمیشن نے پہلے سفارش کی تھی جب وہ جرنیل جو جنگی قیدی بنے ہوئے تھے ملک واپس آگئے تو حکومت نے اس کمیشن کو دوبارہ کام شروع کرنے کا کہا تاکہ ان سے تحقیقات کر کے رپورٹ کے نا مکمل حصہ کو مکمل کیا جائے۔ چنانچہ جب باقی جرنیل قید سے ملک واپس آگئے تو اس کمیشن کا دوبارہ احیاء کیا گیا تاکہ تحقیقات مکمل کر لی جائیں۔ یہ حکم 25/ مئی 1974ء کو جاری ہوتا ہے اور چند روز بعد ہی جماعت کے خلاف فسادات شروع ہو جاتے ہیں یا یوں کہنا زیادہ مناسب ہو گا کہ شروع کرا دیئے جاتے ہیں اور اسمبلی کی اس سپیشل کمیٹی کی کارروائی کے دوران اٹارنی جنرل صاحب اس جریدہ کے حوالے سے یہ الزام سامنے لا رہے ہیں کہ ملک کو دو لخت کرنے کی ذمہ داری احمدیوں پر عائد ہوتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ ان کے خلاف یہ فسادات شروع ہوئے ہیں۔ جب کہ اربابِ حکومت جانتے تھے کہ یہ الزام جھوٹا ہے۔ وہ صرف لا یعنی الزامات عائد کر کے دھوکا دینے کی کوشش کر رہے تھے اور حقائق پاکستان کے عوام سے پوشیدہ رکھے جا رہے تھے۔

ہاں جہاں تک جماعتِ احمدیہ سے تعلق رکھنے والے جنرل یعنی جنرل افتخار جنجوعہ صاحب کا تعلق تھا تو یہ پاکستان کی تاریخ کے واحد جنرل تھے جنہوں نے دورانِ جنگ جامِ شہادت نوش کیا اور کسی جرنیل کو یہ سعادت نصیب نہیں ہوئی اور اس رپورٹ سے یہ واضح طو ر پر نظر آتا ہے کہ اس جنگ کے دوران ان میں سے اکثر اس سعادت کے لیے مشتاق بھی نہیں تھے اور حمود الرحمن رپورٹ میں جہاں باقی اکثر جرنیلوں پر شدید تنقید کی گئی ہے اور انہیں مجرم قرار دیا گیا ہے وہاں جنرل افتخار جنجوعہ شہید کے متعلق اس رپورٹ میں A capable and bold commander کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ اور کسی جرنیل کے متعلق یہ الفاظ استعمال نہیں کیے

گئے ہاں ان کی کارکردگی کا بھی ناقدانہ جائزہ لیا گیا ہے اور اس میں بھی بعض امور کی نشاندہی کی گئی ہے۔ لیکن فرق دیکھیں کہ باقی جرنیلوں پر یہ تنقید کی گئی کہ وہ لڑنے کے لیے تیار ہی نہیں تھے انہوں نے موجود وسائل کا بھی صحیح استعمال نہیں کیا، وہ قائدانہ صلاحیتوں کا مظاہرہ نہیں کر سکے۔ وہ مرکزی کمان کو بھی غیر ضروری طور پر سیاہ تصویر دکھاتے رہے، اپنے فرائض چھوڑ کر چلے گئے وہاں جنرل جنجوعہ شہید پر یہ تبصرہ کیا گیا کہ انہیں جس علاقہ پر قبضہ کرنے کا کہا گیا تھا وہ اس سے زیادہ علاقہ پر قبضہ کرنے کے لیے کوشاں تھے اور جی ایچ کیو کو چاہئے تھا کہ انہیں اس سے روکتا اور حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے بجائے علاقہ دشمن کے حوالہ کرنے کے دشمن کے علاقہ پر قبضہ کیا تھا۔ فرق صاف ظاہر ہے۔(59)

اس حبُّ الوطنی کا صلہ احمدیوں کو یہ دیا گیا کہ قومی اسمبلی میں یہ الزام لگایا گیا کہ ملک کو دو لخت کرنے کے ذمہ دار احمدی تھے۔ جب کہ اس کمیشن کی رپورٹ کے مطابق بھی جسے خود حکومت نے قائم کیا تھا اس الزام کو صرف ایک تیسرے درجہ کا جھوٹ ہی قرار دیا جا سکتا ہے۔

اس کے بعد اٹارنی جنرل صاحب نے دو ایسے اعتراضات کیے جو ایک طویل عرصہ سے مخالف مولویوں کی طرف سے کیے جاتے ہیں۔ اور وہ یہ کہ نعوذ باللہ حضرت مسیح موعودؑ نے اپنی بعض تحریروں میں حضرت عیسیٰؑ اور حضرت حسینؑ کی توہین کی ہے۔ اور اس نام نہاد الزام کو ثابت کرنے کے لیے وہ توڑ مروڑ کر یا سیاق وسباق سے علیحدہ کر کے بعض تحریروں کے حوالے پیش کرتے ہیں۔ ہم یہاں پر ان دو مقدس ہستیوں کے بارے میں حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی چند تحریروں کے اقتباسات پیش کرتے ہیں، جس سے اس الزام کی قلعی کھل جاتی ہے۔ اور زیادہ بحث کی گنجائش ہی نہیں رہتی۔

حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے اپنے ایک اشتہار میں تحریر فرمایا:۔

”اس بات کو ناظرین یاد رکھیں کہ عیسائی مذہب کے ذکر میں ہمیں اسی طرز سے کلام کرنا ضروری تھا جیسا کہ وہ ہمارے مقابل پر کرتے ہیں۔ عیسائی لوگ درحقیقت ہمارے اس عیسیٰ علیہ السلام کو نہیں مانتے جو اپنے تئیں صرف بندہ اور نبی کہتے تھے اور پہلے نبیوں کو راستباز جانتے تھے اور آنے والے نبی حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ پر سچے دل سے ایمان رکھتے تھے اور آنحضرت ﷺ کے بارے میں پیشگوئی کی تھی بلکہ ایک شخص یسوع نام کو مانتے ہیں جس کا قرآن میں ذکر نہیں اور کہتے ہیں کہ اس شخص نے خدائی کا دعویٰ کیا اور پہلے نبیوں کو بٹمار وغیرہ ناموں سے یاد کرتا تھا۔ یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ شخص ہمارے نبی ﷺ کا سخت مکذب تھا اور اس نے یہ بھی پیشگوئی کی تھی کہ میرے بعد سب جھوٹے ہی آئیں گے۔ سو آپ لوگ خوب جانتے ہیں، کہ قرآن شریف نے ایسے شخص پر ایمان لانے کے لئے ہمیں تعلیم نہیں دی ... “ (60)

پھر حضرت مسیح موعود علیہ السلام اپنی تصنیف تحفہ قیصریہ میں تحریر فرماتے ہیں:۔

”اُس نے مجھے اس بات پر بھی اطلاع دی ہے کہ درحقیقت یسوع مسیح خدا کے نہایت پیارے اور نیک بندوں میں سے ہے اور ان میں سے ہے جو خدا کے برگزیدہ لوگ ہیں اور ان میں سے ہے جن کو خدا اپنے ہاتھ سے صاف کرتا اوراپنے نور کے سایہ کے نیچے رکھتا ہے لیکن جیسا کہ گمان کیا گیا ہے خدا نہیں ہے۔ ہاں خدا سے واصل ہے اور ان کاملوں میں سے ہے جو تھوڑے ہیں۔“ (61)

”اور مفسد اور مفتری ہے وہ شخص جو مجھے کہتا ہے کہ میں مسیح ابنِ مریم کی عزت نہیں کرتا بلکہ مسیح تو مسیح میں تو اس کے چاروں بھائیوں کی بھی عزّت کرتا ہوں۔ کیونکہ پانچوں ایک ہی ماں کے بیٹے ہیں۔ نہ صرف اسی قدر بلکہ میں تو حضرت مسیح کی دونوں حقیقی ہمشیروں کو بھی مقدسہ سمجھتا ہوں۔ کیونکہ یہ سب بزرگ مریم بتول کے پیٹ سے ہیں۔“ (62)

ان حوالوں سے یہ بات روزِ روشن کی طرح واضح نظر آتی ہے کہ یہ الزام بالکل غلط اور بے بنیاد ہے کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے حضرت عیسیٰؑ کی توہین کی ہے یا آپ کے احترام کا خیال نہیں رکھا۔ اور حضرت حسینؓ کے بلند مقام کے متعلق حضرت مسیح موعودؑ کا فتویٰ ہے:۔

”... ہم اعتقاد رکھتے ہیں۔ کہ یزید ایک ناپاک طبع دنیا کا کیڑا اور ظالم تھا اور جن معنوں کی رو سے کسی کو مومن کہا جاتا ہے۔ وہ معنے اس میں موجود نہ تھے ... دنیا کی محبت نے اس کو اندھا کر دیا تھا۔ مگر حسین رضی اللہ عنہ طاہر مطہر تھا اور بلا شبہ ان برگزیدوں میں سے تھے جن کو خدا تعالیٰ اپنے ہاتھ سے صاف کرتا ہے اور اپنی محبت سے مامور کر دیتا ہے اور بلا شبہ وہ سردارانِ بہشت میں سے ہے اور ایک ذرہ کینہ رکھنا اس سے موجب سلبِ ایمان ہے اور اس امام کا تقویٰ اور محبت اور صبر اور استقامت اور زہد اور عبادت ہمارے لئے اسوہ حسنہ ہے۔۔ اور ہم اس معصوم کی ہدایت کی اقتدا کرنے والے ہیں۔ جو اس کو ملی تھی۔ تباہ ہو گیا وہ دل جو اس کا دشمن ہے۔ اور کامیاب ہو گیا وہ دل جو عملی رنگ میں اس کی محبت ظاہر کرتا ہے۔ اور اس کے ایمان اور اخلاق اور شجاعت اور تقویٰ اور استقامت اور محبت الٰہی کے تمام نقوش انعکاسی طور پر کامل پیروی کے ساتھ اپنے اندر لیتا ہے۔ جیسا کہ ایک صاف آئینہ ایک خوب صورت انسان کا نقش۔ یہ لوگ دنیا کی آنکھوں سے پوشیدہ ہیں۔ کون جانتا ہے ان کی قدر مگر وہی جو انہی میں سے ہے۔ کیونکہ وہ دنیا سے بہت دور ہیں۔ یہی وجہ حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت کی تھی۔ کیونکہ وہ شناخت نہیں کیا گیا۔“ (63)

حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی تحریر تو ہم نے دیکھ لی کہ یزید کو ہم مومن نہیں کہہ سکتے اور اس کے برعکس جماعت احمدیہ کی مخالفت کرنے والے علماء کے خیالات کی ایک مثال پیش ہے۔

دیوبند کے مشہور مولوی رشید احمد گنگوہی صاحب سے جب پوچھا گیا کہ یزید کو کافر کہنا اور لعن کرنا جائز ہے یا نہیں تو انہوں نے فتویٰ دیا کہ جب تک کسی کا کفر پر مرنا متحقق نہ ہو جائے اس پر لعنت کرنا نہیں چاہیئے، جو علماء اس میں تردد رکھتے ہیں کہ اوّل میں وہ مومن تھا اس کے بعد اُن افعال کا وہ مستحل تھا یا نہ تھا اور ثابت ہوا یا نہ ہوا تحقیق نہیں ہوا (64)۔ البتہ بعض شیعہ کتب جو حضرت حسینؓ کی شان بیان کرتے ہوئے بعض نا مناسب باتیں تحریر ہیں جماعتِ احمدیہ ان سے اتفاق نہیں کرتی اور حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے ان کا ردّ بھی فرمایا ہے۔ مثلاً بعض شیعہ کتب میں تو یہ بھی لکھا ہے حضرت حسینؓ کی ولادت سے کئی ہزار برس قبل حضرت آدمؑ نے جب عرفات میں دعا کی تو پنجتن کا واسطہ دیا اور جب یہ واسطہ دیتے ہوئے حضرت حسین کا نام لیا تو آپ کے آنسو نکل آئے۔ شبِ معراج کے دوران خود آنحضرت ﷺ نے حضرت حسین کا گریہ فرمایا ، جب حضرت نوحؑ کا سفینہ کربلا کے اوپر سے گزر رہا تھا تو اسے جھٹکا لگا اور حضرت نوحؑ روئے، بساطِ سلیمانی جب کربلا کے اوپر سے گزری تو اسے چکر آگیا۔ قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَكَذٰلِكَ نُرِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلِيَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِيْنَ (الانعام : 76) یعنی "اور اسی طرح ہم ابراہیم کو آسمانوں اور زمین کی بادشاہت (کی حقیقت) دکھاتے رہے تا کہ (وہ) مزید یقین کرنے والوں میں سے ہو جائے۔" اس کی تفسیر میں شیعہ کتب میں لکھا ہے کہ جب اس دوران حضرت ابراہیمؑ نے حضرت حسینؓ کی شبیہ دیکھی تو گریہ شروع کر دیا اور جب عیسٰیؑ نے حواریوں کے درمیان کربلا کا ذکر کیا اور سب رونے لگے اور حضرت موسٰیؑ جب کوہِ طور پر گئے تو حضرت حسینؑ کی وجہ سے بار بار روئے (65)۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے اپنی تحریروں میں اور اشعار میں اس قسم کے عقائد کا کماحقہ ردّ فرمایا ہے۔

اس روز اٹارنی جنرل صاحب نے یہ ثابت کرنے کی کوشش میں کہ نعوذُ باللہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے حضرت امام حسینؓ کی توہین کی ہے ، حضرت مسیح موعودؑ کا یہ شعر پڑھا

کربلائے ایست سیر ہر آنم

صد حسین است در گریبانم

پڑھا۔ ابھی وہ یہ تاثر قائم کرنے کا آغاز ہی کر رہے تھے کہ اس شعر میں حضرت امام حسین کی توہین کی گئی ہے کہ حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ نے انہیں شیعہ عالم علامہ نوعی کا یہ شعر سنایا

کربلائے عشقم لب تشنہ سر تا پائے من

صد حسین کشتہ در ہر گوشہ صحرائے من

اور فرمایا کہ یہاں ”صد حسین“ نہیں بلکہ ” ہر گوشہ صحرائے من “ میں صد حسین ہے۔ یہ الفاظ تحقیر کے لئے نہیں بلکہ اظہارِ عشق کے لئے استعمال ہوتے ہیں۔ اٹارنی جنرل صاحب کے پاس اس کا کوئی تسلی بخش جواب نہیں تھا۔

اٹارنی جنرل صاحب کے اعتراض کے جواب میں حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ نے فرمایا ”جہاں تک امام حسینؓ اور دوسرے اہلِ بیعت کی ہتک کے الزام کا تعلق ہے، اس دُکھ دِہ امر کے اظہار کے بغیر چارہ نہیں کہ جماعتِ احمدیہ کے ساتھ مسلسل نا انصافی کا یہ طریق اختیار کیا جا رہا ہے کہ حضرت بانیِ سلسلہ احمدیہ کے اقتباس کو ادھورا پیش کیا جاتا ہے حالانکہ جس رنگ میں ان اقتباسات کو پیش کیا جاتا ہے خود اس کی تردید میں حضرت بانیِ سلسلہ کی واضح تردید موجود ہوتی ہے۔ زیرِ نظر الزام میں حضرت امام حسینؓ کے بارے میں ”اعجازِ احمدی“ کی جو عبارت پیش کی جاتی ہے وہاں مضمون میں توحید اور شرک کا موازنہ کیا جا رہا ہے حضرت امام حسین کے متعلق حضرت بانیِ سلسلہ احمدیہ فرماتے ہیں ... “ پھر حضور نے حضرت امام حسینؓ کی شان میں حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی وہ تحریر پڑھنی شروع کی جس کا حوالہ اوپر دیا گیا ہے تو یہ صورتِ حال ان ممبران کے لیے نا

قابلِ برداشت ہو گئی جو ان خیالات میں غرق تھے کہ وہ جو کچھ کہیں گے اس کو بغیر کسی بحث کے قبول کر لیا جائے گا۔ سب سے پہلے پاکستان پیپلز پارٹی کے رکنِ اسمبلی عبدالعزیز کھڑے ہوئے۔ وہ اس وقت تو خاموش بیٹھے رہے جب کچھ نامکمل حوالوں کو پیش کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی جا رہی تھی حضرت امام حسینؓ کی توہین کی گئی لیکن جب حضرت امام حسین کی شان میں حوالے پڑھے گئے تو انہوں نے فوراً یہ مہمل اعتراض کیا کہ مرزا صاحب جو حوالہ پڑھ رہے ہیں اگر وہ کہیں شائع ہوا ہے تو وہ پڑھ سکتے ہیں۔ لیکن اگر خالی یہاں بیٹھ کر اس سوال کے جواب میں وہ کچھ پڑھنا چاہتے ہیں تو شاید قواعد کی رو سے اس کی اجازت نہیں ہے۔ سپیکر صاحب نے ان ممبر صاحب کو کہا کہ وہ بعد میں اٹارنی جنرل صاحب سے اس بابت بات کر سکتے ہیں۔ اٹارنی جنرل صاحب بھی اس جواب سے کچھ خوش معلوم نہیں ہوتے تھے انہوں نے کہا کہ ” قاعدہ یہ ہے کہ ایک گواہ زبانی گواہی دیتا ہے وہ کسی سوال کے جواب میں پہلے سے تیار شدہ تحریر نہیں پڑھ سکتا۔“ اصل مسئلہ یہ تھا کہ ان حوالوں کے بعد ان کے اُٹھائے گئے الزامات کی عمارت زمین بوس ہوتی نظر آ رہی تھی۔

یہ ایک عجیب اعتراض تھا کہ وہ نا مکمل حوالے پیش کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہے تھے کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے اپنی تحریرات میں نعوذ باللہ حضرت حسینؓ کی توہین کی ہے۔ جب حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ نے حضرت امام حسینؓ کی شان میں حضرت مسیح موعود علیہ السلام کا حوالہ پڑھنا شروع کیا تو یہ عجیب نکتہ اٹھایا گیا کہ گواہ تحریر نہیں پڑھ سکتا۔ اس موضوع پر جب بحث ہو رہی ہو تو حضرت مسیح موعود علیہ السلام کا اس ضمن میں حوالہ نہیں پڑھا جا سکتا تو اور کیا کیا جاسکتا ہے۔ اس پر حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ نے فرمایا

I can quote the quotation

یعنی کہ میں ایک تحریر کا حوالہ پڑھ سکتا ہوں۔ بہر کیف اس مرحلہ پر سپیکر صاحب نے مداخلت کی اور کہا کہ آپ کسی تحریر سے اپنی یاداشت کو تازہ کر سکتے ہیں۔ پھر جاکر یہ حوالہ مکمل پڑھا گیا۔ یہ ایک عجیب اعتراض تھا جو ایک ایسے ممبر کی طرف سے کیا گیا تھا جو خود وکیل تھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ عدالت میں ایک گواہ ایک تیار شدہ Statement نہیں پڑھ سکتا لیکن یہ ایک حوالہ تھا۔ جب جماعت کی طرف ایک غلط بات منسوب کی جا رہی تھی اور اس الزام کی تائید میں نا مکمل یا غلط حوالے پڑھے جا رہے تھے تو جماعتِ احمدیہ کا وفد اپنے صحیح عقائد کو ظاہر کرنے کے لیے متعلقہ حوالہ کیوں نہیں پڑھ سکتا؟

یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی بعض تحریروں کو نا مکمل طور پر پیش کر کے یہ اعتراضات کئے جاتے ہیں کہ آپ نے نعوذُ باللہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی توہین کی ہے۔ مندرجہ بالا حوالہ جات سے اس بے بنیاد الزام کی تردید ہو جاتی ہے۔ لیکن یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ اس الزام کے بارے میں سوالات کرتے ہوئے اٹارنی جنرل صاحب کے حوالہ جات کا وہی عالم رہا جو کہ پہلے تھا۔ سب سے پہلے تو انہوں نے ایک کتاب ”مکتوبِ احمدیہ‘‘ کا حوالہ دیا۔ جماعت احمدیہ کے لٹریچر میں اس نام کی کسی کتاب کا کوئی وجود نہیں۔

یہاں ایک اصولی بات کا ذکر ضروری ہے کہ حضرت مسیح موعود نے اسی کتاب ”انجامِ آتھم“ میں جس کے حوالے اٹارنی جنرل صاحب نے پڑھے تھے تحریر فرمایا ہے:۔

” اور یا درہے کہ یہ ہماری رائے اس یسوع کی نسبت ہے جس نے خدائی کا دعویٰ کیا اور پہلے نبیوں کو چور اور بٹمار کہا اور خاتم الانبیاء ﷺ کی نسبت بجز اس کے کچھ نہیں کہا کہ میرے بعد جھوٹے نبی آئیں گے۔ ایسے یسوع کا قرآن میں کہیں ذکر نہیں۔“

(روحانی خزائن، جلد 11، ص 13)

ان الفاظ سے ظاہر ہے کہ یہ الفاظ خدائی کا دعویٰ کرنے والے اس خیالی یسوع کے بارے میں ہیں جس کا دعویٰ انجیل کرتی ہے جبکہ جہاں تک اللہ تعالیٰ کے پیمبر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا تعلق ہے تو اس کا ذکر قرآنِ کریم میں موجود ہے اور یہ حقیقی حضرت عیسیٰؑ ہیں جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے مبعوث کئے گئے۔

اور انجیل میں یسوع کے متعلق بیان کردہ حالات کا ذکر بھی کیوں کرنا پڑا اس کے بارے میں حضرت مسیح موعود علیہ السلام اسی کتاب میں تحریر فرماتے ہیں:۔

”بالآخر ہم لکھتے ہیں کہ ہمیں پادریوں کے یسوع اور اس کے چال چلن سے کچھ غرض نہ تھی۔ انہوں نے ناحق ہمارے نبی ﷺ کو گالیاں دیکر ہمیں آمادہ کیا کہ ان کے یسوع کا کچھ تھوڑا سا حال ان پر ظاہر کریں۔ چنانچہ اسی پلید نالائق فتح مسیح نے اپنے خط میں جو میرے نام بھیجا ہے آنحضرت ﷺ کو زانی لکھا ہے اور اس کے علاوہ اور بہت گالیاں دی ہیں۔ پس اسی طرح مردار اور خبیث فرقہ نے جو مردہ پرست ہے ہمیں اس بات پر مجبور کر دیا ہے کہ ہم بھی ان کے یسوع کے کسی قدر حالات لکھیں اور مسلمانوں کو واضح رہے کہ خدا تعالیٰ نے یسوع کی قرآن شریف میں کچھ خبر نہیں دی کہ وہ کون تھا اور پادری اس بات کے قائل ہیں کہ یسوع وہ شخص تھا جس نے خدائی کا دعویٰ کیا اور حضرت موسیٰ کا نام ڈاکو اور بٹمار رکھا اور آنے والے مقدس نبی کے وجود سے انکار کیا اور کہا کہ میرے بعد سب جھوٹے نبی آئیں گے۔“

(روحانی خزائن جلد 11 ص 293)

یہ عبارت اس بات کو بالکل واضح کر دیتی ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے نبی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر نہیں ہو رہا بلکہ اس فرضی وجود کے حالات کا ذکر ہو رہا ہے جس نے پادریوں کے مطابق خدائی کا دعویٰ کیا تھا۔

لیکن اگر یہ نکتہ واضح ہو جاتا تو ”انجام آتھم “ کے جن حوالوں کو اٹارنی جنرل صاحب پیش کر رہے تھے ان پر نہ کوئی اعتراض ہو سکتا تھا اور نہ ہی ان سے وہ تاثر پیدا ہو سکتا تھا جو کہ اٹارنی جنرل صاحب پیدا کرنا چاہتے تھے۔ اس لئے اس بار پھر انہیں حوالوں میں جعلسازی کر کے ردّ و بدل کرنا پڑا۔ ہم اس کی مثال پیش کرتے ہیں۔

جب حضرت خلیفۃ المسیح الثالث ؒ نے انہیں باور کرایا کہ ان عبارتوں میں تو یسوع لکھا ہوا ہے حضرت عیسیٰ نہیں لکھا ہوا۔ تو معلوم ہوتا ہے کہ سوال کرنے والوں نے عجلت میں یہ جعلی حوالہ تراشا۔ اٹارنی جنرل صاحب نے یہ حوالہ پیش کیا:۔

”آپ کو (یعنی حضرت عیسیٰ کو) بریکٹ میں یہ ہے ” یسوع “ نہیں ہے یہاں لکھا ہوا ہے

”آپ کو گالیاں دینے اور بد زبانی کی اکثر عادت تھی ...... آپ کو کسی قدر جھوٹ بولنے کی بھی عادت تھی... “

حقیقت یہ ہے کہ یہ جملے نا مکمل طور پر پیش کئے جا رہے تھے۔ یہ عبارت انجام آتھم میں جہاں ہے وہاں سرے سے کوئی بریکٹ موجود ہی نہیں جس میں یہ لکھا ہو کہ یہ عبارت حضرت عیسیٰ کے بارے میں ہے یسوع کے بارے میں نہیں۔ بلکہ یہ عبارت جہاں پر شروع ہو رہی ہے وہاں پر واضح طور پر ایک سے زائد مرتبہ ”یسوع “ کے الفاظ لکھے ہوئے ہیں جس سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ یہ عبارت فرضی یسوع کے بارے میں ہے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں نہیں ہے۔

اب وقفہ کا وقت قریب آ رہا تھا اور اس سے قبل اعتراضات اُٹھانے والے اپنی دانست میں بڑا وار کرنا چاہتے تھے۔ اس مرحلہ پر اٹارنی جنرل صاحب نے پہلے یہ تمہید باندھی کہ آپ نے اپنے محضرنامہ میں لکھا کہ بانی سلسلہ احمدیہ ؑ کا آنحضرت ﷺ سے بہت عقیدت اور پیار کا تعلق تھا۔ اس تمہید کے بعد اٹارنی جنرل صاحب

نے یہ اعتراض اُٹھایا کہ بانی سلسلہ احمدیہ نے لکھا ہے کہ آنحضرت ﷺ عیسائیوں کے ہاتھ کا پنیر کھا لیتے تھے حالانکہ مشہور تھا کہ اس میں سوٴر کی چربی پڑتی ہے۔

اس اعتراض کو پڑھ کر یہ تاثر ملتا ہے کہ سوالات کرنے والے اس بات پر تو تلے ہوئے تھے کہ جماعت ِاحمدیہ کے لٹریچر پر اور عقائد پر ہر طرح کا اعتراض کریں جبکہ انہیں اسلامی لٹریچر پر بھی کوئی خاص دسترس نہیں تھی ورنہ اتنا بودا اعتراض کرنے کی غلطی نہ کرتے۔

سب سے قبل حضرت خلیفة المسیح الثالث ؒ نے صحیح عبارت پڑھ کر سنائی جس میں حضرت مسیح موعود علیہ السلام یہ بیان فرما رہے ہیں کہ دین میں وہم جائز نہیں ہے اور صرف شک کی بناء پر کوئی چیز پلید نہیں ہو جاتی۔ آنحضرت ﷺ اور آپ کے اصحاب عیسائیوں کے ہاتھ کا بنا ہوا پنیر کھا لیتے تھے حالانکہ اس کے بارے میں مشہور تھا کہ اس میں سوٴر کی چربی پڑتی تھی۔ (مشہور تھا، یہ نہیں کہ پڑی ہوتی تھی۔)

اس موضوع پر احادیث کی کتب اور ان کی شروح میں بہت سی روایات درج کی گئیں ہیں اور حضرت خلیفة المسیح الثالث ؒ نے سنن ابی داوٴد، مسند احمد بن حنبل اور بیہقی سے روایات پڑھ کر سنائیں اور یہ واضح فرمایا کہ یہاں یہ مضمون بیان ہوا ہے کہ محض وہم کی بناء پر کوئی چیز حرام نہیں ہو جاتی۔ اس ضمن میں کچھ مثالیں درج کی جا رہی ہیں۔

حضرت ابنِ عباسؓ بیان فرماتے ہیں کہ ایک غزوہ میں آنحضور ﷺ کے پاس پنیر لایا گیا ہے تو آپ نے دریافت فرمایا کہ یہ کہاں کا بنا ہوا ہے؟ صحابہ نے عرض کی کہ فارس کا بنا ہوا ہے اور ہمارا خیال ہے کہ وہ اس میں مردار ڈالتے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ اللہ کا نام لے کر اُسے چھری سے کاٹو اور کھاوٴ۔

(مسند احمد بن حنبل جلد ا ص302)

اس مضمون کے بارے میں مُلّا علی قاری لکھتے ہیں کہ جو مجوسیوں کے دیس سے یا اس کے ارد گرد سے آتی تھیں نجاست سے لبریز ہوتی تھیں جیسا کہ جوخ جس کے متعلق مشہور تھا کہ وہ سور کی چربی سے تیار ہوتا تھا اور جیسے پنیر جس کی تیاری میں سؤر کی چربی وغیرہ ڈالا کرتے تھے۔

(مرقاۃ المفاتیح شرح مشکاۃ المصابیح از ملا علی قاری)

اسی طرح حدیث کی شرح کی ایک اور کتاب میں لکھا ہے:۔

”اور جوخ کا بنانا سؤر کی چربی سے مشہور ہے اور شام کے پنیر کے بارے میں بھی مشہور ہے کہ اسے سؤر کے پیٹ کی چربی سے بنایا جاتا تھا۔ یہ پنیر آنحضرت ﷺ کے پاس لایا گیا تو آپ نے اسے کھایا اور اس کے بارے میں کوئی سوال نہیں کیا۔ ہمارے شیخ نے شرحِ منہاج میں اس کا ذکر کیا ہے۔“

(فتح العین شرح قرۃ العین مصنفہ علامہ شیخ زین الدین بن عبد العزیز مطبوعہ 1311ھ صفحہ 14 باب الصلوۃ)

ان حوالوں سے ظاہر ہے کہ یہاں پر نعوذُ باللہ حرام چیز کھانے کا ذکر نہیں ہے بلکہ یہ بیان ہے کہ صرف وہم کی بناء پر کسی چیز کو حرام نہیں سمجھ لینا چاہئیے۔

دوپہر کا وقفہ ہونے سے پہلے اٹارنی جنرل صاحب نے یہ نکتہ اُٹھایا کہ ممبران میں روزانہ کی کارروائی کا سرکلر ہونے سے قبل ان سے تصحیح کرانا ضروری ہے کیونکہ کئی مرتبہ ایسا ہوا ہے کہ میں نے کچھ کہا اور لکھا کچھ اور گیا۔ سپیکر صاحب نے ان سے اتفاق کیا لیکن یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ حق پھر جماعت کے وفد کو بھی ہونا چاہیئے تھا کیونکہ پھر یہ بھی احتمال تھا کہ حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ کا بیان بھی غلط لکھا جا رہا ہو۔ یہ حق جماعت کے وفد کے پاس بھی ہونا چاہیے تھا کہ وہ اپنے بیان کو پڑھ کر اس کی تصحیح کرے لیکن جب ایک ممبر

اسمبلی نے یہ سوال اُٹھایا کہ کیا جماعت کے وفد کو اس کارروائی کی کاپی دی جائے گی تو سپیکر نے جواب دیا کہ ایسا نہیں ہوگا۔

جب اس کارروائی کا دوبارہ آغاز ہوا تو یحیٰ بختیار صاحب نے دوبارہ یہ بحث شروع کی کہ حضرت بانی سلسلہ احمدیہ نے اپنی تحریروں میں مقدس ہستیوں کی توہین کی ہے۔ اب ہم اس بات کا جائزہ لیتے ہیں کہ اس مرحلہ پر وہ کیا حکمتِ عملی استعمال کر رہے تھے۔ اس جائزہ کے نتیجہ میں یہ افسوسناک حقیقت سامنے آتی ہے کہ سوالات کرنے والے احباب ابھی وہی طریقہ استعمال کر رہے تھے کہ یا تو خود ساختہ حوالے پیش کئے جائیں یا پھر اپنی طرف سے ایک معیّن حوالہ پیش کیا جائے لیکن عبارت کو اس طرح تبدیل کر دیا جائے کہ اس کا مطلب اور مفہوم بالکل بدل جائے اور اس طرح اپنے کمزور موقف میں جان پیدا کرنے کی کوشش کی جائے۔ چنانچہ دوپہر کے سیشن میں اٹارنی جنرل صاحب نے یہ حوالہ پڑھا:

”حضرت فاطمہ نے کشفی حالت میں اپنی ران پر میرا سر رکھا اور مجھے دکھایا کہ میں اس میں سے ہوں۔“

(ایک غلطی کا ازالہ ص13)

یہ صاف ظاہر ہے کہ اٹارنی جنرل صاحب یہ ظاہر کر رہے تھے کہ وہ اس حوالے کی معین عبارت پڑھ رہے ہیں اور جو کارروائی شائع کی گئی ہے اس میں بھی یہ عبارت inverted commas میں دکھائی گئی ہے، جس سے ثابت ہو جاتا ہے کہ اپنی طرف سے اس حوالے کی معین عبارت درج کی گئی تھی لیکن بہت افسوس سے یہ لکھنا پڑتا ہے کہ ”ایک غلطی کا ازالہ“ میں یہ معیّن الفاظ موجود ہی نہیں ہیں۔ اس مبارک کشف کو بیان کرتے ہوئے جو الفاظ استعمال کئے گئے ہیں وہ بالکل ایک اور مفہوم بیان کر رہے ہیں اور جب اس طرح کسی حوالے کی معین عبارت کو پیش کیا جائے تو اسے حرف بحرف صحیح پیش کرنا چاہیئے نہ کہ اس طرح کہ اس کے الفاظ

تبدیل کر کے اپنا مطلب نکالا جائے۔ جب حضور نے اس کا جواب دیا تو اس کے ساتھ ہم تمام تفاصیل پیش کریں گے۔

اس مرحلہ پر جب اٹارنی جنرل صاحب غلط حوالوں کو پیش کرنے کا سلسلہ جاری رکھے ہوئے تھے تو حضور نے ایک حوالہ کے بارے میں فرمایا کہ ہم چیک کر کے اور سیاق و سباق دیکھ کر اس کی تصدیق کریں گے اور حضور نے فرمایا:۔

" آج صبح ایسا حوالہ پیش کیا گیا جس کا وجود ہی نہیں تھا ... ایسے اخبار کا حوالہ تھا جو چھپا ہی نہیں۔"

جیسا کہ ہم حوالوں کے ساتھ ثابت کر چکے ہیں کہ اٹارنی جنرل صاحب نے الفضل کے اس دن کے شمارے کا حوالہ دے دیا تھا جس روز الفضل شائع ہی نہیں ہوا تھا۔ ان دنوں الفضل روزانہ شائع نہیں ہوتا تھا۔ اس موقع پر کسی معذرت کرنے یا شرمندگی کے اظہار کی بجائے اٹارنی جنرل صاحب نے جو کچھ فرمایا وہ انہی کا حصہ ہے۔ انہوں نے کہا:۔

" ہمیں کہتے ہیں کہ اس کا وجود ہی نہیں۔"

اب پڑھنے والے قومی اسمبلی کی ذہنی کیفیت کے بارے میں خود ہی کوئی رائے قائم کر سکتے ہیں۔ سپیشل کمیٹی میں ایک ایسا حوالہ پڑھا گیا جس کے متعلق ثابت کر دیا گیا کہ یہ جعلی ہے۔ حوالہ پیش کرنے والے اس کا کوئی بھی ثبوت پیش نہیں کر سکے کہ اس حوالہ کا کوئی وجود بھی تھا اور کارروائی کے آخر تک اس بات کا کوئی بھی ثبوت مہیا نہیں کیا گیا اور جب اس بات کا ذکر کیا گیا تو نازک مزاجی کا عالم یہ تھا کہ اٹارنی جنرل صاحب نے فرمایا" ہمیں کہتے ہیں کہ اس کا وجود ہی نہیں۔" گویا کہ اگر وہ جعلی حوالہ پیش کریں اور جماعت کے وفد سے اس کے بارے میں دریافت فرمائیں اور جماعت کا وفد انہیں باور کرائے کہ اس روز تو الفضل شائع ہی نہیں ہوا

تھا تو بیچارے اٹارنی جنرل صاحب کو یقین ہی نہیں آتا کہ انہیں کہا جا رہا ہے کہ آپ کا حوالہ تو جعلی نکلا۔ اگر حوالہ جعلی ہے تو پھر ہر ایک کا حق ہے کہ وہ کہے کہ یہ حوالہ جعلی ہے اور جعلی حوالہ پیش کرنے والوں کو یہ سننا پڑے گا۔

اب سپیکر صاحب نے انہیں مزید خفت سے بچانے کے لئے کہا۔

There might be some bonafider mistake of fact. But when the book is available, the book may be handed over and the other members of the delegation can verify those.

یعنی: ہو سکتا ہے کہ نیک نیتی سے ہی غلطی ہو گئی ہو مگر جب کتابیں موجود ہیں توکتاب ان کے حوالے کر دی جائے اور وفد کے دوسرے ممبران اس کی تصدیق کر سکتے ہیں۔

لیکن اٹارنی جنرل صاحب اپنی حوالہ دانی کے بارے میں ابھی بھی پُر اعتماد تھے۔ انہوں کہا

” حوالے موجود ہیں۔ جی!“

اس پر سپیکر صاحب نے کہا کہ متعلقہ کتابیں ان کو یعنی جماعت کے وفد کو دے دیں۔ اس مرحلہ پر اٹارنی جنرل صاحب نے جو فرمایا وہ ہم حرف بحرف نقل کر دیتے ہیں۔

If I give the quotation, then I forget the subject. I wanted it to be clarified.

یعنی اگر میں حوالہ پڑھوں تو میں مضمون بھول جاتا ہوں۔ میں اس معاملہ کی وضاحت چاہتا تھا۔

دنیا بھر کا اصول ہے کہ جب کسی عبارت کا حوالہ پیش کیا جائے تو اس کی عبارت پڑھی جاتی ہے۔ اور معین حوالہ دیا جاتا ہے کہ یہ حوالہ کس کتاب یا اخبار یا جریدے سے لیا گیا ہے۔ لیکن بیچارے اٹارنی جنرل

صاحب اپنی بیچارگی کا اظہار ان الفاظ میں کر رہے تھے کہ میرا مسئلہ یہ ہے کہ اگر میں حوالہ پڑھ دوں تو میں یہ ہی بھول جاتا ہوں کہ مضمون کیا بیان کرنا تھا۔ اب اگر وہ یہ کہنا چاہ رہے تھے کہ انہیں نسیان کی بیماری ہے تو پھر اس کی ذمہ دار بہر حال جماعتِ احمدیہ نہیں تھی۔

اس پر سپیکر صاحب نے کہا کہ جب حوالہ پڑھیں تو کتاب انہیں دے دی جائے اور جب حوالہ ختم ہو تو وفد اس کا جواب شروع کر سکتا ہے۔

اب اٹارنی جنرل صاحب نے ایک بار پھر اپنی علمی قوت جمع کی اور ایک اور حوالہ پڑھنے کا آغاز کیا اور حوالہ پڑھا:

”سیرۃالابدال صفحہ 193“

لیکن یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ شائع ہونے والی کارروائی کے مطابق اس مرحلہ پر نہ تو اٹارنی جنرل صاحب اس حوالہ کی عبارت پیش کر سکے اور نہ ہی حسبِ فیصلہ یہ کتاب جماعت کے وفد کو دی گئی کہ وہ اس عبارت کو دیکھ کر اس کی موجودگی کی تصدیق کر سکے اور خوش قسمتی سے کسی اور موضوع پر بات شروع ہو گئی۔ اب ہر پڑھنے والا یہ سوچے گا کہ ایسا کیوں ہوا ؟ یہ اس لئے ہوا حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی اس تصنیف ”سیرۃ الابدال“ کے صرف 16 صفحات ہیں۔ اور اٹارنی جنرل صاحب اس کتاب کے صفحہ نمبر 193 سے کوئی حوالہ پڑھنے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔ اس سے قبل سپیکر صاحب نے ایک ممبر اسمبلی عبدالعزیز بھٹی صاحب کو کہا تھا کہ وہ جس کتاب کا حوالہ پڑھا جا رہا ہو وہ جماعت کے وفد کے حوالے کریں لیکن بھٹی صاحب بیچارے اس مرحلہ پر کیا کرتے۔ جس حوالے کا کوئی وجود ہی نہیں تھا وہ جماعت کے وفد کے حوالے کیسے کرتے ؟ یہاں ایک وضاحت ضروری ہے۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی تمام کتب روحانی خزائن کے نام سے اکٹھی شائع ہوئی ہیں

۔اس کی جلد نمبر 20میں سیرت الابدال موجود ہے۔ اور روحانی خزائن میں بھی سیرت الابدال صفحہ نمبر144 پر ختم ہوجاتی ہے۔

اس افراتفری کے عالم میں سپیکر صاحب کو بار بار یاد دلانا پڑ رہا تھا کہ جب جماعت کے وفد کے سامنے کوئی حوالہ پڑھا جائے تو متعلقہ کتاب کی جو عبارت پڑھی جا رہی ہے وہ نکال کر جماعت کے وفد کو دے دی جائے تا کہ وہ کم از کم یہ تصدیق تو کر سکیں کہ یہ حوالہ اس کتاب میں موجود ہے کہ نہیں۔ چنانچہ سپیکر صاحب نے ایک بار پھر اٹارنی جنرل صاحب کو ان کا یہ فرض یاد دلایا۔ اس کے جواب میں اٹارنی جنرل صاحب نے جو فرمایا وہ یہ تھا۔

No, all these books are in the possession of the witness. They are presumed to be because these are the writtings of the...

یعنی یہ سب کتابیں گواہ(یعنی جماعت کے وفد کے پاس موجود ہیں۔ انہیں ان کے پاس موجود ہونا چاہئیے...

اس عجیب الخلقت وضاحت کے جواب میں حضور نے فرمایا:۔

In our possession but not at this place

یعنی یہ کتابیں ہمارے پاس موجود ہیں لیکن اس جگہ پر نہیں ہیں۔ اب ادنیٰ سا بھی فہم رکھنے والا شخص یہ سمجھ سکتا ہے کہ جماعت کا وفد اپنی ساری لائبریری تو اپنے ساتھ اُٹھا کر اس ہال میں نہیں لاتا تھا اور نہ اس کی اجازت تھی اور نہ ہی جماعت کے وفد کو یہ علم ہوتا تھا کہ اب کس کتاب کے بارے میں سوال کیا جائے گا۔ یہ فرض تو سوال کرنے والوں کا تھا کہ وہ حوالے کا ثبوت پیش کرتے اور وہ یہ فرض ادا کرنے سے قاصر تھے۔

جماعت کا وفد تو زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتا تھا کہ کارروائی کے اختتام کے بعد متعلقہ کتب میں سے حوالے چیک کر کے اگلے روز جواب دے دیتا۔

سوالات پیش کرنے والے ممبرانِ اسمبلی کو اب تک جو سبکی اُٹھانی پڑی تھی ، اب انہوں نے ایک نئے عزم کے ساتھ اس کے ازالے کی کوشش شروع کی۔ اٹارنی جنرل صاحب نے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے ایک عربی شعر کا ترجمہ پڑھا اور ایک ممبر اسمبلی عبد العزیز بھٹی صاحب نے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی کتاب ” نزول المسیح“ جماعت کے وفد کے سامنے رکھ دی اور کہا کہ اس کے صفحہ 96پر یہ لکھا ہوا ہے پڑھ کر تصدیق کر دیں۔ جماعت کے وفد نے کچھ دیر اس صفحہ کا جائزہ لیا پھر حضور نے سپیشل کمیٹی سے فرمایا کہ یہ عبارت تو اس صفحہ پر موجود ہی نہیں۔ تھوڑی ہی دیر میں سوالات کرنے والوں کو شرمندگی پر شرمندگی اُٹھانی پڑ رہی تھی۔ سپیکر صاحب نے کہا:۔

”بھٹی صاحب! آپ نے یہ کتاب دی ہے صفحہ 96 پر نہیں مل رہا۔ آپ pinpointکریں، اس صفحہ کو underline کریں۔ وہ کہتے ہیں کہ صفحہ 96 پر نہیں مل رہا۔“

معلوم ہوتا ہے کہ اس مرحلہ پر عبدالعزیز بھٹی صاحب تو کوئی کارروائی نہ دکھا سکے لیکن اب نورانی صاحب کو خیال آیا کہ وہ اس ڈولتی ہوئی کشتی کو بچانے کے لئے آگے بڑھیں اور سپیکر صاحب کو کہا کہ وہ اس کے ازالے کے لئے یہ عبارت ”براہینِ احمدیہ “ سے پیش کر سکتے ہیں لیکن سپیکر صاحب اس پیشکش سے زیادہ مطمئن نہیں تھے۔ انہوں نے کہا

” نہیں! نہیں! ایک سیکنڈ تشریف رکھیں۔ جب آپ نے اپنا ریفرنس پوچھا تو آپ اس ریفرنس پر rely کریں گے۔“

پھر اس حوالے نے یکلخت ایک نیا جنم لیا اور اٹارنی جنرل صاحب نے فرمایا:۔

" اعجازِ احمدیہ صفحہ 80"

(" اعجازِ احمدیہ " تو کوئی کتاب نہیں ، البتہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی ایک تصنیف "اعجاز احمدی" ہے اور اس کتاب کا دوسرا نام " ضمیمہ نزول المسیح " بھی ہے لیکن جن صفحات کے حوالے پیش کئے جا رہے تھے وہاں پر یہ شعر اور اس کا ترجمہ موجود نہیں تھا۔)

اب تک صورتِ حال یہ تھی کہ سوال کرنے والی قابل ٹیم نے اعتراض کرنے کے لئے ایک عبارت پڑھی جو کہ ان الفاظ سے شروع ہوتی تھی " تمہارے حسینؓ اور مجھ میں بڑا فرق ہے ..." اور چند منٹ میں اس عبارت کے تین مختلف کتابوں کے حوالے پیش کیے جا چکے تھے اور اس کے با وجود جماعت کے وفد کو دکھانے کے لئے یہ عبارت نہیں مل رہی تھی

اغلباً خفت کو کم کرنے کے لیے شاہ احمد نورانی صاحب نے یہ مہمل سی وضاحت پیش کی:۔

" میرے خیال میں misunderstanding تھوڑی سی ہے۔ آپ اس پر غور فرمائیں کہ انہوں نے جو یہاں کتابیں رکھی ہوئی ہیں۔ یہ وہ ہیں جو ربوہ کی چھپی ہوئی ہیں اور اسی پر نشان لگے ہوئے ہیں۔ جن حضرات نے سوالات کئے ہیں انہوں نے ان کتابوں کو دیکھ کر جو ان کی پرسنل ہیں انہوں نے ان میں سے ریفرنسز دیئے ہیں۔"

یہ عجیب وضاحت تھی۔ سوال کرنے والے جن کتابوں سے حوالے پیش کر رہے تھے وہ انہوں نے خود تو شائع نہیں کی تھیں۔ وہ بھی تو جماعت کی شائع کی ہوئی تھیں۔ یہ سوال کرنے والوں کا کام تھا کہ وہ اس حوالے کا ثبوت پیش کرتے۔ سپیکر صاحب نے جواب دیا

”آپ چیک کر سکتے ہیں۔The books have been available for the last ten days

یعنی دس روزسے یہ کتابیں یہاں پر دستیاب ہیں اور ظاہر ہے کہ جب دس روز سے یہ کتب وہاں پر موجود تھیں جس کتاب کی جس جگہ سے حوالہ پیش کرنا مقصود تھا اس پر نشان لگا کر پیش کرنا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔

نورانی صاحب نے کچھ حیرت سے کہا:۔

” لیکن کتابیں موجود ہیں۔ حوالے سب پر لگے ہوئے ہیں۔ سب موجود ہیں ... “

سپیکر صاحب کی جھنجلاہٹ جاری تھی وہ کہنے لگے

You should check it up ....

یعنی آپ کو چاہیئے کہ اسے چیک کریں۔

اس پر نورانی صاحب فرمانے لگے ”صرف چھاپے خانے کا فرق ہوتا ہے“۔ اب ظاہر ہے کہ اگر ایک ایڈیشن کا حوالہ دیا جائے گا اور دوسرے ایڈیشن کی کتاب ڈھونڈ کر اس صفحہ پر حوالہ ڈھونڈا جائے گا تو اس خفت کو تو بھگتنا پڑے گا۔ اس لئے حوالہ دیتے وقت یہ دیکھنا ضروری ہوتا ہے کہ حوالہ کس ایڈیشن سے نوٹ کیا گیا ہے اور سامنے کون سا ایڈیشن موجود ہے اور حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی کتب کا حوالہ دیتے ہوئے تو یہ مشکل ہونی ہی نہیں چاہیئے تھی کیونکہ جب روحانی خزائن کے نام سے کتب کا مجموعہ شائع ہوا تو اس میں پہلے ایڈیشن کے صفحات کے نمبر بھی ایک طرف لکھے ہوئے ہوتے تھے۔ لیکن حقیقت یہ تھی کہ یہ صرف مختلف ایڈیشن کا معاملہ نہیں تھا کئی مرتبہ غلط حوالے پیش کئے جا رہے تھے۔

خدا ہی جانتا ہے کہ سوال کرنے والے مزید کس کارکردگی کا مظاہرہ کرتے کہ آخر کار جماعت کے وفد نے خود ہی کوشش کر کے یہ حوالہ ڈھونڈا اور انہیں مطلع کیا۔ دراصل یہ عربی شعر ”اعجازِ احمدی“ کے صفحہ 69 اور روحانی خزائن جلد 19 کے صفحہ 181 پر تھا اور یہ حوالہ بھی جماعت کے وفد نے ڈھونڈا تھا۔ حضور نے فرمایا کہ اس کا explanation ہم بعد میں دیں گے۔

اس مرحلہ پر سپیکر نے اعلان کیا کہ اب تک کے لیے اتنا ہی کافی ہے۔ ہم چھ بجے دوبارہ کارروائی شروع کریں گے۔ جب حضور انور اراکینِ وفد کے ہمراہ ہال سے تشریف لے گئے تو سپیکر نے اراکینِ اسمبلی کو رکنے کا کہااور ایک بار پھر حوالہ جات نہ ملنے کی بات شروع ہوئی۔ معلوم ہوتا ہے کہ سپیکر صاحب کو اس بات کا بہت احساس تھا کہ جماعت کے وفد کے سامنے ممبرانِ اسمبلی کو شرمندگی اُٹھانی پڑی ہے کیونکہ انہوں نے کہا:۔

We should not cut a sorry figure before the members of the delegation. And these members should be here up to 6 .

یعنی ہمیں وفد کے ممبران کے سامنے شرمندہ نہیں ہونا چاہئیے۔ وفد کے ممبران 6 بجے یہاں پہنچ جائیں گے۔ پھر کہا

”اگر آپ نے اپنا work دکھانا ہے تو یہ نہیں ہے ایک حوالہ تلاش کرتے ہی آدھا گھنٹہ لگ جائے

The change of edition, or print at Rabwah or Qadian is no excuse, or you say.

یہ ریفرنس نہیں ہے، غلط دیا یا کتاب ہی نہیں exist کرتی۔“

یہ کارروائی ان ممبران کی امیدوں کے بالکل بر عکس جا رہی ہے۔ اس کا اندازہ اس سیشن کے آخری تبصرہ سے لگایا جا سکتا ہے۔ یہ تبصرہ ممبر اسمبلی عبد الحمید جتوئی صاحب کا تھا انہوں نے کہا کہ جو سوال کیا جاتا ہے جماعت کے وفد کے پاس اس کا لکھا ہوا جواب ہوتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ سوالات Leak ہو رہے ہیں اور ممبران اسمبلی میں سے کوئی ایسا کر رہا ہے۔ اس پر دو اور ممبران نے ان کی تائید کی۔

حقیقت یہ تھی کہ جو اعتراضات ممبرانِ کمیٹی کی طرف سے بالخصوص جماعت کے مخالفین کی طرف سے پیش کیے جا رہے تھے، وہ وہی تھے جو تقریباً ایک صدی سے جماعتِ احمدیہ پر کیے جا رہے تھے۔ اوراس وقت سے ہی ان کا تسلی بخش جواب دیا جا رہا تھا۔ اور ان کا جواب ممبرانِ وفد نے پہلے سے ہی تیار کیا ہوا تھا۔ نئی بات یہ تھی کہ جتنے غلط حوالے اب پیش کیے جا رہے تھے، شاید ہی پہلے مسلسل اتنے غلط حوالے پیش کیے گئے ہوں۔

لنچ کے وقفہ کے بعد دوبارہ کارروائی شروع ہوئی۔ اب تک غلط حوالے پیش ہونے کی وجہ سے جو صورتِ حال پیدا ہوئی تھی، اب اس کی درستگی کے لئے یہ تدبیر کی گئی کہ سپیکر صاحب نے یہ تجویز پیش کی کہ کیوں نہ مولانا عطاء اللہ صاحب کو کتب خانہ کا انچارج بنا دیا جائے؟ اور پھر عطاء اللہ صاحب کو کہا کہ آپ کتب خانہ کے انچارج ہو جائیں۔

جب وقفہ کے بعد کارروائی شروع ہوئی تو حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ نے آغاز اسی عربی شعر سے فرمایا جس کا ابھی ذکر کیا گیا تھااور فرمایا کہ اس سے پہلے جو اشعار ہیں وہی اس بات کو واضح کر دیتے ہیں کہ کیا مضمون بیان ہو رہا ہے۔ یہ ذکر اس بات سے شروع ہوتا ہے کہ تم گمان کرتے ہو کہ حسینؓ تمام مخلوق کا سردار ہے اور تمام انبیاء ان کی شفاعت سے نجات پائیں گے اور بخشے جائیں گے اور اس شعر میں حسینکم کے الفاظ اس بات کو واضح کر دیتے ہیں کہ یہاں ایک مخصوص گروہ کے غلط عقائد کا رد کر کے ان کے تصور کا ذکر کیا جا رہا

ہے۔ اس بحث کے دوران حضور نے یہ اصول بیان فرمایا اگر ایک شخص کی تحریریں جو مختلف کتب میں پائی جاتی ہیں اگر ان سب کو سامنے رکھا جائے تو ہی صحیح نتیجہ نکالا جا سکتا ہے۔ اس کے بعد ایک بار پھر ’کفر‘ ، ’ایمان‘ اور ’دائرہ اسلام‘ جیسے الفاظ کے بارے میں بحث ہوئی جس کا ایک اجتماعی جائزہ ہم پہلے ہی لے چکے ہیں۔

اس روز کی کارروائی کے آخر میں یعنی اس سیشن میں جو کہ رات آٹھ بجے شروع ہوا حضور نے فرمایا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی توہین کے الزام کے بارے میں ہمارے جوابات تیار ہیں اور پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی توہین کے الزام کے بارے میں فرمایا۔

”1850-60 ء اور1880ء کے درمیان حکومتِ برطانیہ اپنے ساتھ ایک زبردست فوج پادریوں کی بھی لے کر آئی تھی اور 70ء کے قریب ایک پادری عمادالدین صاحب نے ایک مضمون امریکہ لکھ کر بھیجا جس میں انہوں نے دعویٰ کیا کہ عنقریب وہ وقت آنے والا ہے کہ سارا ہندوستان عیسائی ہو جائے گا اور ہندوستان کے مسلمان بھی عیسائی ہو جائیں گے اور اگر کسی شخص کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ وہ کسی مسلمان کو دیکھے تو اس کی خواہش پوری نہیں ہو گی اور اس وقت اتنی جرأت پیدا ہوئی بعض پادریوں میں کہ انہوں نے یہ اعلان کیا کہ عنقریب نعوذُ باللہ خدا وند یسوع مسیح کا جھنڈا مکہ معظمہ پر لہرایا جائے گا۔ اس وقت دینِ متین کے دفاع کے لئے اور اسلام کے جوابی حملوں کے لئے اللہ تعالیٰ نے متعدد علماء کو پیدا کیا جن میں سے مَیں تین نام لوں گا: نواب صدیق حسن خان صاحب ، مولوی آلِ حسن صاحب، مولوی رحمت اللہ صاحب مہاجر مکی۔ ان کے علاوہ احمد رضا صاحب کے بھی حوالے ہیں اور بھی تھے اور حضرت مسیح موعود بانیِ سلسلہ بھی تھے اور اتنی زبردست جنگ شروع ہوئی کہ اس کا اندازہ لگانا اس زمانہ کے لوگوں کے لئے مشکل ہے۔

اس وقت پادریوں نے حکومتِ برطانیہ کے بل بوتے پر اس قدر گندی گالیاں دی ہمارے محبوب حضرت خاتم الانبیاء محمد ﷺ کو کہ جن کو سوچ کر بھی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ان سب نے جن کا میں نے نام لیا ہے اور کچھ اور جو ہیں انہوں نے پادریوں کی گندہ دہانی کا جواب انہی کی انجیل سے نکال کے، جو انجیل نے ایک خاکہ کھینچا تھا، وہ الزامی جواب جیسے کہتے ہیں وہ دیا اور اعلان کیا۔

بڑا ذہن رکھتے تھے یہ سب علماء اللہ تعالیٰ نے فراست دی تھی، اسلام کا پیار دیا تھاان کو ایک طرف ان کے لئے یہ مشکل تھی کہ حضرت مسیح علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے نبی اور بزرگ بندے اور دوسری طرف یہ تھی کہ ان کے نام پر حضرت محمد ﷺ خاتم الانبیاء جو انبیاء کے اوّل بھی ہیں اور آخر بھی ہیں، ان کی طرف اور ان کی عظمت اور جلال کو ظاہر کرنا تھا اس لیے اللہ تعالیٰ عطاء کردہ فراست کے نتیجے میں ان بزرگوں نے دو مختلف شخصیتیں بنا دیں ایک یسوع کی شخصیت اور ایک مسیح علیہ السلام کی شخصیت، ایک وہ شخصیت جسے انجیل پیش کر رہی ہے اور ایک وہ شخصیت جسے قرآن عظیم پیش کر رہا ہے اور انہوں نے یہ بات واضح کرنے کے بعد کہ حضرت مسیح علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ نبی اور عزت و احترام ان کا کرنا ضروری ہے، لیکن جو حملہ ہم کر رہے ہیں وہ مسیح علیہ السلام پر نہیں وہ اس یسوع پر ہے جس نے تمہارے نزدیک خدائی کا دعویٰ دیا تھاتو دو personalities بالکل علیحدہ علیحدہ کر کے اس طرح اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی اس فراست کے نتیجے میں وہ اس قابل ہوئے کہ اس دجل کو پاش پاش کریں جو اسلام کے خلاف کھڑا کیا گیا تھا۔“

اس کے بعد حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ نے غیر احمدی علماء کے کئی حوالے پیش کئے جن میں انجیل کے پیش کردہ تصوراتی یسوع پر تنقید کی گئی تھی۔

حضور نے سید آلِ حسن صاحب کے اس استفسار کے یہ حوالے پڑھے جس کو مولوی رحمت اللہ مہاجر مکی کی کتاب ”ازالہ اوہام“ میں درج کیا گیا ہے

”پس تربیت حضرت عیسیٰؑ از روئے حکمت بہت ہی ناقص ٹھہری۔ “ (استفسار107)

حضرت عیسیٰؑ کے معجزات کے بارے میں سید آلِ حسن صاحب نے لکھا:۔

”حضرت عیسیٰؑ کا معجزہ احیاءِ میت کا بعض بھان متی کرتے پھرتے ہیں کہ ایک آدمی کا سر کاٹ ڈالا۔ اس کے بعد سب کے سامنے دھڑ سے ملا کر کہا : اٹھ کھڑا ہو۔ وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ “ (استفسار ص336)

”اشیاع اور ارمیہ اور عیسیٰ علیہ السلام کی عیب گوئیاں قواعد نجوم و رمل سے بخوبی نکل سکتی ہیں۔ “

(استفسار ص336)

یسوع نے کہا کہ لومڑیوں کی اپنی کھوئیں ہیں اور پرندوں کی اپنی بسیریں ہیں پر میرے لئے کہیں سر رکھنے کی جگہ نہیں۔ دیکھو یہ شاعرانہ مبالغہ ہے۔ دنیا کی تنگی کی شکایت کرنا، اقبح ترین امور ہے۔ “

(استفسار ص334)

حضرت عیسیٰؑ نے اندازِ خطاب کے بارے میں سید آلِ حسن صاحب لکھتے ہیں۔

”حضرت عیسیٰؑ ایک انجیر کے درخت پر صرف اس جہت سے کہ اسمیں پھل نہ تھے خفا ہوئے۔ پس جمادات پر خفا ہونا کمال جہالت کی بات ہے۔ “

(استفسار۔ ص417)

حضرت عیسیٰؑ نے کون سا مرتبہ درشت گوئی کا اُٹھا رکھا۔"

(استفسار۔ ص417)

حضورؒ نے مولوی رحمت اللہ مہاجر مکی کی کتاب "ازالہ اوہام" جو کہ فارسی میں ہے کے ایک اقتباس کا یہ ترجمہ پڑھا:۔

"جنابِ مسیح کے ہمراہ بہت سی عورتیں چلتی تھیں اور اپنا مال انہیں کھلاتی تھیں۔ فاحشہ عورتیں آنجناب کے پاؤں چومتی تھیں اور آنجناب مرتا مریم کو دوست رکھتے تھے اور خود دوسرے لوگوں کو پینے کے لئے شراب عطا کرتے تھے۔"

(ازالہ اوہام مصنفہ مولوی رحمت اللہ مہاجر مکی ص 370)

اُس وقت اس سپیشل کمیٹی میں اس مسلک سے وابستہ کئی ممبران وہاں موجود تھے جو احمد رضا خان صاحب کے پیرو کار تھے انہیں مجدّد بھی تسلیم کرتے تھے۔ حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ نے یسوع مسیح کے بارے میں ان کی کتاب "العطایا النبویہ فی الفتاویٰ الرضویہ" کا یہ حوالہ پڑھ کر سنایا:۔

"نصاریٰ ایسے کو خدا کہتے ہیں .... ایسے کو یقیناً دغا باز ہے پچھتاتا بھی ہے۔ ایسے کو جس کی دو جورئیں ہیں۔ دونوں پکی زنا کار حد بھر کی فاحشہ۔ ایسے کو جس کے لئے زنا کی کمائی۔ فاحشہ کی خرچی کمال مقدس کمائی ہے ...... جو اس کی شریعت پر عمل کرے ملعون ہے بلکہ اس کا اکلوتا بیٹا خود ہی ملعون ہے۔"

(العطایا النبویہ فی الفتاویٰ الرضویہ مصنفہ احمد رضا خان صاحب ، ناشر شیخ غلام علی اینڈ سنز کشمیری بازار لاہور ص741)

اس کے علاوہ حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ نے جماعتِ احمدیہ کے اشد ترین مخالف جریدے ”اہلحدیث“ کی ایک اشاعت کا حوالہ پڑھ کر سنایا۔ یہ حوالہ 31/ مارچ 1939ء کی اشاعت سے تھا۔ اس اشاعت میں حضرت مسیح علیہ السلام کے بارے میں بہت کچھ لکھا گیا تھا۔ ہم ان خیالات کے چند نمایاں پہلو پیش کرتے ہیں۔

”اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ کہ مسیح خود اپنے اقرار کے مطابق کوئی نیک انسان نہ تھے ...

ظاہر ہے کہ اجنبی عورت بلکہ فاحشہ اور بدچلن عورت سے سر اور پاؤں کو ملوانا اور وہ بھی اس کے بالوں سے ملا جانا کس قدر احتیاط کے خلاف کام ہے۔ اس قسم کے کام شریعتِ الٰہیہ کے خلاف صریح خلاف ہیں ... ان حالات میں مسیح کی شراب سازی خلاف شریعت فعل ہے۔ انجیل کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مسیح نے کذب کو روا رکھا ... ہمیں انجیل کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مسیح اپنی والدہ کی تعظیم نہیں کرتے تھے“

(اہلحدیث 31/ مارچ 1939ء۔ ص8و9)

جن کی اپنی تحریروں میں یہ مواد پایا جاتا ہو حیرت کا مقام ہے کہ وہ کس منہ سے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی تحریروں پر اعتراض کر رہے تھے۔ اس کے بعد حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ نے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے وہ حوالے سنائے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شان کے بارے میں ہیں۔

اس بیان کے اختتام پر حضور نے فرمایا کہ میں تھکاوٹ محسوس کر رہا ہوں باقی کل کر لیا جائے۔ اس پر اس سیشن کا اختتام ہو گیا۔ اسمبلی ممبران میں جماعت کے مخالفین دلائل دینے کی بجائے کس ذہنیت کے ساتھ کارروائی چلانا چاہتے تھے اس کا اندازہ ایک ممبر محمود اعظم فاروقی صاحب کی اس تجویز سے ہوتا ہے جو انہوں نے اس وقت سپیکر صاحب کو دی۔ انہوں نے سپیکر صاحب کو کہا کہ جماعت کے وفد کو رات کے بارہ بجے تک بٹھا کر سوالات کریں۔ ہم بھی بیٹھیں گے۔ اس پر سپیکر صاحب نے کہا کہ گواہ کے کچھ حقوق ہوتے ہیں اور

انہیں یاد دلایا کہ وہ اب تک تو کارروائی سے غیر حاضر رہے ہیں اور اب آکر کارروائی ڈال رہے ہیں۔ اس اوٹ پٹانگ تجویز کا اس کے علاوہ کوئی مقصد نہیں تھا کہ اس طرح جماعت کے وفد کو تھکایا جائے اور انہیں اتنا وقت نہ مل سکے کہ وہ جا کر جو حوالے چیک کرنے ہیں انہیں چیک کر سکیں۔

اس مرحلہ پر ممبرانِ اسمبلی اور سپیکر صاحب نے اٹارنی جنرل صاحب کے طریقہ کار پر بھرپور اعتماد کا اظہار کیا۔ اٹارنی جنرل صاحب نے اس روز کی کارروائی کے اختتام پر کہا کہ مسئلہ یہ ہے کہ مجھے ممبران نے بہت سے سوالات دے دیئے ہیں اور میں ان کو fit in کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔

اس مرحلہ پر ایک ممبر اسمبلی محمد سردار خان صاحب نے نہایت اہم نکتہ اُٹھایا۔ انہوں نے کہا

I want to bring it to the notice of this honourable house, that the main question I should say, before the special committee or the assembly is as to what is the status of the person who does not believe in the finality of the prophethood. That question or that point is still untouched .

یعنی میں اس معزز ایوان کی توجہ اس طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں کہ اس سپیشل کمیٹی یا اس ایوان کے سامنے اصل سوال یہ ہے کہ جو شخص ختمِ نبوت پر ایمان نہیں لاتا اس کی کیا حیثیت ہے؟ اس سوال یا اس نقطہ کا ابھی تک کوئی ذکر ہی نہیں کیا گیا۔

اس پر سپیکر صاحب نے جواب دیا:۔

It will come it will be taken up. It will come at its proper place .

یعنی اس کی باری بھی آئے گی۔ اس کو بھی اُٹھائیں گے، صحیح وقت پر اس کو بھی اُٹھایا جائے گا۔

اس سوال اور اس کے جواب سے مندرجہ ذیل امور واضح ہیں

1)۔ تین روز کے سوالات کے بعد بھی ابھی تک اصل موضوع کا ذکر تک نہیں کیا گیا تھا۔

2)۔ اصل موضوع سے گریز اس وقت کیا جا رہا تھا جب کہ اس موضوع پر جماعتِ احمدیہ کا موقف محضرنامہ کی صورت میں اسمبلی کے اراکین کے سامنے آ چکا تھااور وہ اس کی مضبوط یا بر عکس ہونے کے بارے میں کوئی رائے قائم کر سکتے تھے۔ ظاہر ہے کہ اگر یہ ممبران جماعتِ احمدیہ کے موقف کو مضبوط خیال کر رہے تھے تو اس صورت میں ان کا رجحان یہی ہو سکتا تھا کہ اس سے گریز کیا جائے۔

3)۔ یہ گریز ممبران کی رضامندی سے کیا جا رہا تھا کیونکہ سوالات تو ممبران کی طرف سے آ رہے تھے اور ابھی کچھ ہی دیر قبل انہوں نے اٹارنی جنرل صاحب کے طریقہ کار پر بھر پور اعتماد کیا تھا۔

4)۔ ہم بعد میں جائزہ لیں گے کہ اس روز کے بعد بھی یہ کارروائی اپنے اصل موضوع پر نہیں آئی اور اس سے عمداً گریز کا سلسلہ جاری رہا۔

اب اسمبلی میں ان ممبران کی پریشانی بڑھ چکی تھی جو جماعت احمدیہ سے بُغض رکھتے تھے۔ کارروائی ان کی امیدوں کے بر عکس جا رہی تھی۔ ان کی نفسیاتی الجھن یہ تھی کہ وہ اعتراض تو کر بیٹھتے تھے لیکن جب جواب شروع ہوتا تو انہیں اپنی خفت سامنے نظر آ رہی ہوتی تھی۔ چنانچہ کارروائی کے اختتام کے قریب جب حضور اور جماعت کا وفد باہر جا چکا تھا مولوی ظفر احمد انصاری صاحب نے سپیکر سے درخواست کی:۔

”جنابِ والا ! میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ انہوں نے جو تحریری بیان دینے کا سلسلہ شروع کیا ہے اس کی حوصلہ افزائی نہ کی جائے۔ یہ محضر نامے میں کافی طویل جواب دے چکے ہیں۔ اس لئے جہاں تک ہو سکے ہم ان کو Discourage کریں تا کہ یہ لامتناہی سلسلہ ختم ہو جائے۔ اب اس کی ضرورت نہیں۔“

ان الفاظ پر زیادہ تبصرہ کی ضرورت نہیں۔ جماعتِ احمدیہ نے ایک مختصر سا محضر نامہ پیش کیا تھا، اسے کسی طرح بھی طویل نہیں کہا جا سکتا۔ اب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی گستاخی کے معاملہ میں جب باقاعدہ جماعت کا موقف پڑھا گیا تو اس کا کوئی معقول جواب معترضین کے پاس نہیں تھا۔ 5/ اگست کو کارروائی شروع ہوتی ہے اور 7/ اگست کو مولوی صاحب کو خیال آنے لگ جاتے ہیں کہ یہ تو بہت طویل ہو گئی ہے حالانکہ اس کے بعد بھی کئی روز کارروائی جاری رہی۔ اصل بات تو یہ تھی کہ وہ جوابات سے خفت محسوس کر رہے تھے اور اپنی جان چھڑانا چاہتے تھے۔ لیکن اس کے بعد اٹارنی جنرل صاحب نے کہا کہ وہ چاہتے ہیں کہ گواہ زیادہ سے زیادہ بولے کیونکہ جتنا وہ زیادہ بولے گا اتنا ہی اس کے بیان میں Contradiction آئے گی۔ ان کی خوش فہمی کس حد تک بجا تھی۔ میرا نہیں خیال کہ اس کارروائی کو پڑھنے والے کو اس بارے میں خود فیصلہ کرنے میں کوئی دشواری پیش آئے گی۔

8/ اگست کی کارروائی

8/ اگست کو کارروائی شروع ہونے سے قبل سپیکر صاحب نے اس عندیہ کا اظہار کیا کہ جماعتِ احمدیہ مبائعین اور جماعتِ احمدیہ غیر مبایعین پر سوالات 10/ اگست تک چلیں گے یعنی سپشل کمیٹی کی کارروائی ہو گی۔ 13اور14/ اگست کو قومی اسمبلی کا اجلاس کر کے یہ معاملہ نمٹا دیا جائے گا۔ ہم پہلے یہ ذکر کر چکے ہیں کہ پہلے سپیکر صاحب نے کہا تھا کہ یہ سلسلہ دو تین دن جاری رہ سکتا ہے لیکن اب یہ کہا گیا تھا کہ یہ کارروائی 10/اگست تک چلے گی۔ اس کے بعد عملاً یہ کارروائی اس سے بھی آگے تک جاری رہی۔ اس کی بنیادی وجہ یہی تھی کہ سوال کرنے والے جانتے تھے کہ انہیں اب تک عملاً کامیابی حاصل نہیں ہوئی لیکن وہ محسوس کرتے تھے کہ اگر یہ کارروائی اور زیادہ جاری رہے تو انہیں مطلوبہ نتائج حاصل ہو سکتے ہیں۔

اگلے روز جب کارروائی شروع ہوئی تو حضرت خلیفة المسیح الثالثؒ نے اس اعتراض کا جواب دینا شروع کیا جو ایک روز قبل کیا گیا تھا۔ اور یہ اعتراض حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے اس کشف پر کیا گیا تھا اور اس ضمن میں حضور کی تصنیف "ایک غلطی کا ازالہ" کا حوالہ دیا گیا تھا۔ اور یہی کشف براہینِ احمدیہ میں بھی درج کیا گیا ہے۔ جیسا کہ ہم ذکر کر چکے ہیں کہ اٹارنی جنرل صاحب نے حوالہ پڑھتے ہوئے تحریف شدہ عبارت پڑھی تھی۔ ہم صحیح عبارت درج کرتے ہیں۔ پڑھنے والے فرق کو خود محسوس کر سکتے ہیں۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام تحریر فرماتے ہیں

"... افاضہ انوارِ الٰہی میں محبت اہلِ بیت کو بھی بہت عظیم دخل ہے اور جو شخص حضرتِ احدیت کے مقربین میں داخل ہوتا ہے وہ انہی طیّبین طاہرین کی وراثت پاتا ہے اور تمام علوم و معارف میں ان کا وارث ٹھہرتا ہے۔ اس جگہ ایک نہایت روشن کشف یاد آیا اور وہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ نمازِ مغرب کے بعد عین بیداری میں ...... ایک

عجیب عالم ظاہر ہوا کہ پہلے ایک دفعہ چند آدمیوں کے جلد جلد آنے کی آواز آئی جیسے بسرعت چلنے کی حالت میں پاؤں کی جوتی اور موزہ کی آواز آتی ہے۔ پھر اسی وقت پانچ آدمی نہایت وجیہہ اور مقبول اور خوبصورت سامنے آگئے۔ یعنی جنابِ پیغمبر خدا ﷺ و حضرت علی و حسنین و فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہم اجمعین اور ایک نے ان میں سے اور ایسا یاد پڑتا ہے کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے نہایت محبت و شفقت سے مادرِ مہربان کی طرح اس عاجز کا سر اپنی ران پر رکھ لیا ......"

(روحانی خزائن جلد 18ص213)

اب اگر اس پاکیزہ بیان اور بابرکت کشف سے کوئی غلط اور قابلِ اعتراض مطلب اخذ کرتا ہے تو سوائے اس کے کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کا مخالف تو ہے مگر اس کے دل میں اہلِ بیت کی ذرا سی محبت بھی نہیں ہے۔ ذرا تصور کریں اس عبارت میں حضرت مسیح موعود علیہ السلام یہ مضمون بیان فرما رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنے کے لئے اور روحانی علوم حاصل کرنے کے لئے اہلِ بیت سے محبت رکھنا نہایت ضروری ہے اور معترضین کی ذہنیت ملاحظہ کریں کہ "مادرِ مہربان" کے الفاظ غائب کر کے یہ اعتراض کر رہے ہیں کہ اہلِ بیت کی توہین کی گئی ہے۔ یہ اعتراض صرف معترض کے گندے ذہن کی عکاسی کرتا ہے۔ حضرت فاطمہؓ کو یا آنحضرت ﷺ کو اگر رؤیا میں دیکھا جائے تو یہ نہایت ہی بابرکت رؤیا ہے۔ اس روز یعنی 8/ اگست کو جب کمیٹی کی کارروائی کا آغاز ہوا تو حضور نے علم التعبیر کا ذکر ان الفاظ میں فرمایا:۔

"ایک سوال ایک کشف کے متعلق پوچھا گیا تھا جس کا تعلق حضرت فاطمہؓ سے ہے۔ اس سلسلے میں مَیں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ امتِ محمدیہ میں علم رؤیا کا ایک علم مدوّن ہوا، بڑا زبردست اور اس کے اماموں میں امام جعفر صادقؒ اور ابن سیرینؒ مشہور امام ہیں۔ اس علم کے اور علم کی حیثیت سے مدوّن ہوا اور امتِ مسلمہ کی تاریخ میں

ہمیں یہ نظر آتا ہے کہ کشوف اور رؤیا کی تعبیر کی جاتی ہے ...... اعتراض نہیں کیا جاتا۔ اس نکتہ کو سمجھانے کے لیے چند رؤیا جو پہلے آئی ہیں وہ بتانا چاہتا ہوں۔ اس کے بغیر جس کے متعلق سوال کیا گیا ہے اس کی سمجھ نہیں آسکتی۔

پہلی مثال امام ابو حنیفہؒ کی "تذکرۃ الاولیاء" فارسی میں ہے جس کا ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔ اس میں لکھا ہے۔

"حضرت امام ابو حنیفہؒ نے ایک رات خواب میں دیکھا کہ انہوں نے پیغمبر ﷺ کی ہڈیاں لحد سے جمع کیں اور بعض کو چھوڑ کر بعض کو پسند کر لیا اور اس ہیبت سے آپ بیدار ہو گئے۔ ابن سیرینؒ کے اصحاب میں سے ایک نے پوچھا تو اس نے کہا کہ تو پیغمبر ﷺ کے علم میں اور ان کی سنت کی حفاظت میں ایسا درجہ پائے گا کہ اس میں متعرف ہوجائے گا، صحیح کو سقیم سے جدا کرے گا۔"

(تذکرۃ الاولیاء۔ مصنفہ حضرت فریدالدین عطارؒ، ناشر احمد پبلیکیشنز 2000ء ص187)

تو اتنا بھیانک خواب کہ اپنے خواب، رؤیا میں دیکھتے ہیں کہ روضہ مطہرہ میں سے آپ کے جسمِ مطہر کی ہڈیاں لیں اور بعض کو پسند کیا اور بعض کو نا پسند کیا۔ اس صالح انسان پر کپکپی طاری ہو گئی کہ یہ میں نے کیا دیکھ لیا۔ اور اصحابِ ابنِ سیرین کے جو ان کے شاگرد وغیرہ تھے، ان کے پاس گئے اور کہا کہ میں نے یہ خواب دیکھی ہے۔ گھبرائے ہوئے تھے۔ تو انہوں نے کہا کہ گھبرانے کی بات نہیں۔ آپ نے جو خواب دیکھی، جو رؤیا دیکھی، اس کی تعبیر ہے اور تعبیر یہ ہے کہ آپ سنتِ نبوی میں جو غلط باتیں شامل ہو چکی ہیں، ان کو صحیح سے علیحدہ کر دیں گے اور خالص سنت نبوی ﷺ کے قیام کا ذریعہ بنیں گے۔

دوسری رؤیاء جو یہاں میں مثال کے طور پر پیش کرنا چاہتا ہوں، وہ ”گلدستہ کرامات“ سے ہے۔ اور سوانحِ حضرت سیّد عبدالقادر جیلانیؒ (آپ ہمارے ایک مشہور بزرگ ہیں جن کا نام تعارف کا محتاج نہیں)... جواہر القلائد میں لکھا ہے۔

”فرمایا جناب محبوب سبحانی، قطبِ ربّانی، سیّد شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے کہ ایک روز ہم نے بہ عالمِ طفولیت (یعنی عمر تو بڑی تھی لیکن اپنے آپ کو ایک بچے کی شکل میں دیکھا)... کہ فرشتگانِ آسمانی بحکمِ ربانی ہم کو اٹھا کر حضرت عائشہ صدیقہ کی خدمت میں لے گئے۔ انہوں نے ہم کو گود میں اُٹھایا اور چھاتی سے لگایا اور اتنا پیار کیا کہ پستانِ مبارک میں دودھ بھر آیا اور سرِ پستان ہمارے منہ میں رکھ کر دودھ پلایا اور اتنے میں رسالتمآب ﷺ بھی وہاں رونق افروز ہوئے اور فرمایا۔۔۔ (66)

اس کی بھی اس کشف اور رؤیاء کی بھی تعبیر کی گئی ہے۔ حضرت سید عبد القادر جیلانی پر اعتراض نہیں کیا گیا۔ تیسری مثال اس وقت جو میں دینا چاہتا ہوں، وہ حضرت مولانا سید احمد بریلویؒ صاحب کے ایک خواب کی ہے۔

”ایک دن حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور جناب سیدۃ النساء فاطمۃ الزہراء کو سیّد صاحب نے خواب میں دیکھا۔ اس رات کو حضرت علیؓ نے اپنے دستِ مبارک سے آپ کو نہلایا اور حضرت فاطمہ نے ایک لباس اپنے ہاتھ سے آپ کو پہنایا۔ بعد ان وقوعات کے کمالات طریقہ نبوت کے نہایت آب و تاب کے ساتھ آپ پر جلوہ گر ہونے لگے۔ (یہ خواب کی تعبیر بتائی گئی ہے اس میں) اور وہ عنایات ازلی جو مکنون اور محجوب تھیں ظاہر ہو گئیں اور تربیت یزدانی بلاواسطہ کسی کے متکفل حال آپ کے ہو گئی۔“

ایک چھوٹی سی مثال اور ہے۔ حضرت مولوی اشرف علی صاحب تھانوی فرماتے ہیں:۔

"ہم نے حضرت فاطمہؓ کو دیکھا۔ انہوں نے ہم کو اپنے سے چمٹا لیا ہم اچھے ہو گئے۔"

("افاضات الیومیہ تھانوی" جلد 6، بحوالہ "دیوبندی مذہب" صفحہ 156")

اس کے بعد حضور نے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے مذکورہ کشف کی صحیح تفصیلات بیان فرمائیں اور فرمایا:۔

"تو یہ کشف ہے جس کی طرف "نزول المسیح" میں اشارہ کیا گیا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ کشف ہے۔ جس طرح دوسرے کشوف میں اولیاءِ امت نے حضرت فاطمۃ الزہراءؓ کے متعلق کشوف دیکھے یا جیسے حضرت امام ابو حنیفہؒ نے بظاہر نہایت بھیانک کشف دیکھا لیکن اس کی تعبیر کی گئی تو جیسا کہ امتِ محمدیہ کا متفقہ فیصلہ ہے کہ کشوف و رؤیاء کی تعبیر کی جاتی ہے ان پر اعتراض نہیں کیا جاتا، اس کشف کی بھی تعبیر ہونی چاہیئے اور تعبیر اس کی اس کے اندر واضح ہے کیونکہ جیسا کہ ابھی میں نے بتایا ہے اس کشف میں پانچ وجود آپ کے سامنے آئے اور ان کی موجودگی میں جن میں نبی اکرم ﷺ اور سارے کھڑے ہوئے تھے "مادرِ مہربان کی طرح میرا سر اپنی ران کے ساتھ لگایا" کا مطلب ہے کہ کشف میں خود کو بہت چھوٹے بچے کی طرح دیکھا کہ آپ کا سر صرف ران تک پہنچتا تھا..."

جن لوگوں نے یہ اعتراض اُٹھایا تھا انہوں نے صحیح عبارت میں تحریف کر کے اُٹھایا تھا۔ جماعت احمدیہ کی طرف سے جو جواب دیا گیا، اس میں علم التعبیر کی تاریخ سے معروف مثالیں دے کر اور اس کشف کی صحیح عبارت پیش کر کے دیا گیا۔ ہر پڑھنے والا خود فیصلہ کر سکتا ہے کہ کس کا طرزِ عمل قابلِ مذمت اور کس کا طرز عمل عقل اور اخلاق کے تقاضوں کے مطابق تھا۔

اب اٹارنی جنرل صاحب نے جو یہ دیکھا کہ جو تاثر وہ پیدا کرنا چاہتے تھے اس سے تو الٹ نتیجہ برآمد ہو رہا ہے تو انہوں نے اس موضوع کو بدلنے کے لیے گفتگو کا رُخ وحی کے موضوع کی طرف کیا لیکن ان کی ساری

گفتگومیں ایک مسئلہ مسلسل نظر آ رہا تھا۔ وہ مسئلہ یہ تھا کہ وہ ایک سوال کرتے اور جب حضور اس کا جواب شروع فرماتے تو ابھی ایک دو فقرے مکمل نہیں ہوتے تھے کہ اٹارنی جنرل صاحب کوئی اور گفتگو شروع کر دیتے۔ یہاں یہ سوال اُٹھتا ہے کہ ایسا کیوں کیا جا رہا تھا؟ اس کی دو وجوہات ہو سکتی ہیں۔ ایک وجہ تو یہ ہو سکتی ہے چونکہ اٹارنی جنرل صاحب اور سوالات تیار کرنے والی ٹیم کو اس قسم کے موضوعات کا نہ تو کوئی خاطر خواہ علم تھا اور نہ ہی ان موضوعات سے کوئی دلچسپی تھی۔ وہ صرف ایک رسمی کارروائی کر رہے تھے۔ دوسری ممکنہ وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ سوالات کرنے والے اس بات سے خائف تھے کہ حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ کا کسی موضوع پر مکمل جواب سامنے آئے کیونکہ اس سے ان کے اُٹھائے گئے اعتراضات کا تانا بانا بکھر جاتا تھا۔ اس لئے وہ یہ کوشش کر رہے تھے کہ بار بار بدل بدل کر سوالات کرتے رہیں اور زیادہ سے زیادہ کوشش کریں کہ کسی موضوع پر مکمل جواب سامنے نہ آنے پائے۔

اس گفتگو کے دوران یحیٰ بختیار صاحب نے کہا کہ وحی تو صرف نبیوں کو ہوتی ہے۔ اب وہ ایک اور غلط بات کہہ گئے تھے۔ قرآنِ کریم میں شہد کی مکھی کو بھی وحی ہونے کا ذکر ملتا ہے۔ جب حضور نے اس بات کی نشاندہی فرمائی کہ وحی تو شہد کی مکھی کو بھی ہوتی ہے اور اس ضمن میں سورۃ نحل کی آیت 69 پڑھنی شروع کی تو اٹارنی جنرل صاحب نے ایک مرتبہ پھر قطع کلامی کر کے ایک اور سوال کرنے کی کوشش کی تو اس پر حضور نے انہیں یاد دلایا کہ" میں قرآنِ کریم کی آیت پڑھ رہا ہوں۔" لیکن وہ پھر بھی نہ سمجھے کہ یہ مناسب نہیں کہ قرآنِ کریم کی آیت پڑھی جا رہی ہو اور کوئی شخص بیچ میں اپنی بات شروع کر دے۔

"حضور نے مزید واضح کرنے کے لیے سورۃ القصص کی آیت 8 کا حوالہ دیا جس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کو وحی ہونے کا ذکر ہے اور اٹارنی جنرل صاحب کے پاس ان ٹھوس دلائل کا کوئی جواب نہیں تھا۔

اٹارنی جنرل صاحب نے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے بعض اشعار پر اعتراض کیا تھا۔ اس کے بعد حضور نے ان کا صحیح مطلب بیان فرمایا۔ پھر نبی اور محدَّث کی اصطلاحات پر بات ہوئی۔ اس کارروائی کے دوران یہ صورتِ حال بار بار سامنے آرہی تھی کہ سوال پیش کرتے ہوئے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کا ایک حوالہ بغیر سیاق و سباق کے پڑھ کر کوئی اعتراض اُٹھانے کی کوشش کی جاتی لیکن جب حضرت خلیفة المسیح الثالثؒ تمام حوالہ پڑھتے تو اعتراض خود بخود ہی ختم ہو جاتا۔ کچھ سوال کرنے والوں کی علمی حالت بھی دِگر گوں تھی۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس مرحلہ پر اٹارنی جنرل صاحب نے یہ سوال اُ ٹھا دیا کہ کیا حضرت عیسیٰ علیہ السلام شرعی نبی تھے۔ حالانکہ یہ بات تو بچوں کو بھی معلوم ہے کہ حضرت عیسیٰ کوئی نئ شریعت نہیں لے کر آئے تھے۔ اس مرحلہ پر اٹارنی جنرل صاحب نے جو معیّن جملہ کہا وہ یہ تھا:۔

"نہیں مرزا صاحب ! میں آپ سے یہ عرض کر رہا تھا کہ حضرت عیسیٰؑ امتی نبی نہیں تھے کیونکہ ان کی شریعت آگئی تھی اپنی۔"

اس کے جواب میں حضور نے یہ ضروری تصحیح فرمائی:۔

" حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی کوئی شریعت نہیں ، کوئی بھی نہیں مانتا ، کیونکہ وہ صاحبِ شریعت نبی نہیں تھے۔ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے تابع نبی تھے ..."

اُس اسمبلی اور اٹارنی جنرل صاحب کی دینی معاملات میں علمی حالت یہ تھی کہ ان قابل حضرات کو یہ بھی علم نہیں تھا کہ حضرت عیسیٰ شرعی نبی نہیں تھے بلکہ حضرت موسیٰ کی شریعت کی پیروی کرتے تھے اور اس کے باوجود وہ اپنے آپ کو اس قابل سمجھتے تھے کہ وہ یہ فیصلہ کریں کہ کون مسلمان ہے اور کون مسلمان نہیں ہے۔

کچھ ہی دیر قبل حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ نے رؤیاء و کشوف کے تعبیر طلب ہونے کے بارے میں ایک نوٹ پڑھا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ سوال کرنے والوں نے غور سے اس کو نہیں سنا تھا۔ اس مرحلہ پر اٹارنی جنرل صاحب نے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کا ایک کشف پڑھ کر اعتراض کیا کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے نعوذباللہ خدا ہونے کا دعویٰ کیا تھا۔ یہ کشف ہم حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے الفاظ میں ہی تحریر کر دیتے ہیں۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام اپنی تصنیف کتاب البریہ میں تحریر فرماتے ہیں:۔

”میں نے اپنے ایک کشف میں دیکھا کہ میں خود خدا ہوں اور یقین کیا کہ وہی ہوں اور میرا اپنا کوئی ارادہ اور کوئی خیال اور کوئی عمل نہیں رہا اور میں ایک سوراخ دار برتن کی طرح ہو گیا ہوں۔ یا اس شے کی طرح جسے کسی دوسری شے نے اپنی بغل میں دبا لیا ہو اور اسے اپنے اندر بالکل مخفی کر لیا ہو یہاں تک کہ اس کا کوئی نام و نشان باقی نہ رہ گیا ہو۔ اس اثناء میں مَیں نے دیکھا کہ اللہ تعالیٰ کی روح مجھ پر محیط ہو گئی اور میرے جسم پر مستولی ہو کر اپنے وجود میں مجھے پنہاں کر لیا۔ یہاں تک کہ میرا کوئی ذرہ بھی باقی نہ رہا اور میں نے اپنے جسم کو دیکھا تو میرے اعضاء اس کے اعضاء اور میری آنکھ اس کی آنکھ اور میرے کان اس کے کان اور میری زبان اس کی زبان بن گئی تھی۔ میرے رب نے مجھے پکڑا اور ایسا پکڑا کہ میں بالکل اس میں محو ہو گیا اور میں نے دیکھا کہ اس کی قدرت اور قوت مجھ میں جوش مارتی اور اس کی الوہیت مجھ میں موجزن ہے۔ حضرت عزت کے خیمے میرے دل کے چاروں طرف لگائے گئے اور سلطانِ جبروت نے میرے نفس کو پیس ڈالا۔ سو نہ تو مَیں مَیں ہی رہا اور نہ میری کوئی تمنا ہی باقی رہی ... “(67)

اس پُر معرفت کشف کا بیان تو جاری رہتا ہے لیکن اتنی سی عبارت کا مطالعہ ہی اس بات کو واضح کر دیتا ہے کہ اس کشف میں فنا فی اللہ ہونے کا ذکر ہے، اللہ تعالیٰ کی محبت میں کھوئے جانے کا ذکر ہے، اس کشف کی تعبیر کرتے ہوئے خدائی کا دعویٰ تو اس سے کسی طرح بھی نہیں نکالا جا سکتا اور یہ حقیقت کس طرح نظر انداز

کی جا سکتی ہے کہ خواب اور کشف تعبیر طلب ہوتے ہیں۔ اور جب آئینہ کمالاتِ اسلام میں حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے یہ کشف بیان فرمایا تو خود یہ امر بھی تحریر فرما دیا کہ اس کشف سے وہ عقیدہ مراد نہیں ہے جو وحدت الوجود کا عقیدہ رکھنے والوں کا مذہب ہے اور نہ وہ مطلب نکلتا ہے جو حَلُولی عقائد رکھنے والوں کا مذہب ہے بلکہ اس میں وہی مضمون بیان ہوا ہے جو اس حدیث میں بیان ہوا ہے کہ ایک بندہ نوافل کے ذریعہ میرا قرب حاصل کرتا ہے یہاں تک کہ میں اس سے محبت کرتا ہوں اور جب میں اس سے محبت کرتا ہوں تو میں اس کے کان بن جاتا ہوں جن سے وہ سنتا ہے، اس کی آنکھیں بن جاتا ہوں جن سے وہ دیکھتا ہے، اس کے ہاتھ بن جاتا ہوں جن سے وہ پکڑتا ہے، اس کے پاؤں بن جاتا ہوں جن سے وہ چلتا ہے۔

(صحیح بخاری، کتاب الرقاق، باب التواضع)

اگر اعتراض کرنے والوں کی منطق قبول کر لی جائے تو پھر اس حدیثِ نبوی کی روشنی میں تمام مقربین الٰہی کو خدا کا بیٹاتسلیم کرنا پڑے گا لیکن کوئی بھی ذی شعور یہ منطق قبول نہیں کر سکتا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس مرحلہ پر اٹارنی جنرل صاحب اس کوشش میں تھے کہ وہ یہ ثابت کریں کہ نعوذ باللہ جماعتِ احمدیہ مشرکانہ عقائد رکھتی ہے۔ لیکن اس مقصد کے لئے جو سوالات کئے جا رہے تھے، وہ یہ ظاہر کرتے تھے کہ سوال کرنے والے قرآنِ مجید، احادیثِ نبویہ اور امتِ محمدیہ کے مجددین اور اولیاء کی تحریرات اور اقوال کا سطحی علم بھی نہیں رکھتے۔ اب اٹارنی جنرل صاحب سیرت المہدی میں سے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے ایک بیان فرمودہ کشف کی یہ عبارت پڑھی:۔

" میں نے کچھ احکامات قضا و قدر کے متعلق لکھے اور ان پر دستخط کروانے کی غرض سے اللہ کے پاس گیا۔ انہوں نے نہایت شفقت سے اپنے پاس پلنگ پر بٹھایا۔ اس وقت میری یہ حالت ہوئی جیسے ایک بیٹا اپنے باپ سے سالہا سال کے بعد ملتا ہے ... "

(کسی قدر فرق کے ساتھ یہ بیان سیرت المہدی کے موجودہ ایڈیشن کی جلد اوّل کے صفحہ نمبر74و75پر موجود ہے)

یہ عبارت پڑھ کر اٹارنی جنرل صاحب نے کہا کہ "یعنی وہ خدا کے بیٹے ... "یعنی وہ یہ الزام لگا رہے تھے کہ نعوذُ باللہ حضرت بانی سلسلہ احمدیہ نے خدا کے بیٹے ہونے کا دعویٰ کیا تھا۔ یہ ایک نہایت ہی خلافِ عقل الزام تھا۔ اس کشف کا بیان کرتے ہوئے کہیں خدا کے بیٹے ہونے کا دعویٰ نہیں کیا گیا۔ صرف بیان کیا گیا ہے کہ میری حالت اس وقت ایسی تھی جیسے ایک بیٹا اپنے باپ سے سالہا سال کے بعد ملتا ہے۔ یہ بات کسی طرح بھی قابلِ اعتراض نہیں ہو سکتی۔ پھر تو یہ معترضین اس آیتِ کریمہ پر بھی اعتراض کر دیں گے۔

"پس جب تم اپنے (حج کے) ارکان ادا کر چکو تو اللہ کا ذکر کرو جس طرح تم اپنے آباء کا ذکر کرتے ہو بلکہ اس سے بھی بہت زیادہ ذکر ... " (البقرۃ : 201)

جب اس اجلاس کی کارروائی ختم ہو رہی تھی تو پھر اٹارنی جنرل صاحب نے ایک حوالہ پڑھنے کی کوشش فرمائی۔ یہ سمجھ تو کیا آنی تھی کہ وہ اعتراض کیا کرر ہے ہیں لیکن پہلے ہی انہوں نے خود ہی اعلان کیا کہ انہیں صحیح طرح معلوم نہیں کہ یہ حوالہ کہاں کا ہے؟ انہوں نے فرمایا:۔

"یہ ایک جگہ اور ... یہ اخبار الفضل سے لیا گیا ہے۔ پتہ نہیں کون سا ان کا حوالہ ہے۔ وہ میں آپ کو بتا دوں گا ... "

اٹارنی جنرل صاحب جو کچھ بھی فرما رہے تھے بالکل نا قابلِ فہم تھا۔ وہ نہ کوئی عبارت پڑھ رہے تھے نہ معین حوالہ دے رہے تھے بس کچھ بے یقینی کا اظہار کر رہے تھے۔ اس پر حضور نے دریافت فرمایا۔

کہ یہ کون سا حوالہ ہے؟ اس پر اٹارنی جنرل صاحب نے عبارت پڑھنی شروع کی:۔

"اللہ تعالیٰ کے متعلق وہ کہتے ہیں ریفرنس ہے ایک کہ " وہ بہت خوبصورت عورت ہے ... "

اب تک اٹارنی جنرل صاحب نہ کوئی حوالہ پیش کر سکے تھے کہ معین طور پر کہ یہ عبارت کہاں سے لی گئی ہے اور نہ ہی وہ یہ بتا سکے تھے کہ یہ کہا کس نے تھا۔ اس پر حضور نے فرمایا۔

" نہیں جی! ہمارے علم میں تو ایسا نہیں ... " اور فرمایا کہ چیک کریں گے یہ نہ تصدیق کے قابل ہے نہ تردید کے قابل جب تک چیک نہ کر لیا جائے۔ جب اٹارنی جنرل صاحب نے یہ سنا کہ یہ حوالہ چیک کیا جائے گا تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ مزید گھبرا گئے اور فوراََ یہ کہہ کر اپنی جان چھڑانے کی کوشش کی۔

" نہیں، یہ میں نے ابھی تک پڑھا نہیں۔"

اس پر حضور نے دریافت فرمایا کہ کیا انہوں نے اس حوالے کو پیش کرنے کا ارادہ ترک کر دیا ہے؟ اس پر اٹارنی جنرل صاحب پر پھر کچھ بے یقینی کے ساتھ کہا :

"میں نے پڑھا ہی نہیں ابھی تک۔ میں آپ کو پڑھ کر سنا رہا ہوں۔ پھر آپ چیک کریں۔"

اب صورتِ حال کافی دلچسپ ہو چکی تھی اتنی دیر میں اٹارنی جنرل صاحب کی سوئی" وہ بہت خوبصورت عورت ہے ... " کے الفاظ پر رکی ہوئی تھی۔ اس پر حضور نے فرمایا:۔

" آپ نے عورت کہا نہ بس اتنا اشارہ کافی ہے؟"

اب اٹارنی جنرل صاحب نے ایک بار پھر اپنے حواس جمع کئے اور حوالہ پڑھنا شروع کیا اور کہا

”وہ خوبصورت عورت ہے ... “

حضور:” ہاں ،ہاں ، خوبصورت عورت ہے اللہ “ اور اس کو ...

اٹارنی جنرل صاحب: تو ایسی کوئی چیز آپ کے علم میں ہے؟

حضور: میرے علم میں کہیں نہیں۔ نہ ہمارے بزرگوں کے علم میں ہے کوئی۔ دیکھنا یہ ہے کہ کس نے یہ حوالہ بنایا ہے؟

اب صورتِ حال واضح ہو چکی تھی۔ سپیشل کمیٹی میں جماعت احمدیہ کی طرف سے یہ واضح الزام لگا دیا گیا تھا کہ سوالات کرنے والے ایک بار پھر جعلی حوالہ پیش کرنے کا جرم کر رہے ہیں۔ چاہئیے تو یہ تھا کہ اٹارنی جنرل صاحب فوری طور پر معین حوالہ اور اس کا ثبوت دیتے تا کہ اس الزام کا داغ ان سے دور ہو لیکن انہوں نے کیا کہا ؟انہوں نے کہا کہ میں ایک دو حوالے دیکھوں گا اور سپیکر صاحب سے وقفہ کی درخواست کی۔ اب ضروری ہو گیا تھا کہ سپیکر صاحب ان کی گلو خلاصی کرائیں تاکہ انہیں مزید شرمندگی نہ اُٹھانی پڑے چنانچہ سپیکر صاحب نے وقفہ کا اعلان کر دیا گیا تھا۔ اس کے بعد کئی دن یہ کارروائی جاری رہی لیکن اٹارنی جنرل صاحب اور ان کی اعانت کرنے والے مولوی حضرات اس حوالے کا کوئی ثبوت مہیا نہیں کر سکے۔

سوا بارہ بجے اجلاس کی کارروائی دوبارہ شروع ہوئی۔ ابھی جماعت کا وفد ہال میں نہیں آیا تھا۔ سب سے پہلے تو سپیکر صاحب نے ارشاد فرمایا کہ دروازہ بند کر دیں۔ سب سے پہلے تو مولوی شاہ احمد نورانی صاحب بولے کہ پہلے ان سے (یعنی جماعت کے وفد سے)معیّن جواب لیا جائے۔ اس کے بعد تشریح وغیرہ کریں لیکن تحریری بیان نہ ہو۔ سپیکر صاحب نے انہیں تسلی دلائی تو پھر مفتی محمود صاحب نے اپنے شکوے شروع کئے۔ ان کا پس

منظر یہ تھا کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے بعض الہامات اور کشوف اور رؤیا پر اعتراضات اُٹھائے گئے تھے۔ ان کے جوابات دیتے ہوئے حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ نے احادیث سے بعض بزرگان کی تحریروں سے اور بعض غیر از جماعت احباب کی تحریروں سے کئی مثالیں سنائی دی تھیں کہ اس طرح کے کشف اور رؤیا تو بہت سے بزرگوں کو ہوتے رہے ہیں اور ان کی تعبیر کی جاتی ہے۔ اب عقل کی رو سے جائزہ لیا جائے تو اس طرح کے جواب پر کوئی اعتراض نہیں اُٹھتا بلکہ ہر صاحبِ شعور اس علمی جواب کی قدر کرے گا۔ مگر عقل اور شعور اس کمیٹی میں ایک جنسِ نایاب کی حیثیت رکھتی تھی۔ مفتی صاحب کا اصرار یہ تھا کہ حضور کو روکا جائے کہ جب اس طرح کا کوئی اعتراض ہو تو وہ کوئی اور مثال پیش نہ کریں۔ بھلا کیوں نہ کریں مفتی صاحب نے اس کی کوئی وضاحت نہیں کی۔ مفتی محمود صاحب نے جو فرمایا وہ یہ تھا:۔

”جی عرض یہ ہے کہ کل بھی یہ بات ہوئی تھی وہ ایک جواب لکھ کر لاتے ہیں اور پڑھتے ہیں اور سوال ہوتا ہے ایک بات کے متعلق وہ جواب دیتے ہیں دوسری بات کا۔ اب سوال آج تھا کشف کے متعلق انہوں نے کشف کے مقابلے میں جب کہ کشف اور خواب میں فرق ہے، وہ خود تسلیم کرتے ہیں۔ خواب کی چار پانچ مثالیں دیں کہ فلاں نے خواب دیکھا فلاں نے خواب دیکھا انہوں نے بھی دیکھاتو گویا ان کے جرم سے ہمارا جرم کم ہو جاتا ہے۔ اس طریقے سے پانچ چھ لوگوں کی مثالیں دیں ان کے خوابوں کی کوئی مثال کشف کی نہیں تھی تو میں کہتا ہوں کہ وہ چیز پوچھی جائے اسی کا جواب دے ایک چیز پوچھی جاتی ہے جواب اور باتوں کا آ جاتا ہے۔“

معلوم ہوتا ہے کہ یا تو مفتی محمود صاحب نے حضور کی طرف سے دیا گیا جواب سنا نہیں تھا یا پھر سمجھ نہیں پائے تھے۔ جماعت کے موقف میں واضح طور پر یہ بیان کیا گیا تھا کہ کشف اور خواب دونوں تعبیر طلب ہوتے ہیں اور اس سلسلہ میں بہت سی مثالیں پیش کی گئی تھیں۔

اس کے جواب میں سپیکر صاحب نے یہ تبصرہ کیا کہ بہت سی غیر متعلقہ باتیں آرہی ہیں۔ اب یہ سوچنے کی بات یہ ہے کہ آخر غیر متعلقہ باتیں کیوں آ رہی تھیں ؟ وجہ یہ تھی کہ کارروائی کو تیسرا دن گزر رہا تھا اور کمیٹی سوال پر سوال کئے جا رہی تھی لیکن ابھی تک اس موضوع پر سوال شروع ہی نہیں ہوئے تھے جس کے لیے اس کمیٹی کو قائم کیا گیا تھا۔ پھر نورانی صاحب نے فرمایا:۔

”Explanation قرآن اور حدیث کی روشنی میں مختصر explanation۔“ یہ جملہ پڑھ کر تو احساس ہوتا ہے کہ شاید نورانی صاحب ابھی ابھی گہری نیند سے بیدار ہوئے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ اب تک کمیٹی نے بیسیوں سوالات اور تبصرے لکھ کر اٹارنی جنرل صاحب کو دیئے تھے لیکن کسی ایک میں بھی کسی آیتِ کریمہ یا حدیث شریف کو دلیل کے طور پر پیش نہیں کیا گیا تھا۔ البتہ جو جوابات حضور نے دیئے تھے اور جو جوابات اس کے بعد بھی دیئے گئے ان میں سے بہت سے جوابات میں قرآنی آیات اور احادیث کو بطور دلیل کے پیش کیا گیا تھا۔ پھرایک اور ممبر محمد حنیف خان صاحب نے یہ گلہ کیا ”وہ question کرنا شروع کر دیتا ہے۔“ سب اپنے گلے شکوے کر رہے تھے لیکن سب سے عجیب پوزیشن اٹارنی جنرل صاحب کی تھی۔ بیشتر سوالات تو مولوی حضرات لکھ کر دیتے تھے لیکن انہیں اٹارنی جنرل صاحب کو پڑھنا ہوتا تھا۔ اور اگر سوال لایعنی ہو یاحوالہ ہی غلط ہو تو خفت بھی انہیں اٹھانی پڑتی تھی۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ وہ اب اس صورت ِ حال سے عاجز آ رہے تھے۔ چنانچہ اس مرحلہ پر اٹارنی جنرل صاحب نے کہا:۔

Sir, I will respectfully submit that explanations are different; you may or may not accept; but I request the honourable members not to supply me loose balls to score boundaries .

اٹارنی جنرل صاحب نے کرکٹ کا بہت دلچسپ محاورہ استعمال کیا تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ میں بڑے ادب سے عرض کروں گا کہ تشریحات تو مختلف ہو سکتی ہیں لیکن ممبران مجھے کمزور گیندیں نہ مہیا کریں جن پر یہ چوکے چھکے لگائیں۔

اب اس سے کیا نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے؟ صرف یہی کہ خود سوالات کرنے والا اس بات کا شکوہ کر رہا ہے کہ اسے کمزور سوالات مہیا کئے جا رہے ہیں۔ اس پر سپیکر صاحب نے پھر ممبران سے صحیح طرح حوالہ جات پیش کرنے کی درخواست کی اور کہا:۔

"...... وہ جو questions ہمارے approve ہوئے ہیں۔ ان میں کئی حوالہ جات نکلتے ہی نہیں ہیں۔"

پھر ایک اور ممبر اسمبلی سردار مولا بخش سومرو صاحب نے کہا کہ کوئی جواب پانچ یا دس منٹ سے زیادہ کا نہیں ہونا چاہئے اور جب کتب یہاں پر موجود ہیں تو انہیں اس بات کی اجازت نہیں دینی چاہئے کہ وہ بعد میں اپنی کتب سے پڑھ کر جواب دیں گے۔ سومرو صاحب کی یادداشت کچھ زیادہ مضبوط نہیں تھی۔ وہ بھول گئے تھے کہ پہلے روز ہی اٹارنی جنرل صاحب نے حضور سے کہا تھا کہ اگر وہ کسی سوال کا جواب دینے کے لیے وقت لینا چاہیں تو کمیٹی سے اس کا وقت لے سکتے ہیں۔ اس پر سپیکر صاحب نے سومرو صاحب کو یاد دلایا کہ سوال سوال میں فرق ہوتا ہے۔ بعض سوالات کے جواب میں وضاحتیں ہوتی ہیں اور بعض سوالات کا جواب تحقیق کے بعد دینا ہوتا ہے۔ ویسے یہ کوئی ایسا دقیق نکتہ نہیں تھا کہ اس کو دریافت کرنے کے لیے سومرو صاحب کو سپیکر صاحب کی مدد کی ضرورت ہوتی۔ یہ بات کارروائی کے سرسری مطالعہ ہی سے نظر آجاتی ہے کہ دس میں سے آٹھ سوالات کا جواب تو صرف ایک دو منٹ میں نہایت اختصار سے دیا گیا تھا اور شاید ہی اب تک کی کارروائی میں کسی سوال کا جواب دس منٹ کا ہو۔ پھر عبد العزیز بھٹی صاحب نے کہا کہ جہاں جواب Irrelevant ہو وہاں

سپیکر صاحب اپنا اختیار استعمال کر کے اس کو بند کریں۔ مولوی ظفر انصاری صاحب نے اصرار کیا کہ انہیں لکھی ہوئی چیز پڑھنے کا زیادہ موقع نہ دیا جائے۔ احمد رضا قصوری صاحب نے یہ انکشاف کیا کہ گواہ بعض جوابات کو بار بار دہرا رہا ہے اور بعض کتابوں کے حوالے بھی بار بار دہرائے جا رہے ہیں۔ ہم یہاں اس لیے نہیں بیٹھے کہ ہمیں بتایا جائے کہ احمدیہ عقائد کیا ہیں اور نہ ہی وہ ہمیں تبلیغ کر رہے ہیں۔ اب یہ اعتراض معقولیت سے قطعاً عاری تھا کیونکہ حقیقت یہ نہیں تھی کہ کچھ جوابات دہرائے جا رہے تھے بلکہ حقیقت یہ تھی کہ اٹارنی جنرل صاحب بعض سوالات کو بار بار دہرا رہے تھے اور ظاہر ہے کہ جب کوئی سوال دہرایا جائے گا تو جواب دینے والے کو جواب بھی دہرانا پڑے گا۔ یہ حقیقت اتنی واضح تھی کہ خود وفاقی وزیر عبد الحفیظ پیرزادہ صاحب کو بھی اس کی نشاندہی کرنی پڑی کہ اٹارنی جنرل صاحب کو بعض سوالات اس لیے دہرانے پڑتے ہیں تا کہ جوابات میں تضاد پیدا ہو۔

اس کے بعد جماعتِ احمدیہ کا وفد داخل ہوا۔ اب جو کارروائی شروع ہوئی تو جوابات میں تو کیا تضاد پیدا ہونا تھا، خدا جانے کیا ہوا کہ اٹارنی جنرل صاحب نے جلد جلد کچھ بے ربط سوالات کرنے شروع کیے۔ پہلے انہوں نے ایک حوالہ پڑھ کر یہ سوال اُٹھایا کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی تحریروں میں حضرت مریم کا کیا مقام بیان ہوا ہے ابھی اس پر تین چار منٹ ہی گزرے ہوں گے اور ابھی اس مسئلہ پر بات صحیح سے شروع بھی نہیں ہوئی تھی کہ انہوں نے اچانک یہ سوال اُٹھا دیا کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے پیر مہر علی شاہ گولڑوی کو ملعون لکھا ہے۔ ابھی لائبریرین کو حوالہ پکڑانے کا کہا ہی تھا کہ انہوں نے کہا کہ میں دو چار اکٹھے پڑھ دیتا ہوں اور فوراً ہی اس مسئلہ پر آ گئے کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے رشید احمد گنگوہی کو شیطان گمراہ اور ملعون لکھا ہے۔ ابھی اس کا جواب نہیں آیا تھا کہ سپیکر صاحب نے کہا کہ میں یہ تجویز دوں گا کہ اٹارنی جنرل صاحب ایک وقت میں ایک سوال کریں لیکن وہ ہوا کے گھوڑے پر سوار تھے۔ انہوں نے کہا کہ یہ سب

ایک ہی طرح کے سوالات ہیں اور ایک اور سوال کیا کہ بانی سلسلہ احمدیہ نے سعد اللہ لدھیانوی کے بارے میں یہ الفاظ استعمال کئے ہیں۔ اس کے جواب میں حضور نے فرمایا کہ ہم یہ حوالہ جات چیک کر کے جواب دیں گے۔ اس کے بعد اٹارنی جنرل صاحب نے کچھ اور حوالہ جات پڑھے کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے اپنی تحریروں میں مخالفین کے متعلق سخت الفاظ استعمال کیے ہیں۔ اس کے جواب میں بھی حضور نے فرمایا کہ یہ سب حوالہ جات نوٹ کرا دیئے جائیں ان کے جوابات اکٹھے دیئے جائیں گے۔

اس اعتراض کو پرکھتے ہوئے اس امر کا جائزہ لینا ضروری ہے کہ جن لوگوں کا نام لے کر یہ اعتراض کیا جا رہا تھا کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے ان کے متعلق سخت الفاظ استعمال کیے ہیں، خود ان مخالفین نے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے متعلق کیا الفاظ استعمال کئے تھے۔ پیر مہر علی شاہ گولڑوی کی مثال لے لیں۔ انہوں نے اپنی کتاب سیفِ چشتیائی میں حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے متعلق لکھا تھا "الغرض اکثر الہامات ان کے تو کاذب ہونے کی وجہ سے ان کو مفتری علی اللہ قرار دیتے ہیں اور بعض الہامات گو کہ فی نفسھا صحت رکھتے ہیں مثل آیتِ قرآنیہ ملہمہ کی مگر ان سے الٹا نتیجہ نکالنے کے باعث سے ان پر پوری جہالت کا دھبہ لگاتے ہیں اور مع ھٰذا تلبیس ابلیس ہونے میں بھی کوئی شک نہیں رہتا۔" پھر وہ اسی کتاب میں حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے الہامات کے متعلق لکھتے ہیں کہ یہ تین اقسام کے ہیں "(1) الہاماتِ کاذبہ جن کے کاذب ہونے پر وہ خود ہی گواہ ہیں (2)الہاماتِ کاذبہ جن کو بوجہ نہ پورا نکلنے ان کے کاذب سمجھا گیا ہے(3)الہاماتِ صیّاد یہ جن کا ابنِ صیّاد کے الہام کی طرح اگر سر ہے تو پاؤں نہیں اگر پاؤں ہیں تو سر نہیں ... (4) الہاماتِ شیطانیہ انسیہ جن کو کسی آدمی پڑھے ہوئے نے اس کے قلب میں ڈال دیا ہے(5)الہامتِ شیطانیہ جنیہ (6) الہاماتِ شیطانیہ معنویہ ... " اور پھر حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے متعلق یہ بد زبانی کی "قادیانی صاحب نے اس مقام پر بڑی چالاکی اور دجل سے کام لیا۔" (68)

اور پھر پیر گولڑوی صاحب نے اپنی کتاب سیفِ چشتیائی میں یہ فارسی شعر درج کیا

زمیں نفرت کند از تو فلک گرید بَر احوالت

ملک لعنت کناں نزد خدا بَر آسماں بینی

یعنی زمین تجھ سے نفرت کرتی ہے اور آسمان تیرے حال پر روتا ہے۔ تو دیکھتا ہے کہ خدا کے نزدیک آسمان پر فرشتے تجھ پر لعنت کرتے ہیں۔ (69)

پھر حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے اپنی تصنیف اعجاز احمدی (ضمیمہ نزول المسیح) میں یہ عربی شعر ان صاحب کے متعلق تحریر فرمایا۔

آ لَا اَيُّهَا اللَّعَّانُ مَا لَكَ تَهْجُر

وَ تَلْعَنُ مَنْ هُوَ مُرْسَلٌ وَّ مُوَقَّر

یعنی اے لعنت کرنے والے تجھے کیا ہو گیا ہے کہ بیہودہ بک رہا ہے۔ اور تو اس پر لعنت کر رہا ہے جو خدا کا فرستادہ اور خدا کی طرف سے عزت یافتہ ہے۔ (70)

اور اٹارنی جنرل صاحب حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے اس شعر کو اعتراض کے لئے پیش فرمارہے تھے حالانکہ اس شعر کے الفاظ ہی ظاہر کر دیتے ہیں کہ یہ پیر گولڑوی کی سخت بیانی کے جواب میں ہے۔

اب ہر صاحبِ عقل دیکھ سکتا ہے کہ احمدی حضرت مسیح موعود علیہ السلام کو مامور من اللہ مانتے ہیں اور ان کے الہامات کو خدا تعالیٰ کی طرف سے نازل شدہ مانتے ہیں۔ اور پیر گولڑوی صاحب حضرت مسیح موعود علیہ السلام اور آپ کے الہامات کے متعلق اتنی بد زبانی کر رہے ہیں اور یہ جھوٹی تعلّی کر رہے ہیں کہ آسمان کے

فرشتے نعوذُ باللہ آپ پر لعنت کر رہے ہیں تو مذہب کے مسلّمہ اصولوں کے مطابق ایسا مکذب اور مکفر اگر ملعون نہیں کہلائے گا تو کیا احمدی اسے ولی اللہ سمجھیں گے؟

اٹارنی جنرل صاحب نے یہ اعتراض تو اُٹھا دیا تھا کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے بعض بدزبانی کرنے والے معاندین کے متعلق ملعون کے الفاظ استعمال کئے ہیں لیکن وہ یہ بھول گئے تھے اگر لعنت کا لفظ استعمال کرنا فی ذاتہ قابلِ اعتراض ہے تو ان کا یہ اعتراض دوسرے انبیاء پر، قرآنِ کریم پر اور نبی اکرم ﷺ کی مقدس ذات پر بھی ہوتا ہے۔ قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ بیان فرماتا ہے لُعِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ عَلٰى لِسَانِ دَاوٗدَ وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ (المائدۃ:79) یعنی جن لوگوں نے بنی اسرائیل میں سے کفر کیا وہ داؤد کی زبان سے لعنت ڈالے گئے اور عیسیٰ ابن مریم کی زبان سے بھی اور اللہ تعالیٰ ان لوگوں کی نسبت جنہوں نے ایمان کے بعد کفر کیا فرماتا ہے کہ ان پر اللہ تعالیٰ کی، فرشتوں کی اور لوگوں کی لعنت ہے۔(ال عمران: 88)

حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے کہ رسولِ کریم ﷺ نے قبر کی زیارت کے لیے جانے والی عورتوں پر لعنت کی (بعد میں اس بابت رخصت دے دی گئی تھی) (جامع ترمذی ابواب الجنائز)۔

حضرت حذیفہؓ سے روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے محمد ﷺ کی زبان سے اس شخص پر لعنت کی جو حلقہ کے بیچ بیٹھے (جامع ترمذی۔ باب ما جاء فی کراھیۃ القعود وسط الحلقۃ)

اسی طرح حدیث میں آتا ہے کہ حضرت ابنِ عمرؓ نے بیان فرمایا کہ آنحضرت ﷺ نے اس شخص پر لعنت کی ہے جو زندہ جانور کو باندھ کر اس پر نشانہ بازی کرے۔ (صحیح مسلم۔ کتاب الصید و الذبائح)

بہر حال جیساکہ پہلے ذکر آ چکا ہے کہ حضور نے فرمایا تھا کہ یہ حوالے نوٹ کرا دیئے جائیں، چیک کر کے جواب دیا جائے گا۔ سوال اُٹھانے والوں کو محضر نامے کے مطالعہ سے ہی یہ اندازہ ہو جانا چاہیئے تھا کہ یہ

سوال کرنا انہیں مہنگا پڑے گا۔ عقلمندی کا تقاضا تو یہ تھا کہ یہ سوال اُٹھایا ہی نہ جاتا اور اگر اس کو اُٹھا ہی دیا گیا تھا تو اس کے جواب کے لئے اصرار نہ کیا جاتا کیونکہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے جب بظاہر سخت الفاظ استعمال کئے ہیں، تو وہ مخالفین کی حد سے زیادہ بڑھی ہوئی بد زبانی کے جواب میں مناسب اور جائز سخت الفاظ استعمال فرمائے ہیں لیکن یہ غلطی بھی کر دی گئی۔ ہم کچھ دیر کے لیے واقعات کے تسلسل کو نظر انداز کر کے 9/ اگست کو شام چھ بجے شروع ہونے والی کارروائی کا جائزہ لیتے ہیں۔ جب چھ بجے کارروائی شروع ہوئی تو اٹارنی جنرل صاحب نے از خود دریافت کیا کہ چند حوالے سنائے گئے تھے جو چند بزرگوں کے متعلق توہین آمیز جملے تھے ان کا مطلب کیا تھا۔

حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ کا بات کرنے کا ایک خاص دھیما انداز تھا۔ آپ نے آہستگی سے بات شروع فرمائی اور فرمایا: ”جی ... وہ جو حوالے جس میں سخت زبان استعمال کی گئی تھی۔ جس کی طرف آپ نے میری توجہ دلائی تھی وہ تاریخ کا ایک ورق ہے جس پہ قریباً ستر سال ؟ ستر سال گزر چکے ہیں اور تاریخی واقعات کی صحت سمجھنے کے لیے وہ تاریخ کا ماحول سامنے لاناضروری ہے ورنہ اس کی سمجھ نہیں آ سکتی۔“ کچھ تمہید کے بعد حضور نے مثالیں دینا شروع کیں اور ابھی پہلی مثال ہی دی تھی جس میں بریلویوں نے ایک اور فرقہ سے تعلق رکھنے والوں کو خبیث اور ان سے نکاح کو زنا اور ایسی شادی سے ہونے والی اولاد کو ولد الزنا قرار دیا ہے کہ اٹارنی جنرل صاحب کی آنکھیں کچھ کھلیں کہ وہ کیا غلطی کر بیٹھے ہیں حالانکہ ابھی تو اس بدزبانی کا ذکر شروع ہی نہیں ہوا تھا جو ان کے بزرگوں نے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے متعلق کی تھی۔ اب انہوں نے اس جواب کو روکنے یاکم از کم مختصر کرنے کے لئے ہاتھ پاؤں مارنے شروع کئے اور کہا کہ میرا سوال تو سادہ تھا میں نے تو تین بزرگوں کا نام لے کر دریافت کیا تھا کہ ان کے متعلق مرزا صاحب نے سخت الفاظ استعمال کئے ہیں۔ آپ ان فتووں کا ذکر کر رہے ہیں کہ سنیوں نے شیعوں کو کیا کہا ہے اور شیعوں نے سنیوں کو کیا کہا ہے۔ ان کا کیا جواز

ہے۔ حضور نے اس کے جواب میں ابھی یہی فرمایا تھا کہ ” آپ کا مطلب یہ ہے ...“ ۔ تو معلوم ہوتا ہے کہ اٹارنی جنرل صاحب کو احساس ہوا کہ وہ اپنے اختیارات سے تجاوز کر رہے ہیں۔ سوال تو وہ کر چکے تھے۔ جواب کو روکنا ان کے دائرہ اختیار میں نہیں تھا۔ انہوں نے بات بدل کر کہا کہ” یہ مختصر ہو۔ میں نہیں آپ کو روکتا۔ نہ مجھے اختیار ہے نہ میں آپ کو روک سکتا ہوں۔ صرف یہ ہے کہ Proceedings لمبی ہو گئی ہیں۔ آپ پر بھی Strain ہے۔ اسمبلی پر بھی Strain ہے۔ اس لئے میں مؤدبانہ عرض کروں گا کہ اگر آپ اس کو اس چیز کے لیے Confine کریں۔ اس کا Background ہمیں مل گیا ہے۔ آپ نے پوری تفصیل سے بتایا ہے...“

بہر حال تیر تو اب کمان سے نکل چکا تھا۔ حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ نے فرمایا”اگر میں یہ سمجھوں کہ اس پس منظر کو سامنے لائے ہوئے کہ میں اس مختصر سوال کا مختصر جواب نہیں دے سکتا تو پھر میرے لیے کیا ہدایت ہے آپ کی؟“ اب یہاں پر اٹارنی جنرل صاحب بے بس تھے۔ انہوں نے بے چارگی سے کہا جیسے آپ کی مرضی، میں نےRequest کی تھی۔ اس پر حضور نے فرمایا کہ میں نے سینکڑوں میں سے صرف چند مثالیں لی ہیں اور دوسرا حوالہ پڑھنا شروع کیا۔ اب تو مولوی حضرات کو بھی نظر آ رہا تھا کہ ان کے اعتراض کی کیا گَت بن رہی ہے۔ چنانچہ قواعد کو نظر انداز کرتے ہوئے مولوی غلام غوث ہزاروی صاحب نے سپیکر صاحب سے اپیل کی کہ گواہ کو روکا جائے کہ وہ دوسروں کی گالیاں کیوں پیش کر رہے ہیں۔ لیکن اس وقت سپیکر صاحب ان کی مدد کو نہیں آ رہے تھے چنانچہ سپیکر صاحب نے ان کو تنبیہ کی۔

“This is a question. This can only come through the attorney general. Yes the witness can reply. He should continue, what he was replying.

یعنی یہ ایک سوال ہے اور یہ صرف اٹارنی جنرل صاحب کی وساطت سے کیا جا سکتا ہے۔ جی! گواہ جواب دے سکتا ہے انہیں وہ جواب جاری رکھنا چاہئے جو وہ دے رہے تھے۔

اس کے بعد حضور نے وہ حوالے سنائے جن میں سوال کرنے والوں کے کچھ بزرگوں نے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی شان میں بد زبانی کی انتہا کر دی تھی۔ گندی سے گندی گالی دے کر کے دل دُکھائے گئے تھے۔ شاید ہی کوئی جھوٹا الزام ہو جو آپ کی ذات اقدس پر ان لوگوں نے نہیں لگایا۔ اٹارنی جنرل صاحب نے سعد اللہ لدھیانوی کے متعلق حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی تحریر پر اعتراض کیا تھا۔ حضور نے شاعرِ مشرق اقبال کے کچھ اشعار سنائے جو انہوں نے ایف اے میں سعداللہ لدھیانوی کے متعلق کہے تھے۔ وہ اشعار یہ تھے۔

واہ سعدی دیکھ لی گندہ دہانی آپ کی — خوب ہو گی مہتروں میں قدر دانی آپ کی
بیت سعدی آپ کی بیت الخلاء سے کم نہیں — ہے پسندِ خاکروباں شعر خوانی آپ کی
گوہر بے راہ جھڑے ہیں آپ کے منہ سے سبھی — جان سے تنگ آ گئی ہے مہترانی آپ کی
قوم عیسائی کے بھائی بن گئے پگڑی بدل — واہ کیا اسلام پر ہے مہربانی آپ کی (71)

پھر آپ نے پیر گولڑوی صاحب کی کتاب سیفِ چشتیائی کا حوالہ سنایا جس میں انہوں نے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے متعلق ایک فارسی شعر میں لکھا تھا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک جو فرشتے ہیں وہ تجھ پر لعنت

کر رہے ہیں۔ اس کے جواب میں حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے یہ شعر لکھا تھا جس کا مطلب یہ تھا تم پر آسمانی لعنت ہو۔ پھر اٹارنی جنرل صاحب نے یہ اعتراض کیا تھا کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے رشید احمد گنگوہی کے متعلق سخت الفاظ استعمال کئے ہیں۔ اس کے جواب میں حضور نے حوالہ دیا کہ رشید احمد گنگوہی صاحب نے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے متعلق یہاں تک بدزبانی کی تھی کہ آپ کو اہل ھوا اور گمراہ اور دجال تک کہا ، تب حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے اس کے متعلق وہ سخت الفاظ استعمال کئے۔ اٹارنی جنرل صاحب نے یہ اعتراض کیا تھا کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے مخالفین کے متعلق ذریۃ البغایا کے الفاظ لکھے ہیں اور یہ اصرار کیا تھا کہ اس کا مطلب ولد الحرام ہی ہوتا ہے۔ حضور نے لغوی تحقیق بیان فرمائی اور پرانے بزرگوں کی مثالیں بیان فرمائیں اور اہلِ بیت کے اقوال بیان فرمائے کہ اس کا مطلب سرکش انسان کے ہوتے ہیں اور ہمارے لٹریچر میں اس کا یہی مطلب لیا گیا ہے۔ ان سب مثالوں میں اس کا مطلب ولدالحرام ہونے کے نہیں بلکہ سرکش انسان ہونے کے بیان کئے گئے ہیں۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی صرف ایک تحریر میں اس کا مطلب ”ولدالحرام“ لے کر اس پر اعتراض کرنا درست نہیں۔ ابھی حضور کا جواب جاری تھا کہ سپیکر صاحب نے مغرب کی نماز کے لئے وقفہ کا اعلان کیا۔ حضور نے فرمایا:۔

”میں وہ جو حوالے ہیں نا دوسرے ... “

ابھی جملہ مکمل نہیں ہوا تھا مگر اس سے معلوم ہوتا تھا کہ حضور اس ضمن میں اور حوالوں کو پیش کرنے کا ذکر فرما رہے ہیں کہ سپیکر صاحب نے جلدی سے جملہ کاٹا اور کہا:

”The delegation is permitted to leave“....

اٹارنی جنرل صاحب نے حضور سے دریافت فرمایا کہ کیا یہ concludeہو گیا ہے؟ اس پر حضور نے فرمایا کہ اور حوالے بھی ہیں مگر میں اب انہیں چھوڑتا ہوں۔ میرے خیال میں بات واضح ہو گئی ہے۔

اس کے بعد ہم کارروائی کے تسلسل کے حساب سے ہی جاری رکھتے ہیں۔

اس مرحلہ پر اٹارنی جنرل صاحب نے جن خطوط پر بحث چلانے کی کوشش کی اس کا اندازہ ان مثالوں سے ہو جاتا ہے جو انہوں نے پیش کیں۔ اب تک وہ اس موضوع پر گفتگو شروع کرنے کی ہمت اپنے اندر نہیں پا رہے تھے جس موضوع کے بارے میں اس سپیشل کمیٹی نے کام کرنا تھا۔ اب تک جن خطوط پر انہوں نے بحث لانے کی کوشش کی تھی انہیں ناکامی کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ اب انہوں نے وہی حکمتِ عملی اپنائی جو عموماََ جماعت کے مخالفین اپناتے ہیں یعنی کچھ غلط بیانی کر کے اور کچھ سیاق و سباق کے بغیر حوالے پیش کر کے موقع پر موجود لوگوں کے جذبات یہ کہہ کر بھڑکاؤ کہ مرزا صاحب نے تمہارے متعلق سخت زبانی کی انتہا کر دی ہے تا کہ ان میں سے کوئی متوازن سوچ کا مظاہرہ نہ کر سکے۔ اس کے لئے سب سے پہلے انہوں نے ”نزول المسیح“ کا حوالہ پیش کیا۔ اب شائع ہونے والی کارروائی میں اس حوالے کو inverted commas میں لکھا گیا، اس سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ اس وقت اٹارنی جنرل صاحب یہی تاثر دے رہے تھے کہ میں ” نزول المسیح “ کے معین الفاظ پڑھ رہا ہوں۔ انہوں نے کہا کہ ”نزول المسیح “ کے صفحہ 4 پر لکھا ہے:

”جو شخص میرا مخالف ہے وہ عیسائی یہودی مشرک اور جہنمی ہے۔“

حقیقت یہ ہے کہ ”نزول المسیح“ میں یہ معین الفاظ موجود نہیں اور اصل الفاظ جو وہاں پر درج ہیں وہ بالکل مختلف مضمون بیان کر رہے ہیں۔ اصل الفاظ یہ ہیں:

”اس نے مجھے پیدا کر کے ہر ایک گزشتہ نبی سے مجھے اس نے تشبیہ دی کہ وہی میرا نام رکھ دیا۔ چنانچہ آدم، ابراہیم، نوح، موسیٰ، داؤد، سلیمان، یوسف، یحیٰ، عیسیٰ وغیرہ یہ تمام نام براہینِ احمدیہ میں میرے رکھے گئے اور اس صورت میں گویا تمام انبیاءِ گزشتہ اس امت میں دوبارہ پیدا ہوگئے یہاں تک کہ سب کے آخر میں مسیح پیدا ہو گیا اور جو میرے مخالف تھے ان کا نام عیسائی اور یہودی اور مشرک رکھا گیا۔“

(نزول المسیح ایڈیشن اوّل ص4)

حضور نے نشاندہی فرمائی کہ یہاں یہ تو نہیں لکھا کہ یہ نام میں نے رکھا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس جگہ پر بالکل مختلف مضمون بیان ہو رہا تھا اور وہ یہ کہ ہر مامور من اللہ کے مخالف، انبیاءِ گزشتہ کے مخالفین کی صفات اپنے اندر رکھتے ہیں اور ان سے مماثلت پیدا کر لیتے ہیں اور یہ مضمون حدیثِ نبوی میں بھی بیان ہوا ہے۔ رسولِ کریم ﷺ نے فرمایا ہے کہ میری امت پر ایک زمانہ آئے گا جب اس کے لوگ یہود سے مکمل مشابہت پیدا کرلیں گے۔ اگر یہ زمانہ مسیح موعود کے دور میں نہیں آنا تھا تو پھر اور کب آنا تھا؟

اس سیشن میں مفتی محمود صاحب نے ایک اور طریقہ استعال کیا۔ انہوں نے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی ایک عربی عبارت کی اور اس کا خود وہ ترجمہ کر کے سنایا جس سے وہ جماعتِ احمدیہ کے خلاف متعصبانہ جذبات کو بھڑکا سکیں۔ عربی عبارت یہ تھی

” تِلْكَ كُتُبٌ يَنْظُرُ اِلَيْهَا كُلُّ مُسْلِمٍ بِعَيْنِ الْمَحَبَّةِ وَ الْمَوَدَّةِ وَ يَنْتَفِعُ مِنْ مَعَارِفِهَا وَ يَقْبِلُنِى وَ يُصَدِّقُ دَعْوَتِى۔ اِلَّا ذُرِّيَّةَ الْبَغَايَا الَّذِيْنَ خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَقْبِلُوْن۔“

(”آئینہ کمالاتِ اسلام “صفحہ 548-547)

اور اس کا ترجمہ مفتی محمود صاحب نے خود یہ کر کے سنایا

”یہ وہ کتابیں ہیں جن کی طرف دیکھتا ہے ہر مسلمان محبت اور مودت کی آنکھ سے اور اس کے علوم سے نفع اُٹھاتا ہے اور مجھے قبول کرتا ہے اور میری دعوت کی تصدیق کرتا ہے مگر وہ لوگ جو کنجریوں کی اولاد ہیں، جن کے دلوں پر اللہ نے مہر لگا دی ہے، وہ مجھے قبول نہیں کرتے۔ حضور نے اس وقت یہ نشاندہی فرمائی کہ اس عبارت میں ذریۃ البغایا کے الفاظ ہیں اور اس کا مطلب کنچنیاں یا کنچنیوں کی اولاد نہیں ہوتا اور اس اصطلاح پر لغت کو سامنے رکھ کر بحث ضروری ہے۔

ہم ذریۃ البغایا کے الفاظ پر لغوی تحقیق کے کچھ پہلو پیش کرتے ہیں۔

لغتِ عربی میں جب با کی کسرہ کے ساتھ بغیٰ کا لفظ آئے تو اس کا مطلب بدکاری اور جب با کی فتح کے ساتھ بغیٰ کا لفظ آئے تو اس کا مطلب سرکشی ہوتا ہے۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ حضرت امام باقرؒ نے بھی بغیٰ کا مطلب سرکشی اور زیادتی کرنے والا بیان کیا ہے۔

(مستدرک سفینۃ البحار جلد 1 ص 382)

اگر یہ اعتراض حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی تحریر پر کیا جائے تو یہ اعتراض اہلِ بیت کے بزرگان پر بھی آئے گا کیونکہ حضرت امام حسینؓ کی صاحبزادی حضرت سکینہ نے ایک شعر میں قاتلین حسین کے بارے میں ذریۃ البغایا کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔

(الامام الحسین۔ عربی تالیف عبدالواحد خیاری الجزائری۔ اردو ترجمہ نور محمد انیس مطبوعہ شہداد پور سندھ)

حضرت سیدہ زینب بنت حضرت امام حسینؓ نے بھی قاتلینِ حسین کے بارے میں ذریۃ البغایا کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔

(بحارالانوار جزء 45ص59)

حضرت امام جعفر صادقؒ اور حضرت امام باقرؒ نے خدا کے رسولوں کو قتل کرنے والوں یا اس کی کوشش کرنے والوں کو ذریۃ البغایا قرار دیا ہے۔

(العلل ج 1 ص57 مع اختلاف فی السند و العبارۃ بحوالہ : مسطرفات السرائر۔ابنِ ادریس الحلی جلد 1 ص105۔ مستدرک سفینۃ البحار المؤلف :العلامہ آیت اللہ الشیخ علی النمازی)

اسی طرح حضرت امام جعفر صادقؒ کا قول ہے:۔

" جو شخص ہمارے ساتھ محبت کرتا ہے وہ تو اچھے آدم کا نطفہ ہے اور جو ہم سے عداوت رکھتا ہے وہ نطفہ شیطان ہے۔

(فروعِ کافی جلد 2 کتاب النکاح ص 216)

امام باقرؒ فرماتے ہیں:۔

" خدا کی قسم ہماری جماعت کے سوا تمام لوگ ذریۃ البغایا ہیں۔"

(فروعِ کافی حصہ سوئم کتاب الروضہ ص135 مطبوعہ نول کشور)

حضرت امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں:۔

" جو حضرت عائشہؓ پر زنا کی تہمت لگائے وہ حرامزادہ ہے۔"

(کتاب الوصیّت ص 39 مطبوعہ حیدر آباد)

حضور نے مندرجہ بالا میں سے بہت سے حوالے 9/ اگست کو پڑھ کر سنائے جن سے واضح ہوجاتا تھا کہ ذریۃ البغایا کا مطلب سرکش اور نافرمان انسان کے کئے جاتے رہے ہیں اور مفتی محمود صاحب جو ترجمہ کر کے سنا رہے تھے وہ بے بنیاد تھا۔ اس تحقیق کا معترضین کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

اس کے بعد پھر اٹارنی جنرل صاحب نے وہی پرانا سوال بار بار دہرایا۔ مثلاً ایک موقع پر انہوں نے پوچھا:

”جو اللہ اور رسول ﷺ پر ایمان لاتا ہے ان کو مانتا ہے۔ اور مرزا غلام احمد صاحب کو نبی نہیں مانتا۔ پھر بھی مسلمان رہ سکتا ہے۔“

اس پر حضور نے جواب میں فرمایا۔

”غیر مسلم نہیں ہے۔ گنہگار ہے وہ۔“

اٹارنی جنرل صاحب بیچارے عجیب مخمصے میں مبتلا تھے۔ وہ علمی بحثوں میں پڑنا چاہتے تھے اور اس کارروائی کی نوعیت کا تقاضا بھی یہی تھا لیکن ان کی طبیعت کو اس کام سے کوئی مناسبت نہیں تھی۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ انہوں نے اس بات پر بحث اٹھائی کہ ”اتمامِ حجت“ کا کیا مطلب ہے۔ حضور نے عربی زبان کی رُو سے اس کا مطلب بیان فرمایا۔ اب اٹارنی جنرل صاحب نے ایک لغت نوراللغات کا حوالہ پیش کیا ۔ آغاز میں ہی حضور نے فرمایا کہ یہ تو کوئی معیاری لغت نہیں ہے اور حضور نے معیاری لغت کی مثال کے طور پر منجد، مفرداتِ امام راغب، لسان العرب اور اقرب کے نام بھی لیے۔ بہرحال صاحب موصوف نے اپنی چنیدہ لغت سے اس کا مطلب پڑھنا شروع کیا اور کہا کہ اس لغت میں اتمامِ حجت کا مطلب یہ لکھا ہے:

”صحت کا پورا کرنا۔ کسی معاملہ میں آخری مرتبہ سمجھانے اور معاملہ طے کرنے کی جگہ۔“

اصل میں نورالغات میں "اتمامِ حجت" کا مطلب یہ لکھا ہے:

"حجت کا پورا کرنا، کسی امر میں آخری مرتبہ سمجھانے اور معاملہ طے ہونے کی کوشش کرنے کی جگہ"

اس لغت کے الفاظ میں جو غلطی ہے وہ تو ظاہر ہے لیکن ایک بار پھر اٹارنی جنرل صاحب اس لغت کا حوالہ دیتے ہوئے بھی صحیح اور معیّن الفاظ نہیں پڑھ رہے تھے۔ اردو لغات میں سب سے زیادہ تفصیلی لغت " اردو لغت " شائع کردہ ترقی اردو بورڈ میں اتمامِ حجت کا مطلب یہ لکھا ہے۔

"سمجھانے کی آخری کوشش، آخری دلیل، فیصلہ کن بات۔"

اٹارنی جنرل صاحب عجیب مخمصے میں پھنس گئے تھے۔ جس لغت کو وہ دلیل کے طور پر پیش کر رہے تھے نہ صرف اس کا بیان کردہ مطلب غلط تھا بلکہ اس بیچاری لغت کی تو اردو بھی ٹھیک نہیں تھی۔ حضور نے اس بات کی نشاندہی فرمائی کہ اس کی تو اردو بھی ٹھیک نہیں یہ معیاری لغت کہاں سے ہو گئی۔ اس کے جواب میں اٹارنی جنرل صاحب نے فرمایا کہ آپ کوئی معیاری ڈکشنری لے آئیں اس میں دیکھ لیں گے۔ اس کے بعد انہوں نے اس کے معنی کے متعلق اپنی تحقیق بیان کرنے کا سلسلہ جاری رکھا اور ان کے بے ربط جملوں کا مطلب یہ نکلتا تھا کہ وہ خود بھی اس اصطلاح کے معنی کے بارے میں واضح نہیں ہیں۔ اس کے جواب میں حضور نے فرمایا اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا This is rediculous اٹارنی جنرل صاحب تو اٹارنی جنرل! اسمبلی میں موجود مولوی حضرات کی علمی حالت بھی ایسی تھی کہ جب وقفہ ہوا اور جماعت کا وفد ہال سے چلا گیا تو مولوی غلام رسول ہزاروی صاحب سپیکر صاحب سے فخریہ انداز میں کہنے لگے:

" میں آج کے مباحثے کے بارے میں عرض کرتا ہوں آج مرزا صاحب بری طرح پھنسے ہیں۔ اس لئے اتمامِ حجت جس کے معنی وہ کر رہے ہیں جس کو دنیا بالکل تسلیم نہیں کر سکتی ..."

اس جملے سے بیچارے مولوی صاحب کی بچگانہ خوشی ظاہر ہوتی ہے۔ وہ اس خیال میں تھے کہ آج اللہ کر کے تیسرے دن ہمیں بھی کوئی خوشی ملی ہے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ سپیکر صاحب ان کی خوش فہمی میں شریک نہیں تھے کیونکہ اس کے جواب میں انہوں نے کہا کہ یہ بعد میں دیکھیں گے۔

بہر حال ان کی جو بھی خوش فہمی تھی جلد رفع ہو گئی کیونکہ وقفہ کے بعد کارروائی شروع ہوئی تو ایسا تصرف ہوا کہ حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ نے جن الفاظ کے لغوی معانی کے متعلق بات ہوئی تھی ان پر مختصر تحقیق کے بیان سے بات شروع فرمائی۔ حضور نے حجت اور اتمامِ حجت کے الفاظ کے متعلق قرآنِ کریم سے مثالیں دیں ، مفرداتِ امام راغب اورلسان العرب جیسی عظیم لغات سے ان الفاظ کے مطالب بیان فرمائے، امام زہری کے اقوال پڑھ کر سنائے۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی تحریر سے اس کے بارے میں اقتباس پڑھا۔ اس خفت کے بعد اٹارنی جنرل صاحب یا ان کی مدد کرنے والوں نے کسی لغت کا حوالہ دینے کی کوشش نہیں کی۔

پھر حضور نے فرمایا کہ آپ نے ایک کتاب کلمۃ الفصل سے حوالہ دیا ہے اور اسے حضرت خلیفۃ المسیح الثانی کی طرف منسوب کیا ہے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ کلمۃ الفصل حضرت خلیفۃ المسیح الثانی کی کتاب ہے ہی نہیں بلکہ حضرت مرزا بشیر احمد صاحب کی کتاب ہے۔ پھر حضور نے وہ پورا حوالہ پڑھ کر سنایا جس سے کیا گیا اعتراض خود بخود ہی رفع ہو جاتا تھا۔ معلوم ہوتا ہے اب تک اٹارنی جنرل صاحب کو یقین نہیں آ رہا تھا انہوں نے جو حوالہ دیا تھا اس میں وہ مصنف کا نام غلط بتا گئے ہیں یا پھر وہ اب خفت مٹانے کی کوشش کر رہے تھے۔ جب انہوں نے یہ سنا کہ یہ کتاب حضرت خلیفۃ المسیح الثانی کی تصنیف نہیں ہے تو انہوں نے فوراً کہا:

”ان کی compilation ہے۔“

جب اس کا جواب بھی نفی میں ملا تو پھر انہوں نے ایک راستہ نکالنے کی کوشش کی اور کہا: ۔

" تقریباً ان کو اکٹھا کیا گیا ہے۔"

جب اس کی بھی تردید کر دی گئی تو پھر یحیٰ بختیار صاحب نے اس تحریر کے مندرجات پر بحث اُٹھانے کی کوشش کی لیکن اس وضاحت کے بعد بھی دورانِ گفتگووہ اس کے جملے کا حوالہ دیتے ہوئے وہ یہی کہتے رہے کہ مرزا بشیر الدین محمود احمد نے یہ لکھا ہے۔ حالانکہ یہ خلاف واقعہ تھا۔

اس کے بعد اس روز ایک بار پھر "کلمۃ الفصل" پر گفتگو ہوئی لیکن دوبارہ وہی مسئلہ سامنے آیا پہلے اٹارنی جنرل صاحب نے غلط صفحہ نمبر پڑھ دیا۔ جب اس صفحہ پر متعلقہ عبارت نہیں ملی تو پھر انہوں نے دوسرا صفحہ نمبر بتایا۔ جب صحیح عبارت سامنے آئی تو حضور نے نشاندہی فرمائی کہ یہاں پر نجات کا ذکر ہو رہا ہے اور ان الفاظ کا مطلب یہ نہیں ہے کہ غیر احمدی مسلمان ملت ِاسلامیہ سے خارج ہیں۔ آخر میں اٹارنی جنرل صاحب نے کہا کہ کیونکہ یہ کتاب حضرت بانیِ سلسلہ احمدیہ کی یا خلفاءِ سلسلہ میں سے کسی کی نہیں اس لئے وہ اس پر بات نہیں کریں گے۔

پہلے اٹارنی جنرل صاحب نے یہ بحث بھی اُ ٹھانے کی کوشش کی تھی کہ تقسیمِ ہند کے وقت احمدیوں نے اپنے آپ کو مسلمانوں سے علیحدہ ایک فریق کے طور پر پیش کیا تھا اور یہ ظاہر کیا تھا کہ وہ مسلمانوں سے مذہبی طور پر علیحدہ ہیں اور اس طرح مسلم لیگ کے اغراض و مقاصد کو نقصان پہنچایا تھا۔ حضور نے الفضل کا ایک حوالہ پڑھ کر سنایا۔ اٹارنی جنرل صاحب یا تو غلط حوالہ پیش کرتے یانامکمل عبارت پڑھ کر یا تبدیل شدہ عبارت پڑھ کر ایک تاثر پیدا کرنے کی کوشش کرتے۔ لیکن جب پورا اقتباس پڑھا جاتا تو یہ اثر ویسے ہی زائل ہوجاتا۔ اور اس مرتبہ بھی یہی ہوا۔

جب وقفہ کے بعد رات کو آٹھ بجے دوبارہ اجلاس شروع ہوا تو حضورؒ نے اٹارنی جنرل صاحب کے ایک پیش کردہ حوالے کا پورا پس منظر پڑھ کر سنایا۔ اٹارنی جنرل صاحب نے کہا تھا کہ حضرت خلیفۃ المسیح الثانی نے ایک ذمہ دار انگریز افسر کو پیغام بھجوایا تھا کہ تم دو پارسی پیش کرو میں اس کے مقابل پر چار احمدی پیش کروں گا اور یہ اعتراض کیا تھا کہ اس طرح انہوں نے اپنے آپ کو مسلمانوں سے علیحدہ مذہب سے وابستہ ظاہر کیا تھا۔ اگر اس خطبہ جمعہ کو مکمل طور پر پڑھ لیا جاتا تو یہ سوال اُٹھنے کی نوبت نہ آتی۔ حضرت خلیفۃ المسیح الثانی نے فرمایا تھا:۔

”میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ ممکن ہے برطانوی حکومت اس غلطی میں مبتلا ہو کہ اگر مسلم لیگ کو نظر انداز بھی کر دیا جائے تو مسلمان قوم بحیثیت مجموعی ہمارے خلاف نہیں ہوگی۔ بلکہ ایسے مسلمان جو لیگ میں شامل نہیں اور ایسی جماعتیں جو لیگ کے ساتھ تعلق نہیں رکھتیں، ان کو ملا کر وہ ایک منظم حکومت ہندوستان میں قائم کر سکے گی۔ اس خیال کے آنے پر میں نے مزید سوچا اور فیصلہ کیا کہ ایسے لوگ جو لیگ میں شامل نہیں یا ایسے لوگ جنہیں تعصب کی وجہ سے لیگ والے اپنے اندر شامل کرنا پسند نہیں کرتے۔ جیسے احمدی کہ ان کو تعصب کی وجہ سے لیگ میں شامل کرنا پسند نہیں کیا جاتا۔ ان دونوں قسم کے لوگوں کو چاہیئے کہ آپس میں مل جائیں اور مل کر گورنمنٹ پر یہ واضح کر دیں کہ خواہ ہم لیگ میں نہیں۔ لیکن اگر لیگ کے ساتھ حکومت کا ٹکراؤ ہوا۔ تو ہم اس کو مسلمان قوم کے ساتھ ٹکراؤ سمجھیں گے اور جو جنگ ہوگی، اس میں ہم بھی لیگ کے ساتھ شامل ہوں گے۔ یہ سوچ کر میں نے چاہا کہ ایسے لوگ جو اثر رکھنے والے ہوں۔ خواہ اپنی ذاتی حیثیت کی وجہ سے اور خواہ قومی حیثیت کی وجہ سے ان کو جمع کیا جائے۔ دوسرے میں نے مناسب سمجھا کہ کانگرس پر بھی اس حقیقت کو واضح کر دیا جائے کہ وہ اس غلطی میں مبتلا نہ رہے کہ مسلمانوں کو پھاڑ پھاڑ کر وہ ہندوستان پر حکومت کر سکے گی۔ اسی طرح نیشنلسٹ خیالات رکھنے والوں پر بھی یہ واضح کر دیا جائے کہ وہ کانگرس کے ایسے حصوں کو سنبھال کر

رکھیں اوران کے جوشوں کو دبائیں جن کا یہ خیال ہو کہ وہ مسلمانوں کو دبا کر یا ان کو آپس میں پھاڑ پھاڑ کر حکومت کر سکتے ہیں۔"

("الفضل" 13/ نومبر 1946ء کالم نمبر 1 تا3)

یہ تھی پوری عبارت۔ اب ملاحظہ کیجئے کہ کیا اس میں اپنے آپ کو غیر مسلم قرار دیا گیا تھا ؟ کیا یہ کوشش یہ تھی کہ مسلمانوں کو اور مسلم لیگ کو نقصان پہنچایا جائے؟ حضرت خلیفۃ المسیح الثانی نے تو حکومت کو یہ انتباہ کیا تھا کہ اگر اس کی مسلم لیگ کے ساتھ جنگ ہوئی تو ہم ہر حال میں مسلم لیگ کا ساتھ دیں گے اور یہ فرما رہے تھے کہ حکومت اور کانگرس یہ خیال ترک کر دیں کہ وہ مسلمانوں کو پھاڑ کر ان پر حکومت کر سکتے ہیں۔ اگر اس سے کوئی شخص یہ نتیجہ نکال رہا ہے کہ اس خطبہ میں اپنے آپ کو مسلمانوں سے علیحدہ ظاہر کیا جا رہا ہے تو پھر اس شخص کی عقل پر ماتم ہی کیا جا سکتا ہے لیکن آفرین ہے اس قابل قومی اسمبلی پر اور قابل اٹارنی جنرل پر کہ اس حوالے کے پڑھے جانے کے بعد بھی وہ یہی نکتہ اُٹھاتے رہے کہ احمدی پاکستان کے قیام کے حق میں نہیں تھے اور کہا کہ آپ کی ہمیشہ سے یہ کوشش رہی ہے کہ اپنے آپ کو مسلمانوں سے علیحدہ رکھیں۔ اگر چہ اس سلسلہ میں حضور نے اور بہت سے حوالے بھی انہیں سنائے۔ ہٹ دھرمی ایک لا علاج مرض ہے۔

اس کے بعد یحیٰی بختیار صاحب نے یہ تمہید بیان کی کہ آپ کے نزدیک آنحضرت ﷺ کے بعد اُمتی نبی آ سکتا ہے۔ اٹارنی جنرل صاحب نے پھر دو سوال اُٹھائے۔ ایک تو یہ کہ آپ کے نزدیک کیا حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے علاوہ بھی کوئی نبی آ سکتا ہے اور دوسرا یہ کہ کیا پھر آپ کے نزدیک حضرت مسیح موعود علیہ السلام آخری نبی ہوں گے؟ پہلے سوال کے متعلق تو حضور کا اصولی جواب یہ تھا کہ اب وہ امتی نبی آ سکتا ہے

۔ مگر وہی آ سکتا ہے جس کے متعلق آنحضرت ﷺ نے خوشخبری دی ہو اور فرمایا کہ جہاں تک مجھے علم ہے ایک وجود کے علاوہ آنحضرت ﷺ نے کسی اور امتی نبی کی بشارت نہیں دی اگر کسی کے علم میں کوئی ایسی حدیث ہو جس میں کسی دوسرے وجود کو بھی آنحضرت ﷺ نے نبی کا نام دیا ہو تو وہ بیان کر سکتے ہیں۔

اور جہاں تک دوسرے سوال کا تعلق ہے تو یہ سوال ہی بنیادی طور پر غلط ہے اور اس کی بنیاد یہ غلط تصور ہے کہ آخری ہونا اپنی ذات میں کوئی فضیلت کی بات ہے۔ حالانکہ زمانی طور پر آخری ہونا کسی طور پر کوئی فضیلت کا پہلو نہیں رکھتا۔ البتہ یہ بات ایک عظیم الشان فضیلت کے بعد ہے کہ اب جو بھی مامور یا مصلح یا نبی آئے گا وہ آنحضرت ﷺ کی اتباع اور محبت کے نتیجہ میں یہ مقام پائے گا اور آپ کے تمام احکامات اور تعلیمات کی پیروی کرے گا اور جماعتِ احمدیہ کا یہی عقیدہ ہے۔ اصل میں وہ یہ اعتراض اُٹھانا چاہتے تھے کہ احمدی حضرت مسیح موعود علیہ السلام کو آخری نبی مانتے ہیں۔

اس کے جواب میں حضور نے فرمایا کہ تمام فرقوں کے مطابق مسیح موعود نے آنحضرت ﷺ کے بعد آنا ہے تو کیا یہ وجود ان فرقوں کے نزدیک آخری نبی نہیں بن جائے گا۔ اس بات کا کوئی جواب نہیں دیا گیا اور حضور نے شاہ محمد اسمٰعیل شہید صاحب کا حوالہ بھی دیا جنہوں نے اپنی کتاب تقویۃ الایمان مع تذکیر الاخوان میں لکھا تھا ”اس شہنشاہ کی تو یہ شان ہے ایک آن میں ایک حکم کُنۡ سے چاہے تو کروڑوں نبی اور ولی اور جن اور فرشتہ جبرئیل اور محمد ﷺ کے برابر پیدا کر ڈالے۔“ (72)

اٹارنی جنرل صاحب نے یہ سوال اُٹھایا کہ ”ایک اور سوال پوچھتا ہوں۔ روز قیامت سارے نبی اللہ کے دربار میں حاضر ہوں گے۔ آخری نبی کون شمار ہو گا۔ حضرت محمد ﷺ یا مسیح یا عیسیٰ علیہ السلام۔“

اس پر حضور نے یہ پُر معرفت جواب دیا کہ

"حضرت محمد ﷺ سب سے پہلے نبی بھی ہیں اور سب سے آخری نبی بھی ہیں۔"

اس پر اٹارنی جنرل صاحب نے کہا:۔

"آخری نبی وہی ہو جائیں گے۔"

اس پر حضور نے فرمایا:

"بالکل۔"

اس پر اٹارنی جنرل صاحب نے پھر یہ بحث اُٹھائی کہ اب اور نبی آ سکتے ہیں اور آخری نبی کون ہو گا اور سپیکر صاحب نے بھی اصرار کیا کہ اس سوال کا جواب نہیں آیا۔ اس پر حضور نے پھر فرمایا کہ امتِ محمدیہ میں وہ اشخاص جن کی بزرگی پر شک نہیں کیا جا سکتا، جب وہ یہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ چاہے تو محمد ﷺ جیسے کروڑوں پیدا کر سکتا ہے تو ان کے لئے یہ بات خاموشی سے قبول کر لی جاتی ہے تو وہ بات ہمارے لئے بحث کا موضوع کس طرح بن سکتی ہے اور فرمایا کہ جس امتی نبی کی بشارت دی گئی تھی اس کا اپنا کوئی وجود نہیں اور اس نے آنحضرت ﷺ کے مقاصد کے لئے اپنے نفس پر کامل موت وارد کی ہے۔ اس لئے اس کو آخری نبی نہیں کہا جا سکتا۔

حضورؒ نے ان کی توجہ اس امر کی طرف بھی مبذول کرائی کہ رسول کریم ﷺ نہ صرف انبیاء کا آخر ہیں بلکہ اوّل بھی ہیں۔ جیسا کہ آنحضرت ﷺ ارشاد فرماتے ہیں کہ میں اس وقت سے اللہ تعالیٰ کا بندہ اور خاتم النبیین ہوں جب کہ ابھی آدمؑ مٹی میں تھے۔ (73)

بہر حال جب 8/ اگست کی کارروائی ختم ہوئی تو کم از کم دو ممبران یعنی مولا بخش سومرو اور میاں عطاء اللہ خوشی کا اظہار کر رہے تھے کہ آج اٹارنی جنرل صاحب نے اچھی بحث کی ہے لیکن حقیقت کا اظہار اگلے روز کیسے ہوتا ہے اس کا ہم جائزہ ابھی لیتے ہیں۔

9/ اگست کی کارروائی

9/ اگست کی کارروائی کے آغاز میں مولوی ظفر انصاری صاحب نے جو تبصرہ فرمایا وہ صرف یہ ظاہر کر رہا تھا کہ ان پر دلائل کا کوئی اثر نہیں ہو سکتا۔ الفضل 13/ نومبر 1946ء کا جو حوالہ ہم درج کر چکے ہیں اس کے مندرجات بالکل واضح ہیں لیکن ابھی بھی ان صاحب کا خیال تھا کہ اس کا وہ حصہ پڑھا گیا جس سے جماعت احمدیہ کا اپنا کام بنتا تھا۔ اس لئے وہ کہہ رہے تھے کہ یہ تمام اخبار ریکارڈ میں داخل کیا جائے۔ کارروائی شروع ہوئی تو ممبران کی ایک اور گھبراہٹ سامنے آئی۔ احمد رضا قصوری صاحب نے سپیکر صاحب سے درخواست کی کہ جب احمدیوں کا وفد ہال سے چلا جاتا ہے تو ہم آپس میں بات کرتے ہیں۔ اگر یہ ریکارڈ کل کلاں کسی کے ہاتھ لگ گیا تو اس پر کوئی اعتراض کر سکتا ہے کہ جب گواہ یہاں پر موجود نہیں ہوتے تھے تو چیئرمین اور ممبران جو کہ جج کی حیثیت سے بیٹھے ہوئے تھے اس بارے میں تبادلہ خیالات کرتے تھے۔ اس لئے میری درخواست ہے کہ جب ایسا ہو رہا ہو تو پلگ نکال دیا جائے یعنی اس گفتگو کی ریکارڈنگ نہ کی جائے۔ اس پر سپیکر صاحب نے کہا کہ ہم یہاں پر عدالت کی حیثیت سے نہیں بلکہ سپیشل کمیٹی کی حیثیت سے بیٹھے ہیں۔ اس کے کچھ دیر بعد ایک اور ممبر چوہدری جہانگیر صاحب نے اپنی اس پریشانی کا اظہار کیا۔

”مسٹر چیئرمین سر! میں یہ گزارش کرنا چاہتا ہوں کہ Delegation کے ممبر بڑے Brief Cases لے کر اور Bags لے کر اندر آ جاتے ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ جنابِ والا کہ وہ اسمبلی کی ہاؤس کی کارروائی کو ٹیپ ریکارڈ کر رہے ہوں۔ اس کے متعلق ذرا تسلی کر لیجئے۔“

اگر اُس وقت اس کمیٹی میں سب کچھ انصاف کے تقاضوں کے مطابق ہو رہا تھا تو ممبران کو اتنی پریشانی نہیں ہونی چاہئیے تھی کہ یہ سب کچھ منظر عام پر آ گیا تو کیا ہو گا۔

اس کے بعد جب سوالات شروع ہوئے تو اٹارنی جنرل صاحب نے ایک بار پھر وہی پرانے سوالات دہرانے شروع کیے کہ کیا حضرت مسیح موعود علیہ السلام نبی تھے؟ یا امتی نبی تھے؟ کیا آپ کے بعد بھی کوئی نبی آ سکتا ہے؟ پھر آخری نبی کسے کہا جائے گا؟ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ ان سوالات کے جواب میں انہیں جماعتِ احمدیہ کا موقف بتا دیا گیا تھا پھر انہیں بار بار دہرانے سے ان کا مقصد کیا تھا؟

ان سوالات کے جواب میں حضور نے فرمایا کہ آنے والے مسیح کو رسول اللہ ﷺ نے مسلم کی ایک حدیث میں چار مرتبہ نبی اللہ فرمایا ہے اور امتِ محمدیہ آج تک مسیح نبی اللہ کے آنے پر عقیدہ رکھتی آئی ہے۔ اور سب اس بات کو تسلیم کرتے آئے ہیں کہ ایک نبی نے آنا ہے۔ اور حضور نے جماعتِ احمدیہ کا عقیدہ ان الفاظ میں بیان فرمایا:۔

”... ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ تیرہ سو سال تک ہمارے سلفِ صالحین جو عقیدہ رکھتے آئے ہیں وہ درست ہے، اور ان کے اس عقیدہ کے مطابق آنے والے کی خبر دی گئی تھی، سارے فرقے اس سے اتفاق رکھتے ہیں، وہ آگیا تو یہ جماعتِ احمدیہ کا نیا عقیدہ نہیں۔ پہلے دن سے اس عقیدہ پر امتِ محمدیہ اور اس کے سارے فرقے جو ہیں وہ متفق ہیں کہ اس امت میں ایک نبی پیدا ہوگا۔“

حضور نے اب واضح الفاظ میں یہ حقیقت تمام قومی اسمبلی کے سامنے بیان فرما دی تھی کہ تمام فرقے ایک ایسے وجود کا انتظار کرتے رہے ہیں جس نے مقامِ نبوت پر سرفراز ہونا تھا۔ فرق صرف یہ ہے کہ جماعتِ احمدیہ کے عقیدہ کے مطابق جس وجود نے آنا تھا وہ آگیا۔ اگر یہ عقیدہ ختمِ نبوت کے منافی ہے پھر اس کلیہ کی رو سے کوئی فرقہ بھی ختمِ نبوت پر ایمان نہیں رکھتا۔ اگر یہ حقیقت نہیں تھی تو فوراً ہر طرف سے یہ اعتراضات اُٹھنے چاہئیں تھے کہ یہ بالکل غلط ہے۔ ہمارے فرقہ کا یہ عقیدہ ہرگز نہیں ہے اور فوراً اپنے اس دعوے کے حق

میں حوالے بھی پیش کرنے چاہئیں تھے لیکن کیا ایسا ہوا؟ ایسا نہیں ہوا۔ کسی کو جرأت نہیں ہوئی کہ حضور کے اس دعوے کی تردید کر سکتا۔

اور آنحضرت ﷺ کے جاری فیضان کے بارے میں حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ نے فرمایا:۔

”میں اس کا اعلان کر دیتا ہوں کہ ہمارے نزدیک اب اللہ تعالیٰ کے انعامات کے سب دروازے اتباع محمد ﷺ کے بغیر بند ہیں۔ تواب میں نے چونکہ یہ اعلان کر دیا ہے اس واسطے براہِ راست آپ مجھ سے سوال کریں۔“

پھر اٹارنی جنرل صاحب نے خاتم النبیّین ﷺ کی مختلف تفاسیر کے بارے میں سوال کیا۔ اس پر حضور نے جواب دیا:۔

”ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ خاتم النبیّین ہیں۔ اس معنی میں بھی کہ آپ سے قبل جس قدر انبیاء گزرے ہیں ان کی ساری روحانی تجلّیات مجموعی طور پر محمد ﷺ کی روحانی تجلیات سے حصہ لینے والی اور ان سے کم تھیں۔ پہلے بھی اور آئندہ بھی۔ کوئی شخص بزرگی، روحانی بزرگی اور روحانی عزت کے چھوٹے سے چھوٹے مقام کو بھی حاصل نہیں کر سکتا سوائے نبی اکرم ﷺ کے فیض سے حصہ لینے کے۔ یہ ہمارا عقیدہ ہے۔“

اس مرحلہ پر ایک بار پھر یحیٰی بختیار صاحب نے یہ اعتراض اُٹھانے کی کوشش کی کہ احمدی حضرت مسیح موعود علیہ السلام کو آخری نبی مانتے ہیں۔ اس پر حضور نے فرمایا:۔

”میں نے ابھی عرض کی کہ امتِ محمدیہ شروع سے لے کے تیرہ سو سال تک حضرت نبی اکرم ﷺ کو خاتم النبیین مانتے ہوئے ایک ایسے مسیح کا انتظار کرتی رہی جسے مسلم کی حدیث میں خود آنحضرت ﷺ نے چار بار نبی اللہ کہا اور وہ خاتم النبیین پر بھی ایمان رکھتے تھے۔ اس واسطے میرے نزدیک توکوئی اس میں الجھن نہیں ہے۔ ساری امت تیرہ سو سال تک خاتم النبیین کے خلاف اس عقیدہ کو نہیں سمجھتی کہ ایک مسیح آئے گا جو نبی

اللہ ہو گا اور میں نے ابھی بتایا ہے کہ امت کے سلف صالحین کی سینکڑوں عبارتیں یہاں بتائی جا سکتی ہیں جو آنے والے کا مقام ظاہر کر رہی ہیں ...

اس طرح سینکڑوں حوالے ہیں۔ اگر آپ کو ضرورت ہو تو میں آٹھ دس دن میں وہ سینکڑوں حوالے آپ کو دکھا سکتا ہوں کہ تیرہ سو سال تک امت محمدیہ ایک نبی کا انتظار بھی کرتی رہی اور تمام سلفِ صالحین اس بات پر متفق تھے کہ اس نبی کا انتظار ختمِ نبوت کو توڑنے والا نہیں ہے۔”

اس مرحلہ پر ٹھہر کر یہ جائزہ لیتے ہیں کہ اس سپیشل کمیٹی کے سپرد یہ کام تھا کہ یہ جائزہ لے کہ جو آنحضرت ﷺ کو آخری نبی نہیں سمجھتا اس کا اسلام میں status کیا ہے؟ اب تک ممبرانِ اسمبلی غیر متعلقہ سوالات میں وقت ضائع کر رہے تھے۔ اب حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ نے اس موضوع پر جماعت احمدیہ کا واضح موقف بیان فرما دیا تھا اور یہ بھی واضح اعلان فرما دیا تھا کہ تمام فرقوں کے سلف صالحین ایک موعود نبی کا انتظار کرتے رہے ہیں۔ اگر یہ سپیشل کمیٹی موضوع پر آنے کا کچھ بھی ارادہ رکھتی تو یہ اچھا موقع تھا کہ وہ اصل موضوع پر سوالات شروع کر دیتے۔ لیکن اب بھی ان میں اس کی ہمت نہیں تھی۔ وہ اصل موضوع سے گریز کرنے میں ہی اپنی عافیت سمجھتے تھے۔ اٹارنی جنرل صاحب نے ایک بار پھر موضوع تبدیل کیا اور وہ سوال دہرایا جو وہ پہلے بھی کئی مرتبہ دہرا چکے تھے یعنی کیا آپ کے مطابق کیا بانی سلسلہ احمدیہ مسیح موعود بھی ہیں اور امتی نبی بھی؟

اس کے بعد انہوں نے کچھ حوالے تصدیق کے لئے نوٹ کرائے۔ اور پھر اپنی طرف سے اٹارنی جنرل صاحب نے یہ کہا کہ احمدیوں کے علاوہ باقی فرقے یہ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کے بعد اب کوئی نبی نہیں

آئے گا اور احمدی کہتے ہیں کہ امتی نبی آ سکتا ہے۔ اس پر حضور نے پھر اس کی تردید کرتے ہوئے فرمایا کہ تیرہ سو سال تک امت محمدیہ ایک مسیح نبی اللہ کا انتظار کر تی رہی ہے۔

اس پر اٹارنی جنرل صاحب نے کہا کہ وہ تو پہلے ہی نبی بن چکے ہیں۔ حالانکہ یہاں نئے اور پرانے کا کوئی سوال ہی نہیں تھا اگر یہ عقیدہ رکھا جائے کہ آنحضرت ﷺ کے بعد کسی قسم کا کوئی نبی نہیں ہو سکتا تو پھر وہ بھی نہیں ہو سکتا جسے پہلے ہی نبوت ملی ہو۔ اس کے جواب میں حضور نے یہ پر معرفت نکتہ بیان فرمایا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام شریعتِ موسویہ کو جاری کرنے کے لئے دنیا میں آئے تھے یعنی قرآنِ کریم کے مطابق تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو صرف بنی اسرائیل کی طرف مبعوث کیا گیا تھا اور بہت سے غیر احمدی مسلمان یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ وہی حضرت عیسیٰ علیہ السلام امتِ محمدیہ کی اصلاح کے لئے بھجوائے جائیں گے۔ اس پر یحیٰ بختیار صاحب نے جو کچھ فرمایا وہ انہیں کا حصہ ہے۔ انہوں نے کہا:

”مرزا صاحب ان کی اتھارٹیchangeہو گئی ... “

حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ فرما رہے تھے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام تو صرف حضرت موسیٰؑ کی پیروی اور تورات کی پیروی میں بنی اسرائیل کی طرف بھیجے گئے تھے جیسا کہ انجیل میں ان کے بہت سے اقوال سے ثابت ہے اور سب سے بڑھ کر قرآن کریم میں ان کے متعلق یہ ارشاد موجود ہے۔ وَرَسُوْلًا اِلٰی بَنِیْٓ اِسْرَآئِیْلَ (اٰل عمران: 49) یعنی حضرت عیسیٰ بنی اسرائیل کی طرف بھیجے گئے تھے اور یہ خبر ان کی والدہ کو ان کی پیدائش سے قبل اللہ تعالیٰ کی طرف سے دی گئی تھی۔ اور کسی آیت میں یہ نہیں آتا کہ ان کو کسی اور قوم کی طرف مبعوث کیا جانا مقدر تھا۔ لیکن اب قومی اسمبلی میں اٹارنی جنرل صاحب یہ اعلان فرمارہے تھے کہ اب ان کی اتھارٹیchangeہو گئی ہے۔ گویا ان کے نزدیک قومی اسمبلی صرف یہی اختیار نہیں رکھتی تھی کہ یہ فیصلہ کرے

کہ کون مسلمان ہے اور کون نہیں بلکہ یہ اختیار بھی رکھتی تھی کہ یہ فیصلہ کرے کہ کس نبی کا دائرہ کار کیا ہے۔ اٹارنی جنرل صاحب نے اس نکتے کی وضاحت نہیں فرمائی کہ جو بات قرآن کریم میں بیان کی گئی ہے وہ کس طرح تبدیل ہو گئی اور کس نے اسے تبدیل کر دیا؟ اس مرحلہ پر پہنچ کر اٹارنی جنرل صاحب یہ سوال بار بار اُٹھا رہے تھے کہ اگر بانی سلسلہ احمدیہ امتی نبی تھے تو کیا اب ان کے بعد کوئی اور نبی ہو سکتا ہے؟ اگر نہیں ہو سکتا تو کیوں نہیں ہو سکتا ؟ اب یہ سوالات کا لا یعنی سلسلہ تھا۔ اس بارے میں جماعتِ احمدیہ کا جو بھی عقیدہ ہے اس کے قطعِ نظر قومی اسمبلی کا یہ کام نہیں کہ وہ بیٹھ کر یہ فیصلہ کرے کہ اللہ تعالیٰ نے کب نبی مبعوث کرنا ہے اور کب نہیں کرنا۔ موسوی سلسلہ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد کوئی نبی مبعوث نہیں ہوا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے یہی چاہا تھا۔ اب کوئی اس پر اعتراض نہیں کر سکتا کہ اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام نبی تھے تو ان کے بعد کوئی اور نبی کیوں نہیں مبعوث ہوا۔

اس مرحلہ پر کچھ دیر کے لئے یہ امید پیدا ہو چلی تھی کہ شاید اب یہ کارروائی اپنے اصل موضوع کی طرف آ جائے اور وہ موضوع یہ مقرر ہوا تھا کہ جو شخص آنحضرت ﷺ کو آخری نبی نہیں مانتا اس کا اسلام میں کیا status ہے۔ اور اس مرحلہ پر حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ نے بڑے جامع انداز میں یہ بیان فرمایا تھا کہ جماعتِ احمدیہ کے نزدیک خاتم النبیّین کے معنی کیا ہیں اور آنحضرت ﷺ کا اعلیٰ اور ارفع مقام کیا ہے اور حضرت مسیح موعود علیہ السلام کا دعویٰ کیا تھا۔ اور جب حضور نے یہ لطیف نکتہ بیان فرمایا کہ تیرہ سو سال سے امتِ احمدیہ ایک ایسے مسیح کی منتظر رہی جس کے متعلق آنحضرت ﷺ نے نبی کا لفظ بیان فرمایا تھا اور وہ پھر بھی آنحضرت ﷺ کی ختمِ نبوت کے قائل تھے۔ تو پھر اٹارنی جنرل صاحب کو چاہیئے تھا کہ وہ اصل موضوع کے بارے میں سوالات اُٹھاتے اور بحث ایک ٹھوس رنگ اختیار کرتی لیکن جیسا کہ ہم جائزہ لیں گے کہ ایک بار پھر اٹارنی جنرل صاحب اصل موضوع سے کترا کے نکل گئے اور ایک بار پھر یہ واضح ہو رہا تھا کہ اربابِ حل

و عقد کا یہ ارادہ ہی نہیں کہ وہ اس بحث کو اپنے اصل موضوع پر آنے دیں۔ یہاں پر ایک سوال لازماً پیدا ہو تا ہے کہ آخر وہ اس موضوع سے کترا کیوں رہے تھے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی بعثت سے قبل تیرہ سو سال تک امتِ محمدیہ کے کتنے ہی بزرگ گزرے ہیں جو اس عقیدہ کا بَرملا اظہار کرتے رہے کہ خاتم النبیّین کا یہ مطلب نہیں ہے کہ آنحضرت ﷺ کے بعد کوئی امتی نبی بھی نہیں آسکتا۔ آنحضرت ﷺ کے بعد شرعی نبی کوئی نہیں آسکتا لیکن آپ کی غلامی میں اور آپ کی اطاعت کا جوا اُٹھا کر امتی نبی ضرور آ سکتا ہے۔ ہم اس کی صرف چند مثالیں یہاں پر پیش کرتے ہیں۔ ان مثالوں سے یہ بخوبی ظاہر ہوجاتا ہے کہ اٹارنی جنرل صاحب بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہو گا کہ ان کی ٹیم کا یہ دعویٰ بالکل غلط تھا کہ تمام امتِ مسلمہ اس بات پر متفق رہی ہے کہ آنحضرت ﷺ کے بعد کوئی نبی نہیں آ سکتا۔

سب سے بڑھ کر یہ کہ صحیح مسلم میں کتاب الفتن کی ایک ہی حدیث میں رسول کریم ﷺ نے آنے والے مسیح کو چار مرتبہ نبی اللہ کا نام دیا ہے اور فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ نبی دجّال کے فتنہ کا سدِّباب کرے گا۔ اس حدیث کے راوی حضرت نواس بن سمعانؓ ہیں۔

اس کے علاوہ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں:۔

”قُوْلُوْا خَاتَمَ النَّبِیّٖیْن وَ لَا تَقُوْلُوْا لَا نَبِیَ بَعْدَہٗ “

یعنی (آپ ﷺ کو) خاتم النبیین تو کہو لیکن یہ نہ کہو کہ آپ کے بعد کوئی نبی نہیں ہو گا۔

(الدرالمنثور فی التفسیر الماثور، مصنفہ جلال الدین السیوطی، الجزء الخامس، دارالکتب العلمیّہ۔ بیروت ص386)

حضرت مغیرہ بن شعبہؓ کے سامنے ایک آدمی نے یوں درود پڑھا صَلّی اللّٰہُ عَلٰی مُحَمَّدٍ خَاتَمِ الْاَنْبِیَاءِ لَا نَبِیَ بَعْدَہٗ۔ یعنی اللہ محمد ﷺ خاتم الانبیاء پر سلامتی نازل کرے۔ آپ کے بعد کوئی نبی نہیں۔ اس پر حضرت

مغیرہ بن شعبہؓ نے فرمایا جب تو نے خاتم الانبیاء کہا تھا تو یہ تیرے لئے کافی تھا۔ ہم یہ حدیث بیان کرتے ہیں کہ حضرت عیسیٰؑ ظہور فرمائیں گے جب آپ ظہور فرمائیں گے تو وہ پہلے بھی ہوں گے اور بعد بھی ہوں گے۔

(الدر المنثور فی التفسیر الماثور، مصنفہ جلال الدین السیوطی، الجزء الخامس، دارالکتب العلمیّہ۔ بیروت ص386)

حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ اپنی تصنیف قُرَّةُ الْعَیْنَیْنِ فِیْ تَفْضِیْلِ الشَّیْخَیْنِ میں درود شریف کا ذکر کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:۔

”وَ قَدْ قَضَیْتَ اَنْ لَّا شَرْعَ بَعْدِیْ فَصَلِّ عَلَیَّ وَ عَلٰی آلِیْ بِاَنْ تَجْعَلَ لَهُمْ مَرْتَبَةَ نَبُوَّةٍ عِنْدَكَ وَ اِنْ لَّمْ یَشْرَعُوْا فَکَانَ مِنْ کَمَالِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ اَنْ اَلْحَقَ آلَه بِالْاَنْبِیَاءِ فِی الْمَرْتَبَةِ“۔

ترجمہ۔ اور یقیناً تو نے فیصلہ کر دیا ہے کہ میرے بعد شریعت نہیں ہو گی۔ پس تو مجھ پر اور میری آل پر سلام بھیج ان معنوں میں کہ اپنے حضور انہیں نبوت کا مرتبہ عطا کر۔ اگر چہ وہ شریعت لانے والے نہ ہوں۔ پس یہ رسول اللہ ﷺ کا کمال ہے کہ آپ نے اپنی آل کو نبیوں کے ساتھ ملا دیا۔

(قرۃ العینین فی تفضیل الشیخین مصنفہ حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ، المکتبۃ السلفیہ۔ شیش محل روڈ لاہور ص320)

اب ہم دیکھتے ہیں کہ حدیثِ نبوی لَا نَبِیَّ بَعْدِیْ کی تشریح میں علماء سلف کیا فرماتے رہے ہیں۔

مشہور عالم مُلّا علی قاری تحریر فرماتے ہیں:۔

”بعض علماء آنحضرت ﷺ کے قول لَا نَبِیَّ بَعْدِیْ کے بارے میں کہتے ہیں کہ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ جب عیسیٰ ابن مریم نازل ہوں گے تو وہ اس امت کے حکّام میں سے ایک ہوں گے اور وہ شریعتِ محمدیہ کی طرف بلائیں گے اور کوئی اور نبی نازل نہیں ہو گا۔ میں کہتا ہوں کہ یہ اس بات کی نفی نہیں ہے کہ کوئی نبی پیدا

ہو جائے اور وہ آنحضرت ﷺ کی پیروی کرنے والا ہو۔ آپ کی شریعت کے احکام کے بیان میں اگرچہ اس کی طرف وحی بھی ہوتی ہو جس طرح رسولِ کریم ﷺ کے اس قول میں اس طرف اشارہ ہے کہ اگر موسیٰؑ زندہ ہوتے تو انہیں میری پیروی کے علاوہ چارہ نہ ہوتا۔ آنحضرت ﷺ کی مراد اس سے یہ ہے کہ اگر وہ نبوت اور رسالت کے وصف کے ساتھ بھی آئیں تو انہیں میری پیروی کرنی ہو گی۔“

(من مرقاۃ المفاتیح شرح مشکاۃ المصابیح للعلامۃ الفاضل والفھامۃ الکامل المرحوم برحمۃ ربہ الباری علی بن سلطان محمد القاری الجزء الخامس ص564)

حضرت مجدد الف ثانیؒ اپنے ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:

”پس حصول کمالاتِ نبوت مرتابعانِ را بطریق تبعیت و وراثت بعد از بعثت خاتم الرسل علیہ و علیٰ آلہ و علیٰ جمیع الانبیاء و الرسل الصلوات و التحیات منافی خاتمیّت نیست“

ترجمہ: خاتم الرسل کی بعثت کے بعد کامل تابعداروں کو اتباع اور وراثت کے طریق سے کمالات نبوت کا حاصل ہونا خاتمیت کے منافی نہیں۔

(مکتوباتِ امامِ ربانی حضرت مجدد الف ثانیؒ، باہتمام محمد سعید احمد نقشبندی، ص141)

علّامہ شہاب الدین تورپشتی جو ساتویں صدی کے بزرگ تھے تحریر فرماتے ہیں:

”اگر سوال کیا جاوے کہ حدیث نواس بن سمعان میں بعد وصف دجال اور اس کے ہلاک ہونے کے آپ نے عیسیٰ علیہ السلام کی بابت فرمایا یَفْتَحُ بَابَ الدَّارِ کہ وہ انصاف کا دروازہ کھولیں گے۔ کَمَا فِی اَصْلِ الْحَدِیْثِ اور

اسی حدیث میں حضرت عیسیٰؑ کو نبی اللہ کہا۔ اور دوسری جگہ فرمایا فَیَرْغَبُ نَبِیُّ اللّٰہِ اس پر حضرت عیسیٰؑ کی نبوت ثابت ہوتی ہے اور تم اس سے نفی نبوت کرتے ہو۔

جواب یہ ہے کہ ہم وحی شریعت کی نفی کرتے ہیں نہ الہامِ الٰہی کی اور ہم آخر زمانے میں یعنی آنحضرت ﷺ کے حکمِ نبوت کی نفی کرتے ہیں نہ اسمِ نبوت کی“

(عقائد مجدّدیّہ المسمّٰی بہ اَلصِّرَاطُ السَّوِیّ ترجمہ عقائدِ توریشی مصنفہ علامہ شہاب الدین توریشیؒ۔ ناشر اللہ والے کی قومی دوکان ص224)

ملّا علی قاری اپنی کتاب الموضوعات الکبیر میں تحریر کرتے ہیں۔

”لَوْ عَاشَ اِبْرَاھِیْمُ وَ صَارَ نَبِیًّا ، لَوْ صَارَ عُمَرُ نَبِیًّا لَکَانَا مِنْ اَتْبَاعِہٖ عَلَیْہِ الصَّلاۃُ وَالسَّلامُ کَعِیْسٰی وَالْخِضْرِ وَالْیَاس عَلَیْھِمُ السَّلامُ فَلا یُنَاقِضُ قَوْلَہٗ تَعَالٰی وَ خَاتَمَ النَّبِیّٖنَ اِذِ الْمَعْنٰی اَنَّہٗ لَا یَأْتِیْ نَبِیٌّ بَعْدَہٗ یَنْسَخُ مِلَّتَہٗ وَلَمْ یَکُنْ مِنْ اُمَّتِہٖ “

ترجمہ : اگر ابراہیم زندہ رہتے اور نبی بن جاتے اور اسی طرح اگر (حضرت) عمرؓ بھی نبی بن جاتے تو وہ دونوں حضرت عیسیٰؑ۔ حضرت خضر اور حضرت الیاس کی طرح آنحضرت ﷺ کے تابع ہوتے۔ پس یہ اللہ تعالیٰ کے قول وَ خَاتَمَ النَّبِیّٖنَ کے مخالف نہیں ہے۔ اس کے معنی ہیں کہ آپ کے بعد کوئی ایسا نبی نہیں آئے گا جو آپ کے دین کو منسوخ کرے اور آپ کا امتی نہ ہو۔“

(الموضوعات الکبیر مصنفہ ملا علی قاری ناشر نور محمد اصح المطابع آرام باغ کراچی ص100)

امام عبد الوہاب شعرانیؒ تحریر کرتے ہیں

”اِعْلَمْ اَنَّ النُّبُوَّۃَ لَمْ تَرْتَفِعْ مُطْلَقًا بَعْدَ مُحَمَّدٍ ﷺ وَ اِنَّمَا ارْتَفَعَ نُبُوَّۃُ التَّشْرِیْعِ فَقَطْ فَقَوْلُہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَ سَلَّمَ لَا نَبِیَّ بَعْدِیْ وَلَا رَسُوْلَ بَعْدِیْ اَیْ مَا ثَمَّ مَنْ یَّشْرَعُ بَعْدِیْ شَرِیْعَۃً خَاصَّۃً “

جان لو مطلق نبوت بند نہیں ہوئی۔ صرف تشریعی نبوت بند ہوئی ہے۔ آنحضرت ﷺ کے قول لَا نَبِیَّ بَعْدِیْ وَ لَا رَسُوْلَ بَعْدِیْ سے یہ مراد ہے کہ آپ کے بعد کوئی شخص شریعتِ خاصہ کے ساتھ نہیں آئے گا۔“

(الیواقیت والجواھر فی بیان عقائد الاکابر الجزء الاول۔ ناشر۔ داراحیاء التراث العربی مؤسّسۃ التاریخ العربی بیروت ص374)

حضرت محی الدین ابنِ عربیؒ تحریر فرماتے ہیں

” ... عِیْسٰی عَلَیْہِ السَّلَامُ یَنْزِلُ فِیْنَا حَکَمًا مُقْسِطًا عَدْلًا فَیَکْسِرُ الصَّلِیْبَ وَ یَقْتُلُ الْخِنْزِیْرَوَلَا نَشُكُّ قَطْعًا اَنَّہ رَسُوْلُ اللّٰہِ وَ نَبِیُّہ وَ ھُوَ یَنْزِلُ فَلَہ عَلَیْہِ السَّلَامُ مَرْتَبَۃُ النُّبُوَّۃِ بِلَا شَكٍّ عِنْدَ اللّٰہِ وَمَا لَہ مَرْتَبَۃُ التَّشْرِیْعِ عِنْدَ نُزُوْلِہ فَعَلِمْنَا بِقَوْلِہ ﷺ اَنَّہ لَا نَبِیَّ بَعْدِیْ وَ لَا رَسُوْلَ وَ اَنَّ النُّبُوَّۃَ قَدِ انْقَطَعَتْ وَالرِّسَالَۃَ اِنَّمَا یَرِیْدُ بِھِمَا التَّشْرِیْعُ۔۔۔“

یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہم میں نزول فرمائیں گے اس حال میں کہ وہ حکم و عدل ہوں گے۔ وہ صلیب کو توڑیں گے اور خنزیر کو قتل کریں گے۔ اور ہمیں آپ کے نبی ہونے پر قطعاً کوئی شک و شبہ نہیں اور جب وہ نازل ہوں گے تو اللہ کے نزدیک یقیناً نبوت کا مرتبہ پائیں گے اور نزول کے وقت وہ شرعی نبی نہیں ہوں گے۔ اور ہمیں آنحضرت ﷺ کے قول لَا نَبِیَّ بَعْدِیْ وَ لَا رَسُوْلَ کا یہ مطلب سمجھایا گیا ہے کہ یقینا رسالت منقطع ہو چکی ہے۔ اس سے مراد شریعت ہے ... “

(الفتوحات المکیہ۔ المجلد الاوّل۔ ناشر دار صادر بیروت، ص545)

پھر اسی کتاب میں ایک اور مقام پر حضرت محی الدین ابنِ عربیؒ فرماتے ہیں۔

”فَاِنَّ النُّبُوَّةَ الَّتِیْ قَدِ انْقَطَعَتْ بِوُجُوْدِ رَسُوْلِ اللّٰہِ ﷺ اِنَّمَا ھِیَ النُّبُوَّةُ التَّشْرِیْعِ لَا مُقَامُھَا فَلا شَرْعَ یَکُوْنُ نَاسِخًا لِشَرْعِہٖ ﷺ وَلا یَزِیْدُ فِیْ حُکْمِہٖ شَرْعًا آخَرَ وَ ھٰذَا مَعْنٰی قَوْلِہٖ ﷺ اَنَّ الرِّسَالَةَ وَالنُّبُوَّةَ قَدِ انْقَطَعَتْ فَلا رَسُوْلَ بَعْدِیْ وَلَا نَبِیَّ اَیْ لَا نَبِیَّ بَعْدِیْ یَکُوْنُ عَلٰی شَرْعٍ یُخَالِفُ شَرْعِیْ بَلْ اِذَا کَانَ یَکُوْنُ تَحْتَ حُکْمِ شَرِیْعَتِیْ ۔“

ترجمہ: وہ نبوت جو رسول کریم ﷺ کے آنے سے منقطع ہو گئی ہے وہ صرف تشریعی نبوت ہے نہ کہ مقامِ نبوت۔ پس اب کوئی شرع نہ ہو گی جو آنحضرت ﷺ کی شرع کی ناسخ ہو اور نہ آپ کی شریعت میں کوئی نیا حکم بڑھانے والی شرع ہو گی اور یہی معنی رسولِ کریم کے اس قول کے ہیں کہ نبوت اور رسالت منقطع ہو گئی ہے۔ پس میرے بعد نہ کوئی رسول ہو گا نہ نبی یعنی مراد آنحضرت ﷺ کے اس فرمان کی یہ ہے کہ اب کوئی ایسا نبی نہیں ہو گا جو میری شریعت کے مخالف شریعت پر ہو بلکہ جب (کوئی نبی) ہو گا تو وہ میری شریعت کے تحت ہو گا۔

(الفتوحات المکیہ، المجلد الثانی، ناشر دار صادر بیروت ص3)

اور یہ عقیدہ کہ آنحضرت ﷺ کے بعد امتی نبی ہو سکتا ہے صرف سلف صالحین تک محدود نہیں تھا بلکہ اس دور کے علماء بھی بڑی تعداد میں یہ عقیدہ رکھتے رہے۔ چنانچہ بانی دارالعلوم دیوبند، مولانا محمد قاسم نانوتوی صاحب اپنی تصنیف تحذیر الناس میں ایک سوال کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں:۔

”قبل عرض جواب یہ گزارش ہے کہ اوّل معنی خاتم النبیین معلوم کرنے چاہئیں تا کہ فہمِ جواب میں کچھ دقت نہ ہو سو عوام کے خیال میں تو رسول اللہ صلعم کا خاتم ہونا بایں معنی ہے کہ آپ کا زمانہ انبیاء سابق کے زمانہ کے بعد اور سب میں آخر نبی ہیں مگر اہلِ فہم پر روشن ہو گا کہ تقدّم یا تأخّر زمانی میں بالذات کچھ فضیلت نہیں پھر

مقامِ مدح میں وَلٰکِنْ رَّسُوْلَ اللّٰہِ وَ خَاتَمَ النَّبِیّٖنَ فرمانا اس صورت میں کیونکر صحیح ہوسکتا ہے۔ ہاں اگر اس وصف کو اوصافِ مدح میں سے نہ کہیے اور اس مقام کو مقام مدح قرار نہ دیجئے تو البتہ خاتمیت باعتبار تاخرِ زمانی صحیح ہو سکتی ہے مگر میں جانتا ہوں کہ اہلِ اسلام میں سے کسی کو یہ بات گوارا نہ ہوگی ...

عرض پردازہوں کہ اطلاقِ خاتم اس بات کو مقتضٰی ہے کہ تمام انبیاء کا سلسلہ نبوت آپ پر ختم ہوتا ہے جیسا انبیاء گزشتہ کا وصفِ نبوت میں حسب تقریر مذکور اس لفظ میں آپ کی طرف محتاج ہونا ثابت ہوتا ہے اور آپ کا اس وصف میں کسی کی طرف محتاج ہونا انبیاء گزشتہ ہوں یا کوئی اور اسی طرح اگر فرض کیجئے آپ کے زمانے میں بھی اس زمین میں یا کسی اور زمین میں یا آسمان میں کوئی اور نبی ہو تو وہ بھی اس وصفِ نبوت میں آپ ہی کا محتاج ہو گا اور اس کا سلسلہ نبوت بہر طور پر آپ پر مختتم ہو گا ...بلکہ اگر بالفرض آپ کے زمانے میں بھی کہیں اور نبی ہو جب بھی آپ کا خاتَم ہونا بدستور باقی رہتا ہے۔“

(تحذیر الناس، مصنفہ مولانا قاسم نانوتوی صاحب، قاری پریس دیوبند ص3)

اسی طرح نواب صدیق حسن خان صاحب نے تحریر کیا ہے کہ

”حدیث لَا وَحْیَ بَعْدَ مَوْتِیْ بے اصل ہے ہاں لَا نَبِیَّ بَعْدِیْ آیا ہے۔ اس کے معنی نزدیک اہلِ علم کے یہ ہیں کہ میرے بعد کوئی نبی شرعِ ناسخ نہ لائے گا۔“

(اقتراب الساعۃ، مطبع مفید عام آگرہ، مصنفہ نواب صدیق حسن خان ص162)

ان کتابوں میں بھی جو لکھی ہی جماعت کی مخالفت میں گئی تھیں اور جن میں جماعتِ احمدیہ کے خلاف جی بھر کر زہر اگلا گیا تھا، اس بات کا برملا اظہار کیا گیا تھا کہ امتِ مسلمہ کے سلفِ صالحین کی ایک بڑی تعداد یہ عقیدہ رکھتی رہی ہے کہ گو کہ آنحضرت ﷺ کے بعد شرعی نبی نہیں آ سکتا لیکن آنحضرت ﷺ کی اتباع

میں ایک شخص کو نبوت کا مقام مل سکتا ہے چنانچہ ایک کتاب " مرزائیت نئے زاویوں سے " میں مصنّف لکھتا ہے:۔

"اب رہی یہ بحث کہ صوفیاءِ کرام نے نبوت کے معنی میں یہ توسیع کیوں فرمائی کہ اس کا اطلاق اولیاء پر بھی ہو سکے تو یہ ایک لطیف بحث ہے۔ ہماری تحقیق یہ ہے کہ اس کی ذمہ داری صوفیاء کے اس تصور پر عائد ہوتی ہے جو انہوں نے نبوت سے متعلق قائم کیا۔ انہوں نے یہ سمجھا کہ کمالاتِ نبوت ایسی چیز ہے جو سعی اور کوشش سے حاصل ہو سکتی ہے۔ زہد و ریاضت اور اللہ کی خوشنودی کے حصول میں جد و جہد انسان کو اس حد تک پہنچا دیتی ہے کہ اس کا آئینہ دل اتنا مجلا اور شفاف ہو جائے کہ غیب کے انوار و تجلّیات کی جھلک اس پر منعکس ہو۔ ان کا دل مہبطِ وحی قرار پائے اور اس کے کان طرح طرح کی آوازیں سنیں یعنی مقامِ نبوت یا محدثیت اور بالفعل نبوت کا حصول یہ دو مختلف چیزیں نہیں۔ مقامِ نبوت سے مراد عمل و فکر کی وہ صلاحیتیں ہیں جو بشریت کی معراج ہیں۔ اُن تک رسائی کے دروازے امتِ محمدیہ پر بلاشبہ کھلے ہیں۔ شوقِ عبودیت اور ذوقِ عبادت شرط ہے۔ جو بات ختمِ نبوت کی تصریحات کے بعد ہماری دسترس سے باہر ہے۔ وہ نبوت کا حصول ہے کہ اس کا تعلق یکسر اللہ تعالیٰ کے انتخاب سے ہے۔ یعنی یہ اس پر موقوف ہے کہ اس کی نگاہِ کرم اس عہدہ جلیلہ کے لئے اپنے کسی بندے کو چن لے۔ جس میں نبوت کی صلاحیتیں پہلے سے موجود ہوں اور جو مقامِ نبوت پر پہلے سے فائز ہو۔ اب چونکہ نامزدگی کا یہ سلسلہ بند ہے۔ اس لئے کوئی شخص ان معنوں میں تو نبی ہرگز نہیں ہو سکتا کہ اس کا ماننا دوسروں کے لئے ضروری ہو اور اس کے الہامات دوسروں پر شرعاً حجت ہوں۔ البتہ مقامِ نبوت یا نبوت کی صلاحیتیں اب بھی حاصل ہو سکتی ہیں۔ نبوت کے اس تصور سے چونکہ نبوتِ مصطلحہ اور ولایت کے اس مقام میں بجز نامزدگی کے اور کوئی بنیادی فرق نہیں رہتا۔ اس لئے وہ حق بجانب ہیں کہ اس کو بھی ایک طرح کی نبوت قرار دیں کہ دونوں فطرت و حقیقت کے اعتبار سے ایک ہی چیز کے دو نام ہیں۔"

(مرزائیت نئے زاویوں سے مصنفہ محمد حنیف ندوی ص 75۔76)

اس کے علاوہ اس کارروائی کے دوران حضور نے ایک اور اہم پہلو یہ پیش فرمایا کہ آنحضرت ﷺ کے متعلق روایات میں صرف یہ نہیں آتا کہ آپ آخری نبی ہیں بلکہ یہ بھی آتا ہے کہ آپ سب سے اوّل نبی بھی ہیں۔ ہم اس مفہوم کی کچھ روایات درج کرتے ہیں

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے:۔

لَمَّا خَلَقَ اللّٰہُ عَزَّ وَ جَلَّ آدَمَ خَیْرَ لِآدَمَ بَنِیْہِ، فَجَعَلَ یَرٰی فَضَائِلَ بَعْضِہِمْ عَلٰی بَعْضٍ قَالَ فَرَآنِی نُورًا سَاطِعًا فِی اَسْفَلِہِمْ فَقَالَ یَا رَبِّ مَنْ ھٰذَا؟ قَالَ: ھٰذَا اِبْنُکَ اَحْمَدُ ھُوَالْاَوَّلُ وَالْآخِرُ وَ ھُوَ اَوَّلُ شَافِعٍ

(دلائل النبوۃ و معرفۃ احوال صاحب الشریعۃ۔ احمد بن الحسین البیہقی۔ السفر الخامس۔ دارالکتب علمیہ بیروت ص483)

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا:۔

”جب اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو پیدا کیا تو آدم کے لئے ان کے بیٹوں کو عظمت دی اور حضرت آدم ان میں سے بعض کی بعض پر فضیلت دیکھنے لگے۔ آنحضرت ﷺ فرماتے ہیں کہ جب انہوں نے مجھے سب لوگوں کے نیچے سے ابھرتے ہوئے نور کی صورت میں دیکھا۔ انہوں نے پوچھا اے رب یہ کون ہے ہے؟ (اللہ تعالیٰ) نے فرمایا یہ تیرا بیٹا احمد ہے۔ وہ اوّل ہے اور وہی آخر ہے اور وہ سب سے اوّل شفاعت کرنے والا ہے۔

اس حدیثِ قدسی سے صاف ظاہر ہے کہ آنحضرت ﷺ صرف آخری نبی نہیں بلکہ سب سے اوّل نبی بھی ہیں۔ اگر آخری نبی کا یہ مطلب ہے کہ آپ کے بعد کوئی امتی نبی بھی نہیں آ سکتا تو پھر چونکہ آپ اوّل نبی

بھی ہیں اس لئے پھر یہ مفروضہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ آپ کے علاوہ پھر کوئی نبی نہیں آیا اور اس طرح اس بناء پر تمام انبیاء کی نبوت کی نفی کرنی پڑے گی۔

اب ان چند مثالوں سے ظاہر ہے کہ پہلی صدی سے لے کر موجودہ دور تک سلفِ صالحین اور بعد کے علماء کی ایک بڑی تعداد اس بات کی قائل رہی ہے کہ آنحضرت ﷺ کی بعثت کے بعد آنحضرت ﷺ کی غلامی میں امتی نبی آنے کا دروازہ بند نہیں ہوا اور خاتم النبیّین کے الفاظ کا قطعاً یہ مطلب نہیں کہ آپ کے بعد اب کسی قسم کا کوئی نبی نہیں آ سکتا۔ اب پوری قومی اسمبلی پر مشتمل سپیشل کمیٹی کے سپرد تو یہ کام ہوا تھا کہ یہ تعین کرے کہ جو شخص آنحضرت ﷺ کو آخری نبی نہیں سمجھتا اس کا اسلام میں کیا Status ہے۔ اب اگر وہ یہ بحث شروع کرتے تو یہ کہا جا سکتا تھا کہ یہ کارروائی اپنے موضوع پر آگئی ہے۔ جیسا کہ حضرت خلیفۃ المسیح الثالث ؒ نے فرمایا تھا کہ پرانے بزرگوں اور بعد کے علماء نے اتنے تواتر سے اس بات کا اظہار کیا ہے کہ آنحضرت ﷺ کے بعد امتی نبی کا مقام حاصل کرنا مقامِ خاتم النبیّین کے منافی نہیں ہے کہ ان حوالوں کی تعداد سینکڑوں میں ہے۔ تو چاہئے تو یہ تھا کہ قومی اسمبلی بھی مشتاق ہوتی کہ ہاں ہمیں بھی وہ حوالے سنائیں ورنہ ہم ابھی تک تو یہی سمجھے بیٹھے تھے کہ آنحضرت ﷺ کے بعد جو کسی قسم کی نبوت کے دروازے کو کھلا ہوا سمجھے وہ فوراً دائرہ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔ سوالات اُٹھانے والے اپنی اس کمزوری کو جانتے تھے۔ عقل کا تقاضا یہ تھا کہ اگر اس بنیاد پر کسی کو غیر مسلم کہا جاتا تو اس کافر گری کے عمل کی زد میں سلفِ صالحین کی ایک بڑی تعداد آ جاتی۔ چنانچہ اس صورتِ حال میں ہم اس بات کو سمجھ سکتے ہیں کہ آخر کیوں ایک بار پھر اٹارنی جنرل صاحب نے موضوع سے گریز کیا اور دوسرے موضوع پر سوالات شروع کر دیئے۔

بہر حال اس کے بعد اٹارنی جنرل صاحب نے اپنی طرف سے ایک دلیل پیش فرمائی۔ اس دلیل کی حالت ملاحظہ ہو۔ انہوں نے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی اس تحریر کو پڑھا:

"... اور میں بیت اللہ میں کھڑے ہو کر قسم کھا سکتا ہوں کہ وہ پاک وحی جو میرے پر نازل ہوتی ہے وہ اسی خدا کا کلام ہے جس نے حضرت موسیٰ ؑ اور حضرت عیسیٰ ؑ اور حضرت محمد مصطفےٰ ﷺ پر اپنا کلام نازل کیا تھا۔" (74)

یہ حوالہ پڑھ کر یحییٰ بختیار صاحب نے حضور سے کہا:۔

"یہ آپ دیکھ لیجئے۔"

یہ پڑھتے ہوئے آدمی سوچتا ہے کہ آخر اس پر وہ کیا اعتراض کریں گے۔ انہوں نے یہ حوالہ دکھاتے ہی کہا:۔

"اب مرزا صاحب۔ آپ اس پر ذرا کچھ روشنی ڈالیں کہ جب مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ میں بیت اللہ میں کھڑے ہو کر یہ قسم کھا سکتا ہوں کہ وہ پاک وحی جو میرے پر نازل ہوتی ہے۔ ایک نبی کی حیثیت سے بول رہے ہیں کہ مجھ پر جو وحی نازل ہوتی ہے وہ اسی خدا کا کلام ہے جس نے حضرت موسیٰؑ، حضرت عیسیٰ ؑ اور حضرت محمد مصطفےٰ ﷺ پر اپنا کلام نازل کیا تھا۔ یہ ان تینوں سے ایک علیحدہ نبی ہو کے اپنے کلام کا ذکر کر رہے ہیں۔"

یعنی ان کی مراد یہ تھی کہ اس حوالہ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کا دعویٰ امتی نبی ہونے کا نہیں تھا اور نہ آپ کا دعویٰ یہ تھا کہ آپ ؑ نے جو کچھ پایا ہے وہ آنحضرت ﷺ کے فیض سے پایا ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ اس حوالہ پر یہ اعتراض کسی طور سے نہیں اُٹھ سکتا یہاں صرف منبع وحی کا ذکر ہے۔ اٹارنی جنرل صاحب کا مطلب کیا یہ تھا کہ امتی نبی کو یہ کہنا چاہئے کہ مجھ پر کسی اور خدا کی وحی اترتی ہے اور اس خدا کی وحی نہیں اترتی جس نے گزشتہ انبیاء سے کلام کیا تھا۔ اٹارنی جنرل صاحب کا یہ استنباط ان کے پاس دلائل کے فقدان کا ثبوت تو ہو سکتا ہے لیکن اسے کوئی سنجیدہ استنباط نہیں کہا جا سکتا۔ سب سے بڑھ کر یہ

کہ اس کتاب کے اسی صفحہ پر اس نام نہاد اعتراض کی مکمل تردید ہو جاتی ہے۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام تحریر فرماتے ہیں:۔

”میں مستقل طور پر کوئی شریعت لانے والا نہیں ہوں اور نہ میں مستقل طور پر نبی ہوں مگر ان معنوں سے کہ میں نے اپنے رسول مقتدا سے باطنی فیوض حاصل کر کے اور اپنے لئے اس کا نام پا کر اس کے واسطہ سے خدا کی طرف سے علمِ غیب پایا ہے مگر بغیر کسی جدید شریعت کے۔“

یحیٰ بختیار صاحب کو حضورؒ نے اس عبارت کا مطلب سمجھانا شروع کیا مگر وہ بار بار یہ اصرار کر رہے تھے کہ اس کا یہ مطلب نکلتا ہے کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام پر ایک مختلف نبی کی حیثیت سے وحی آئی ہے۔ حالانکہ اگر مذکورہ عبارت مکمل پڑھی جائے تو یہ عبارت تو صاف صاف یہ اعلان کر رہی ہے کہ حضرت مسیح موعود کو امتی نبی کا مقام آنحضرت ﷺ کی اقتداء کی برکت سے ملا تھا۔ اور آپ کوئی نئی شریعت نہیں لائے تھے۔ مگر اٹارنی جنرل صاحب کو اپنے استدلال پر اتنا یقین تھا کہ وہ اپنی بات پر مصر تھے اور یہاں تک کہہ گئے

The words are quite simple and plane

یعنی یہ الفاظ تو بالکل واضح ہیں۔ بات تو ٹھیک تھی حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے الفاظ تو بالکل واضح تھے لیکن اٹارنی جنرل صاحب اور انہیں سوالات مہیا کرنے والوں کا ذہن کج روی کا شکار تھا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ تمام انبیاء میں آنحضرت ﷺ کی وحی سب سے زیادہ کامل ہے اور انبیاء کی وحی ، عام لوگوں کے الہام و وحی سے ممتاز ہے اور جو وحی انسانوں کو ہو سکتی ہے وہ بہر حال شہد کی مکھی پر ہونے والی وحی سے افضل ہے لیکن یہ سب وحی ایک ہی خدا کی طرف سے ہے۔ ان سب کا منبع ایک ہی ہے۔

ابھی یہ بحث کسی نتیجہ کے قریب نہیں پہنچی تھی کہ اٹارنی جنرل صاحب نے موضوع تبدیل کیا اور یہ اعتراض پیش کیا کہ احمدیوں نے ہمیشہ اپنے آپ کو باقی مسلمانوں سے علیحدہ رکھا ہے۔ حالانکہ احمدیوں نے تو ہمیشہ مظالم کا نشانہ بننے کے با وجود مسلمانوں کے مفادات کے لئے سب سے زیادہ قربانیاں دی ہیں۔ یہ اعتراض اس لئے بھی بے بنیاد تھا۔ عالمِ اسلام میں بہت سے فرقوں نے بہت سے پہلوؤں سے اپنا علیحدہ تشخص برقرار رکھا ہے۔ بلکہ بہت سے علماء نے دوسرے فرقوں کے متعلق یہ فتاویٰ دیئے تھے کہ ان کے ساتھ شادی بیاہ، مودت تو ایک طرف رہی عام معاشی تعلقات بھی حرام ہیں۔ اٹارنی جنرل صاحب نے اس سلسلہ میں الفضل کے بہت سے حوالے بھی نوٹ کرائے۔ حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ نے فرمایا کہ یہ حوالے نوٹ کر لئے جائیں ان کو چیک کر کے جواب دیا جائے گا لیکن یہ بات حیران کن ہے کہ یہ سوال جماعت احمدیہ سے کیوں کیا جا رہا تھا؟ اس اسمبلی میں کئی جماعتوں کے اراکین بزعمِ خود منصف بن کر بیٹھے تھے، ان کی جماعتوں نے تاریخ کے بہت نازک ادوار میں اپنے آپ کو مسلمانوں کی اکثریت سے علیحدہ رکھا تھا۔ جماعتِ اسلامی کی مثال لے لیں۔ قیامِ پاکستان کے وقت جب مسلمانوں کی اکثریت مسلم لیگ کا ساتھ دے رہی تھی تو اس وقت جماعتِ اسلامی صرف مسلم لیگ کو اور ان کے قائدین کو برا بھلا کہہ رہی تھی۔ یہ سوال اس جماعت سے کیوں نہیں کیا جا رہا تھا۔

9 / اگست کی کارروائی کے آخر میں ایک بار پھر مفتی محمود صاحب نے ”ذریۃ البغایا“ والے اعتراض میں جان پیدا کرنے کی کوشش کی اور یہ سوال اُٹھایا کہ قرآنِ کریم میں یہ لفظ کن معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ اس پر حضور نے اس بات کی طرف اشارہ فرمایا کہ قرآنِ کریم میں تو ”ابن البغایا“ یا ”ذریۃ البغایا“ کا محاورہ استعمال ہی نہیں ہوا لیکن مفتی محمود صاحب یہ نکتہ اُٹھا رہے تھے کہ قرآنِ کریم میں ”بغی‘ کا لفظ تو استعمال ہوا ہے اور اس کا مقصد یہ تھا کہ یہ لفظ بدکاری معنوں میں استعمال ہوا ہے اور اپنے نکتے کو ثابت کرنے کے لئے وہ سورۃ النور کی یہ آیت پیش کر رہے تھے

... وَ لَا تُكْرِهُوا فَتَيٰتِكُمْ عَلَى الْبِغَاءِ اِنْ اَرَدْنَ تَحَصُّنًا ... (النور : 34)

یعنی اپنی لونڈیوں کو اگر وہ شادی کرنا چاہیں (روک کر مخفی) بدکاری پر مجبور نہ کرو۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ یہاں پر یہ بحث نہیں تھی کہ " البغی " کا کیا مطلب ہے بلکہ بحث یہ تھی کہ ذریۃ البغایا کے محاورے کا کیا مطلب ہے لیکن یا تو یہ بات مفتی صاحب کے علم میں نہیں یا پھر وہ عمداً پوری تصویر پیش نہیں کر رہے تھے۔ حقیقت یہ قرآنِ کریم کے الفاظ کی لغت مفرداتِ امام راغب میں اس لفظ کا مطلب یہ لکھا ہے:۔

"کسی چیز کی طلب میں میانہ روی کی حد سے تجاوز کی خواہش کرنا کے ہیں۔ خواہ تجاوز کر سکے یا نہ "

اور پھر لکھا ہے" بغی " دو قسم پر ہے محمود یعنی حد عدل و انصاف سے تجاوز کر کے مرتبہ احسان حاصل کرنا اور فرض سے تجاوز کر کے مرتبہ احسان حاصل کرنا اور فرض سے تجاوز کر کے تطوع بجا لانا اور مذموم یعنی حق سے تجاوز کر کے باطل یا شبہات میں واقع ہونا۔" اور پھر لکھا ہے کہ " بغیٌ "کے معنی تکبر کرنے کے بھی آتے ہیں کیونکہ اس میں بھی اپنی حد سے تجاوز کرنے کے معنی پائے جاتے ہیں۔

سورہ توبہ کی آیت 47اور48میں یبغونکم الفتنۃ ، ابتغوا الفتنۃ کے الفاظ فتنہ چاہنے کے معانی میں استعمال ہوئے ہیں اور سورۃ الشوریٰ کی آیت 43میں یبغون فی الارض بغیر الحق کے الفاظ "زمین میں ناحق سرکشی سے کام لینے کے " معنوں میں استعمال ہوئے ہیں اور یہی الفاظ سورۃ یونس کی آیت 24میں انہی معانی میں استعمال ہوئے ہیں اور اسی آیت کریمہ میں انما بغیکم علیٰ انفسکم کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ یقینا تمہاری بغاوت اپنے نفسوں کے ہی خلاف ہے۔ سورۃ الحج کی آیت میں ثم بغی علیہ کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ اس کا مطلب ہے " پھر اس کے خلاف سرکشی کی جائے۔" اس کے علاوہ قرآنِ کریم

کی بہت سی آیت میں یہ لفظ سرکشی اور بغاوت کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ یہ دعویٰ بالکل بے بنیاد ہے کہ یہ لفظ صرف زنا اور بد کاری کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔

اس کے بعد یہ گھسا پٹا اعتراض دہرایا گیا کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے انگریز گورنمنٹ کی اطاعت اور ان سے تعاون کا حکم دیا تھا۔ اوّل تو اس اعتراض کا اس مسئلہ سے کیا تعلق تھا کہ جس پر غور کرنے کے لیے یہ کمیٹی کام کر رہی تھی۔ زیر غور مسئلہ تو یہ تھا کہ جو شخص حضرت محمد ﷺ کو آخری نبی نہیں مانتا اس کا اسلام میں کیا Status ہے اور یہ سوال کیا جا رہا ہے کہ آج سے کئی دہائیاں قبل جب برِصغیر میں انگریزوں کی حکومت قائم تھی تو کیا احمدی اس حکومت کی اطاعت کرتے تھے یا نہیں۔ کوئی بھی صاحبِ شعور دیکھ سکتا ہے کہ غیر متعلقہ امور پر سوالات کر کے محض اصل موضوع سے کنارہ کیا جا رہا تھا۔ اور یہ سوال قیامِ پاکستان کے بعد سے اب تک کیا جا رہا ہے۔ اگر ایک منٹ کے لیے یہ تسلیم کر لیا جائے کہ جس گروہ نے انگریز حکومت کی اطاعت کی تھی اسے دائرہ اسلام سے خارج کر دینا چاہیے۔ یا اگر کوئی گروہ اس وقت انگریزوں کی حکومت سے تعاون کر رہا تھا تو اس کا مطلب یہ لیا جائے گا کہ اس نے اپنے آپ کو امتِ مسلمہ سے علیحدہ رکھا ہے۔ تو پہلے یہ دیکھنا چاہیے کہ اس وقت کون کون سے گروہ انگریز حکومت کی اطاعت کر رہے تھے اور ان سے تعاون کر رہے تھے۔ یہ حقیقت پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ انگریزوں کی حکومت قائم ہونے سے قبل ہندوستان طوائف الملوکی کے ایک خوفناک دور سے گزر رہا تھا۔ مغل سلطنت تو اب لال قلعہ کی حدود تک محدود ہو چکی تھی اور اس دورِ خرابی میں ہندوستان میں بالعموم اور پنجاب میں بالخصوص مسلمانوں کے حقوق بُری طرح پامال کیے جا رہے تھے اور پنجاب میں تو سکھوں کی حکومت میں مسلمانوں پر وہ وحشیانہ مظالم کئے گئے تھے کہ جن کو پڑھ کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ان کی مذہبی آزادی مکمل طور پر سلب کی جا چکی تھی۔ اس دور میں جب کہ ابھی پورے ہندوستان پر انگریزوں کا غلبہ نہیں ہوا تھا، اس وقت ان علاقوں کے لوگوں کے خیالات کیا تھے جہاں پر

ابھی مقامی راجہ مہاراجہ حکومت کر رہے تھے۔ اس کے متعلق مسلمانوں کے مشہور لیڈر سر سید احمد خان صاحب لکھتے ہیں:۔

"... ہماری گورنمنٹ کی عملداری دفعۃً ہندوستان میں نہیں آئی تھی بلکہ رفتہ رفتہ ہوئی تھی جس کی ابتداء 1757ء کے وقت سراج الدولہ کے پلاسی پر شکست کھانے سے شمار ہوتی ہے۔ اس زمانے سے چند روز پیشتر تک تمام رعایا اور رئیسوں کے دل ہماری گورنمنٹ کی طرف کھنچتے تھے اور ہماری گورنمنٹ اور اس کے حکّامِ تعہد کے اخلاق اور اوصاف اور رحم اور استحکامِ عہود اور رعایا پروری اور امن و آسائش سن سن کر جو عملداریاں ہندو اور مسلمانوں کی ہماری گورنمنٹ کے ہمسائے میں تھیں وہ خواہش رکھتی تھیں اس بات کی کہ ہماری گورنمنٹ کے سایہ میں ہوں۔" (75)

اس زمانہ کے حالات کے گواہ، مسلمانوں کے لیڈر اور عظیم خیر خواہ سر سید احمد خان صاحب لکھ رہے ہیں جب کہ خود ہندوستان کے لوگوں کی جن میں مسلمان اور ہندو دونوں شامل تھے یہ خواہش تھی کہ وہ انگریزوں کی حکومت کے تحت آجائیں۔ اس دور میں جب کہ پنجاب اور اس کے ساتھ ملحقہ علاقوں میں انگریزوں کی نہیں بلکہ سکھوں کی حکومت قائم تھی۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دورِ حکومت میں تو پھر بھی مسلمانوں کی کچھ اشک شوئی ہوئی ورنہ باقی سکھ فرمانرواؤں کے دور میں مسلمانوں کی مذہبی آزادی کو اس بُری طرح پامال کیا گیا کہ بعض مسلمان قائدین نے ان کے خلاف اعلانِ جہاد کر دیا۔ جن میں ایک نمایاں نام سید احمد شہید صاحب اور مولوی اسماعیل شہید کا ہے۔

حضرت سید احمد شہیدؒ کا فتویٰ تھا:۔

"سرکار انگریز گو منکرِ اسلام ہے مگر مسلمانوں پر کچھ ظلم اور تعدّی نہیں کرتی اور نہ ان کو فرضِ مذہبی اور عبادت ِلازمی سے روکتی ہے۔ ہم ان کے ملک میں اعلانیہ وعظ کہتے اور ترویج کرتے ہیں وہ کبھی مانع اور مزاحم نہیں ہوتی بلکہ اگر ہم پر کوئی زیادتی کرتا ہے تو اس کو سزا دینے کو تیار ہے۔ ہمارا اصل کام اشاعتِ توحید الٰہی اور احیائے سنن سید المرسلین ہے۔ سو ہم بلا روک ٹوک اس ملک میں کرتے ہیں۔ پھر ہم سرکارِ انگریز پر کس سبب سے جہاد کریں اور خلاف ِاصولِ مذہب طرفین کا خون بلاسبب گرادیں۔" (76)

تو سید احمد شہید صاحبؒ کے نزدیک اس دور میں انگریز حکومت کے خلاف جہاد کرنا خلاف ِاصول مذہب اسلام تھا۔ اسی دور میں مولوی اسماعیل شہید صاحب نے سکھوں سے جہاد کرنے کے لیے لوگوں کو ترغیب دی اور لشکر ترتیب دیئے۔ انہوں نے یہ واضح اعلان کیا کہ "جو مسلمان سرکارِ انگریز کی امان میں رہتے ہیں ہندوستان میں جہاد نہیں کر سکتے۔" (77)

جب انگریزوں کی حکومت ہندوستان میں مستحکم ہو گئی تو علماء نے اس کی بڑھ چڑھ کر حمایت کی چنانچہ جماعت ِاحمدیہ کے ایک اشد مخالف مولوی محمد حسین صاحب بٹالوی تحریر کرتے ہیں:۔

"بناء علیہ اہلِ اسلام ہندوستان کے لئے گورنمنٹ انگریزی کی مخالفت و بغاوت حرام ہے۔"(78)

پھر تحریر کرتے ہیں:

"اس امن و آزادی عام و حسنِ انتظام برٹش گورنمنٹ کی نظر سے اہلحدیث ِہند اس سلطنت کو ازبس غنیمت سمجھتے ہیں اور اس سلطنت کی رعایا ہونے کو اسلامی سلطنتوں کی رعایا ہونے سے بہتر جانتے ہیں اور جہاں کہیں وہ رہیں یا جائیں (عرب میں خواہ روم میں خواہ اور کہیں) کسی اور ریاست کا محکوم و رعایا ہونا نہیں چاہتے۔" (79)

اس وقت ہندوستان اور عرب کے تمام مسالک کے علماء بڑھ چڑھ کر انگریز حکومت کے تحت ہندوستان کو عین دارالاسلام قرار دے رہے تھے اور اس طرح برطانوی حکومت کی بہت اہم مدد کر رہے تھے۔ برطانوی حکومت کے تحت ہندوستان کے بارے میں بریلوی مسلک کے مجدّد احمد رضا خان صاحب بریلوی کا فتویٰ ہے:۔

”ہندوستان دارلحرب نہیں دارالاسلام ہے“

(عرفانِ شریعت حصہ اوّل مرتب کردہ مولوی عرفان علی۔ الناشر سنی دارالاشاعت علویہ رضویہ لائلپور ص7)

شیعہ مسلک کے مشہور عالم سید علی حائری صاحب جو کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی مخالفت میں بھی پیش پیش رہے تھے، سکھوں کے دور کا ذکر کر کے کہتے ہیں:۔

”... مگر یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ آج ہم ہندوستان میں ایسی مبارک مہربان سلطنت کے تحت عدل و انصاف سے ہیں کہ وہ ان تمام عیوب اور خود غرضیوں سے پاک ہے جس کو مذاہب کے اختلاف سے کوئی بھی اعتراض نہیں ہے اور جس کا قانون ہے کہ سب مذاہب آزادی کے ساتھ اپنے مذہبی فرائض کو ادا کریں۔ لہٰذا اس سلطنت (برطانیہ عظمیٰ) کے وجود و بقا و قیام و دوام کے لیے تمام احباب دعا کریں اور اس کے ایثار کا جو وہ اہلِ اسلام اور خاص کر شیعوں کی تربیت میں بے دریغ مرعی رکھتی ہے۔ ہمیشہ صدقِ دل سے شکر گزار ہوں۔“

(موعظہ تقیہ، تقریر سید علی حائری، ناشر کتب خانہ حسینیہ ص66)

صرف ہندوستان کے علماء ہی نہیں بلکہ مکہ مکرمہ کے مختلف فرقوں سے تعلق رکھنے والے علماء بھی یہی فتاویٰ دے رہے تھے انگریز حکومت کے تحت ہندوستان عین دارالاسلام ہے اور انگریز حکام بڑے فخر سے اپنی کتب میں یہ فتاویٰ درج کرتے تھے کہ یہ فتاویٰ مسلمان علماء نے ہماری حکومت کے بارے میں دیئے ہیں۔ چنانچہ

جماعتِ احمدیہ کے قیام سے بہت قبل W.W. Hunter نے اپنی کتاب کے اپنڈیکس میں مکہ مکرمہ سے جاری کردہ حنفی، شافعی اور مالکی مسلک کے فتاویٰ درج کئے ہیں کہ انگریزوں کے تحت ہندوستان دارالاسلام ہے۔

(ملاحظہ کیجئے: The Indian Musalmans, by WW Hunter, published by Sang e Meel Publications 1999p216-217)

جب ہندوستان کے مسلمانوں نے اپنے سیاسی مفادات کی حفاظت کے لیے مسلم لیگ قائم کی تو اس کے اغراض و مقاصد بھی طے کیے گئے۔ ان میں سے پہلا مقصد یہ تھا:۔

To promote among Indian Muslims feelings of loyalty towards the British Government, and to remove any misconception that may arise as to the intentions of the government with regard to any of its measures.

ہندوستان کے مسلمانوں میں برٹش گورنمنٹ کی بابت وفاداری کے احساس کو بڑھانا اور گورنمنٹ کے کسی قدم کے بارے میں اگر کوئی غلط فہمی پیدا ہو تو اسے دور کرنا۔ (80)

اور جب پنجاب میں مسلم لیگ کا قیام عمل میں آیا تو اس کے بنیادی اغراض و مقاصد طے کیے گئے۔ ان چار مقاصد میں سے ایک یہ تھا:۔

”مسلمانوں کے درمیان برٹش گورنمنٹ کی نسبت سچی وفاداری کا خیال قائم رکھنا اور بڑھانا۔“ (81)

واضح رہے کہ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ اگر کوئی سیاسی جماعت ہندوستان کے مسلمانوں کی نمائندہ جماعت کہلانے کی مستحق تھی تو وہ مسلم لیگ تھی اور اس کے اغراض و مقاصد میں انگریزوں کی حکومت کے

بارے میں کن نظریات کا اظہار کیا گیا تھا یہ مندرجہ بالا حوالے سے واضح ہے۔ اور جب وائسرائے ہند لارڈ منٹو کی خدمت میں پنجاب مسلم لیگ نے ایڈریس پیش کیا تو اس میں ان الفاظ میں مسلم لیگ کی پالیسی کا اعادہ کیا گیا:۔

”ہماری جماعت انگریزی تاج سے مستقل محبت و وفاداری رکھتی ہے ...... ہم اس موقع کو زور کے ساتھ یہ عرض کیے بغیر گزر جانے دینا نہیں چاہتے کہ بعض انقلاب پسندوں نے جو انارکزم کا رویہ اختیار کیا ہے۔ اس سے نہ صرف مسلمانانِ پنجاب کو بلکہ کل ہندوستان کی اسلامی جماعت کو دلی نفرت ہے۔“ (82)

اور 1911ء میں پنجاب مسلم لیگ نے جو ایڈریس لارڈ ہارڈنگ وائسرائے ہند کو پیش کیا اس میں یہ اقرار کیا:۔

”گزشتہ چند سال میں ہندوستان کا پولیٹیکل مطلع اس صوبہ میں سڈیشن اور بے چینی کے بادلوں سے مکدر ہو رہا تھا۔ مسلمانوں نے کبھی ایک لمحہ کے لیے اپنی برٹش گورنمنٹ کی مستحکم عقیدت میں پس وپیش نہیں کیا۔“(83)

اور 1912ء میں جب پنجاب مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس ہوا تو اس کے خطبہ صدارت کا آ غاز برٹش گورنمنٹ کی گوناں گوں برکات کے ذکر سے ہوا۔(84)

خود جماعتِ اسلامی کے بانی مودودی صاحب کا فتویٰ اپنے دور کے متعلق یہ تھا کہ اب انگریز حکومت کے تحت ہندوستان دارالحرب نہیں ہے۔ وہ لکھتے ہیں:۔

”جس زمانہ میں شاہ عبدالعزیز صاحب نے جوازِ سود کا فتویٰ دیا تھا، اس زمانہ میں یہ مسلمانِ ہند کے لئے دارالحرب تھا، اس لئے کہ انگریزی قوم مسلمانوں کی حکومت کو مٹانے کے لئے جنگ کر رہی تھی۔ جب اس کا استیلاء مکمل ہو گیا اور مسلمانانِ ہند نے اس کی غلامی قبول کر لی تو یہ ان کے لئے دارالحرب نہیں رہا۔ ایک وقت

میں یہ افغانستان کے مسلمانوں کے لئے دارالحرب تھا۔ ایک زمانہ میں ترکوں کے لئے دارالحرب ہوا۔ مگر اب یہ تمام مسلمان حکومتوں کے لئے دارالصلح ہے۔"

(سود۔ مصنفہ ابوالاعلیٰ مودودی صاحب۔ ناشر اسلامک پبلیکیشنز لاہور۔ ص349)

اگر یہی کلیہ تسلیم کر لیا جائے کہ جن مسلمانوں نے ہندوستان میں انگریز حکومت سے تعاون کیا یا تعاون کا اعلان کیا انہیں ملتِ اسلامیہ سے علیحدہ متصور کرنا چاہئے تو اس نامعقول کلیہ کی زد میں سرسیداحمد خان، سید احمد شہید، مولوی اسماعیل شہید، غیر احمدی علماء اور پاکستان کی بانی جماعت مسلم لیگ کے تمام مسلمان لیڈر آجائیں گے۔ نہ صرف یہ بلکہ ہندوستان کے مسلمانوں کی بھاری اکثریت کے متعلق بھی یہی کہنا پڑے گا کہ انہیں ملتِ اسلامیہ سے علیحدہ سمجھنا چاہیے۔ لیکن ماضی کے ان حقائق پر نظر ڈالے بغیر مخالفینِ جماعت مسلسل یہ اعتراض کرتے رہتے ہیں کہ جماعتِ احمدیہ نے انگریز حکومت سے تعاون کیوں کیا اور ان کی تعریف کیوں کی؟ یہ اعتراض جماعتِ احمدیہ پر نہیں بلکہ خود اعتراض کرنے والوں پر ہونا چاہیئے تھا۔ بلکہ جب ہم نے صاحبزادہ فاروق علی خان صاحب سے انٹرویو کیا تو ان کا کہنا تھا کہ انگریز حکومت سے تعاون کے بارے میں جو جوابات دیئے گئے تھے ممبرانِ اسمبلی کی ان سے تسلی نہیں ہوئی تھی۔ ہم نے جو حوالے درج کئے ہیں ان کے مطابق تو یہ سوال اُٹھتا ہی نہیں ہے کجا یہ کہ اس پر تسلی ہونے یا نہ ہونے کی بحث کی جائے۔

۹/ اگست کے دن کے آخری حصہ کی کارروائی کا کچھ حصہ تو پہلے ہی بیان ہو چکا ہے۔ اور اس روز کے آخری اجلاس کا بیشتر حصہ بھی اس امر پر بحث کرتے ہوئے گزرا کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے مخالفین کے بارے میں سخت الفاظ استعمال کئے ہیں کہ نہیں۔ اس دن کی کارروائی کے آخر میں اٹارنی جنرل صاحب نے اکمل صاحب کے ایک شعر کا سہارا لے کر یہ اعتراض اُٹھانے کی کوشش کی کہ جماعتِ احمدیہ کے عقائد کے

مطابق نعوذُ باللہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کا مقام آنحضرت ﷺ سے زیادہ بلند ہے۔ یہ بھی ایک پرانا اعتراض ہے اور اس کا جواب جماعت کے لٹریچر میں بار ہا بڑی تفصیل سے آچکا ہے۔ لیکن یہ بات قابلِ غور ہے کہ وہ یہ اعتراض اُٹھانا چاہتے تھے کہ جماعتِ احمدیہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کا مقام آنحضرت ﷺ سے زیادہ سمجھتی ہے۔ اور اس کی تائید میں حضرت مسیح موعودؑ کا کوئی الہام یا تحریر نہیں پیش کی گئی، خلفاء میں سے کسی کی تحریر یا قول پیش نہیں کر سکے۔ پیش کیا بھی تو کیا ظہور الدین اکمل صاحب کا ایک شعر۔ اب اگر کوئی یہ جاننا چاہے کہ اسلام کے عقائد کیا ہیں تو کیا قُرونِ اُولیٰ کے کسی شاعر کا شعر پیش کیا جائے گا یا یہ مناسب ہو گا کہ کسی قرآنی آیت یا حدیث شریف کا حوالہ پیش کیا جائے۔ اس خلافِ عقل طرزِ استدلال کی وجہ یہ تھی کہ وہ اپنے اس اعتراض کی تائید میں حضرت مسیح موعودؑ کی کوئی تحریر یا الہام ڈھونڈ ہی نہیں سکتے تھے۔ وہاں تو ہر جگہ اس بات کا اعلان ہے کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی حیثیت آنحضرت ﷺ کے ایک روحانی فرزند اور خادم کی ہے۔

اس دن کی کارروائی کے اختتام پر جو کچھ ہوا اس سے تو یہی اندازہ ہوتا ہے کہ اب تک جو جماعتِ احمدیہ کی طرف سے مختلف فرقوں کے علماء کے حوالے پیش کئے گئے تھے کہ کس طرح مختلف فرقوں نے دوسرے فرقوں کو کافر کہا ہے، اس سے مولوی حضرات کے کیمپ میں کافی بے چینی پیدا ہوئی تھی اور ایسا ہونا لازمی تھا کیونکہ ان کی ایک کوشش تھی کہ کسی طرح یہ ثابت کریں کہ احمدی تو غیر احمدی مسلمانوں کو مسلمان ہی نہیں سمجھتے اور اس لئے اب ہمیں یہ حق ہے کہ ہم آئین میں احمدیوں کو غیر مسلم قرار دیں لیکن اب تک یہ ہوا تھا کہ کثرت سے مختلف فرقوں کے علماء کے فتاویٰ پیش کئے گئے تھے جن میں انہوں نے ایک دوسرے کو کافر قرار دیا تھا تو عقل یہ تقاضا کرتی تھی کہ پھر تو ان تمام فرقوں کو غیر مسلم قرار دے دینا چاہئے۔ چنانچہ اس

بگڑتی ہوئی صورتِ حال کو سنبھالنے کے لئے نورانی صاحب نے کہا کہ جو فتوے جماعت کے وفد نے یہاں پر سنائے ہیں ان کی Original کتابیں یہاں پیش کرنی چاہئیں۔ اس کے بغیر ان کا بیان مکمل نہیں ہونا چاہیئے۔

اس پر حضور نے فرمایا کہ وہ کل یہاں پر رکھد یئے جائیں یا لائبریری میں رکھ دیئے جائیں۔ اب یہ صورتِ حال بھی نورانی صاحب کے لئے نا قابلِ قبول تھی کیونکہ اس طرح ان فتووں کی نمائش ہی لگ جاتی تھی۔ اس پر کچھ دیر بعد نورانی صاحب نے ایک اور نکتہ اُٹھایا اور وہ یہ تھا کہ جو کفر کے فتووں کے حوالے جماعت کا وفد پیش کرے وہ اس صورت میں قبول کئے جائیں جب کہ دیوبند یا فرنگی محل وغیرہ کے Original اصل مہروں والے فتوے پیش کئے جائیں ورنہ اس کا مطلب یہ لیا جائے گا کہ وفد نے گواہی غلط دی ہے۔ اب یہ ایک بالکل بچگانہ فرمائش تھی۔ جماعت احمدیہ نے مختلف فرقوں کی معروف کتب سے حوالے پیش کئے تھے اور کہیں نہیں کہا تھا کہ ہم دیوبند، فرنگی محل یا ملتان کے کسی مدرسہ کے Original مہر والے فتووں سے پڑھ رہے ہیں۔ اور یہ فتوے جماعتِ احمدیہ کے پاس کیوں ہونے تھے۔ یہ فتوے تو ان مولوی حضرات یا ان کے مدرسوں کے پاس ہی ہونے تھے۔ ہاں اگر کسی کو شک تھا کہ کتب کے حوالے غلط دیئے گئے تھے تو وہ متعلقہ کتاب دیکھنے کا مطالبہ پیش کر سکتا تھا لیکن ایسا نہیں کیا جا رہا تھا کیونکہ یہ سب فتاویٰ صحیح تھے۔ اگر یہی کلیہ تسلیم کیا جاتا تو جماعتِ احمدیہ بھی یہ مطالبہ کر سکتی تھی کہ ہمارا بھی صرف وہی حوالہ صحیح سمجھا جائے گا جس پر جماعت کی مجلسِ افتاء کی مہر ہو، جماعت کی کسی کتاب میں درج کوئی فتویٰ ہم تسلیم نہیں کریں گے۔ ابھی اس پر بحث چل رہی تھی کہ سپیکر صاحب نے کارروائی لکھنے والوں کو جانے کا کہا اور اس روز کی کارروائی اختتام پذیر ہوئی۔

10 / اگست کی کارروائی

اس روز صبح کی کارروائی کے دوران زیادہ تر پرانے حوالوں پر ہی بات ہوئی۔ ان کو چیک کر کے اسمبلی میں ان کی صحیح اور مکمل عبارت سنائی گئی۔ اس کے علاوہ ایک مرتبہ پھر یہ تلخ حقیقت سامنے آئی کہ الفضل کے کچھ شماروں سے کچھ عبارتیں پیش کر کے اعتراضات اُٹھائے گئے تھے۔ حضور نے فرمایا کہ جب ہم نے جائزہ لیا تو ان شماروں میں یہ عبارتیں موجود ہی نہیں تھیں۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ابھی تک قومی اسمبلی کی سپیشل کمیٹی میں جعلی حوالے پیش کر کے جماعت کے خلاف جذبات بھڑکائے جا رہے تھے۔ ایک روز پہلے اٹارنی جنرل صاحب نے حوالہ پیش کیا تھا کہ 16 /جولائی1949ء کے الفضل کے مطابق حضرت خلیفۃ المسیح الثانی نے فرمایا تھا کہ دشمن محسوس کرتا ہے کہ ہم اگر ہم میں کوئی نئی حرکت پیدا ہوئی تو ہم اس کے مذہب کو کھا جائیں گے۔ حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ نے انکشاف فرمایا کہ ریکارڈ کے جائزہ سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ اس روز الفضل کے شمارے میں حضرت خلیفۃ المسیح الثانی کا کوئی خطبہ یا مضمون شائع ہی نہیں ہوا۔ اب یہ صورتِ حال سامنے آ رہی تھی کہ ایک عبارت پیش کر کے ممبرانِ اسمبلی کو یہ باور کرانے کی کوشش کی جا رہی تھی کہ احمدی ان کے مذہب کو ختم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں اور حقیقت یہ سامنے آئی کہ یہ حوالہ بھی جعلی نکلا۔ اس مرحلہ پر اٹارنی جنرل صاحب کے لئے یہ ایک اور دھچکا تھا۔ اس انکشاف کے بعد انہوں نے کچھ بے یقینی کے عالم میں کہا:۔

" یعنی کہیں نہیں چھپا کہ تاریخ میں کوئی فرق ہو گیا ہے؟ کیونکہ یہ نہ ہو کہ پھر وہ بیچ میں تاریخ کسی اور کا آجائے۔ بعض دفعہ پرنٹنگ میں غلطی ہو جاتی ہے۔"

اٹارنی جنرل صاحب کے یہ جملے پڑھتے ہوئے کچھ سمجھ میں نہیں آتی کہ وہ کیا کہنا چاہ رہے تھے۔ وہ ایک سینیئر وکیل تھے اور بخوبی جانتے تھے کہ جب کوئی شخص کوئی حوالہ پیش کرتا ہے کہ تو یہ اس کا فرض ہے کہ

وہ اس کا ثبوت مہیا کرے، نہ کہ جس پر اعتراض کر رہا ہے اس سے یہ لایعنی فرمائش کرے کہ اب تم ہی یہ حوالہ ڈھونڈ کر لاؤ تا کہ میں تم پر اعتراض کر سکوں۔ اگر ان کے مطابق حوالہ دیتے ہوئے تاریخ غلط ہو گئی تھی تو یہ قصور ان کا تھا اور ان کے ساتھ کام کرنے والے مولوی صاحبان کی ٹیم کا تھا اور ان سے یہ غلطی بار بار ہو رہی تھی۔

ابھی ممبران اسمبلی جو منصف اور فریق دونوں کا کردار ادا کر رہے تھے اس صدمہ سے سنبھلے نہیں تھے کہ ان کے لئے ایک اور پریشانی کا سامان پیدا ہو گیا۔ 9/ اگست کی کارروائی کے دوران یحیٰ بختیار صاحب نے 3/ جولائی 1952ء کے الفضل کا حوالہ پیش کیا تھا کہ اس میں لکھا ہے:۔

”ہم فتح یاب ہوں گے۔ ضرور تم مجرموں کی طرح ہمارے سامنے پیش ہوگے۔ اس وقت تمہارا حشر بھی وہی ہو گا جو فتح مکہ کے دن ابو جہل اور اس کی پارٹی کا ہوا۔“

یہ حوالہ پیش کرنے کا مقصد واضح تھا اور وہ مقصد یہ تھا کہ لوگوں کو بھڑکایا جائے کہ کہ احمدی تمہیں اپنا محکوم بنانے کی تیاری کر رہے ہیں اور تمہیں ابوجہل کی طرح سمجھتے ہیں۔ حضور نے گزشتہ حوالے کے بعد اس کے متعلق بھی انکشاف فرمایا کہ یہ بھی جعلی نکلا ہے۔ اس شمارے میں یہ عبارت موجود ہی نہیں۔ عقل کا تقاضا تو یہ تھا کہ اٹارنی جنرل صاحب سپیشل کمیٹی میں کوئی وضاحت پیش کرتے کہ وہ اور ان کی ٹیم اتنے کم وقت میں اتنی زیادہ غلطیاں کیوں کر رہے ہیں؟ آخر کیا ہو رہاہے کہ ایک کے بعد دوسرا حوالہ جعلی ثابت ہو رہا ہے۔ لیکن انہوں نے کیا کیا؟ اسی ذکر کے دوران حضور نے فرمایا کہ ہم ایک غریب جماعت ہیں۔ اس لئے پہلے خطبہ کا خلاصہ چھپ جاتا ہے اور پھر ٹیپ ریکارڈنگ سے مکمل متن چھپتا ہے۔ اس پر یحیٰ بختیار صاحب نے یہ خلاف عقل بحث اُٹھانے کی کوشش کی کہ جماعتِ احمدیہ تو غریب جماعت ہے ہی نہیں۔ سیدھی سی بات ہے کہ جو

حوالہ آپ نے پڑھا وہ جعلی نکلا۔ یہ وضاحت پیش کرو کہ ایسا کیوں ہوا۔ کسی کی غربت یا امارت کا اس سے کیا تعلق؟

اس مرحلہ پر یہ صورتِ حال نظر آرہی تھی کہ اٹارنی جنرل صاحب نے "تذکرہ" کے صفحہ 227 کا حوالہ دے کر ایک عبارت پڑھی۔ پھر یکلخت انہیں پریشانی دامنگیر ہوئی کہ کہیں یہ بھی غلط نہ نکل آئے تو فوراً کہا:۔

"خیر یہ بعد میں کر لیں۔ آپ دیکھ لیں اگر ایک دو صفحے آگے پیچھے ہوں ..."

پھر ان کے تذبذب میں اضافہ ہو گیااور انہیں یہ وسوسہ لاحق ہوا کہ شاید ایک دو صفحے آگے پیچھے بھی یہ عبارت نہ ملے تو ایک اور نکتہ ان الفاظ میں بیان فرمایا:۔

"بعض دفعہ 227 کا 247 ہوتا ہے۔"

پڑھنے والے اس بارے میں خود ہی کوئی نتیجہ نکال سکتے ہیں۔ کیا ان سوالات کو سنجیدہ بھی قرار دیا جا سکتا ہے؟ معلوم ہوتا ہے کہ اس مرحلہ تک سوالات کرنے والوں کا اعتماد مکمل طور پر رخصت ہو چکا تھا۔

ایک بار پھر بحث اس نکتہ کی طرف واپس آ گئی کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی تحریر میں جب حقیقی مسلمان کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں تو اس سے کیا مطلب لیا جائے۔ یہاں حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی تصنیف آئینہ کمالاتِ اسلام کا ایک حوالہ پیشِ نظر تھا جس کا حوالہ محضر نامہ میں بھی دیا گیا تھا۔

اٹارنی جنرل صاحب نے جب یہ سوال کیا اور کہا کہ جب اس قسم کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے تو اس سے یہ تاثر پڑتا ہے کہ جو غیر احمدی ہیں وہ مسلمان ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن اصل میں مسلمان نہیں ہیں۔ اس پر حضرت خلیفة المسیح الثالثؒ نے فرمایا کہ اس کا جواب محضر نامہ میں آچکا ہے لیکن چونکہ سوال دہرایا گیا

ہے اس لئے میں اس کا جواب دہرانا چاہتا ہوں۔ اس پر حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی تصنیف ِلطیف آئینہ کمالات ِاسلام کا حوالہ پڑھ کر سنایا کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی تحریر میں جب اصطلاح حقیقی مسلمان کی استعمال ہوتی ہے تو اس کا کیا مطلب لینا چاہیے۔ یہ عبارت غور سے پڑھنی چاہیے۔ کیونکہ اس مرحلہ پر جو کارروائی ہوئی مختلف اسمبلی ممبران اس کو توڑ موڑ کر اور غلط اضافوں کے ساتھ لوگوں کے سامنے پیش کرتے رہے اور اپنے بیانات کی زینت بناتے رہے تاکہ یہ ثابت کریں کہ اگر اسمبلی نے احمدیوں کو غیر مسلم قرار دیا تو اس کے ذمہ دار احمدی خود ہیں کیونکہ انہوں نے اس کارروائی کے دوران یہ موقف پیش کیا تھا کہ ہم اپنے علاوہ دوسرے مسلمانوں کو مسلمان نہیں سمجھتے۔ بہر حال حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ نے حضرت مسیح موعود عیہ السلام کا جو حوالہ پڑھا وہ یہ تھا:۔

" اصطلاحی معنے اسلام کے وہ ہیں جو اِس آیت کریمہ میں اس کی طرف اشارہ ہے یعنی یہ کہ بَلٰی مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهُ لِلّٰہِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهُ اَجْرُهُ عِنْدَ رَبّه وَلَا خَوْ فٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُونَ۔ یعنی مسلمان وہ ہے جو خدا تعالیٰ کی راہ میں اپنے تمام وجود کو سونپ دیوے یعنی اپنے وجود کو اللہ تعالیٰ کیلئے اور اس کے ارادوں کی پیروی کیلئے اور اس کی خوشنودی کے حاصل کرنے کیلئے وقف کر دیوے اور پھر نیک کاموں پر خدا تعالیٰ کے لئے قائم ہو جائے اور اپنے وجود کی تمام عملی طاقتیں اُس کی راہ میں لگا دیوے مطلب یہ ہے کہ اعتقادی اور عملی طور پر محض خدا تعالیٰ کا ہو جاوے۔

"اعتقادی "طور پر اس طرح سے کہ اپنے تمام وجود کو درحقیقت ایک ایسی چیز سمجھ لے جو خدا تعالیٰ کی شناخت اور اس کی اطاعت اور اس کے عشق اور محبت اور اس کی رضا مندی حاصل کرنے کے لئے بنائی گئی ہے۔

اور ’’عملی ‘‘طور پر اس طرح سے کہ خالصاً لِلّٰہ حقیقی نیکیاں جو ہر ایک قوت سے متعلق اور ہریک خداداد توفیق سے وابستہ ہیں بجا لاوے مگر ایسے ذوق و شوق و حضور سے کہ گویا وہ اپنی فرمانبرداری کے آئینہ میں اپنے معبود حقیقی کے چہرہ کو دیکھ رہا ہے......

اب آیات ممدوحہ بالا پر ایک نظر غور ڈالنے سے ہر یک سلیم العقل سمجھ سکتا ہے کہ اسلام کی حقیقت تب کسی میں متحقّق ہوسکتی ہے کہ جب اس کا وجود معہ اپنے تمام باطنی و ظاہری قویٰ کے محض خدا تعالیٰ کیلئے اور اس کی راہ میں وقف ہوجاوے اور جو امانتیں اس کو خدا تعالیٰ کی طرف سے ملی ہیں پھر اسی مُعطی حقیقی کو واپس دی جائیں اور نہ صرف اعتقادی طور پر بلکہ عمل کے آئینہ میں بھی اپنے اسلام اور اس کی حقیقت کاملہ کی ساری شکل دکھلائی جاوے یعنی شخص مدعی اسلام یہ بات ثابت کر دیوے کہ اس کے ہاتھ اور پیر اور دل اور دماغ اور اس کی عقل اور اس کا فہم اور اس کا غضب اور اس کا رحم اور اس کا حلم اور اس کا علم اور اس کی تمام روحانی اور جسمانی قوتیں اور اس کی عزت اور اس کا مال اور اس کا آرام اور سرور اور جو کچھ اس کا سر کے بالوں سے پیروں کے ناخنوں تک باعتبار ظاہر و باطن کے ہے یہاں تک کہ اس کی نیّات اور اس کے دل کے خطرات اور اس کے نفس کے جذبات سب خدا تعالیٰ کے ایسے تابع ہوگئے ہیں کہ جیسے ایک شخص کے اعضاء اس شخص کے تابع ہوتے ہیں۔ غرض یہ ثابت ہوجائے کہ صدق قدم اِس درجہ تک پہنچ گیا ہے کہ جو کچھ اُس کا ہے وہ اُس کا نہیں بلکہ خدا تعالیٰ کا ہوگیا ہے اور تمام اعضاء اور قویٰ الٰہی خدمت میں ایسے لگ گئے ہیں کہ گویا وہ جوارح الحق ہیں۔

اور ان آیات پر غور کرنے سے یہ بات بھی صاف اور بدیہی طور پر ظاہر ہورہی ہے کہ خدا تعالیٰ کی راہ میں زندگی کا وقف کرنا جو حقیقت اسلام ہے دو قسم پر ہے ایک یہ کہ خدا تعالیٰ کو ہی اپنا معبود اور مقصود اور محبوب ٹھہرایا جاوے اور اس کی عبادت اور محبت اور خوف اور رجا میں کوئی دوسرا شریک باقی نہ رہے اور اس

کی تقدیس اور تسبیح اور عبادت اور تمام عبودیّت کے آداب اور احکام اور اوامر اور حدود اور آسمانی قضا و قدر کے امور بدل و جان قبول کئے جائیں اور نہایت نیستی اور تذلّل سے ان سب حکموں اور حدّوں اور قانونوں اور تقدیروں کو بارادت تام سر پر اٹھا لیا جاوے اور نیز وہ تمام پاک صداقتیں اور پاک معارف جو اس کی وسیع قدرتوں کی معرفت کا ذریعہ اور اس کی ملکوت اور سلطنت کے علو مرتبہ کو معلوم کرنے کے لئے ایک واسطہ اور اس کے آلاء اور نعماء کے پہچاننے کے لئے ایک قوی رہبر ہیں بخوبی معلوم کر لی جائیں ...“

(آئینہ کمالات اسلام۔ روحانی خزائن جلد 5 صفحہ 58 تا 60)

ابھی حضور نے یہ حوالہ یہیں تک ہی پڑھا تھا کہ مولوی غلام غوث ہزاروی صاحب کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ وہ سپیکر صاحب سے کہنے لگے:۔

”جنابِ صدر یہ محضر نامہ میں تین صفحے ہم پڑھ چکے ہیں۔ یہ تین صفحے سنانا تو بہت وقت لگے گا ... اسلام کی تعریف مرزا صاحب نے اپنا تقدس ظاہر کرنے کے لیے کی ہے۔“

پڑھنے والے اس بات کو خود ہی پرکھ سکتے ہیں کہ اس جواب کو شروع کرنے سے پہلے ہی حضرت خلیفة المسیح الثالثؒ نے یہ فرما دیا تھا کہ اس سوال کا جواب تو محضر نامہ میں آ چکا ہے لیکن چونکہ سوال دہرایا گیا ہے اس لئے میں اس کے جواب کو دہرانا چاہوں گا۔ سوال کرنے والوں کی حالت یہ تھی کہ ان کے پاس کرنے کو وہی گھسے پٹے سوالات تھے جنہیں وہ مسلسل دہرائے جا رہے تھے اور یہ سوال کتنے ہی عرصہ سے کئے جا رہے تھے۔ نیا سوال کوئی بھی نہیں تھا۔ لیکن جب جواب سنایا جاتا تھا تو وہ اُن سے برداشت نہیں ہوتا تھا۔ جب اس کے متعلق ایک بار پھر سوال کیا گیا کہ کیا یہ حوالہ محضر نامے میں ہے تو اس پر حضرت خلیفة المسیح الثالثؒ نے فرمایا کہ پہلے دن یہ تسلیم کیا گیا تھا کہ اگر سوال کو دہرایا جائے گا تو جواب بھی دہرایا جائے گا۔ اس کے بعد اس

حوالے پر سوالات کرتے ہوئے اٹارنی جنرل صاحب نے سوال کر کے جو بحث اُٹھائی وہ یہ تھی۔ پہلے انہوں اپنی طرف سے مزاح پیدا کرنے کی کوشش کی اور تبصرہ کیا کہ یہ مقام کون حاصل کر سکتا ہے؟ اس پر حضور نے نشاندہی فرمائی کہ امتِ مسلمہ کی تاریخ میں لاکھوں لوگ یہ مقام حاصل کر چکے ہیں اور اب بھی ایسے ہزاروں میں ہوں گے جنہوں نے یہ اعلیٰ روحانی مقام حاصل کیا ہے۔ اس کے بعد اٹارنی جنرل صاحب نے کہا کیا سب احمدی اس تعریف میں آ سکتے ہیں؟ اس پر حضور نے فرمایا:۔

”... نہیں آ سکتے۔ میں نے صاف کہہ دیا ہے نہیں آ سکتے۔“

اب حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے مندرجہ بالا حوالہ کے مطابق، جس میں حقیقی مسلمان کی یہ علامات لکھی گئی ہیں، یہ بات چل رہی تھی۔ اٹارنی جنرل صاحب نے سوال کیا کہ کیا غیر احمدیوں میں کوئی اس معیار کا حقیقی مسلمان ہے آپ کے عقیدے کے مطابق۔ اس پر حضور نے فرمایا:۔

”میرے عقیدے کے مطابق۔ ہاں یہ بڑا واضح ہے سوال۔ میرے عقیدے کے مطابق اس تعریف کے لحاظ سے میرے علم میں کوئی غیر مسلمان حقیقی مسلمان نہیں۔ غیر احمدی مسلمان ملتِ اسلامیہ سے تعلق رکھنے والا اس معیار کا کوئی نہیں۔“

یحییٰ بختیار صاحب نے کہا ”حقیقی کوئی نہیں؟

اس پر حضور نے وضاحت فرمائی ” اس معیار کا حقیقی مسلمان۔“ اور پھر فرمایا: اس حوالے سے جو لکھا ہے۔

اس پر اٹارنی جنرل صاحب نے سپیکر صاحب سے وقفہ کے لیے درخواست کی اور سپیکر صاحب نے وقفہ کا اعلان کیا۔

ہم ذرا تفصیل سے اس سوال اور اس جواب کا جائزہ لیں گے۔ کیونکہ بہت سے اسمبلی ممبران نے بار بار یہ دعویٰ کیا ہے کہ جب حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ سے یہ سوال پوچھا گیا کہ آپ غیر احمدیوں کو کیا سمجھتے ہیں تو انہوں نے کہا کہ ہم انہیں مسلمان نہیں سمجھتے، کافر سمجھتے ہیں، جہنمی سمجھتے ہیں اور جب انہوں نے یہ کہہ دیا تو ہم مجبور ہو گئے کہ انہیں بھی کافر کہیں۔ یہ بات یا اس سے ملتی جلتی بات تو پوری کارروائی میں شروع سے لے کر آخر تک ،الف سے لے کر ی تک نہیں پائی جاتی۔ ہم پہلے اس بات کی بہت سی مثالیں درج کر چکے ہیں کہ جب بھی یہ سوال حضور سے پوچھا گیا ، حضور نے جواب دیا کہ غیر احمدی مسلمان ،ہمارے نزدیک مسلمان اور ملتِ اسلامیہ کا فرد رہتے ہیں۔ بلکہ سوالات کرنے والے نامکمل حوالے اور جزوی تصویر سامنے رکھ کر کئی دن یہ کوشش کرتے رہے تھے کہ حضور ایسی کوئی بات فرمائیں جو موجبِ اعتراض ہو۔ ہر ممبر کو کارروائی کی کاپی ملتی تھی کہ وہ اپنی تسلی کر سکتا ہے بلکہ حکومت کے پاس تو اس کارروائی کا آڈیو ریکارڈ بھی ہونا چاہئے۔ یہ ممبران تو حکومت سے مطالبہ بھی کر سکتے ہیں کہ اس آڈیو ریکارڈ کو منظرِ عام پر لایا جائے۔ ہاں یہ مندرجہ بالا حصہ دس اگست 1974ء کی کارروائی میں ہے۔ اور اسی کو موڑ توڑ کر یہ بیچارے ممبران اپنے اس فیصلے کا جواز پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ پیشتر اس کے کہ ان میں سے کچھ اہم ممبران اسمبلی کے بیانات درج کریں ،پڑھنے والا اس سوال اور حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ کے اس جواب میں یہ باتیں تو واضح طور پر دیکھ سکتا ہے۔

(ا) سوال یہ تھا ہی نہیں کہ آپ غیر احمدیوں کو مسلمان سمجھتے ہیں کہ نہیں؟ سوال یہ تھا کہ اگر حقیقی مسلمان کی تعریف یہ ہے کہ وہ شخص جو اپنی تمام خواہشوں، ارادوں ، عملی اور ایمانی قوتوں کو خدا کے لئے وقف کر دے یہاں تک کہ وہ خدا تعالیٰ کا ہو جائے۔ اور وہ تمام پاک صداقتیں اور پاک معارف جو اس کی سلطنت کے علو مرتبہ کو معلوم کرنے کے لئے ضروری ہیں بخوبی معلوم کر لے۔ وہ خدا تعالیٰ کے لئے اور اس کی مخلوق کی خدمت کے لئے اپنی زندگی وقف رکھتا ہو اور اپنے تمام وجود کو حوالہ بخدا کر دے۔ اس کے تمام جذبات مٹ

جائیں۔ وہ خدا کی خاطر ہر بے عزتی کو قبول کرنے کے لئے مستعد ہو اور ہزاروں موتوں کو قبول کرنے کے لئے تیار ہو اور سب نفسانی تعلقات توڑ دے تو یہ مقام کن کو حاصل ہو سکتا ہے۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ سوال کرنے والے کو عقل کا استعمال کر کے یہ سوچنا چاہئے کہ اگر خدا کی طرف سے ایک مامور آئے اور ایک شخص یا ایک طبقہ اس مامور کا انکار کر دے بلکہ اس کی تکذیب کرے اور پھر بھی اگر وہ ان مدارجِ عالیہ کو حاصل کر سکتا ہے تو یہ سوال اُٹھتا ہے کہ اس مامور کی بعثت کا مقصد کیا رہ جاتا ہے۔ اس سے خدا کے فعل پر اعتراض وارد ہوتا ہے کہ اس نے مامور کیوں مبعوث کیا؟ جب کہ اس کے بغیر ہی تمام مدارج حاصل کئے جا سکتے تھے۔ اور اس تعریف میں یہ بھی درج تھا کہ ایسا شخص خدا کے سب حکموں کو تسلیم کرتا ہو۔ اگر ایک شخص خدا کے ایک مامور کا انکار اور تکذیب کر رہا ہے تو وہ ان لوگوں کے نزدیک اس تعریف کے تحت کس طرح آ سکتا ہے جو اس مامور من اللہ کو برحق سمجھتے ہیں۔

(2) جب حضورؒ سے یحيٰی بختیار صاحب نے سوال کیا کہ کیا تمام احمدی اس تعریف کے مطابق حقیقی مسلمان ہیں تو حضورؒ نے اس کا جواب نفی میں دیا۔ اس تعریف کی رو سے تو حضورؒ نے تمام احمدیوں کو بھی اس مقام کا حامل قرار نہیں دیا۔ ظاہر ہے کہ حضورؒ کسی احمدی کو کافر قرار نہیں دے سکتے۔ غیر احمدیوں کے بارے میں بھی یہ بات اسی تناظر میں دیکھنی چاہئے۔

(3) حضور کا جو جواب ہے اس میں کہیں بھی غیر احمدیوں کو کافر یا غیر مسلم نہیں کہا گیا۔ بلکہ الفاظ تو یہ تھے ”غیر احمدی مسلمان ملتِ اسلامیہ سے تعلق رکھنے والا اس معیار کا کوئی نہیں“ اس میں ہر گز کافر نہیں کہا گیا بلکہ اس میں تو واضح طور پر یہ کہا گیا ہے کہ غیر احمدی مسلمان بھی ملتِ اسلامیہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس جملہ میں ہی کئے جانے والے اعتراض کا کافی جواب موجود ہے۔ البتہ حضورؒ نے یہ فرمایا تھا یہ معیار جو بیان کیا جا رہا

ہے ،اس معیار کا کوئی غیر احمدی میرے علم میں نہیں ہے۔ اور اس معیار کا ذکر پہلے ہم کر چکے ہیں کہ ایسے شخص میں اسلام کی حقیقی روح پیدا ہو گی جب یہ شخص خدا کی راہ میں اپنا تمام وجود سونپ دے اوراپنے تمام وجود کو خدا کی راہ میں سونپ دے۔ اور اس کے تمام اعضاء ا ور نیّات خدا کے لئے ہوجائیں۔ اور وہ نیستی کے ساتھ خدا کے تمام احکام دل و جان سے قبول کرے۔ اس کے بندوں کی خدمت اور ہمدردی اور چارہ جوئی کے لئے اپنی زندگی وقف کر دے اور دوسروں کو راحت پہنچانے کے لئے خود دکھ گوارا کر لے۔ اور وہ اپنا تمام وجود مع اپنی تمام خواہشوں اور قوتوں کے حوالہ بخدا کر دے اوراس کے تمام جذبات مٹ جائیں وہ خدا کے جلال کو ظاہر کرنے کے لئے ہر بے عزتی اور ذلت کو برداشت کرنے کے لئے مستعد ہو۔ اس درجہ کا فرمانبردار ہو کہ خدا کے لئے اس کا ایک ہاتھ دوسرے ہاتھ کو کاٹ سکے۔ اور اس سے تعلق کا ثبوت دینے کے لئے اپنے تمام نفسانی تعلقات توڑ لے۔

یہ تھا معیار جس کا ذکر کیا جا رہا تھا۔ اور ظاہر ہے کہ اگر ایک فرقہ کے نزدیک اللہ تعالیٰ نے ایک مامور مبعوث کیا ہے تو اس کے انکار بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہو گا کہ اس کی تکفیر کے بعد بھی کیا کوئی یہ اعلیٰ مرتبہ پا سکتا ہے جس کا مذکورہ بالا حوالہ میں ذکر ہے تو پھر اس سے خدا کے فعل پر اعتراض اُٹھتا ہے کہ آخر اس مامور کی بعثت کی ضرورت کیا تھی جبکہ اس کے بغیر بلکہ اس کی تکفیر کرنے کے بعد بھی تمام اعلیٰ مراتب حاصل کئے جا سکتے ہیں۔ اور حضور نے اپنے جواب میں فرمایا تھا کہ ملتِ اسلامیہ سے تعلق رکھنے والے غیر احمدیوں میں سے میرے علم کے مطابق اس معیار کا کوئی نہیں ہے۔ غیر احمدی مسلمانوں کو کافر کہنے کا کوئی ذکر ہی نہیں تھا بلکہ ان کو ملتِ اسلامیہ سے تعلق رکھنے والا کہا گیا تھا۔ ان کو مسلمان کہا گیا تھا۔

مخالفین جماعت کی طرف سے بھی قومی اسمبلی کی تحریف شدہ کارروائی شائع کی گئی ہے۔ یہ شائع شدہ کارروائی بہت مختصر ہے۔ چونکہ اکثر حصہ کو مولوی حضرات شائع کرنے کی ہمت ہی نہیں کر سکتے تھے۔ مگر جو

حصہ شائع بھی کیا گیا ہے اس میں جگہ جگہ تحریف کی گئی ہے۔ مندرجہ بالا حصہ شائع کرتے ہوئے ان مولوی حضرات نے اپنی طرف سے یہ ہوشیاری کی ہے کہ آئینہ کمالاتِ اسلام کے حوالے کا وہ حصہ نہیں شائع کیا جو حضور نے اس وقت پڑھا تھا۔ لیکن یہ جملہ اس تحریف شدہ اشاعت میں بھی اس طرح لکھا گیا ہے:۔

”میرے عقیدے کے مطابق اس لحاظ سے کوئی غیر احمدی ملتِ اسلامیہ سے تعلق رکھنے والا اس معیار کا نہیں۔“

(تاریخی قومی دستاویز 1974ء۔ ترتیب و تدوین اللہ وسایا۔ ناشر عالمی مجلسِ ختم نبوت ۔ حضوری باغ روڈ ملتان۔ جنوری 1997ء ص153)

اگر چہ جیسا کہ اصل سے موازنہ ظاہر کرتا ہے کہ اس جملہ میں بھی تحریف کی گئی ہے اور سب سے اہم بات یہ کہ ”اس معیار“ کی جو تعریف بیان کی گئی تھی وہ درج نہیں کی لیکن پھر بھی یہ تحریف شدہ جملہ اس بات کو بالکل واضح کردیتا ہے کہ اس جملہ میں غیر احمدی مسلمانوں کو ملتِ اسلامیہ سے تعلق رکھنے والا بیان کیا گیا تھا، غیر مسلم ہر گز نہیں کہا گیا تھا۔

اور اللہ وسایا صاحب نے ایک اور کتاب تحریکِ ختمِ نبوت بھی لکھی ہے۔ اس کے حصہ سوئم میں اٹارنی جنرل یحییٰ بختیار صاحب کا ایک انٹرویو بھی شائع کیا گیا ہے۔ اس میں یحییٰ بختیار صاحب خود کہتے ہیں کہ مرزا صاحب نے حقیقی مسلمان کی لمبی تعریف بیان کی جو کہ گیارہ بارہ صفحات کی تھی اور پھر یہ بات کہی کہ کوئی غیر احمدی حقیقی مسلمان نہیں ہو سکتا۔ اس انٹرویو میں بھی یحییٰ بختیار صاحب نے اپنے نام نہاد کارناموں کا بہت ذکر کیا ہے اور ان کے انٹرویو میں بہت سی غلط بیانیاں بھی ہیں لیکن سوال یہ اُٹھتا ہے کہ وہ تو یہ کہہ رہے تھے کہ حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ نے حقیقی مسلمان کی نہایت طویل تعریف بیان کی تھی۔ اس کا ذکر تو اللہ وسایا صاحب کی شائع کی گئی کارروائی میں موجود نہیں۔ اللہ وسایا صاحب نے تو جو کارروائی شائع کی ہے اس میں تو اس کا نام و

نشان نہیں ملتا۔ خود انہی کی ایک اور کتاب یہ ثابت کر رہی ہے کہ اللہ وسایا صاحب نے تحریف شدہ کارروائی شائع کی تھی۔ اور پھر حضور کا جملہ صرف یہ تھا کہ میرے علم میں کوئی غیر احمدی اس معیار کا نہیں ہے اور کیا معیار پیشِ نظر تھا اس کا ذکر ہم کر چکے ہیں۔ (تحریکِ ختم نبوت، جلد سوئم، مصنفہ اللہ وسایا، ناشر عالمی مجلسِ ختمِ نبوت ملتان ص847)

ایک اور امر قابلِ ذکر ہے کہ یحییٰ بختیار صاحب کے انٹرویو میں بھی حقیقی مسلمان کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں، مسلمان کے نہیں۔

اب ہم دیکھتے ہیں کہ گزشتہ پچیس سال سے پاکستان کی قومی اسمبلی کے اہم ممبران کارروائی کے اس حصہ کے متعلق کیا پُر مغز نکات بیان فرما رہے ہیں۔ ہم ذکر کر چکے ہیں کہ دوسری طرف کا نقطہ نظر معلوم کرنے کے لئے ہم نے بعض ایسی اہم شخصیات کا انٹرویو بھی کیا جو اس موقع پر موجود تھیں اور انہوں نے بھی کارروائی کے اس مرحلہ کے متعلق کچھ نہ کچھ بیان فرمایا۔ یہ اس لئے ضروری تھا کہ ہم ان معزز اراکینِ اسمبلی سے براہِ راست مل کر اس کے متعلق ان کی رائے ریکارڈ کر لیں تاکہ کوئی واسطہ بیچ میں نہ ہو۔

ڈاکٹر مبشر حسن صاحب بیان کرتے ہیں کہ وہ اس وقت قومی اسمبلی میں موجود تھے۔ ڈاکٹر صاحب پیپلز پارٹی کے بانی اراکین میں سے ہیں۔ اس وقت کابینہ کے ایک اہم رکن تھے۔ بعد میں وہ پیپلز پارٹی کے سیکریٹری جنرل بھی رہے۔ انہوں نے ہم سے انٹرویو کے دوران جو بیان کیا وہ ہم لفظ بلفظ نقل کر دیتے ہیں۔ ڈاکٹر مبشر حسن صاحب فرماتے ہیں:۔

مبشر حسن صاحب: ''... لیکن وہ جو ریزولیشن تھا ایک اور بات جو ہے وہ مجھے اس کا بڑا قلق ہے۔ اور اس ریزولیشن کے پاس ہونے میں اس بات نے بہت کردار ادا کیا۔ وہ یہ ہے کہ آپ کو علم ہے کہ مسٹر بھٹو نے کہا

تھا کہ میں ایسا Solution دوں گا اور خاموش ہو جاؤ۔ انہوں نے پارلیمنٹ کی ایک House meeting in private sitting، پرائیویٹ سٹنگ private sitting اسے کہتے ہیں جہاں جو پارلیمنٹ کا ممبر نہ ہو اسے بھی بلایا جا سکے۔ اور وہاں پر ناصر احمد صاحب اور طاہر احمد صاحب گئے۔ یحیٰی بختیار صاحب نے ان سے سوالات کئے۔ ایک سوال کے جواب میں یحیٰی بختیار نے ان سے پوچھا کہ کیا آپ جو احمدی نہیں ہیں مسلمان، انہیں مسلمان سمجھتے ہیں تو انہوں نے جواب دیا کہ نہیں۔“

سلطان: آپ اس موقع پر موجود تھے؟

مبشر حسن صاحب: ”میں موجود تھا۔ اُس فقرے پر جب یہ فقرہ انہوں نے کہا کہ ہم باقیوں کو مسلمان نہیں سمجھتے۔ تو سارے ہاؤس میں او او او۔ اس طرح کی آوازیں بلند ہوئیں۔ اچھا جی اے سانوں مسلمان نہیں سمجھدے۔ That turned the vote (اس چیز نے ووٹ کو تبدیل کر دیا۔)“

جوبات ڈاکٹر صاحب نے بیان فرمائی ہے وہ پوری کارروائی میں نہیں پائی جاتی۔ جو جواب ہم نے لفظ بلفظ نقل کر دیا ہے اس جملہ میں تو اس الزام کی تردید پائی جاتی ہے۔ اس میں تو غیر احمدیوں کو ملّتِ اسلامیہ سے تعلق رکھنے والا بیان کیا گیا۔

اور جب ہم نے قومی اسمبلی کے سپیکر صاحبزادہ فاروق علی خان صاحب سے انٹرویو کیا تو ان کا کہنا یہ تھا کہ اٹارنی جنرل صاحب نے یہ سوال پوچھا تھا کہ آپ بھی مسلمان ہیں ہم بھی مسلمان ہیں۔ آپ بھی اللہ اور رسول کو مانتے ہیں۔ ہم بھی اللہ اور رسول کو مانتے ہیں لیکن یہ بتائیں آپ کہ آپ اپنے آپ کو راسخ العقیدہ مسلمان سمجھتے ہیں اور باقی جو مسلمان ہیں آپ ان کو بھی راسخ العقیدہ مسلمان سمجھتے ہیں کہ نہیں؟ صاحبزادہ

فاروق علی خان صاحب نے کہا کہ اس کے جواب میں حضور نے فرمایا کہ ہم باقیوں کو مسلمان سمجھتے ہیں مسلمان جانتے ہیں لیکن راسخ العقیدہ مسلمان نہیں سمجھتے۔

یہاں ہم یہ بات سمجھنے سے قاصر ہیں کہ اگر ایک فرقہ اپنے عقائد کو صحیح سمجھ رہا ہو تو وہ اس کے خلاف عقائد رکھنے والے فرقہ کو راسخ العقیدہ کیسے کہہ سکتا ہے۔ اگر کسی بھی فرقہ سے پوچھا جائے تو یہی کہے گا کہ ہمارے نزدیک ہم راسخ العقیدہ ہیں اور دوسرے نہیں ہیں لیکن اس کارروائی میں اٹارنی جنرل صاحب نے اس قسم کا کوئی بھی اظہار نہیں کیا تھا کہ آپ بھی مسلمان ہیں اور ہم بھی مسلمان ہیں۔

پھر ہم نے پروفیسر غفوراحمد صاحب سے ملاقات کی اور ان کا انٹرویو لیا۔ جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ پروفیسر غفور صاحب اس وقت قومی اسمبلی میں جماعتِ اسلامی کے پارلیمانی لیڈر تھے اور جماعتِ اسلامی کے سیکریٹری جنرل بھی تھے۔ اور انہوں نے ہمارے سوال کئے بغیر خود ہی اس جواب کا ذکر کیا اور ان کے نزدیک بھی اصل بات یہی تھی کہ اسمبلی نے احمدیوں کو غیر مسلم نہیں کہا تھا بلکہ احمدیوں نے غیر احمدیوں کو غیر مسلم قرار دیا تھا۔ پہلے تو یہ واقعہ بیان کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ جماعتِ احمدیہ کی طرف سے بشیرالدین صاحب آئے تھے لیکن اس پر ہم نے انہیں یاد دلایا کہ حضرت خلیفۃ المسیح الثانی نہیں بلکہ حضرت مرزا ناصر احمد صاحب قومی اسمبلی میں جماعت کے وفد کی قیادت کر رہے تھے۔ پھرپروفیسر غفور صاحب نے کہا کہ جماعتِ احمدیہ مبائعین کی طرف سے حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ اور غیر مبائعین کی طرف سے ان کا وفد قومی اسمبلی میں پیش ہوئے تو انٹرویو میں اس سوال کے بارے میں پروفیسر غفور صاحب کے معیّن الفاظ یہ تھے:۔

”جی مرزا ناصر احمد صاحب اور لاہوری فرقہ کے لوگ بھی آئے تھے۔ اور دونوں کے ساتھ گفتگو ہوئی تھی اور گفتگو اس طرح ہوئی تھی یحییٰ بختیار کے Through... پھر یہ بات بھی کہی کہ مرزا غلام احمد کو جو نہیں مانتا وہ

مسلمان نہیں اور دونوں نے یہ کہا کہ وہ جہنم میں جائے جائیں گے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے ان کو جہنم سے نکال دے۔ لیکن وہ جہنمی ہیں۔ یہ بات نہیں ہے کہ ہم کافر کہہ رہے ہیں قادیانیوں کو۔ اصل بات یہ ہے کہ وہ سارے مسلمانوں کو کافر کہہ رہے ہیں۔ ہر وہ آدمی جو مرزا غلام احمد پر ایمان نہیں لاتا وہ ان کے نزدیک کافر ہے۔ اور وہ جہنمی ہے اور یہی بات دونوں نے کہی۔"

پڑھنے والے خود دیکھ سکتے ہیں کہ جماعت کے وفد نے تو غیر احمدیوں کو مسلمان کہا تھا اور اس بات کو اس وقت اسمبلی کے سپیکر صاحبزادہ فاروق علی خان صاحب بھی تسلیم کرتے ہیں اور پروفیسر غفور صاحب نے بالکل خلافِ واقعہ جواب منسوب کیا ہے۔ بلکہ ڈاکٹر مبشر حسن صاحب کے جواب میں کچھ اضافہ جات بھی کئے ہیں یعنی دونوں وفود نے یہ کہا کہ ہم غیر احمدیوں کو نہ صرف غیر مسلم بلکہ جہنمی بھی سمجھتے ہیں۔ یہ جواب نہ جماعت ِ احمدیہ مبایعین کے وفد نے دیا تھا اور نہ ہی غیر مبایعین کے وفد نے یہ جواب دیا تھا۔ اس کا پوری کارروائی میں کوئی ذکر نہیں بلکہ اس کے بالکل برعکس جواب دیا گیا تھا۔ جس میں نہ کسی کے جہنم میں جانے کا ذکر تھا اور نہ کسی کے جہنم سے باہر آنے کا ذکر تھا۔ یہاں پر مجھے ایک لطیفہ یاد آگیا کہ ایک بچے نے جب اپنی کوئی خواب گھر میں بیان کرنی ہوتی تھی تو یہ کہنے کی بجائے کہ میں نے یہ خواب دیکھی یہ کہتا تھا کہ میں نے ایک خواب سوچی۔ تو ان ممبرانِ اسمبلی نے یہ جواب سنے نہیں تھے بلکہ سوچے تھے۔

اس پر ہم نے ان کی خدمت میں پھر عرض کی کہ میں نے یہ کارروائی پڑھی ہے۔ یہ سوال تو کئی دن چلا تھا۔ اور اصل میں تو سوال کچھ اور تھا۔ جب اتنا اختلاف ہے تو پھر کیا اس کارروائی کو ظاہر کر دینا مناسب نہ ہو گا۔ اس پر انہوں نے جواب دیا کہ آپ مطالبہ کریں ہم اس مطالبہ کی حمایت کریں گے۔ اس پر ہم نے اپنے سوال کی طرف واپس آتے ہوئے کہا کہ میں نے یہ بات پہلے بھی پڑھی تھی۔ لیکن جب کارروائی پڑھی تو اس میں یہ بات as such نہیں تھی۔ اس پر پروفیسر غفور صاحب نے فرمایا

”کارروائی پڑھ کہاں سے لی آپ نے۔ مجھے اس بات پر حیرت ہے۔ مجھے available نہیں۔ میں ممبر رہا ہوں قومی اسمبلی کا۔ سینٹ کا۔“

اس پر ہم نے انہیں یاد دلایا کہ جماعتِ احمدیہ کے مخالفین نے تو اس کو شائع بھی کر دیا ہے۔ (اگرچہ مخالفین نے یہ کارروائی مسخ کر کے اور تبدیل کر کے شائع کی ہے اور ہماری تحقیق کا ماخذ یہ تحریف شدہ اشاعت نہیں تھی۔)

اس پر پروفیسر غفور صاحب نے فرمایا کہ شائع کی ہو گی پر وہ Authentic نہیں ہے۔ اس پر ہم نے پھر سوال دہرایا کہ کیا آپ کے نزدیک مخالفین نے جو اشاعت کی ہے وہ Authentic نہیں ہے۔ اس پر انہوں نے اپنے اسی موقف کا اعادہ کیا۔

بہت سے سیاستدانوں کی طرف سے جماعت کی طرف جو جواب منسوب کیا گیا اس کے متعلق فیض کے الفاظ میں یہی کہا جا سکتا ہے

وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا

وہ بات ان کو بہت ناگوار گزری ہے

اور یہ بھی مدِ نظر رہنا چاہئے کہ یہ پہلی مرتبہ نہیں تھا کہ خلیفہ وقت سے ایسا سوال کیا گیا ہو اور امامِ جماعت احمدیہ نے مذکورہ جواب دیا ہو۔ جب 1953ء کے فسادات کے بعد تحقیقاتی عدالت قائم ہوئی اور اس نے کارروائی شروع کی تو 13/ جنوری 1954ء کی کارروائی میں تحقیقاتی عدالت کی کارروائی میں حضرت خلیفة المسیح الثانی سے سوال کیا گیا:

”اگر کوئی شخص مرزا غلام احمد صاحب کے دعاوی پر واجبی غور کرنے کے بعد دیانتداری سے اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ آپ کا دعویٰ غلط تھا تو کیا پھر بھی وہ مسلمان رہے گا؟“

اس پر حضرت خلیفۃ المسیح الثانی نے فرمایا۔

”جی ہاں عام اصطلاح میں وہ پھر بھی مسلمان سمجھا جائے گا۔“

پھر 14 / جنوری کی کارروائی میں یہ سوال ایک اور رنگ میں کیا گیا۔ تحقیقاتی عدالت جو کیانی اور منیر پر مشتمل تھی ،نے دریافت کیا۔

”کیا ایک سچے نبی کا انکار کفر نہیں؟“

مقصد یہ تھا کہ جب آپ لوگ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کو سچا نبی سمجھتے ہیں تو پھر کیا ان کا انکار کرنے والوں کا کفر کہیں گے؟

اس کے جواب میں حضور نے فرمایا:۔

”ہاں یہ کفر ہے۔ لیکن کفر دو قسم کا ہوتا ہے۔ ایک وہ جس سے کوئی ملت سے خارج ہو جاتا ہے۔ دوسرا وہ جس سے وہ ملت سے خارج نہیں ہوتا۔ کلمہ طیبہ کا انکار پہلی قسم کا کفر ہے۔ دوسری قسم کا کفر اس سے کم درجہ کی بدعقیدیوں سے پیدا ہوتا ہے۔“

اور ہم پہلے ہی یہ بیان کر چکے ہیں کہ احادیث میں اپنے باپ کے علاوہ کسی اور کی طرف اپنے آپ کو منسوب کرنے والے اور اپنے باپ سے بیزار ہونے والے ،نسب پر طعن کرنے والے، میّت پر چلّا کر رونے

والے، ترک نماز کرنے والے اور اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی اور کی قسم کھانے والے کو کافر اور ان کے اعمال کو کفر کہا گیا ہے لیکن یہ اس قسم کا کفر ہے جس سے ایک شخص ملّت سے خارج نہیں ہوتا۔

اور اس کے بعد مولوی حضرات نے بھی حضرت خلیفۃ المسیح الثانی سے اسی قسم کے سوالات کئے تھے اور حضور نے مذکورہ بالا اصول کی بنیاد پر ہی ان کے جوابات دیئے تھے۔

اور اس بات پر پروفیسر غفوراحمد صاحب کو تو بالکل اعتراض نہیں ہونا چاہئے تھا کیونکہ خود ان کی جماعت کے بانی اور ان کے قائد مودودی صاحب نے تو اس بات پر بہت برہمگی کا اظہار کیا تھا کہ مسلم لیگ ہر آدمی کو جو اپنے آپ کو مسلمان کہے اپنی جماعت کا رکن بنا لیتی ہے۔ ان کے نزدیک ہر مسلمان کو حقیقی مسلمان سمجھ لینا بڑی بنیادی غلطی تھی۔ چنانچہ وہ اپنی کتاب مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصہ سوئم میں لکھتے ہیں۔

”ایک قوم کے تمام افراد کو محض اس وجہ سے کہ وہ نسلاً مسلمان ہیں حقیقی معنی میں مسلمان فرض کر لینا اور یہ امید رکھنا کہ ان کے اجتماع سے جو کام بھی ہو گا اسلامی اصول پر ہو گا پہلی اوربنیادی غلطی ہے۔ یہ انبوہِ عظیم جس کو مسلمان قوم کہا جاتا ہے اس کا حال یہ ہے کہ اس کے 999 فی ہزار افراد نہ اسلام کا علم رکھتے ہیں، نہ حق اور باطل کی تمیز سے آشنا ہیں، نہ ان کا اخلاقی نقطہ نظر اور ذہنی رویہ اسلام کے مطابق تبدیل ہوا ہے۔ باپ سے بیٹے اور بیٹے سے پوتے کو بس اسلام کا نام ملتا چلا آرہا ہے اس لیے یہ مسلمان ہیں۔“

(مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصہ سوئم مصنفہ ابولاعلیٰ مودودی، ناشر دفتر ترجمان القرآن۔ درالاسلام۔ جماپور ۔ متصل پٹھانکوٹ۔ بار سوئم دو ہزار)

تو یہ بات واضح ہے کہ مودودی صاحب کے نزدیک ایک ہزار میں سے 999 مسلمان کہلانے والے حقیقی مسلمان نہیں تھے۔

یہاں یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ یحییٰ بختیار صاحب نے کہا کہ حضور نے فرمایا کہ ہم دوسرے فرقوں کو حقیقی مسلمان نہیں سمجھتے۔ مبشر حسن صاحب نے کہا کہ یہ کہا گیا کہ ہم غیر احمدیوں کو مسلمان نہیں سمجھتے۔ صاحبزادہ فاروق علی خان صاحب نے کہا کہ یہ کہا گیا کہ ہم باقی مسلمانوں کو مسلمان سمجھتے ہیں لیکن راسخ العقیدہ نہیں سمجھتے۔ پروفیسر غفور احمد صاحب نے کہا کہ یہ کہا تھا کہ ہم غیر احمدیوں کو کافر اور دوزخی سمجھتے ہیں۔ ان سب حضرات کا باہمی اختلاف بہت واضح ہے اور ایک کا بیان دوسرے کے بیان کو غلط ثابت کر رہا ہے۔ اور حقیقت کیا تھی وہ ہم بیان کر چکے ہیں۔

اور یہ بات تو مختلف اسلامی فرقوں کے لٹریچر میں عام ہے کہ صحیح اور حقیقی مسلمان صرف ہمارا ہی فرقہ ہے۔ جیسا کہ کتاب کَشْفُ الْبَارِیْ عَمَّا فِیْ صَحِیْحِ الْبُخَارِیْ میں لکھا ہے

”فِرَقِ اسلامیہ ان کو کہتے ہیں جو مسلمان ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں اور اپنے آپ کو اسلام سے منسوب کرتے ہیں خواہ گمراہ ہوں یا صحیح راستے پر ہوں، معتزلہ، خوارج، مرجئہ، کرامیہ، جہمیہ وغیرہ سب کے سب علی التشکیک فِرَقِ ضالّہ ہیں، صحیح اسلامی فرقہ ”اہل السنۃ والجماعۃ“ ہے جو ”وَمَا اَنَا عَلَیْہِ وَ اَصْحَابِیْ“ کے مطابق ہے، یہ لقب بھی اسی ارشادِ نبوی سے ماخوذ ہے۔“

(کشف الباری عما فی صحیح البخاری جلد اول، افادات شیخ الحدیث مولانا سلیم اللہ خان مہتمم جامعہ فاروقیہ کراچی، ناشر مکتبہ فاروقیہ، شاہ فیصل کالونی کراچی ص558)

اس کے بعد چائے کا وقفہ ہوا اور جب سوا بارہ بجے دوبارہ اجلاس شروع ہوا اور ابھی جماعت کا وفد ہال میں نہیں آیا تھا کہ سپیکر صاحب نے ممبران اسمبلی کو مخاطب کر کے ایک نیا انکشاف کیا۔ ان کے الفاظ یہ تھے:۔

I will just draw the attention of the honourable memebers that we have decided certain things about the programme. I want to tell to the honourble members that the attorney general needs a week to prepare what he has done in six days. It takes at least a week for preperation. We also need a week for the preperation of our record .Only then we can supply to the honourable memebers the copies of the record .Without which we cannot proceed further .....So today will be the last day. Rather this meeting will be the last for the cross examination. But the cross examination will continue. The date will be fixed and will be announced.

یعنی اٹارنی جنرل صاحب فرما رہے تھے کہ ہم نے ابھی یہ فیصلہ کیا ہے کہ اب ان اجلاسات کو تقریباً ایک ہفتہ کے لیے ملتوی کر دیا جائے کیونکہ اٹارنی جنرل صاحب نے جو کچھ ان چھ دنوں میں کیا ہے اس کے پیشِ نظر وہ تیاری کر سکیں۔ اور ریکارڈ تیار کیا جا سکے تا کہ مزید پیش رفت ہو سکے۔ آج اس کارروائی کا آ خری دن ہو گا اور یہ اجلاس آخری اجلاس ہو گا۔ نئ تاریخ کا اعلان بعد میں کر دیا جائے گا۔ اور سوالات کا سلسلہ جاری رہے گا۔

اب اس مرحلہ پر ہم اس حیران کن پیش رفت کا جائزہ لیتے ہیں۔ اسمبلی نے سٹیرنگ کمیٹی قائم کی تھی اور اس کمیٹی کا لائحہ عمل بھی طے کیا تھا۔ باوجود جماعت کے مطالبہ کے جماعت کو مطلع نہیں کیا گیا تھا کہ کیا سوال کیے جائیں گے۔ اور ظاہر ہے کہ اٹارنی جنرل صاحب کے علم میں تھا کہ وہ کیا سوالات پوچھیں گے اور چھ روز سے مسلسل سوالات کا سلسلہ جاری تھا ابھی اس موضوع پر سوالات شروع بھی نہیں ہوئے تھے جن پر تحقیق کرنے کے لیے پوری اسمبلی پر مشتمل کمیٹی قائم کی گئی تھی اور اٹارنی جنرل صاحب یہ فرما رہے تھے کہ انہیں

مزید تیاری کے لیے چھ دن درکار ہیں۔ یہ سوال اُٹھتا ہے کہ اس معرکۃ الآراء حکومت کے اٹارنی جنرل صاحب اور ان کی اعانت کرنے والے علماء نے متعلقہ موضوع پر کیا ایک بھی سوال نہیں تیار کیا تھا کہ متعلقہ معاملہ پر سوال کئے بغیر ہی ان کا مواد ختم ہو گیا۔ حالانکہ انہیں تیاری کے لیے خاطر خواہ وقت پہلے ہی مل چکا تھا۔ اور یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ یہ قدم اتنا اچانک کیوں اُٹھایا گیا۔ نہ جماعت کے وفد نے درخواست کی کہ ہمیں تیاری کے لیے کوئی وقت درکار ہے نہ ممبرانِ اسمبلی کو پہلے کوئی عندیہ دیا گیا کہ یہ کارروائی کچھ دنوں کے لئے معطل ہونے والی ہے اور چائے کا وقفہ ہوا اور پھر یہ اعلان کر دیا گیا کہ اب کچھ دنوں کا وقفہ کیا جاتا ہے اور پہلے سے یہ وقفہ پروگرام میں شامل نہیں تھا۔ اور یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ اس سے پہلے جو چائے کا وقفہ ہوا تھا وہ اٹارنی جنرل صاحب کی درخواست پر کیا گیا تھا۔

غیر متعلقہ ہی سہی جو سوالات کئے گئے تھے وہ کوئی نئے سوالات نہیں تھے۔ کوئی جماعت کے جوابات سے اتفاق کرے یا نہ کرے یہ بالکل علیحدہ بات ہے لیکن یہ سوالات گزشتہ اسی نوے سال سے کئے جا رہے تھے اور جماعت کے مخالفین کا لٹریچر ان سوالات سے بھرا ہوا تھا اور جماعت کا لٹریچر ان کے جوابات سے بھرا ہوا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر کسی طالب علم کو جماعت کی اور جماعت کے مخالفین کی چند کتابیں ایک دن کے لیے دے دی جائیں تو وہ ان سے بہتر سوالات تیار کر سکتا ہے۔

اس پس منظر میں یہی نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ یہ کارروائی مخالفین کی امیدوں کے مطابق نہیں جا رہی تھی اور وہ خود اپنی کارکردگی سے مطمئن نہیں تھے۔ اب جبکہ وہ اپنے سوالات کا نتیجہ دیکھ چکے تھے انہیں اب مزید تیاری کے لئے کچھ وقت کی اشد ضرورت تھی۔

اور جب وقفہ کے بعد سوا بارہ بجے کارروائی کا دوبارہ آغاز ہوا تو اٹارنی جنرل صاحب کے سوالات کے آغاز ہی سے یہ بات واضح ہو گئی کہ واقعی انہیں اور ان کے معاونین کو کچھ وقفہ کی ضرورت تھی۔ وہ اعتراض یہ اُٹھا رہے تھے کہ احمدیوں نے ہمیشہ خود کو مسلمانوں سے علیحدہ رکھا ہے اور اس کی دلیل یہ پیش کر رہے تھے کہ ہر مذہب کے لوگوں نے اپنا علیحدہ کیلنڈر بنایا ہے۔ عیسائیوں کا اپنا، مسلمانوں کا اپنا اور ہندوؤں اور پارسیوں کے اپنے اپنے کیلنڈر ہیں، اسی طرح احمدیوں نے بھی اپنا علیحدہ کیلنڈر بنایا ہوا ہے۔ گویا تان اس بات پر ٹوٹ رہی تھی کہ اس طرح احمدیوں نے اسلام سے اپنا علیحدہ مذہب بنایا ہوا ہے۔ بہت سے پیدائشی احمدی بھی یہ اعتراض پڑھ کر دم بخود رہ گئے ہوں گے ، اس لیے وضاحت ضروری ہے۔ معروف اسلامی ہجری کیلنڈر تو قمری حساب سے رائج ہے اور مسلمانوں میں شمسی کیلنڈر کے لیے عیسوی کیلنڈر استعمال ہوتا ہے جو کہ حضرت عیسیٰ کی پیدائش کے سال سے شروع ہوتا ہے۔ حضرت خلیفۃ المسیح الثانی نے ایک ایسا شمسی کیلنڈر تیار کروایا جو کہ رسول کریم ﷺ کی ہجرت کے سال سے شروع ہوتا تھا۔ اور جنوری فروری مارچ وغیرہ نام کی بجائے نئے نام رکھے گئے جو اس ماہ میں ہونے والے ایسے اہم واقعات کی نسبت سے رکھے گئے جو رسولِ کریم ﷺ کی زندگی میں ہوئے۔ مثلاً جنوری کا نام صُلح اس نسبت سے رکھا گیا کہ اس ماہ میں صُلح حدیبیہ کا واقعہ ہوا تھا، فروری کا نام تبلیغ اس وجہ سے رکھا گیا کہ اس ماہ میں آنحضرت ﷺ نے بادشاہوں کو تبلیغی خطوط لکھے تھے۔

گویا اگر کوئی آنحضرت ﷺ کی محبت میں یہ کہے کہ شمسی کیلنڈر کو حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش کی بجائے رسولِ کریم ﷺ کی ہجرت سے شروع کرنا چاہیے۔ اور مہینوں کے نام آنحضرت ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے واقعات پر رکھنے چاہئیں تو اس کا مطلب یہ لیا جائے کہ یہ شخص یا یہ جماعت اپنے آپ کو اسلام سے علیحدہ کر رہی ہے اور اسے دائرہ اسلام سے خارج کر دینا چاہیے۔ کوئی ذِی ہوش اِس لغو سوچ کی حمایت نہیں کر سکتا۔ اس کے علاوہ اگر کیلنڈر دیکھ کر کسی کے مذہب کا فیصلہ کرنا ہے تو پھر عالمِ اسلام میں تو سب سے زیادہ عیسوی کیلنڈر

مستعمل ہے تو کیا ان سب مسلمانوں کو عیسائی سمجھا جائے گا۔ پھر یہ اعتراض اُٹھایا گیا کہ احمدیوں نے مسنون درود کی بجائے اپنا علیحدہ درود بنایا ہوا ہے اور اس میں احمد کا نام شامل کیا گیا ہے۔ اس الزام کی لمبی چوڑی تردید کی ضرورت نہیں۔ دنیا کے دو سو سے زیادہ ممالک میں احمدی موجود ہیں ان میں سے کسی سے بھی دریافت کیا جا سکتا ہے کہ وہ نماز میں کونسا درود پڑھتا ہے اور جماعت کے لٹریچر میں ہزاروں جگہ پر درود کی عبارت درج ہے کہیں سے پڑھ کر اپنی تسلی کی جا سکتی ہے۔ اپنے اعتراض کو ثابت کرنے کے لئے اٹارنی جنرل صاحب نے ایک احمدی کے مرتب کردہ کتابچہ "درود شریف" کا حوالہ پیش کیا اور یہ اعتراض پیش کیا کہ احمدیوں نے ہمیشہ سے خود کو مسلمانوں سے ہر طرح علیحدہ رکھا ہے۔ یہاں تک کہ احمدیوں کا درود بھی علیحدہ ہے اور اس میں محمد ﷺ اور آلِ محمد ﷺ کے علاوہ احمد اور آلِ احمد کے الفاظ بھی شامل ہیں۔ اس بار سوالات کرنے والی ٹیم کی کوشش تھی کہ سابقہ خفت کا ازالہ کیا جائے۔ غالباً اٹارنی جنرل صاحب یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ اس مرتبہ میں جعلی حوالہ پیش نہیں کر رہا انہوں حضور سے کہا:۔

" میں ابھی آپ کو فوٹو سٹیٹ دیتا ہوں آپ اسے ایک نظر دیکھ لیجئے۔"

اس مرحلہ پر مولوی ظفر انصاری صاحب نے اُٹھ کر کہا، " یہ ضمیمہ صفحہ 144 رسالہ درود شریف..." اور ایک طویل روایت بھی پڑھی اور ثابت کرنے کی کوشش کی کہ یہ علیحدہ درود حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی موجودگی میں بھی پڑھا گیا تھا۔ ابھی ان کا بیان ختم ہوا تھا کہ یہ انکشاف کسی بجلی کی طرح ان پر گرا کہ یہ حوالہ بھی جعلی اور خود ساختہ ثابت ہو گیا ہے۔ حضور نے فرمایا:۔

"... یہ رسالہ درود شریف جو کہا جاتا ہے۔ ہمارے پاس ہیں۔ ان میں یہ ہے ہی نہیں۔"

اب اٹارنی جنرل صاحب گھبرا کے بولے:۔

” مرزا صاحب! یہ clarification اس لئے میں ضروری سمجھتا ہوں کہ آپ اس کو approve نہیں کرتے؟ آپ کہتے ہیں کہ یہ غلط ہے؟“

اگر اس وقت ان میں خوش فہمی کی کوئی رمق باقی رہ گئی تھی تو وہ بھی رخصت ہو گئی۔ حضور نے پھر فرمایا:۔

”میں یہ کہتا ہوں کہ جس کتاب کے متعلق کہا جا رہا ہے کہ یہ اس میں ہے۔ یہ اس میں نہیں ہے۔“

یعنی پہلے تو پاکستان کی قابل قومی اسمبلی میں صرف جعلی حوالے پیش کئے جارہے تھے۔ اب یہ نوبت آگئی تھی کہ جعلی حوالے کی جعلی فوٹو کاپی بھی پیش کی گئی۔ نظریات اور عقائد کی بحث کو ایک طرف رکھ دیں، اس طرح جعلی حوالے اور جعلی فوٹو کاپی پیش کرنا صرف اخلاقی دیوالیہ پن کو ظاہر کرتا ہے۔ ہر پڑھنے والا اس واقعہ پر اپنی رائے خود قائم کر سکتا ہے۔ اس حالت کے باوجود اس گروہ کا یہ دعویٰ حیرت انگیز ہے کہ ہمیں یہ حق حاصل ہے کہ ہم یہ فیصلہ کریں کون مسلمان ہے اور کون نہیں۔

اب اٹارنی جنرل صاحب کچھ معذرت خواہانہ رویہ دکھا رہے تھے انہوں نے کہا کہ میں آپ پر کوئی الزام نہیں لگا رہا، آپ سے clarification چاہتا ہوں۔ اس پر حضور نے فرمایا:۔

”ہاں میں نے clarification دے دی کہ نہیں ہے۔“

اٹارنی جنرل صاحب نے پھر کہا کہ میرے پاس سوالات آتے ہیں۔ میری ڈیوٹی ہے کے آپ کی توجہ اس طرف مبذول کراؤں۔ آپ یہ نہ سمجھیں کہ میں آپ پر کوئی Allegation لگا رہا ہوں۔

اور یہ اعتراض اس لئے بھی بالکل بے بنیاد تھا کیونکہ امتِ مسلمہ میں بھی معروف مسنون درود کے علاوہ بھی اور بہت سے درود معروف ہیں اور پڑھے جاتے ہیں۔ ان میں درود کی دعا میں آلِ محمد کے ساتھ مختلف لوگوں کو یہاں تک کہ تمام مومنین کو درود میں شامل کیا گیا ہے۔

(ملاحظہ کیجئے "فضائل درود شریف مصنفہ مولانا محمد زکریا۔")

اس سیشن میں باقی سوالات بھی اسی نوعیت کے تھے کہ احمدیوں نے خود ہی ہمیشہ سے اپنے آپ کو مسلمانوں سے علیحدہ رکھا ہے۔ اور اس کی نام نہاد برہانِ قاطع کے طور پر اٹارنی جنرل صاحب نے حضرت خلیفۃ المسیح الثانی کی ایک تصنیف "سیرت مسیح موعود علیہ السلام" کے انگریزی ترجمہ میں درج ایک Heading کو پیش کیا۔ اس کی عبارت یہ تھی

Ahmadis to form a seperate community from outside Mussalmans

اس عبارت کی غلط انگریزی ہی اس بات کو ظاہر کر رہی ہے کہ ترجمہ میں یہ سہواً غلط عبارت شائع ہوئی ہے جیسا کہ دنیا بھر میں کتب کی اشاعت میں ہوتا ہے لیکن اس ضمن میں مندرجہ ذیل امور قابلِ توجہ ہیں۔

1)۔ حضرت خلیفۃ المسیح الثانی کی اصل تصنیف میں یہ ہیڈنگ موجود نہیں یہ مترجم کی طرف سے ہے۔

2)۔ اس کے نیچے درج عبارت ہی اس بات کو ظاہر کر دیتی ہے کہ یہاں پر وہ بات نہیں بیان کی جا رہی جسے ثابت کرنے کے لئے اٹارنی جنرل صاحب کوششیں کر رہے تھے۔ یہاں پر تو یہ لکھا ہے کہ جب 1901ء میں مردم شماری ہوئی تو حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے احمدیوں کو یہ ہدایت فرمائی کہ وہ اس موقع پر اپنے آپ کو "احمدی مسلمان" لکھوائیں۔ ذرا تصور کریں کہ اس جگہ پر یہ عبارت موجود ہے اور اس کا حوالہ پیش کر کے اٹارنی جنرل صاحب یہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ تاریخی طور پر احمدی کبھی بھی اپنے آپ کو

مسلمانوں کا حصہ نہیں سمجھتے رہے۔ اگر وہ اپنے آپ کو مسلمانوں کا حصہ نہیں سمجھتے رہے تو پھر مردم شماری میں اپنے آپ کو مسلمان کیوں لکھواتے رہے تھے۔

جب وقت ختم ہوا تو جماعت کے وفد پر اس بات کا انکشاف کیا گیا کہ اب کارروائی کچھ دنوں کے لیے روکی جا رہی ہے اور سپیکر صاحب نے اعلان کیا کہ اب کچھ دنوں کے لیے کارروائی روکی جا رہی ہے کیونکہ اٹارنی جنرل صاحب بھی مشقت سے گزرے ہیں اور وفد کے اراکین بھی مشقت سے گزرے ہیں۔ اسی گفتگو کے دوران اٹارنی جنرل صاحب نے فرمایا:۔

It is a strain on me also......

یہ (کارروائی) مجھ پر بھی بوجھ ہے۔۔۔

جماعت کے وفد کے رخصت ہوتے وقت سپیکر صاحب نے شکریہ ادا کیا اور تلقین کی کہ اس کارروائی کو ظاہر نہ کیا جائے۔

اس وقت بعض ممبرانِ اسمبلی اس بات کا اعلان بھی کر رہے تھے کہ حضور سے جو سوال ہونے ہوں ان کی اطلاع جماعت کو پہلے ہی سے ہوتی ہے۔ اور راولپنڈی کے ایک ممبر قومی اسمبلی عبدالعزیز بھٹی صاحب جو وکیل بھی تھے نے اس کا ذکر ایک احمدی وکیل مکرم مجیب الرحمن صاحب سے کیا اور وجہ یہ بیان کی کہ مرزا صاحب یوں جواب دیتے ہیں جیسے انہیں سوال کا پہلے سے ہی علم ہو۔ مکرم مجیب صاحب نے اس کا جواب یہ دیا کہ جماعت کی سو سالہ تاریخ میں جو اعتراضات بارہا کئے جاچکے ہیں اور جن کا جواب بارہا دیا جا چکا ہے ان کے بارے میں آپ کا یہ خیال کیوں ہے کہ خلیفہ وقت کو ان کا جواب معلوم نہیں ہوگا۔ آپ مجھے کوئی ایسا سوال بتائیں جو جماعت کی تاریخ میں پہلے نہ کیا گیا ہو اور آپ نے پہلی مرتبہ کیا ہو۔ (85)

پہلے تو جب جماعت کا وفد ہال سے چلا جاتا تھا تو ممبرانِ اسمبلی جو گفتگو کرتے تھے وہ اسمبلی کے رپورٹرز تحریر کرتے رہتے تھے لیکن وقفہ سے پہلے کچھ اجلاسات کے اختتام پر جب جماعت کا وفد چلا جاتا تھا تو رپورٹرز کو بھی بھجوا دیا جاتا تھا اور یہ بات چیت تحریر نہیں کی جا سکتی تھی۔

اس طرح سپیشل کمیٹی کی کارروائی میں وقفہ ہو گیا۔ اٹارنی جنرل صاحب کو تیاری کے لیے اس وقفہ کی ضرورت تھی۔ اور جماعتِ احمدیہ کا امام اپنی جماعت کو کس تیاری کے لیے توجہ دلا رہا تھا اس کا اندازہ اس خطبہ جمعہ سے ہوتا ہے جو حضور نے اس دوران 16 / اگست 1974ء کو مسجد اقصیٰ ربوہ میں ارشاد فرمایا تھا۔ حضور نے ارشاد فرمایا:۔

”یہ ابتلاؤں کا زمانہ ، دعاؤں کا زمانہ ہے اور سخت گھڑیوں ہی میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے محبت اور پیار کے اظہار کالطف آتا ہے۔ ہماری بڑی نسل کو بھی اور ہماری نوجوان نسل اور اطفال کو بھی، مرد و زن ہر دو کو یہ یقین رکھنا چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کے محبوب مہدی کے ذریعہ غلبہ اسلا م کا جو منصوبہ بنایا ہے اسے دنیا کی کوئی طاقت ناکام نہیں کر سکتی۔ اللہ تعالیٰ کے بنائے ہوئے منصوبوں کو زمینی تدبیریں ناکام نہیں کیا کرتیں۔ پس غلبہ اسلام کا یہ منصوبہ تو انشاء اللہ پورا ہو کر رہے گا۔ جیسا کہ کہا گیا ہے اسلام ساری دنیا پر غالب آئے گا اور جیسا کہ ہمیں بتایا گیا ہے نوعِ انسانی کے دل جماعتِ احمدیہ کی حقیر قربانیوں کے نتیجہ میں حضرت محمد رسول اللہ کے لیے فتح کیے جائیں گے اور نوعِ انسانی کو حضرت خاتم الانبیاء ﷺ کی قوتِ قدسیہ کے نتیجہ میں ربِّ کریم کے قدموں میں جمع کر دیا جائے گا۔ یہ بشارتیں اور یہ خوش خبریاں تو انشاء اللہ پوری ہو کر رہیں گی ۔ ایک ذرہ بھر بھی ان میں شک نہیں البتہ جس چیز میں شک کیا جاسکتا ہے اور جس کے نتیجہ میں ڈر پیدا ہوتا ہے وہ صرف یہ ہے کہ جو ذمہ داریاں اللہ تعالیٰ نے اس کمزور جماعت کے کندھوں پر ڈالی ہیں اپنی بساط کے مطابق وہ ذمہ داریاں ادا کی جا رہی ہیں یا نہیں؟

پس جماعت اپنے کام میں لگی رہے۔ یعنی تدبیر کے ساتھ، دعاؤں کے ساتھ غلبہ اسلام کے جہاد میں خود کو مصروف رکھے اور خدا تعالیٰ کی راہ میں قربانیاں دیتی چلی جائے۔ وہ خدا جو ساری قدرتوں کا مالک اور جو اپنے امر پر غالب ہے۔ اس نے جو کہا ہے وہ ضرور پورا ہوگا۔ خدا کرے ہماری زندگیوں میں ہماری کوششوں کو مقبولیت حاصل ہو اور غلبہ اسلام کے وعدے پورے ہوں اور ہمیں اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل ہو۔" (86)

پاکستان کے لیے دعاؤں کی تحریک کرتے ہوئے حضور نے فرمایا:-

"ہمارے ملک کی اکثریت اور بہت بڑی اکثریت نہایت شریف ہے۔ وہ کسی کو دکھ پہنچانے کے لیے تیار نہیں لیکن ملک ملک کی عادتیں ہوتی ہیں۔ کسی جگہ شریف آدمی مقابلہ کے لیے تیار ہو جاتا ہے اور کسی جگہ شریف آدمی یہ سمجھتا ہے کہ میری شرافت کا تقاضا ہے کہ خاموش رہوں۔ جن لوگوں نے یہاں تکلیف کے سامان پیدا کیے ہیں وہ دو چار ہزار یا پانچ دس ہزار سے زیادہ نہیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے ہماری دعا ہے کہ ان کو بھی ہدایت نصیب ہو۔ ہمارے دل میں تو کسی کی دشمنی نہیں ہے لیکن آج ملک کو بھی آپ کی دعاؤں کی ضرورت ہے۔ اس لئے احبابِ جماعت جہاں غلبہ اسلام کے لیے دعائیں کریں وہاں پاکستان جو ہمارا پیارا اور محبوب ملک ہے۔ اپنے اس وطن کے لیے بھی بہت دعائیں کریں۔" (87)

جماعت احمدیہ کی طرف سے کارروائی کو صحیح خطوط پر لانے کی ایک اور کوشش

اب تک کی کارروائی کو پڑھ کر یہ اندازہ تو بخوبی ہو جاتا ہے کہ کارروائی میں اُٹھائے جانے والے سوالات میں اکثر تو معقولیت سے ہی عاری تھے۔ اصل موضوع سے گریز کر کے غیر متعلقہ سوالات کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ جاری تھا۔ اکثر سوالات کا نہ موضوع سے کوئی تعلق تھا اور نہ ہی یہ کہا جا سکتا تھا کہ یہ سوالات جماعت کی

طرف سے پیش کئے جانے والے محضر نامے پر کئے جا رہے ہیں۔ ایک کے بعد دوسرا پیش کردہ حوالہ غلط نکل رہا تھا۔ اس پس منظر میں جماعتِ احمدیہ کی طرف سے ایک اور کوشش کی گئی کہ کسی طرح یہ کارروائی صحیح خطوط پر شروع کی جا سکے۔ چنانچہ پندرہ اگست کو ناظر اعلیٰ مکرم صاحبزادہ مرزا منصور احمد صاحب نے قومی اسمبلی کے سیکریٹری کو لکھا کہ اس موضوع پر کارروائی کی جا رہی ہے اور ہمیں امید ہے کہ سپیشل کمیٹی کسی صحیح نتیجہ پر پہنچنے کی خواہش مند ہو گی۔ اس کے لئے ہماری رائے ہے کہ تحریری سوال پہلے سے بھیج دیئے جائیں اور ان کے تحریری جوابات جماعت کی طرف سے بھجوائے جائیں اور اگر یہ طریقہ کار پہلے سے اختیار کرلیا جاتا تو ایوان کا بہت سا وقت بچ سکتا تھا اس خط کے آخر میں لکھا گیا تھا

After all it is not a criminal proceeding or an ordinary legal cross examination of an accused indvidual or a party. The committee is studying a very serious matter involving religious beliefs of millions of people. It is a grave moment not only in the history of Pakistan but also in the history of Islam. I would therefore be grateful if you please convey our request to the steering committee. I am sure the committee, realising the gravity and seriousness of the issue would grant our request.

20/ اگست کو کارروائی تو شروع ہو گئی لیکن اس خط کا جواب 23/ اگست کو موصول ہوا کہ یہ خط ایوان میں پڑھا گیا اور یہ فیصلہ کیا گیا کہ سپیشل کمیٹی پرانے طریقہ کار پر ہی کام کرتی رہے۔ بہر حال یہ جماعتِ احمدیہ کی طرف سے ایک کوشش تھی کہ اس کارروائی میں کئے جانے والے سوالات کوئی سنجیدہ رنگ اختیار کریں مگر افسوس قومی اسمبلی نے اس کوشش کو بھی کامیاب نہیں ہونے دیا۔

کارروائی دوبارہ شروع ہوتی ہے اور صمدانی ٹریبونل کی رپورٹ حکومت کو پیش کی جاتی ہے

20/ اگست کو دوبارہ اسمبلی کی سپیشل کمیٹی کی کارروائی شروع ہوئی۔ لیکن اس روز ایک اور اہم واقعہ ہوا۔ اس روز صمدانی ٹریبونل نے اپنی رپورٹ پنجاب کی صوبائی حکومت کو پیش کر دی۔ جسٹس صمدانی نے یہ رپورٹ پنجاب کے وزیرِ اعلیٰ محمد حنیف رامے صاحب کو ان کے دفتر میں پیش کی۔ وزیرِ اعلیٰ نے اعلان کیا کہ جسٹس صمدانی نے بڑی محنت سے یہ رپورٹ مرتب کی ہے اور اب صوبائی حکومت اس پر غور کرے گی اور اسے اپنی سفارشات کے ساتھ وفاقی حکومت کو بھیج دے گی۔

(مشرق 21/ اگست 1974ء ص1)

23/ اگست کو وزیرِ اعلیٰ پنجاب حنیف رامے صاحب نے یہ رپورٹ وزیرِ اعظم بھٹو صاحب کو پیش کر دی۔ اور یہ بھی کہا کہ اس رپورٹ کی سفارشات پر عملدر آمد کیا جائے گا اور کہا کہ وزیرِ اعظم اس بات کا اعلان کر چکے ہیں کہ قومی اسمبلی کی خاص کمیٹی اس رپورٹ سے استفادہ کرے گی۔

(مشرق 24/ اگست 1974ء ص1)

اس رپورٹ کو کبھی شائع نہیں کیا گیا۔ جسٹس صمدانی نے، جنھوں نے ربوہ کے سٹیشن پر ہونے والے واقعہ پر یہ تحقیقات کی تھیں، اس بات پر مایوسی کا اظہار ان الفاظ میں کیا۔ وہ اپنی خود نوشت ”جائزہ“ میں اس ٹریبونل کی رپورٹ کے بارے میں تحریر کرتے ہیں۔

”اس انکوائری سے متعلق مجھے دو باتیں اور بھی لکھنی ہیں تا کہ عوام میں جو غلط فہمیاں ہیں وہ دور ہو جائیں۔ پہلی بات تو یہ کہ انکوائری اس لئے کروائی گئی کہ عوام میں جو شدید ردِ عمل تھا وہ دور ہو۔ لیکن جب انکوائری مکمل ہو گئی اور حکومتِ پنجاب کو رپورٹ دے دی گئی تو وہ رپورٹ عوام کے لئے شائع نہیں کی گئی۔ کیوں؟ کیا عوام کو انکوائری کا نتیجہ جاننے کا حق نہیں ہے جبکہ انکوائری کروائی ہی عوام کی تسلی کے لئے گئی تھی؟ ... حکومت کو یہ جان لینا چاہیے کہ ایسی انکوائریز کی رپورٹ جو عوام کی اطلاع کے لئے کروائی گئی ہیں نہ چھاپنا غلط ہے لیکن مزے کی بات یہ ہے کہ عوام کی طرف سے بھی ایسا کوئی مطالبہ نہیں ہے۔ میری رائے میں تو مطالبہ ہو یا نہ ہو، حکومت کو اپنا فرض پورا کرنا چاہیے۔ تبھی عوام کو بھی معلوم ہو گا کہ ایسی رپورٹیں چھپنی چاہئیں۔“

(جائزہ مصنفہ خواجہ محمد احمد صمدانی، ناشر سنگِ میل پبلیکیشنز لاہور 2004، ص 69و 70)

جب ہم نے جسٹس صمدانی صاحب سے دریافت کیا کہ اس انکوائری سے کیا نتیجہ نکلا تھا تو انہوں جو جواب دیا وہ بغیر کسی تصدیق یا تردید کے یا بغیر کسی اتفاق یا اختلاف کے حرف بحرف درج کیا جاتا ہے، انہوں نے کہا۔

”Conclude یہ کیا گیا تھا کہ دیکھیں ہر معاشرے میں شریف لوگ بھی ہوتے ہیں غنڈے بھی ہوتے ہیں۔ احمدیوں میں بھی غنڈے ہیں۔ تو انہوں نے چونکہ، نشتر میڈیکل کالج کے لڑکوں نے ... جاتے ہوئے بد تمیزی کی تھی اس لئے انہوں نے یہ organize کیا کہ اس بد تمیزی کا بدلہ لیا جائے۔ تو چند غنڈوں نے بدلہ لیا اس میں جماعتِ احمدیہ یا امیر جماعتِ احمدیہ کا کوئی تعلق نہیں۔ اس میں یہ بات واضح کر دی گئی ہے۔“

یہ بات ہمیں اپنے ایک انٹرویو میں جسٹس صمدانی صاحب نے بتائی۔ ٹریبونل کی مکمل رپورٹ کے مندرجات کیا تھے؟ کیونکہ حکومت نے اس رپورٹ کو شائع نہیں کیا اس لئے ہم اس پر کوئی تبصرہ نہیں کر

سکتے۔ اگر اس رپورٹ کو شائع کیا جاتا تو پھر اس کے مندرجات پر تبصرہ کیا جا سکتا تھا، جس طرح سپیشل کمیٹی کی کارروائی پر تبصرہ کیا جا رہا ہے۔

ربوہ کے جو لڑکے سٹیشن کے واقعہ میں شامل تھے انہوں نے بلا شبہ غلطی کی لیکن اگر یہ لڑکے غنڈے تھے تو کیسے غنڈے تھے کہ کم از کم ڈیڑھ دو سو غنڈے دو گھنٹے کے قریب نشتر میڈیکل کالج کے لڑکوں کی پٹائی کرتے رہے اور کسی مضروب کی ہڈی تک نہ ٹوٹی اور نہ ہی کسی کو ایسی چوٹ آئی جسے ضربِ شدید کہا جا سکے۔ اور جب ہم نے دریافت کیا کہ اس ٹریبونل کے رو برو 120 مقامات کی فہرست پیش کی گئی تھی جہاں پر فسادات ہوئے تھے تو صمدانی صاحب کا کہنا تھا کہ یہ تو مجھے یاد نہیں کہ لسٹ پیش ہوئی کہ نہیں لیکن اس واقعہ کے بعد فسادات کا کوئی جواز نہیں تھا۔

قومی اسمبلی کی کارروائی کے آغاز میں اٹارنی جنرل صاحب نے حضور سے کہا کہ آپ نے کچھ سوالات کے جوابات ابھی دینے ہیں۔ یعنی پہلے جن حوالہ جات کو پیش کرکے اعتراضات اُٹھائے گئے تھے ان میں سے کچھ کو چیک کر کے جواب دینا ابھی باقی تھا۔ اس پر حضرت خلیفة المسیح الثالثؒ نے فرمایا کہ جوابات میرے پاس ہیں اور ان کے جوابات دینے شروع کیے۔ پہلا حوالہ الفضل 3 / جولائی 1952ء کا تھا کہ اس میں لکھا تھا کہ ہم کامیاب ہوں گے اور دشمن ہمارے سامنے ابو جہل کی طرح پیش ہوں گے۔ اس کے جواب میں حضور نے فرمایا کہ اس پرچہ کو دیکھا گیا اور اس میں لفظی طور پر یا معنوی طور پر اس قسم کا کوئی جملہ نہیں موجود۔ ظاہر ہے کہ یہ وہ آغاز نہیں تھا جس کی خواہش اٹارنی جنرل صاحب یا ان کی ٹیم یا اسمبلی کے اراکین رکھتے تھے۔ ان کے زاویہ سے بسم اللہ ہی غلط ہو رہی تھی۔ اٹارنی جنرل صاحب ذرا گھبرا کر بولے:۔

”مرزا صاحب! آپ نے غور سے دیکھا ہے؟ کسی اور پرچہ میں ... ‘‘

اٹارنی جنرل صاحب کی حیرت پر حیرت ہے۔ یہ کوئی پہلا حوالہ تو نہیں تھا جو کہ غلط پیش کیا گیا تھا۔ بہر حال حضور نے جواب دیا:۔

”ہاں میں نے یہ اس دن کہا تھا کہ پانچ دس دن آگے یا پیچھے کے بھی ہم دیکھ لیں گے۔“

غالباً اٹارنی جنرل صاحب کے لئے یہ بات نا قابلِ برداشت ہو رہی تھی کہ اس قسم کی ایک اور خفت برداشت کرنی پڑے لیکن اس بوکھلاہٹ میں انہوں نے جو کچھ کہا وہ انہی کا حصہ ہے۔ وہ بولے

” نہیں بعض دفعہ سال کی غلطی ہو جاتی ہے۔ اس تاریخ یا قریب سال کا ... “

ذرا ملاحظہ کریں کہ حوالہ قومی اسمبلی کے اراکین پیش کر رہے ہیں اور اٹارنی جنرل صاحب اس کو پڑھ کر سنا رہے ہیں اور حوالہ پیش کرنے کا مقصد یہ ہے کہ جماعتِ احمدیہ پر اعتراض کیا جائے اور اس آڑ میں ان کو ان کے حقوق سے محروم کیا جائے اور حسبِ سابق حوالہ ایک بار پھر غلط نکل آیا لیکن جماعتِ احمدیہ کے وفد سے ہی یہ فرمائش کی جا رہی ہے کہ ہمارا حوالہ تو غلط نکل آیا لیکن اب تم کوشش کر کے کہیں یہ ڈھونڈ کر ثابت کرو کہ یہ عبارت الفضل میں شائع ہوئی تھی تا کہ ہم تمہارے خلاف اعتراض کر سکیں۔ اس لایعنی فرمائش کے جواب میں حضور نے فرمایا کہ کئی دہائیوں میں شائع ہونے والے ’الفضل‘ کے شماروں میں یہ ڈھونڈنا ممکن نہیں۔

لیکن آفرین ہے اٹارنی جنرل صاحب پر کہ اس کے بعد وہ فرمانے لگے کہ بعض دفعہ سال کی غلطی بھی ہو جاتی ہے ہوسکتا ہے جہاں 1952ء ہے وہ 1951ء ہو۔ بعض دفعہ 13 کی جگہ 213 ہو جاتا ہے۔ اب یہ عجیب صورتِ حال تھی کہ ایک حوالہ پیش کر کے جماعتِ احمدیہ پر الزامات لگائے جا رہے ہیں اور وہ حوالہ بیان کردہ تاریخ کے الفضل میں موجود نہیں۔ اور اٹارنی جنرل صاحب جماعت کے وفد سے یہ فرمائش کر رہے ہیں کہ کسی

اور الفضل میں سے یہ حوالہ کسی طرح ڈھونڈ کر اسمبلی کی خدمت میں پیش کیا جائے۔ جو سوال کر رہا ہے یہ اس کا فرض ہوتا ہے کہ متعلقہ حوالہ نکال کر اپنے سوال میں وزن پیدا کرے نہ کہ اس کا جس پر اعتراض کیا جارہا ہے۔ اس ضمن میں جو آخری جملہ اٹارنی جنرل صاحب فرما سکے وہ یہ تھا:۔

" ... تو آپ کے پاس یہ نہیں ملا؟" ان کی بے یقینی کی کیفیت کو دور کرنے کے لئے حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ نے ایک بار پھر ارشاد فرمایا:۔

"ہاں ! ہاں! ہمیں نہیں مل رہا۔"

پھر ضمیمہ تحفہ گولڑویہ کی ایک عبارت پیش کی گئی تھی کہ "دوسرے فرقوں کو جو دعویٰ اسلام کرتے ہیں بکلی ترک کرنا پڑے گا(88)" اور اس پر یہ اعتراض اُٹھانے کی کوشش کی گئی تھی کہ گویا یہ کہا گیا ہے کہ باقی مسلمان فرقوں کو اسلام کی طرف منسوب نہیں ہونا چاہئے۔ حضور نے اس حوالہ کا سیاق و سباق پڑھا جس میں بالکل ایک اور مضمون بیان ہو رہا ہے اور وہ یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کا منشا یہ ہے کہ جو حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی تکذیب کرتا ہے اور آپ کو کافر کہتا ہے وہ اس قابل نہیں کہ احمدی اس کے پیچھے نماز پڑھیں اور اب احمدیوں کا امام احمدیوں میں ہی سے ہونا چاہئے۔ یہاں اس بات کا کوئی ذکر ہی نہیں تھا کہ کسی فرقہ کو اسلام کی طرف منسوب ہونے یا اسلام کا دعویٰ کرنے کا حق ہے کہ نہیں اور اس ساری عبارت پر وہ اعتراض اُٹھ ہی نہیں سکتا جو اُٹھانے کی کوشش کی گئی تھی۔ پھر اسی طرح حضور نے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی تصنیف انوارالاسلام کی ایک عبارت کا پورا سیاق و سباق پڑھ کر سنایا۔ اس کا حوالہ پیش کر کے اٹارنی جنرل صاحب نے یہ اعتراض اُٹھانے کی کوشش کی تھی کہ حضرت اقدس مسیح موعود علیہ السلام نے مسلمانوں کے بارے میں سخت الفاظ استعمال کئے ہیں۔ حضور نے ساری عبارت پڑھ کر سنائی یہاں سارا خطاب ان پادریوں اور عیسائیوں سے ہے

جو کہ آنحضرت کو گالیاں دیتے اور ان کی شان کے بارے میں گندے الفاظ استعمال کرتے تھے۔ پہلے ایک اجلاس میں اٹارنی جنرل صاحب نے 13/ نومبر 1946ء کا ایک حوالہ پڑھ کر سنایا تھا کہ تقسیمِ ہند سے معاً قبل حضرت خلیفۃ المسیح الثانی نے فرمایا تھا کہ تم ایک پارسی لے آؤ میں اس کے مقابلہ میں دو دو احمدی پیش کرتا جاؤں گا۔ اور اپنی طرف سے یہ استدلال کرنے کی کوشش کی تھی کہ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ احمدی اپنے آپ کو خود مسلمانوں سے علیحدہ مذہب سے وابستہ سمجھتے ہیں اور اشارہ یہ کیا جا رہا تھا کہ بالخصوص تقسیمِ ہند سے قبل کے نازک دور میں جب ہندوستان کے مسلمان پاکستان کے لیے جد وجہد کر رہے تھے اس وقت احمدی اپنے آپ کو مسلمانوں سے علیحدہ گروہ ظاہر کر رہے تھے۔ اگرچہ جو عبارت پیش کی جا رہی تھی اس میں صرف یہ ذکر تھا کہ ملک میں احمدیوں کی تعداد پارسیوں سے زیادہ ہے اور اگر پارسیوں کی رائے لی جارہی ہے تو احمدیوں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ نے اس حوالہ کا سارا سیاق و سباق پڑھ کر سنایا۔ یہ حوالہ 1946ء میں حضرت خلیفۃ المسیح الثانی کے سفر دہلی کے متعلق ہے۔ اس سفر کا مقصد کیا اپنے آپ کو مسلمانوں سے علیحدہ گروہ کے طور پر پیش کرنا تھا یا مسلم لیگ کے ہاتھوں کو مضبوط کرنا تھا، اس کا اندازہ اس بیان کے ان حصوں سے بخوبی ہو جاتا ہے۔ حضرت خلیفۃ المسیح الثانی نے فرمایا:۔

"میں نے قادیان سے اپنے بعض نمائندے اس غرض کے لئے بھجوائے کہ وہ نواب چھتاری سے تفصیلی گفتگو کر لیں اور انہیں ہدایت کی کہ وہ لیگ کے نمائندوں سے بھی ملیں۔ اور ان پر یہ امر واضح کر دیں کہ ہم یہ نہیں چاہتے کہ لیگ کے مقاصد کے خلاف کوئی کام کریں۔ اگر یہ تحریک لیگ کے مخالف ہو تو ہمیں بتا دیا جائے۔ ہم اس کو چھوڑنے کے لئے تیار ہیں۔ اور اگر مخالف نہ ہو تو ہم شروع کر دیں۔ اس پر لیگ کے بعض نمائندوں نے تسلیم کیا کہ یہ تحریک ہمارے لئے مفید ہو گی۔ بالکل باموقع ہو گی اور ہم یہ سمجھیں گے کہ اس ذریعہ سے ہماری مدد کی گئی ہے۔"

اور یہ تحریک کیا تھی ؟یہ تحریک یہ تھی حضرت خلیفۃ المسیح الثانی فرماتے ہیں:۔

”... اگر لیگ کے ساتھ حکومت کا ٹکراؤ ہواتو ہم اس کو مسلمان قوم کے ساتھ ٹکراؤ سمجھیں گے اور جو جنگ ہو گی اس میں ہم بھی لیگ کے ساتھ شامل ہوں گے۔ یہ سوچ کر میں نے یہ چاہاکہ ایسے لوگ جو اثر رکھنے والے ہوں۔ خواہ اپنی ذاتی حیثیت کی وجہ سے اور خواہ قومی حیثیت کی وجہ سے، ان کو جمع کیا جائے۔ دوسرے میں نے یہ مناسب سمجھا کہ کانگرس پر بھی اس حقیقت کو واضح کردیا جائے کہ وہ اس غلطی میں مبتلا نہ رہے کہ مسلمانوں کو پھاڑ پھاڑ کر وہ ہندوستان پر حکومت کر سکے گی۔ اس طرح نیشنلسٹ خیالات رکھنے والوں پر بھی یہ واضح کر دیا جائے کہ وہ کانگرس کے ایسے حصوں کو سنبھال کر رکھیں۔“(89)

کیا یہ حوالہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ جماعتِ احمدیہ اپنے آپ کومسلمانوں سے علیحدہ رکھ کر ان کے مقاصد کے خلاف کام کر رہی تھی یا وہ مسلمانوں کے مفادات کی خاطر حکومت پر یہ واضح کر رہی تھی کہ اگر مسلم لیگ اور حکومت میں جنگ ہوئی تو ہم مسلم لیگ کے ساتھ ہوں گے۔ اور اس حوالہ سے یہ بات صاف نظر آجاتی ہے کہ احمدیوں نے انگریز حکومت پر یہ واضح کر دیا تھا کہ انگریز حکومت مسلمانوں میں اختلافات پیدا کرنے کا خیال چھوڑ دے اور اگر اس امر کا نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت اور ہندوستان کے مسلمانوں میں انتہائی ٹکراؤ کی صورت پیدا ہوئی تو احمدی بہر حال مسلمانوں کا ساتھ دیں گے۔ مندرجہ بالا حوالہ کی روشنی میں اس کا جواب ظاہر ہے۔ اسمبلی میں اس عبارت کے ایک جملے کا حوالہ دے کر جھوٹا اعتراض اٹھانے کی بھونڈی کوشش کی گئی تھی۔ اس حوالہ میں تو بالکل بر عکس مضمون بیان ہوا تھا۔

اسی طرح حضور نے بعض اور حوالوں پر اُٹھائے گئے اعتراضات کے جوابات بیان فرمائے اور جب ان حوالوں کو مکمل طور پر پڑھا جاتا تو کسی مزید وضاحت کی ضرورت ہی نہ رہتی ،یہ واضح ہو جاتا کہ اعتراض غلط تھا۔

اس کے بعد حضور نے فرمایا کہ ایک حوالہ تشحیذالاذہان مارچ1914ء کا پڑھا گیا تھا کہ ” بیعت نہ کرنے والا جہنمی۔“ حضور نے فرمایا کہ اصل میں اس شمارے میں یہ مضمون بیان ہی نہیں ہو رہا کہ کون جہنمی ہے اور کون نہیں ہے۔یہاں تو یہ مضمون بیان ہو رہا ہے کہ خدا تعالیٰ کے الہامات میں تضاد نہیں ہو سکتا۔یعنی یہ ممکن نہیں کہ اللہ تعالیٰ ایک شخص کو یہ الہام کرے کہ تو میرا مقرر کردہ مامور ہے اور دوسرے کو یہ الہام کرے کہ یہ شخص فرعون ہے۔اور ایک کو الہام کرے کہ تیری پیروی نہ کرنے والا رسول اللہ ﷺ کے حکم کی نا فرمانی کرنے کی وجہ سے جہنمی ہے اور دوسرے کو یہ الہام کرے کہ جو اس کی پیروی کرتے ہیں وہ شقاوت کا طریقہ اختیار کرتے ہیں۔(یہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کا ایک مکتوب تھا جو کہ ایک نام نہاد ملہم بابو الٰہی بخش کے نام لکھا گیا تھا۔یہ مکتوب تشحیذالاذہان مارچ 1914ء کے صفحہ 41تا46 پر شائع ہوا تھا۔)

پھر حضور نے فرمایا کہ تشحیذالاذہان اگست 1917ء کا ایک حوالہ دیا گیا تھا” صرف ایک نبی ہو گا“

حضور نے تشحیذ الا ذہان کے اس شمارے سے ساری عبارت پڑھ کر سنائی کہ یہ جملہ تو یہاں نہیں لکھا ہوا ۔یہاں یہ ذکر ہے کہ یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ اسلام میں صرف ایک نبی کیوں ہوا۔بہت سے ہونے چاہئیے تھے۔یہ بات میں ذہن میں لائیں کہ آنحضرت ﷺ نبیوں کی مہر ہیں۔آپ نے جس کو نبی قرار دیا صرف وہی نبی ہو سکتا تھااور پھر یہاں حضرت مسیح موعود علیہ السلام کا یہ ارشاد درج ہے کہ جب ایک شخص نے یہ سوال کیا کہ اسلام میں آپ سے پہلے کون سا امتی نبی ہوا ہے۔تو پھر اس پر حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے فرمایا کہ

یہ سوال مجھ پر نہیں آنحضرت ﷺ پر ہے کہ انہوں نے صرف ایک کا نام نبی رکھا۔ اس سے پہلے کسی کا نام نبی نہیں رکھا۔ مذکورہ شمارے میں آنحضرت ﷺ کے ارشاد کی بات ہو رہی ہے۔ اور آپ کے جاری فیضان کی بات ہو رہی ہے۔

(تشحیذالاذہان اگست 1917 کا سارا شمارہ ایک مضمون پر مشتمل تھا جس کا عنوان تھا" محمدی ختمِ نبوت کی اصل حقیقت۔")

اس کے بعد حضور نے ایک اور غلط حوالے کی نشاندہی فرمائی۔ اٹارنی جنرل صاحب نے الفضل 16/جولائی 1949ء سے ایک حوالہ پیش کیا تھا کہ یہ گھبراتے ہیں کہ ہم اس کے مذہب کو کھا جائیں گے اور مقصد یہ تھا کہ یہاں ذکر ہے احمدی مسلمان دوسروں کے مذہب کو کھا جائیں گے۔ حضور نے فرمایا کہ اس شمارے میں تو اس قسم کا کوئی جملہ یا مضمون نہیں موجود لیکن ہم نے وعدہ کیا تھا کہ آگے پیچھے کے شماروں کا بھی جائزہ لیں گے تو جو حوالہ ملا ہے وہ بہت دلچسپ ہے۔ اس سے ملتی جلتی عبارت الفضل 25/جولائی 1949ء کے الفضل میں شائع ہوئی تھی۔ اور یہاں ایک اور بالکل مختلف مضمون بیان ہو رہا ہے۔ یہاں تو یہ مضمون بیان ہو رہا ہے کہ حضرت محمد ﷺ کی ذات ہر نقص سے پاک اور دوسروں کے لئے ایثار کرنے والی نظر آتی ہے۔ آپ ساری زندگی میں کسی شخص کا حق مارتے ہوئے نظر نہیں آتے۔ لیکن اس کے باوجود آپ کی ذاتِ اقدس کے بارے آپ کے مخالف بغض اور کینہ کا اظہار کرتے رہے ہیں۔ دشمن اس بغض اور کینہ کے اظہار سے باز نہیں آتا۔ جو شخص بھی مذہب کے بارے میں کچھ لکھتا ہے فوراً آپ کی ذات پر حملہ کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔ آخر اس کا سبب کیا ہے؟ اس کا سبب یہ ہے کہ مخالفین یہ محسوس کرتے ہیں کہ اسلام ایک صداقت ہے اگر اس کو نہ روکا گیا تو یہ صداقت پھیل جائے گی اور انہیں مغلوب کر لے گی۔ یہی ایک چیز ہے جس کی وجہ سے آپ کی ذات سے دشمنی کی جا رہی ہے کہ اسلام ایک غالب آنے والا مذہب ہے، اسلام دوسرے مذاہب کو

کھا جانے والا مذہب ہے۔ اسے دیکھ کر مخالفین کے فوراً کان کھڑے ہو جاتے ہیں اور وہ مقابلہ کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ اور ہمیں خوش ہونا چاہیئے کہ دشمن یعنی اسلام کا دشمن یہ محسوس کرتا ہے کہ اگر ہم میں کوئی نئی حرکت پیدا ہوئی تو ہم اس کے مذہب کو کھا جائیں گے۔

اصل میں الفضل کے اس شمارے میں حضرت مصلح موعود کا ایک خطبہ جمعہ درج کیا گیا ہے۔ اس خطبہ جمعہ میں تو حضور نے یہ بیان فرمایا تھا کہ اسلام غالب آنے والا مذہب ہے اور رسول اللہ ﷺ کے دشمن دراصل آپ ﷺ کا شکار ہیں اور اس لئے وہ آپ کے دشمن ہو گئے ہیں اور حضور نے فرمایا تھا یہ سب قوت اور برکت محمد ﷺ سے آئی ہے۔ معلوم نہیں کہ اس خطبہ کو پڑھ کر اٹارنی جنرل صاحب اعتراض کیوں اُٹھا رہے تھے۔ رسول اللہ ﷺ کی فتح کا اعلان انہیں ناگوار کیوں گزر رہا تھا۔

(ملاحظہ کیجئے الفضل نمبر169 جلد3 صفحہ 3 تا6 اس پر 4/جولائی اور 25 /جولائی 1949ء دونوں کی تاریخیں درج ہیں۔)

اب یہ صاف نظر آ رہا تھا کہ غلط حوالے پیش کر کے اور نا مکمل پیش کر کے سابقہ کارروائی میں جو الزام لگائے گئے تھے اور جو تاثر پیش کرنے کی کوشش کی گئی تھی اس کی ساری عمارت جھوٹ کی بنیادوں پر اُٹھائی گئی تھی۔ حضور نے جو واضح ثبوت پیش کئے ان کے بعد وہ ساری عمارت زمین بوس ہو رہی تھی جس کو بنانے کے لئے اتنے مکر و فریب سے کام لیا گیا تھا۔ غالباً اٹارنی جنرل صاحب اب ہر قیمت پر یہ سلسلہ روکنا چاہتے تھے کہ صحیح حقائق سامنے آکر ان کی اور ان کی ٹیم کی شرمندگی کا باعث بنیں۔ انہوں نے اس کے لئے جو بحث اُٹھائی وہ درج کی جاتی ہے۔

اٹارنی جنرل صاحب نے یہ شاہکار قسم کا سوال کیا۔

” مرزا صاحب 1949ء میں کیوں؟ عیسائی مشنریوں نے کوئی انکوائری شروع کی تھی، اسلام کے خلاف جب انہوں نے یہ بات کہی۔“ پھر انہوں نے اس عجیب سوال کو ان الفاظ میں دہرایا کہ ”... میں آپ سے یہ پوچھ رہا ہوں کہ 1949ء میں کون سا حادثہ تھا جو انہوں نے کہا؟ دشمن کون تھے؟“

اٹارنی جنرل صاحب کا یہ سوال پڑھ کر تو حیرت ہوتی ہے کہ یہ حضرات نہ تو دنیا کی کچھ خبر رکھتے تھے اور نہ ہی کسی عبارت کو سمجھنے کی صلاحیت ظاہر ہو رہی تھی۔ اس حوالے میں کہیں یہ ذکر نہیں تھا کہ 1949ء میں ہی یہ متعصبانہ مخالفت ظاہر ہوئی ہے۔ اس حوالے میں ایک تاریخی حقیقت کا ذکر ہو رہا تھا اور صدیوں سے یہ معاندانہ رویہ مسلسل ظاہر ہو تا رہا ہے۔ اس بات سے صرف وہی شخص انکار کر سکتا ہے جو کہ اس موضوع کے بارے میں کوئی علم نہ رکھتا ہو اور نہ ہی اسے اس بات کی کوئی پرواہ ہو کہ آنحضرت ﷺ کی ذات اقدس پر کس قسم کے حملے کئے جا رہے ہیں۔ اس پر حضور نے فرمایا کہ چودہ سو سال سے آج کے دن تک ... اس وقت تک وہ تحریک جاری ہے۔“

لیکن اٹارنی جنرل صاحب نے ایک بار پھر کمال لا علمی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا

”کون اسلام کے دشمن تھے ؟ کون آنحضرت ﷺ پر حملہ کر رہے تھے؟ ... “

اس پر حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ نے فرمایا کہ عیسائیوں کی طرف سے یہ حملے کئے جا رہے تھے۔ اس کی وجہ کیا تھی یہ تو ہمیں نہیں معلوم لیکن اب اٹارنی جنرل صاحب نے آنحضرت ﷺ کی ذات اقدس پر حملہ کرنے والوں کے کرتوتوں پر پردہ ڈالنا چاہتے تھے۔ انہوں نے پھر کہا:۔

” عیسائی کہاں کر رہے تھے؟“

اس کے بعد انہوں نے جو کچھ فرمایا وہ انہی کا ہی حصہ ہے۔ اٹارنی جنرل صاحب نے کہا کہ 1949ء میں تو پاکستان بن چکا تھا اور کسی کی ہمت نہیں تھی کہ وہ آنحضرت ﷺ کی شان میں کسی قسم کی کوئی گستاخی کرتا۔ گویا اٹارنی جنرل صاحب کو یہ علم ہی نہیں تھا کہ پاکستان سے باہر بھی ایک دنیا آباد ہے اور اس حوالے میں تو کہیں ذکر ہی نہیں تھا کہ یہ صرف پاکستان کی بات ہو رہی ہے۔ اس میں تو ان صدیوں کی مخالفت کا ذکر ہے جب کہ پاکستان وجود میں ہی نہیں آیا تھا۔ ہم نے اٹارنی جنرل صاحب کے خیالات درج کر دیئے ہیں۔ آج کے دور میں تو انٹر نیٹ کی سہولت موجود ہے۔ ہر پڑھنے والا خود جائزہ لے سکتا ہے کہ آج تک اسلام اور آنحضرت ﷺ کے دشمن ، تمام اخلاقی معیاروں کو بالائے طاق رکھ کر آنحضرت ﷺ کی ذات اقدس پر کتنے غلیظ حملے کر رہے ہیں۔ کتنی ہی گندی کتابیں تحریر کی گئیں اور یہ عمل صدیوں سے مسلسل جاری ہے اور صرف 1949ء کا ہی سوال نہیں کوئی سال ایسا نہیں گزرا جس میں یہ زہریلے وار نہ کئے گئے ہوں لیکن اسلام کی محبت کے اتنے دعووں کے باوجود پاکستان کی قومی اسمبلی کے قابل اراکین کو کچھ ہوش نہیں تھی کہ دنیا میں کیا ہو رہا ہے۔ اگر کسی چیز کی ہوش تھی تو اس بات کی کہ کس طرح اس جماعت کو اس کے بنیادی حقوق سے محروم کر دیا جائے جو کہ دنیا بھر میں اسلام کے دشمنوں کا مقابلہ کر رہی ہے۔ سب جانتے ہیں کہ تقریباً ایک دہائی سے آنحضرت ﷺ پر ہونے والے رکیک حملے پہلے سے زیادہ شدید ہوں گئے ہیں۔ آخر اس کی نوبت کیوں آئی؟ ایک وجہ یہ بھی ہے کہ دشمن نے عالمِ اسلام کو دلائل کی اس جنگ میں غافل پایا اور حملہ مزید شدید کر دیا۔ اٹارنی جنرل صاحب کے سوالات اس غفلت کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ آنحضرت ﷺ کی محبت کا تو یہی تقاضا تھا کہ یہ احباب چوکنا رہتے لیکن یہ سوالات تو ظاہر کرتے ہیں کہ یہ لوگ دشمنانِ اسلام کی کارروائیوں پر پردہ ڈالنے کی کوشش کر رہے تھے۔ انّا للہ و انّا الیہ راجعون

گزشتہ اجلاسات میں یہ اعتراض بھی اُٹھایا گیا تھا کہ جماعت کے لٹریچر میں ان لوگوں کے لیے سخت الفاظ استعمال کئے گئے ہیں جنہوں نے 1857ء میں ہندوستان میں انگریز حکومت کے خلاف بغاوت کی تھی۔ یہ جنگ ان فوجیوں نے شروع کی تھی جو ایسٹ انڈیا کمپنی کی فوج میں تنخواہ دار ملازم تھے۔ اور ۱۹۴۷ء میں آزادی کے بعد سے اس جنگ کو جنگِ آزادی کا نام دے کر اس میں شریک سپاہیوں کو مجاہد کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ قطع نظر اس بحث کے جماعت کے لٹریچر میں ان کے متعلق کیا لکھا ہے اور 1857ء کی جنگ کی حقیقت کیا تھی، یہ دیکھنا ضروری ہے کہ وہ اہم مسلمان لیڈر جو اس دور کے گواہ تھے اور اس دور کے مسلمانوں کا بُرا بھلا آج کے لوگوں کی نسبت زیادہ اچھی طرح سمجھتے تھے، وہ اس جنگ کے متعلق کیا خیالات رکھتے تھے۔ کیا وہ سمجھتے تھے کہ اس جنگ میں شریک مسلمانوں کے ہمدرد تھے یا ان کے خیال میں اس جنگ میں شرکت کرنے والوں نے ہندوستان کے مسلمانوں کو نقصان پہنچایا تھا۔ حضورؒ نے ان خطوط پر جواب دیا اور اس دور کے مشہور مسلمان قائدین کے کچھ حوالہ جات سنائے۔ ان میں سے کچھ پیش ہیں۔ سرسید احمد خان صاحب اپنی کتاب اسبابِ بغاوتِ ہند میں تحریر کرتے ہیں:۔

”غور کرنا چاہیے کہ اس زمانہ میں جن لوگوں نے جہاد کا جھنڈا بلند کیا ایسے بد اطوار آدمی تھے کہ بجز شراب خوری اور تماش بینی اور ناچ اور رنگ دیکھنے کے کچھ وظیفہ ان کا نہ تھا۔ بھلا یہ کیونکر پیشوا اور مقتدا جہاد کے گنے جا سکتے تھے۔ اس ہنگامے میں کوئی بھی بات مذہب کے مطابق نہیں ہوئی۔ سب جانتے ہیں کہ سرکاری خزانہ اور اسباب جو امانت تھا اس میں خیانت کرنا۔ ملازمین کی نمک حرامی کرنی مذہب کی رو سے درست نہ تھی۔ صریح ظاہر ہے کہ بے گناہوں کا قتل علی الخصوص عورتوں اور بچوں اور بڈھوں کا مذہب کے بموجب گناہِ عظیم تھا ... پھر یہ بات بھی مفسدوں کی حرامزدگیوں میں سے ایک حرامزدگی تھی نہ واقعہ میں جہاد۔“ (90)

خواجہ حسن نظامی صاحب نے بہادر شاہ ظفر کے مقدمہ کی روئیداد شائع کی تھی جس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ اس وقت بہادر شاہ ظفر بھی جسے بادشاہ بنایا گیا تھا، سپاہیوں کے ہاتھ میں ایک بے بس مہرے کی حیثیت رکھتا تھا۔ خواجہ حسن نظامی نے اس جنگ کے متعلق لکھا ہے۔

”غدر ۱۸۵۷ء میں جس قسم کے ناجائز واقعات پیش آئے اسلام نے کہیں بھی ان کی اجازت نہیں دی۔ تیرہ سو برس سے آج تک تاریخ ایک واقعہ بھی ایسا پیش نہیں کرتی کہ اسلام کی اجازت سے اس قسم کی کوئی حرکت کی گئی ہو جیسی غدر 57ء میں پیش آئی...“ (91)

اور خود اس جنگ کے دوران کئی مولوی صاحبان مسجد میں یہ بحث کرتے رہے تھے کہ یہ جنگ ہرگز جہاد نہیں ہے۔ اور کچھ مغل شہزادے ایسے بھی تھے جو ان سپاہیوں کو جو انگریز عورتوں اور بچوں کو قتل کر رہے تھے یہ کہہ کر روکنے کی کوشش کر رہے تھے کہ اسلام میں بچوں اور عورتوں کو قتل کرنا منع ہے۔ لیکن یہ لوگ ان کو بھی قتل کرنے پر آمادہ ہوئے تو ان منع کرنے والوں کو وہاں سے فرار ہونا پڑا۔ (92)

جماعت کے ایک اشد مخالف مولوی محمد حسین صاحب بٹالوی، جماعت کے ایک اور مخالف مولوی نذیر حسین صاحب دہلوی کے متعلق تحریر کرتے ہیں:۔

”مولانا سید محمد نذیر حسین صاحب محدّث دہلوی نے اصل معنی جہاد کے لحاظ سے بغاوت ۱۸۵۷ء کو شرعی جہاد نہیں سمجھا بلکہ اس کو بے ایمانی و عہد شکنی عناد خیال کر کے اس میں شمولیت اور اس کی معاونت کو معصیت قرار دیا۔“ (93)

خود مولوی محمد حسین بٹالوی صاحب نے 1857ء کی جنگ کے بارے میں کن خیالات کا اظہار کیا اس کا اندازہ ان کی اس تحریر سے ہو جاتا ہے جو کہ حضور نے سپیشل کمیٹی میں پڑھ کر سنائی۔

” عہد و امن والوں سے لڑنا ہر گز شرعی جہاد (ملکی ہو خواہ مذہبی نہیں ہو سکتا بلکہ عناد و فساد کہلاتا ہے۔ مفسدہ 1857ء میں جو مسلمان شریک ہوئے تھے وہ سخت گنہگار اور بحکمِ قرآن و حدیث مفسد و باغی بد کردار تھے۔ اکثر ان میں عوام کالانعام تھے بعض جو خواص و علماء کہلاتے تھے وہ بھی اصل علومِ دین قرآن و حدیث سے بے بہرہ تھے یا نا فہم و بے سمجھ۔“

(اشاعۃ السنہ نمبر 10 جلد 9 ص 309)

سب سے بڑھ کر یہ کہ یہ جنگ اس لئے شروع کی گئی تھی کہ اب انگریزوں کی حکومت ختم کر دی گئی ہے اور بہادر شاہ ظفر کی حکومت قائم ہو گئی ہے ، خود ان بادشاہ سلامت کا اس جنگ کے شرکاء اور اس جنگ کے بارے میں کیا خیال تھا؟ اس کے بارے میں بہادر شاہ ظفر کے ایک درباری ظہیر دہلوی لکھتے ہیں کہ بہادر شاہ ظفر نے اپنے خاص درباریوں کو جمع کر کے کہا:۔

” ... مجھے معلوم ہوا فلکِ غدار اور زمانہ نا ہنجار کو میرے گھر کی تباہی منظور ہے۔ آج تک سلاطینِ چغتائی کا نام چلا آتا تھا اور اب آئندہ کو نام و نشان یک قلم معدوم و نابود ہو جائے گا۔ یہ نمک حرام جو اپنے آقاؤں سے منحرف ہو کر یہاں آکر پناہ پذیر ہوئے ہیں کوئی دن میں ہَوَّا ہوئے جاتے ہیں۔ جب یہ اپنے خاوندوں کے کہ نہ ہوئے تو میرا ساتھ کیا دیں گے۔ یہ بدمعاش میرا گھر بگاڑنے آئے تھے بگاڑ چلے ... “

(داستانِ غدر مصنفہ ظہیر دہلوی ناشر سنگِ میل ص 81)

اور یہ جنگ شروع کرنے والے لوگ کون تھے۔ یہ وہی تھے جو اب تک اپنے ہم وطنوں پر اور ہم مذہب لوگوں پر گولیاں چلا کر انگریزوں کی حکومت ہندوستان میں قائم کر رہے تھے اور خود برملا اعتراف کر رہے تھے کہ ہم وہ ہیں جنھوں نے اپنی گردنیں کٹا کر انگریزوں کی حکومت ہندوستان میں قائم کی ہے اور جنگ شروع

ہونے کے بعد بھی یہ سپاہی ہاتھ جوڑ کر یہ کہتے تھے کہ ہم آپ کے نمک حلال ہیں، ہمیں آپ نے ہی پالا ہے اور ہم نے انگریز حکومت کی خاطر سر کٹوانے سے کبھی دریغ نہیں کیا۔ یہ پاکستان میں ہونے والی جعلی تاریخ سازی کا کرشمہ ہے کہ انگریزوں کے سب سے بڑے آلہ کار کو ان کے خلاف جہاد کرنے والے مجاہدین کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔

(تفصیلات کے لئے ملاحظہ کیجئے داستانِ غدر کا صفحہ 46اور47 اور50)

بہر حال 1857ء کی جنگ کے متعلق جواب ختم ہوا۔ حضور نے اس ضمن میں بہت سے ٹھوس حقائق پیش کئے اور مندرجہ بالا حوالوں میں سے بھی کئی پیش کئے گئے۔ حضور نے بعض اور پیش کردہ حوالوں کی حقیقت بیان فرمانی شروع کی۔

جیسا کہ ہم ذکر چکے ہیں، پہلے اٹارنی جنرل صاحب نے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی تصنیف "سیرت الابدال" کے 193 صفحہ کا حوالہ پیش کر کے سوال کیا تھا۔ ابھی جماعت کے وفد نے اس کی تردید یا تصدیق کرنی تھی۔ اس مرحلہ پر حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ نے اس حوالہ کے متعلق فرمایا:

"اس کا جواب یہ ہے کہ "سیرت الابدال" جو کتاب ہے اس کے صرف سولہ صفحے ہیں۔ تو ان سولہ صفحوں میں سے وہ کون سا page 193 تلاش کیا گیا ہے جس پر اعتراض کیا گیا ہے۔ کتاب کے سارے صفحے ہی سولہ ہیں۔"

یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ اب ممبران اسمبلی کے کئے گئے سوالات کی حقیقت خوب ظاہر ہو رہی تھی۔ انہیں ایک کے بعد دوسری شرمندگی کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ غالباً اٹارنی جنرل صاحب کی کوشش تھی کہ وہ کم از کم اس خفت سے بچ جائیں کہ سولہ صفحے کی کتاب کے صفحہ نمبر 193 کا حوالہ پیش کرنے کی سعادت ان کے حصے میں آئی ہے۔ ڈوبتے کو تنکے کا سہارا۔ انہوں نے کہا:

" نہیں وہ کسی دوسرے volume کا ہو گا۔"

شاید ان کی مراد تھی کہ یہ صفحہ نمبر حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی تمام کتب کے مجموعے " روحانی خزائن " کا ہو گا۔ اس پر حضور نے ارشاد فرمایا کہ اس volume میں بھی یہ کتاب صفحہ 144 پر ختم ہو جاتی ہے۔ اب اٹارنی جنرل صاحب بے بس تھے۔

اس کے جواب میں یحیٰ بختیار صاحب حیرت سے یہی دہراتے رہے کہ کیا وہ حوالہ ہے ہی نہیں۔ انہوں نے کہا:۔

"نہیں ہے بالکل ؟"

حضور نے انہیں بے یقینی کے جنجال سے نکالنے کے لئے فرمایا:۔

"نہیں ہے۔"

اب یحیٰ بختیار صاحب بولے:۔

" ٹھیک ہے ،ہم دیکھ لیں گے۔"

کارروائی کئی روز چل کر ختم ہوگئی لیکن اٹارنی جنرل صاحب ثبوت پیش نہ کر سکے۔ ہمارے لئے یہ سمجھنا مشکل ہے کہ اگر ایک کتاب کے سولہ صفحے ہیں تو اس کے صفحہ نمبر193 پر اٹارنی جنرل صاحب کیا دیکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔

قومی اسمبلی میں پیش کئے جانے والے یہ سب حوالے غلط ثابت ہو رہے تھے۔ اُٹھائے گئے اعتراضات کی بنیاد یہ خود ساختہ حوالے تھے۔ اگر یہ حوالے ہی صحیح نہیں تھے تو پھر ان اعتراضات کی کوئی حیثیت نہیں رہ جاتی تھی۔ سب ممبران کے لئے یہ بات باعثِ شرم تھی کہ ان کے پیش کئے گئے اعتراضات کا یہ حشر ہو رہا ہے۔ اس

مرحلہ پر سپیکر صاحب اس اجلاس سے اُٹھ کر باہر چلے گئے اور ان کی جگہ اشرف خاتون عباسی صاحبہ نے اجلاس کی صدارت شروع کی۔ اس کے بعد اٹارنی جنرل صاحب نے ان غلط حوالوں پر کوئی وضاحت پیش کرنا مناسب نہیں سمجھا مگر قاضی اکمل صاحب کے شعر پر طویل سوال و جواب کیے۔

پھر انہوں نے اپنی توجہ خطبہ الہامیہ کی طرف کی اور یہاں بھی وہی غلطی دہرائی جو اب تک کمیٹی کی طرف سے کیے جانے والے سوالات کا خاصہ رہی تھی۔

اٹارنی جنرل صاحب نے خطبہ الہامیہ کا حوالہ پڑھنے کی کوشش شروع کی لیکن آغاز میں ہی کچھ گڑبڑا گئے۔ انہیں یقین نہیں تھا کہ صفحہ نمبر کون سا ہے۔ انہوں نے ایک کی بجائے دو صفحہ نمبر پڑھے۔ پھر حوالے کے معیّن الفاظ پڑھنے کی کوشش ترک کی اور صرف عمومی طور پر یہ کہا کہ خطبہ الہامیہ میں مرزا صاحب نے کہا ہے کہ اسلام ابتدائی حالت میں ہلال کے چاند کی طرح تھا اور مرزا صاحب نے اپنے دور کو چودھویں کا چاند قرار دیا ہے۔ اعتراض کا لبِ لباب یہ تھا کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے گویا نعوذ باللہ اپنے آپ کو آنحضرت ﷺ سے افضل قرار دیا ہے۔ ابھی اس پر بات جاری تھی کہ سپیکر صاحب نے یہ کہہ کر وقفے کا اعلان کیا کہ شام کے اجلاس میں حضور کو اس کا حوالہ دکھا دیا جائے۔ وقفہ ہوا اور ختم ہوا۔ وقفہ کے بعد حضور نے فرمایا کہ ہم نے خطبہ الہامیہ کا جو صفحہ نمبر بتایا گیا تھا اس پر اور اس کے آگے پیچھے بھی دو تین صفحات کو چیک کیا ہے مگر یہاں پر تو کوئی ایسی عبارت موجود نہیں۔ اس پر اٹارنی جنرل صاحب نے فخر سے کہا کہ ہمیں مل گیا ہے اور مولوی ظفر احمد صاحب انصاری سے کہا کہ آپ سنا دیں۔ مولوی صاحب شروع ہوئے کہ مرزا بشیر الدین نے ذکر کیا ہے، الفضل قادیان یکم جنوری 1916ء ... ایک بار پھر نا قابلِ فہم صورتِ حال درپیش تھی کہ حوالہ خطبہ الہامیہ کا تھا اور اس کی جگہ الفضل کے ایک شمارے سے عبارت پڑھی جارہی تھی جہاں پر حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی تحریر یا تقریر کو Quote ہی نہیں کیا جا رہا تھا اور کہا جا رہا تھا کہ یہ مرزا بشیرالدین محمود احمد نے

کہا ہے۔ حضور نے فرمایا کہ بات تو خطبہ الہامیہ کی ہو رہی تھی مگر مولوی صاحب اتنی سی بات بھی سمجھ نہیں پائے اور الفضل کی عبارت پڑھنی شروع کی۔ حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ نے اس پر فرمایا کہ اصل کتاب خطبہ الہامیہ ہے ہمیں بس اس میں سے سنا دیں۔

شاید بہت سے پڑھنے والوں کو قومی اسمبلی کے اس اندازِ استدلال کا کچھ بھی سمجھ نہ آ رہا ہو اس لیے وضاحت ضروری ہے۔ مولوی صاحب اسمبلی میں الفضل کے جس شمارے سے بزعم خود حضرت خلیفۃ المسیح الثانی کی تقریر کا حوالہ پڑھ رہے تھے (94) اس شمارے میں حضرت خلیفۃ المسیح الثانی کی تقریر کا خلاصہ درج ہے مگر اس میں خطبہ الہامیہ یا ہلال اور بدر کی تمثیل کا ذکر ہی نہیں۔ حضرت خلیفۃ المسیح الثانی کا خطاب تو اس خوش خبری کے بارہ میں تھا کہ پارہ اوّل کا انگریزی ترجمہ تیار ہو گیا ہے۔ وہ جو حوالہ پڑھ رہے تھے وہ حضرت غلام رسول راجیکی صاحب کی پنجابی تقریر کا ترجمہ تھا اور اس جگہ پر بھی خطبہ الہامیہ کا نام تک درج نہیں تھا۔ مولوی صاحب نے خطبہ الہامیہ کا حوالہ پڑھنے میں یہ کہہ کر تردد کیا کہ یہ بہت لمبا ہے۔ بہر حال حضور کے اصرار پر مولوی صاحب نے خطبہ الہامیہ سے عبارت پڑھنے کی کوشش از سرِ نو شروع کی اور جو حوالہ پڑھا وہ ملاحظہ ہو:۔

”اسلام ہلال کی طرح شروع ہوا اور مقدر تھا کہ انجام کار آخر زمانہ میں بدر ہو جائے خداتعالیٰ کے حکم سے پس خدا تعالیٰ کی حکمت نے چاہا کہ اسلام اس صدی میں بدر کی طرح شکل اختیار کرے جو شمار کی رو سے بدر کی طرح مشابہ ہو۔ پس انہی معنوں کی طرف اشارہ ہے خداتعالیٰ کے قول میں کہ لَقَدْ نَصَرَکُمُ اللّٰہُ بِبَدْرٍ۔ پس اس امر میں باریک نظر سے غور کر اور غافلوں میں سے نہ ہو۔“ (95)

حضور نے اسی قت ارشاد فرمایا کہ

”یہ جو حوالہ ابھی سنایا گیا ہے اس میں اسلام کا ذکر ہے نبی اکرم ﷺ یا بانی سلسلہ کا ذکر نہیں۔“ شاید اس لئے سوالات کرنے والے خطبہ الہامیہ کا حوالہ پڑھنے کی بجائے ادھر اُدھر کے حوالے پڑھ رہے تھے کیونکہ انہوں نے جو دعویٰ کیا تھا کہ یہ خطبہ الہامیہ میں لکھا ہے، وہ غلط تھا۔ یہ بات بالکل واضح تھی۔ اس لیے اٹھایا گیا اعتراض بالکل رفع ہو جاتا تھا۔ کیا قومی اسمبلی کے ممبران کے نزدیک اگر اسلام ترقی کرتا چلا جائے تو یہ بات رسولِ کریم ﷺ کی شان کو کم کرنے والی تھی۔ اور جب اسلام ترقی کرتا ہے تو یہ رسول کریم ﷺ کی قوتِ قدسیہ ہی کا کارنامہ ہے۔ کیا ان کے نزدیک یہی مناسب تھا کہ نعوذُ باللہ اسلام ترقی نہ کرے بلکہ اسے زوال ہو۔ کوئی بھی ذی ہوش اس سوچ کو قبول نہیں کر سکتا۔ اس حوالہ کو پڑھ کر کوئی صاحبِ فہم یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس میں رسولِ کریم ﷺ کی توہین کی گئی ہے۔ اب حضور نے تفصیل سے خطبہ الہامیہ کی عبارت پڑھ کر سنائی۔ اس ساری عبارت میں اسلام کی عظمت اور رسول اللہ ﷺ کی شان بیان کی گئی تھی۔ اس عبارت میں کوئی شائبہ تک نہیں پایا جاتا کہ نعوذ باللہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کو آنحضرت ﷺ سے افضل قرار دیا گیا ہے۔ یہ بالکل جھوٹا اعتراض تھا۔ خطبہ الہامیہ میں تو یہ لکھا ہے ” اور محمد ﷺ کے بغیر ہمارا کوئی نبی نہیں اور قرآن کے سوا ہماری اور کوئی کتاب نہیں۔ اے رشد کے طالبو! اس سے رشد طلب کرو۔“

(روحانی خزائن جلد 16ص165)

پھر خطبہ الہامیہ کے پیش لفظ میں حضرت مسیح موعود علیہ السلام فرماتے ہیں:۔

” ... اور ماحاصل معراج کا یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ خیر الاولین والآخرین ہیں ... “

(روحانی خزائن جلد16ص22)

پھر خطبہ الہامیہ میں حضرت مسیح موعود علیہ السلام تحریر فرماتے ہیں:۔

”اس جدید طرز کی معراج سے غرض یہ تھی کہ آنحضرت ﷺ خیر الاولین ولآخرین ہیں اور نیز خدا تعالیٰ کی طرف سیر ان کا اس نقطہ ارتفاع پر ہے کہ اس سے بڑھ کر کسی انسان کو گنجائش نہیں۔“

(روحانی خزائن جلد16ص23)

اب اگر خطبہ الہامیہ کو پڑھ کر کوئی یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ نعوذُ باللہ اس میں حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے خود کو رسول اللہ ﷺ سے افضل قرار دیا ہے تو اس کی عقل پر ماتم ہی کیا جا سکتا ہے۔

اب اٹارنی جنرل صاحب کو کچھ اور نہیں سوجھی تو کہا کہ ان جملوں کی مرزا بشیر الدین محمود احمد نے جو تشریح کی ہے وہ تو وہی ہے جو ظفر انصاری صاحب نے پڑھی ہے اور حوالہ دیا کہ الفضل یکم جنوری 1916ء میں یہ لکھا ہے۔ جیسا کہ ہم پہلے واضح کر چکے ہیں کہ اس میں حضرت خلیفۃ المسیح الثانی کا یہ فرمان درج تھا کہ پارہ اوّل کا انگریزی ترجمہ قرآن تیار ہو گیا ہے۔ خطبہ الہامیہ کا تو کوئی ذکر ہی نہیں تھا۔

اب صورتِ حال یہ تھی کہ وقفہ اس لیے کیا گیا تھا کہ سپیشل کمیٹی تازہ دم ہو کر نئے ثبوتوں کے ساتھ جماعت پر وزنی اعتراضات اُ ٹھانے کی کوشش کرے گی۔ اور ابھی تک جو خفت اُ ٹھانی پڑی تھی اس کا ازالہ ہو گا۔ لیکن عملاً یہ ہوا کہ حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ نے اس کا آغاز اس طرز پر فرمایا کہ بہت سے حوالے جو انہوں نے اب تک پیش کئے تھے جن پر ان کے اعتراضات کا دارومدار تھا ان کی حقیقت کھولنی شروع فرمائی۔ اکثر حوالے تو سرے سے ہی غلط تھے۔ متعلقہ جگہ وہ عبارت ہی موجود نہ تھی۔ یا ایک آدھا جملہ سیاق و سباق سے ہٹ کر پیش کیا گیا تھا۔ جب پورے حوالے پڑھے گئے تو ان مقامات پر تو بالکل بر عکس مضمون بیان ہو رہا تھا، جس سے اس اعتراض کی ویسے ہی تردید ہو جاتی تھی۔

سوالات کسی نے بھی لکھ کر دیئے ہوں ،حوالہ کسی نے بھی نکالا ہو،بیچارے اٹارنی جنرل صاحب کو یہ سوالات پیش کرنے پڑتے تھے اور جب ان کا جواب ملتا تو خفت بھی سب سے زیادہ ان کے حصہ میں آتی تھی۔ اب تک تو ان کا ردِ عمل حیرانی یا زیادہ سے زیادہ بوکھلاہٹ کا تھا لیکن اس تازہ صورتِ حال نے ان کے رویہ میں چڑچڑا پن بھی پیدا کر دیا تھا۔ انہوں نے اس بات کی کوئی وضاحت نہیں پیش کی کہ ملک کی قومی اسمبلی پر مشتمل سپیشل کمیٹی میں مسلسل غلط حوالے کیوں پیش کئے جا رہے تھے۔ آخر اتنی متواتر غلطیوں کا جواز کیا تھا؟اس کا ذمہ دار کون تھا؟جب حضور نے اور دو حوالوں کی نشاندہی فرمائی کہ جو مکتوباتِ احمدیہ کے ایک صفحہ اور الفضل کے ایک شمارے کی عبارت پر اعتراض اُٹھائے گئے تھے تو اس صفحہ اوراس شمارے میں اس قسم کی عبارات نہیں ملیں،تو اس پر اٹارنی جنرل صاحب کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ وہ کہنے لگے

” ... اس واسطے میں آپ سے گزارش کروں گا،جب آپ انکار کر دیتے ہیں تو اس سے اگر بعد میں کوئی چیز مل گئی تو بڑا برا inference ہوتا ہے۔ “

اس کے بعد اٹارنی جنرل صاحب نے کہا:۔

”یہ presume کیا جاتا ہے کہ احمدیت کے بارے میں جتنی بھی important چیزیں ہیں۔ وہ آپ کے علم میں ضرور ہوں گی۔ “

اس مرحلہ پر ان کے اس جملہ کا تجزیہ ضروری ہے۔ جماعت نے پہلے سپیشل کمیٹی سے درخواست کی تھی کہ جو سوالات کیے جانے ہیں وہ پہلے سے بتا دیئے جائیں تاکہ جماعت کے لٹریچر سے متعلقہ حوالہ جات نکال کر ،پوری تحقیق کر کے ان کے جوابات کمیٹی کو دیئے جائیں۔ لیکن کمیٹی اس خیال میں تھی کہ وہ کوئی بہت حیران کن سوالات پیش کرے گی۔ جب وہ سوالات پیش کیے گئے جو مولوی ممبرانِ اسمبلی نے لکھ کر دئے اور اٹارنی

جنرل صاحب نے ان کو حضور کے سامنے رکھا تو جماعت نے تحقیق شروع کی تو معلوم ہوا کہ بہت سے پیش کردہ حوالے تو سرے سے غلط تھے یا پوری عبارت نہیں پیش کی گئی تھی۔ اب کوئی بھی شخص جماعت کے پورے لٹریچر کا، تمام اخبارات کا، تمام حوالوں کا حافظ نہیں ہوسکتا۔ یہ تو حوالہ پیش کرنے والے کا فرض ہوتا ہے کہ وہ صحیح صفحہ، صحیح عبارت، صحیح ایڈیشن پیش کرے اور اٹارنی جنرل صاحب بلکہ پوری قومی اسمبلی اس معاملہ میں مکمل طور پر ناکام ہوئی تھی تو اس کا الزام جماعت کے وفد کو دینا بالکل خلافِ عقل تھا اور جہاں تک بُرے Inference کا تعلق ہے تو یہ اس وقت ہونا چاہئے تھا جب کہ خود اٹارنی جنرل صاحب کے پیش کردہ حوالے غلط ثابت ہو رہے تھے اور رہی یہ بات کہ گزشتہ نوے برس کے دوران دنیا کے بیسیوں ممالک میں جماعت کا جو جریدہ اور جو کتاب چھپی تھی یا کسی احمدی شاعر نے اگر کوئی شعر کہا تھا یا کسی جماعت نے کوئی قرارداد پاس کی تھی، یہ تمام باتیں خلیفہ وقت کے ذہن میں ہر وقت مستحضر ہونی چاہئیں، اٹارنی جنرل صاحب کی اس بات کو کوئی بھی صاحبِ عقل تسلیم نہیں کر سکتا۔ زیادہ سے زیادہ یہ حسن ظن کیا جا سکتا ہے کہ اس کارروائی کے دوران ان کو جو ناکامی ہو رہی تھی اس نے وقتی طور پر ان کی قوتِ فیصلہ کو مفلوج کر دیا تھا۔ پہلے اٹارنی جنرل صاحب سے یہ سوال ہونا چاہئیے تھا کہ انہوں نے خود سپیکر صاحب سے کہا کہ ہمارے سامنے حوالے موجود ہیں اور پھر بھی وہ غلط حوالے پڑھتے رہے۔ کیا انہیں اردو پڑھنی نہیں آتی تھی یا پھر وہ عمداً غلط عبارات پڑھ رہے تھے۔ حضور نے اس کا یہ اصولی جواب دیا کہ

”یہ Inference جو ہے میرے نزدیک درست نہیں ہے۔ اس لئے میرا یہ دعویٰ نہیں کہ لاکھوں صفحوں کی کتب ... جن کی اشاعت تقریباً نوے سال پر پھیلی ہوئی ہے، میں اس کا حافظ ہوں اور ہر حوالہ مجھے یاد ہے۔“

پھر آپ نے فرمایا:۔

’’لیکن جب میں یہ کہتا ہوں کہ میرے علم میں نہیں ہے تو آپ کو یقین رکھنا چاہئے کہ میرے علم میں نہیں ہے۔‘‘

پاکستان کی قابل قومی اسمبلی کے قابل اراکین کی اس وقت کیا سوچ تھی ،اٹارنی جنرل صاحب نے ان کے متعلق فرمایا:۔

’’ ... اسمبلی ممبران کو یہ شک ہوتا ہے کہ جو جواب آپ کے حق میں ہوتا ہے،اس کے حوالے آپ ضرور لے آتے ہیں۔جو جواب آپ کے حق میں نہیں ہوتا ،آپ اس کو ٹالتے ہیں ... ‘‘

اگر اسمبلی ممبران کا یہ خیال تھا تو نہایت ہی نامعقول خیال تھا۔اگر کوئی ممبر جماعتِ احمدیہ پر اعتراض کرنے کے لئے کوئی حوالہ پیش کر رہا تھا تو یہ اس کا فرض تھا کہ اس کا ثبوت مہیا کرے ، جماعتِ احمدیہ کے وفد کا یہ کام نہیں تھا کہ اس کو ثبوت مہیا کرے۔اگر الفضل کے اس شمارے کا حوالہ دیا جائے گا جو کبھی شائع ہی نہیں ہوا تھا یا اس کتاب کی عبارت پیش کی جائے گی جو کہ کبھی لکھی ہی نہیں گئی تھی۔اگر ایسی عبارت پڑھی جائے گی جو اس صفحے پر موجود ہی نہیں جس کا حوالہ دیا جا رہا ، اگر ایک کتاب کے سولہ صفحے ہیں اور اس کے صفحہ نمبر 193 کا حوالہ دیا جائے گا۔تو اس صورت میں جماعتِ احمدیہ کا وفد یہ حوالہ کس طرح ڈھونڈے گا؟

بہر حال یہ اس کا اثر تھا یا کوئی اور وجہ تھی ، سپیکر صاحب نے اس اجلاس کے دوران اٹارنی جنرل صاحب کو اصرار سے یہ کہا کہ وہ اس کارروائی کو اب مختصر کرنے کی کوشش کریں۔اس پس منظر میں سپیکر صاحب اٹارنی جنرل صاحب کی ہمدردی میں اس سے زیادہ اور کیا کر سکتے تھے۔

اٹارنی جنرل صاحب یا ان کی ٹیم کی ذہنی کیفیت کچھ بھی تھی لیکن جب ملک کی قومی اسمبلی میں ایک غلط حوالہ پیش کر کے جماعتِ احمدیہ پر غلط اعتراض کیا جا رہا ہو تو جماعتِ احمدیہ کے وفد کا یہ فرض تھا کہ وہ ان

کا مکمل جواب دے۔ اٹارنی جنرل صاحب نے ایک احمدی کی کتاب کا حوالہ دے کر اعتراض اُٹھایا تھا کہ اس میں جو درود دیا گیا ہے اس میں حضرت مسیح موعود علیہ السلام کا نام بھی شامل ہے۔ حضور نے فرمایا کہ ہم نے اس کتاب کے تمام ایڈیشن دیکھ لئے ہیں۔ درود کی جو عبارت یہاں پڑھ کر سنائی گئی تھی وہ اس کے کسی ایڈیشن میں سرے سے موجود ہی نہیں۔ ابھی اٹارنی جنرل صاحب اس تازہ صدمہ سے سنبھل نہیں پائے تھے کہ انہیں ایک اور صدمہ سے دوچار ہونا پڑا۔ یحیٰی بختیار صاحب نے ایک کتاب کے انگریزی ترجمہ کا حوالہ پیش کیا تھا۔ حضور نے اس کا اصل اردو کا حوالہ پیش کیا تو یہ اعتراض خود بخود ہی باطل ہو گیا۔ اٹارنی جنرل صاحب نے ترجمہ پر اصرار کرنا چاہا تو سپیکر صاحب نے یہ کہہ کر بات ختم کر دی

When the original is available translation is of no use.

جب اصل کتاب موجود ہے تو پھر ترجمہ کی کوئی اہمیت نہیں۔

سوالات کرنے والی ٹیم اپنی طرف سے نئی تیاری کے ساتھ کارروائی میں شامل ہونے آئی تھی۔ لیکن وقفہ کے بعد پہلے دن انہیں جس ہزیمت سے دوچار ہونا پڑا وہ ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھی۔

21/ اگست کی کارروائی

جب 21/ اگست کی کارروائی شروع ہوئی تو سپیکر صاحب نے ممبرانِ اسمبلی کو مطلع کیا کہ حضرت صاحبزادہ مرزا منصور احمد صاحب ناظر اعلیٰ صدر انجمن احمدیہ کی طرف سے ایک خط موصول ہوا ہے جس میں انہوں نے لکھا ہے کہ جماعتِ احمدیہ کو اس سپیشل کمیٹی کی بحث کی ریکارڈنگ مہیا کی جائے۔ سپیکر نے کہا کہ میں نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ فی الحال ایسا نہیں کیا جا سکتا۔ ممبرانِ اسمبلی نے اس بات کی متفقہ تائید کی کہ اس کارروائی کی ریکارڈنگ جماعتِ احمدیہ کو بالکل نہیں دینی چاہئے۔ محمد حنیف خان صاحب نے کہا کہ آپ نے کہا ہے کہ فی الحال نہیں دی جا سکتی، یہ ریکارڈنگ کبھی بھی نہیں دینی چاہئیے۔ پروفیسر غفور صاحب نے کہا کہ صرف ریکارڈنگ ہی نہیں بلکہ اس کی کاپی بھی نہیں دینی چاہئیے۔ حضرت صاحبزادہ مرزا منصور احمد صاحب ناظر اعلیٰ صدر انجمن احمدیہ نے یہ خط 15/ اگست 1974ء کو تحریر فرمایا تھا، اس سے قبل کارروائی کے آغاز پر 6/اگست 1974ء کو ایڈیشنل ناظر اعلیٰ محترم صاحبزادہ مرزا خورشید احمد صاحب کی طرف سے بھی ایک خط قومی اسمبلی کے سیکریٹری کو لکھا گیا تھا کہ اس کارروائی کی ریکارڈنگ جماعت احمدیہ کو مہیا کی جائے اس خط میں یہ یقین دلایا گیا تھا کہ اگر یہ ریکارڈنگ مہیا کر دی جائے تو صدر انجمن احمدیہ بھی اس کے مندرجات کو ظاہر نہیں کرے گی۔ اب تک جس نہج پر کارروائی چلی تھی اس کو پیش نظر رکھا جائے تو ممبرانِ اسمبلی کے اس انکار کی وجہ سمجھنا مشکل نہیں۔ پھر یہ تجویز سامنے رکھی گئی کہ جماعتِ احمدیہ کے وفد کو سوالات سے پہلے مطلع کر دیا جائے تا کہ وہ اس کا تحریری جواب جمع کرا سکیں۔ اٹارنی جنرل صاحب نے اس کی مخالفت کی اور پوری سپیشل کمیٹی نے اٹارنی جنرل صاحب کی رائے کی متفقہ تائید کی۔ یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ جب ہم نے صاحبزادہ فاروق علی خان صاحب سے دریافت کیا کہ جب جماعت کی طرف سے یہ درخواست کی گئی کہ ہمیں سوالات سے پہلے مطلع کر دیا

جائے تو اس کو منظور نہیں کیا گیا تھا تو اس کی وجہ کیا تھی۔ اس کے جواب میں سابق سپیکر صاحب نے فرمایا کہ میرے سامنے اس قسم کی کوئی بات نہیں آئی تھی۔ ریکارڈ کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ پہلے سٹیرنگ کمیٹی کو اور پھر سپیشل کمیٹی کو یہ درخواست کی گئی تھی لیکن اسے منظور نہیں کیا گیا تھا۔ اور سپیکر صاحب نے ایوان میں بھی اس درخواست کا ذکر کیا تھا۔

اس کے بعد مولوی ظفر انصاری صاحب نے بھی ایک تجویز پیش فرمائی۔ اور وہ تجویز یہ تھی

"جنابِ والا میں ایک چیز یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ بعض ممبران بار بار یہ کہتے ہیں کہ بہت دیر ہو رہی ہے۔ دیر یقیناً ہو رہی ہے لیکن جب ہم نے ایک دفعہ یہ کام شروع کر دیا تو پھر اسے کسی ایسے مرحلہ پر چھوڑنا بہت غلط ہو گا اور مقصد کے لئے مضر ہو گا۔ میرے ذہن میں ایک تجویز یہ ہے کہ ہم کسی موضوع پر چار پانچ Questions ایک دفعہ پڑھ دیں۔ ان سے اگر یہ کہہ دیں کہ وہ اسے Admit کرتے ہیں یا نہیں کرتے۔ کوئی Explaination نہ لیں۔ اگر وہ Admit نہیں کرتے ہم کوشش کریں گے کہ ہم Original Produce کریں۔"

یہ بات مدِ نظر رہے کہ مولوی ظفرانصاری صاحب سوالات تیار کرنے کے لئے اٹارنی جنرل صاحب کے دستِ راست کے طور پر کام کر رہے تھے۔ یہ تجویز پیش کیوں کی گئی اس کی وجہ ظاہر ہے۔ جو سوالات کئے جا رہے تھے ان میں پیش کردہ حوالے اگر کبھی قسمت سے ٹھیک ہو جاتے تھے تو جب پوری عبارت پیش کی جاتی تھی تو یہ صاف نظر آجاتا تھا کہ اس عبارت پر تو یہ اعتراض ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ نامکمل حوالہ پیش کر کے جو تاثر پیدا کرنے کی کوشش کی جا رہی ہوتی تھی وہ ناکام ہو جاتی تھی۔ اس لئے اب بار بار کی خفت سے بچنے کے

لئے مولوی صاحب نے یہ حل تجویز فرمایا تھا کہ جماعت ہر حوالے کے جواب میں صرف یہ کہے کہ یہ حوالہ صحیح ہے یا غلط اور اس کا سیاق و سباق بھی سامنے نہ رکھے۔

اس تجویز کے جواب میں سپیکر صاحب نے کہا:۔

”اگر آپ original produce کریں تو بڑا easy ہوتا ہے۔ جب آپ حوالہ دیتے ہیں تو وہ کہتے ہیں کہ ہم دیکھیں گے چیک کریں گے۔ verify کریں گے۔“

اب یہ بڑی معقول تجویز تھی کہ اگر اصل حوالہ اسی وقت پیش کر دیا جائے تو پھر اتنی دیر اور تلاش کی کوئی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ لیکن مولوی ظفرانصاری صاحب اس طرف آنا ہی نہیں چاہتے تھے۔ انہوں نے اس کے جواب میں اپنی سابقہ بات ہی دہرائی اور صرف یہ اضافہ کیا کہ اگر وفد چاہے تو explaination کے لئے سپلیمنٹری وقت لے سکتا ہے۔

اس مرحلہ پر سپیکر صاحب نے ایک عجیب بات کی کہ اکثر سوالات تو ہو چکے ہیں اب کچھ سپلیمنٹری سوالات رہ گئے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اصل موضوع یہ تھا کہ جو شخص یا گروہ آنحضرت ﷺ کو آخری نبی نہیں مانتا اس کا اسلام میں کیا status ہے یعنی کیا ایسا شخص قانون کی نظر میں مسلمان ہو گا کہ نہیں۔ اگر کوئی شخص آنحضرت ﷺ کو آخری نبی نہیں مانتا تو پھر کیا اسے قانونی طور پر مسلمان سمجھنا چاہیئے کہ نہیں۔ اس موضوع پر تو ابھی جماعت ِ احمدیہ کے وفد سے کوئی سوالات کئے ہی نہیں گئے تھے۔ اور سپیکر صاحب کہہ رہے تھے اکثر سوالات ہو بھی گئے۔ جماعت کا وفد تو اس موضوع پر اپنے موقف کا واضح اعلان کر چکا تھا لیکن اسمبلی ممبران اس پر سوالات کرنے سے کترا رہے تھے۔

ممبرانِ اسمبلی اس کارروائی کے افشا ہونے سے اس قدر خوف زدہ تھے کہ اس مرحلہ پر ایک ممبر نے کہا کہ وہ دروازہ کھلا رہتا ہے اور وہاں پر کوئی Constantly سنتا رہتا ہے۔ سپیکر صاحب نے ہدایت دی کہ یہ معلوم کر کے بتائیں کہ یہ شخص کون ہے، یہ طریقہ کار غلط ہے۔ جب حضرت خلیفۃ المسیح الثالث ؒ جماعتِ احمدیہ کے وفد کے اراکین کے ہمراہ تشریف لائے تو اٹارنی جنرل صاحب نے کہا کہ کل کی کوئی بات رہ گئی ہو بیان کر دیں۔ حضور نے فرمایا کہ کل الفضل کا حوالہ دیا گیا تھا کہ اس میں حضرت خلیفۃ المسیح الثانی نے خطبہ الہامیہ کی ایک عبارت کی تشریح کی ہے۔ تو اس کو چیک کیا گیا ہے جس جگہ کا حوالہ دیا گیا تھا اس پر ایسی کوئی عبارت نہیں ملی۔

حضور نے فرمایا کہ کل مجھ پر جو الزام لگایا گیا تھا (یعنی بعض ممبران نے یہ الزام لگایا تھا کہ جو حوالہ ان کی تائید میں ہو وہ یہ نکال کر لے آتے ہیں اور جو ان کے خلاف جائے اس کو ٹالتے رہتے ہیں)۔ ابھی حضور نے اپنا جملہ مکمل نہیں کیا تھا کہ اٹارنی جنرل صاحب نے جملہ کاٹ کر کہا کہ ”نہیں مرزا صاحب میں نے کوئی الزام نہیں لگایا۔“

لیکن حضور نے فرمایا۔

”نہیں میری بات تو سن لیں۔ اس لیے سوالوں کے متعلق جو حوالے چاہئیں اسے معزز اراکین جو چاہیں خود تلاش کریں۔ ہمیں آپ صرف یہ پوچھیں یہ حوالہ ہے اس کا مطلب کیا ہے؟ ... ہم پر یہ بوجھ نہ ڈالیں کہ آپ کے لئے ہم حوالے تلاش کریں۔“

ایک روز پہلے تو اٹارنی جنرل صاحب کے رویہ کی تلخی کا عالم کچھ اور تھا لیکن اس روز وہ کچھ معذرت خواہانہ رویہ ظاہر کر رہے تھے۔ انہوں نے کہا:۔

”نہیں وہ ٹھیک ہے۔ میں ابھی یہی کروں گا کہ اگر آپ کہیں کہ اس حوالے کا آپ کو علم نہیں تو کافی ہے۔“

اب غلط، جعلی اور خود ساختہ حوالوں کو پیش کرنے کی انتہا ہو چکی تھی حضور نے پھر واضح فرمایا:۔

”صرف جو حوالہ آپ کہیں کہ ” فلاں کتاب میں ہے“ اسی تاریخ کے متعلق میں بات کروں گا۔ ایک دن پہلے اور ایک دن بعد کی بھی بات نہیں کروں گا ... “

یحییٰ بختیار صاحب نے ایک بار پھر غلط حوالوں کی وضاحت پیش کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا:۔

”نہیں، وہ ٹھیک ہے۔ مرزا صاحب ! بات یہ ہے ، یہ جو حوالہ جات ہیں، کچھ اخباروں میں، کچھ رسالوں میں، کچھ کتابوں میں re produce کر کے کتابت کی غلطی ہو جاتی ہے، اور ممبر صاحب کہیں سے اُٹھا کے مجھ سے سوال پوچھتے ہیں تو وہ میں آپ سے پوچھتا ہوں۔ بعض دفعہ کی تاریخ میں فرق دس دن کا۔ 21 کی جگہ 31 ہو جاتا ہے۔ بعض اوقات سال کا فرق ہو جاتا ہے 51 کی جگہ ... تو ایسا ہو جاتا۔“

اٹارنی جنرل صاحب کی بے ربط وضاحت پر ” عذرِ گناہ بد تر از گناہ“ کی مثل صادق آتی تھی۔ اس پر حضور نے فرمایا:۔ ”تو جو پوچھنے والے ہیں، وہ ذرا محنت کر لیا کریں۔“

اس پر اٹارنی جنرل صاحب نے وضاحت کی ایک اور کوشش کی اور کہا کہ زیادہ تر حوالے الفضل کے ہیں اور ہمارے پاس الفضل کی فائل نہیں ہے، اس وجہ سے ہمیں یہ مشکل ہوتی ہے۔ حقیقت یہ تھی کہ اکثر حوالے الفضل کے نہیں تھے اور جو کتب کے حوالے بھی تھے وہ بھی اسی طرح مسلسل غلط نکل رہے تھے اور رہا الفضل تو اس اخبار کا ہر شمارہ سرکاری ادارے کو بھجوایا جاتا تھا۔ اگر نیت صاف ہوتی تو وہاں سے یہ ریکارڈ طلب کیا جا سکتا تھا۔

اس پر حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ نے فرمایا:۔

”نہیں میں نے تو صرف یہ عرض کی ہے کہ میں نے اپنی طرف سے نہایت دیانتداری کے ساتھ خود ہی اس بات کو تسلیم کر لیا تھا کہ ہم تلاش کریں گے لیکن جس کا بدلہ مجھے یہ دیا گیا کہ بڑا نا مناسب اعتراض مجھ پر کر دیا گیا ... تو اس واسطے میں صرف یہ عرض کر رہا ہوں کہ جو بوجھ آپ کا ہے وہ آپ اُٹھائیں اور جو ہمارا ہے وہ ہم اُٹھانے کی کوشش کریں گے۔“

اس پر اٹارنی جنرل صاحب نے کہا کہ میں آپ کی دیانت پر شک نہیں کرتا اور پھر کہا کہ کل جو اعتراض اُٹھایا گیا تھا وہ Clarify ہو گیا ہے۔ اٹارنی جنرل صاحب نے واضح کیا کہ انہیں یہ غلط فہمی کس طرح ہوئی تھی۔ اس کے جواب میں حضور نے فرمایا: جب ایک سوال کیا جاتا ہے تو بعض دفعہ وفد کے کسی ممبر کے ذہن میں اس کا پس منظر آجاتا ہے اور وہ دورانِ گفتگو حضور کی خدمت میں اس بارے میں عرض کر دیتا ہے۔

اب اٹارنی جنرل صاحب اپنی طرف سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہے تھے کہ جماعتِ احمدیہ نے خود اپنے آپ کو مسلمانوں سے علیحدہ رکھا ہے اور اپنی دانست میں اس کی مضبوط دلیل یہ پیش کی کہ جب برِ صغیر آزاد ہو رہا تھا اور برصغیر کے مسلمان مسلم لیگ کے ساتھ مل کر پاکستان کے قیام کے لئے کوششیں کر رہے تھے تو احمدیوں نے ان کی مخالفت کی تھی اور ان کا ساتھ نہیں دیا تھا۔

پہلی بات تو یہ کہ ہم پہلے ہی حوالے درج کر چکے ہیں کہ یہ الزام غلط تھا لیکن اس ضمن میں مندرجہ ذیل حقائق سامنے لانے ضروری ہیں۔

1۔ اگر یہ فرض کیا جائے کہ جس گروہ نے آزادی کے وقت مسلم لیگ کا ساتھ نہیں دیا تھا، اس نے اپنے آپ کو خود امتِ مسلمہ سے علیحدہ رکھا ہے اور اب اسے قانونی طور پر غیر مسلم قرار دے دینا چاہیئے تو یہ الزام

جماعتِ احمدیہ پر نہیں بلکہ ان جماعتوں پر آتا تھا جو جماعتِ احمدیہ کی مخالفت میں سب سے پیش پیش تھیں اور اس کے ممبران اس اسمبلی میں بھی موجود تھے۔ جماعتِ اسلامی کے ممبران اس اسمبلی میں موجود تھے اور ان کے بانی مودودی صاحب نے آزادی کے وقت مسلم لیگ کی بھرپور مخالفت کی تھی۔ جمعیت علماء اسلام کے ممبران اس اسمبلی میں موجود تھے ان کے بزرگان سیاسی طور پر مسلم لیگ کی مخالفت کرتے رہے تھے۔ ان کے علاوہ نیپ سے وابستہ اراکین اس موقع پر موجود تھے، یہ سیاسی گروہ بھی پاکستان کے قیام تک مسلم لیگ اور قیامِ پاکستان کی مخالفت کرتا رہا تھا۔ ان تاریخی حقائق کی موجودگی میں جماعت احمدیہ پر یہ اعتراض اُٹھانا مضحکہ خیز تھا۔

2۔ اگر ایسا ہی تھا کہ جماعتِ احمدیہ قیامِ پاکستان کی مخالفت کر رہی تھی تو پھر آزادی سے معاً قبل ہونے والے انتخابات میں، جس کے نتیجہ میں پاکستان کے بننے یا نہ بننے کا فیصلہ ہونا تھا، جماعتِ احمدیہ نے تمام مرکزی نشستوں پر مسلم لیگ کو کیوں ووٹ دیئے تھے؟ حضرت خلیفۃ المسیح الثانی نے ان انتخابات سے قبل یہ اعلان شائع فرمایا تھا

" آئندہ الیکشنوں میں ہر احمدی کو مسلم لیگ کی پالیسی کی تائید کرنی چاہیئے تا انتخابات کے بعد مسلم لیگ بلاخوفِ تردید کانگرس سے یہ کہ سکے کہ وہ مسلمانوں کی نمائندہ ہے۔

(الفضل 22/ اکتوبر 1945ء)

3۔ اگر جماعتِ احمدیہ قیامِ پاکستان کی مخالفت کر رہی تھی تو پنجاب باؤنڈری کمیشن کے روبرو اس نے اپنا یہ تحریری موقف کیوں جمع کرایا تھا کہ احمدی مسلمان قیامِ پاکستان کے حق میں اپنی رائے کا اظہار کر چکے ہیں۔ اب اس باؤنڈری کمیشن کا تمام ریکارڈ شائع ہو چکا ہے۔ (جماعتِ احمدیہ کی طرف سے پیش کردہ میمورنڈم کتاب The

Partition of the Punjab 1947, Vol 1, published by Sang-e-Meel Publications کے صفحہ 428 تا 469 پر ملاحظہ کیا جا سکتا ہے)۔ حقیقت یہ ہے کہ آل انڈیا مسلم لیگ کے بعد اس کمیشن کے روبرو پاکستان کے حق میں سب سے طویل میمورنڈم جماعتِ احمدیہ کی طرف سے ہی جمع کروایا گیا تھا۔

4۔ قادیان تحصیل بٹالہ میں شامل تھا۔ پنجاب کے باؤنڈری کمیشن میں ایک میمورنڈم مسلم لیگ بٹالہ کی طرف سے بھی جمع کرایا گیا تھا۔ اس میمورنڈم میں لکھا تھا:

If religious places and shrines are to be considered, Qadian town situated in the jurisdiction of Batala Sadar Police Station, requires special attention. Among the Mussalmans, the Ahmadis acclaim the late Mirza Ghulam Ahmad as a prophet. This prophet was born and bred up, lived and died and was buried here . Qadian is the very cradle of Ahmadi faith, it grew and blossomed here and every particle of this earth is linked with its history. And the Qadianis have declared in unequivocal-terms in favour of Pakistan.

(The Partition of The Punjab 1947, Vol 1, published by Sang-e- Meel Publications.478)

ترجمہ: اگر مقدس مقامات اور عمارات کو زیرِ غور لایا جا رہا ہے تو قادیان بٹالہ صدر پولیس سٹیشن کے علاقہ میں واقع ہے اور خاص توجہ کا تقاضا کرتا ہے۔ مسلمانوں میں سے احمدیوں کا یہ عقیدہ ہے کہ مرحوم مرزا غلام احمد نبی تھے۔ یہ نبی یہاں پر پیدا ہوئے، بڑے ہوئے، یہیں پر زندگی گزاری اور یہیں پر ان کا انتقال ہوا اور یہیں

پر دفن ہوئے۔ قادیان احمدی عقائد کا پنگوڑھا ہے، یہیں سے اس نے ترقی کرنی شروع کی۔ یہاں کے ایک ایک ذرہ سے ان کی تاریخ وابستہ ہے۔ اور قادیانی واضح طور پر پاکستان کی حمایت کا اعلان کر چکے ہیں۔

1947ء میں پاکستان کی خالق جماعت یہ اعلان کر رہی تھی اور 1974ء میں قومی اسمبلی میں یہ الزام لگایا جا رہا تھا احمدیوں نے قیامِ پاکستان کی مخالفت کی تھی اور خود اپنے آپ کو مسلمانوں سے علیحدہ رکھا تھا۔ انّا للہ و انّا الیہ راجعون

بہر حال اٹارنی جنرل صاحب نے اپنے پیش کردہ الزام کو ثابت کرنے کے لئے الفضل کے کچھ حوالے پیش کرنے شروع کئے۔ انہوں نے کہا کہ الفضل 17 / جون 1947ء میں مرزا محمود احمد امام جماعتِ احمدیہ کا یہ بیان شائع ہوا تھا:۔

"آخر میں دعا کرتا ہوں کہ اے میرے رب! میرے اہلِ ملک کو تو سمجھ دے اور اوّل تو یہ ملک بٹے نہیں اور اگر بٹے تو اس طرح بٹے کہ پھر مل جانے کے راستے کھلے رہے ہیں۔"

الفضل کے اس شمارے میں حضرت خلیفۃ المسیح الثانی کی ایک طویل مجلسِ عرفان شائع ہوئی تھی۔ اس میں یہ فقرے یا اس مفہوم کی کوئی بات موجود نہیں ہے۔ اس ساری مجلسِ عرفان کے ارشادات مسلمانوں کی ہمدردی اور ان کی خیر خواہی کے جذبات سے پُر ہیں۔ اس مجلس میں حضور نے فرمایا کہ

"جب ہندوستان کے ہونے والے فسادات میں مسلمانوں پر کہیں پر ظلم ہوتا ہے تو انگلستان کے اخبارات ایک پالیسی کے تحت اسے شائع نہیں کرتے اور جب بھی مسلمانوں کے حقوق کا معاملہ اُٹھتا ہے تو یوروپین قومیں مسلمانوں کے مخالفین کے حق میں اور ان کے خلاف رائے رکھتی ہیں۔ حضور نے فرمایا کہ میں نے انگلستان میں اپنے مبلغین کو لکھا کہ تم لوگ وہاں بیٹھے کیا کر رہے ہو مسلمانوں کی حمایت میں مضامین کیوں نہیں لکھتے ان کے

خلاف پروپیگنڈا کی تردید کیوں نہیں کرتے؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ ہم تو لکھ رہے ہیں لیکن وہاں کے اخبارات اسے شائع نہیں کر رہے۔"

(الفضل 17 / جون 1947ص 1 تا 8)

خدا جانے اس مجلس عرفان میں اٹارنی جنرل صاحب کو کیا بات نظر آئی کہ انہوں نے یہ نتیجہ نکال لیا کہ احمدیوں نے خود اپنے آپ کو مسلمانوں سے علیحدہ رکھا ہے۔ اس مجلسِ عرفان میں تو حضور نے فرمایا تھا کہ امرتسر کے مسلمانوں پر ظلم ہوا، اس کا بدلہ دوسرے مقامات پر غیر مذاہب سے نہ لیں بلکہ اپنے بھائیوں کی مالی مدد کریں اور ان کے پاس جا کر ان سے اظہارِ یکجہتی کریں۔ اسی طرح 17 / مئی 1947ء کے الفضل میں بھی ایسی کوئی بات نہیں جس سے کسی طرح یہ مطلب اخذ کیا جا سکے کہ احمدی اپنے آپ کو باقی مسلمانوں سے علیحدہ رکھنا چاہتے تھے۔

جہاں تک 5 / اپریل، 12 / اپریل 1947ء کے شماروں کا تعلق ہے تو اس کا سوال 1953ء میں عدالتی تحقیقات میں بھی اُٹھایا گیا تھا۔ 5 / اپریل کی اشاعت میں خلاصہ تھا اور اس میں بعض الفاظ غلط شائع ہو گئے تھے اور 12 / اپریل کی اشاعت میں مجلس عرفان کا مکمل ریکارڈ شائع ہوا تھا اور سارا مضمون بالکل واضح ہو گیا تھا۔ یہاں پاکستان کے قیام کی مخالفت کا کوئی ذکر ہی نہیں تھا۔ ان دنوں ہندوستان میں ہندو مسلم فسادات ہو رہے تھے جگہ جگہ خون خرابہ ہو رہا تھا۔ حضور نے ایک رؤیا بیان فرما کر اس امید کا اظہار فرمایا تھا کہ شاید ہندوؤں اور مسلمانوں میں صلح اور یکجہتی کی کوئی صورت پیدا ہو جائے اور یہ فسادات بند ہو جائیں او ر آخر میں غیر احمدی مسلمانوں کے بارے میں فرمایا:۔

”یہ سب حالات بتاتے ہیں۔ کہ ہمارے اور ان کے درمیان ایک قدرتی اتحاد ہے اور ہم جسم کے ٹکڑوں کی طرح ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکتے۔ ان سے جدا ہونے کے معنے یہ ہوں گے۔ کہ پھلدار درخت تبر رکھ کر کاٹ دیا جائے۔ یاد رکھو ہماری جماعت کی ساری ترقی انہی کی وجہ سے ہوئی ہے اور آئندہ بھی انشاء اللہ ان کی وجہ سے ہو گی ... ہم پہلے تو یہی کوشش کریں گے کہ کہ ہندوستان مین یکجہتی پیدا ہو جائے۔ ورنہ ہم مسلمانوں کا ساتھ دیں گے۔“

(الفضل 12 / اپریل1947ء ص3)

الغرض کسی بھی زاویہ سے جائزہ لیا جائے اٹارنی جنرل صاحب پیش کردہ اعتراض کوئی بھی وزن نہیں رکھتا تھا۔ ایک بار پھر جعلی حوالہ پیش کر کے بھی وہ اپنے اعتراض کے مردہ میں جان نہیں ڈال سکے۔

اس کے بعد اٹارنی جنرل صاحب زیادہ تر انہی اعتراضات کو دہرا رہے تھے جو اس کمیٹی کے سامنے پہلے بھی پیش ہو چکے تھے۔ ایک بوسیدہ یہ اعتراض بھی پیش کیا کہ آپ کا مشن اسرائیل میں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ فلسطین میں احمدی اس وقت سے موجود ہیں جب کہ ابھی اسرائیل وجود میں بھی نہیں آیا تھا اور احمدیوں کی تعداد تو وہاں پر بہت کم ہے، باقی فرقوں کے مسلمان احمدیوں کی نسبت بہت بڑی تعداد میں موجود ہیں۔ وہاں احمدیوں کی بھی مسجد ہے اور غیر احمدی مسلمانوں کی بھی بہت سی مساجد ہیں۔ اس بات پر کسی طرح کوئی اعتراض اُٹھ ہی نہیں سکتا۔ احمدی تو اپنی غریبانہ آمد میں سے چندہ دے کر اپنا خرچہ چلاتے ہیں اور اس سے تبلیغ کا کام بھی کیا جاتا ہے۔ یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ اسرائیل کی فوج میں مسلمان فوجی بھی شامل ہیں اور اسرائیلی فوج بعض مسلمان اماموں کو کچھ رقم بھی دیتی ہے کہ تاکہ وہ مرنے والے مسلمان افراد کی آخری رسومات ادا کریں۔ اس

بات کا ذکر International Religious Freedom Report 2008 میں بھی موجود ہے جو کہ Bureau of Democracy, Human Rights, and Labor نے 2008ء میں شائع کی ہے۔

ہر سال کئی مسلمان (جو کہ احمدی نہیں ہیں) اسرائیل کی فوج میں شمولیت اختیار کرتے ہیں۔ خاص طور پر وہ مسلمان جو بدو گھرانوں سے تعلق رکھتے ہیں ہر سال خاطر خواہ تعداد میں اسرائیلی فوج میں شمولیت اختیار کرتے ہیں۔ 2000ء اور 2003ء کے درمیان اسرائیلی فوج میں داخل ہونے والے مسلمانوں میں ساٹھ فیصد سے زیادہ اضافہ ہوا تھا۔ (ملاحظہ کیجیے Haaretz 30 Dec. 2004 انٹرنیٹ پر موجود ہے)۔ اور مسلمانوں میں سے ایک صاحب Raleb Majdele کو تو اسرائیلی حکومت میں مرکزی وزیر بھی لگا دیا گیا تھا اور وہ 2009ء تک اس عہدے پر کام کرتے رہے۔ کئی سنی مسلمان اسرائیلی پارلیمنٹ Knesset کے ممبر رہ چکے ہیں اور اب تو ایک سنی خاتون Haneen Zoabi بھی اسرائیلی پارلیمنٹ کی ممبر بن گئی ہیں۔ ان حقائق کی موجودگی میں جماعتِ احمدیہ پر یہ اعتراض مضحکہ خیز ہے کہ اسرائیل میں کچھ احمدی کیوں موجود ہیں، وہاں انہوں نے مسجد اور مشن ہاؤس کیوں بنایا ہوا ہے۔ اگر یہ اعتراض ہونا چاہئیے تو دوسرے فرقوں سے وابستہ مسلمانوں پر ہونا چاہئیے۔

ایک اور نیا نکتہ جو اٹارنی جنرل صاحب نے منکشف فرمایا کہ جب حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے دہلی کا سفر کیا تو انہوں نے پولیس کی حفاظت کا مطالبہ کیوں کیا؟ پھر خود ہی یحیٰی بختیار صاحب کو اپنی غلطی کا احساس ہوا اور کہا کہ Everybody has right وہ میں نہیں کہہ رہا۔ اس پر حضور نے فرمایا کہ ہماری کتابوں میں ہے کہ پولیس سے Protection نہیں مانگی تھی۔ اس پر اٹارنی جنرل صاحب نے کہا کہ پولیس نے خود ہی کیا ہو گا۔ پولیس کی Protection میں وہ تقریر کیا کرتے تھے۔ اٹارنی جنرل صاحب کا ذہنی انتشار نہ جانے اور کیا کرشمے دکھاتا کہ سپیکر صاحب نے کہا کہ مغرب کی نماز کے لیے وقفہ ہوتا ہے۔

یہاں یہ جائزہ لینا ضروری ہے کہ اٹارنی جنرل صاحب کے اس سوال کی حقیقت کیا ہے۔ اوّل تو اگر یہ بات سچ بھی ہوتی تو یہ سمجھ میں نہیں آتی کہ اگر ایک شخص ایسی حالت میں جب کہ امنِ عامہ کو خطرہ ہو، پولیس کو حفاظت کے لیے کہے تو اس میں قابلِ اعتراض بات کون سی ہے۔ جب حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے 1891ء میں دہلی کا سفر کیا تو اس وقت مخالفت کا یہ عالم تھا کہ جس گھر میں حضور رہائش فرماتھے اس پر قتل کی نیت سے مسلسل بلوائیوں نے حملے کیے تھے۔ اور جب حضرت مسیح موعود علیہ السلام مباحثہ کے لیے جامع مسجد دہلی تشریف لے جا رہے تھے تو راستے میں حملہ کرنے کے لیے کچھ لوگ بندوقوں سمیت تیار تھے مگر خود ہی بگھی والوں نے راستہ تبدیل کر لیا۔ یہ اعتراض اُٹھانے والے یہ بھول گئے کہ جب آنحضرت ﷺ طائف کے سفر سے واپس تشریف لائے تو آپ مکہ میں داخل ہونے سے قبل حرا کے مقام پر رک گئے اور آپ نے مکہ کے ایک مشرک رئیس مطعم بن عدی کو پیغام بھجوایا کہ کیا میں تمہارے پڑوس میں داخل ہو سکتا ہوں۔ اس پر مطعم بن عدی نے خود بھی ہتھیار پہنے اور اپنے بیٹوں کو بھی مسلّح کرکے بیت الحرام کے قریب کھڑے ہو گئے اور یہ اعلان کیا کہ میں نے محمد (ﷺ) کوپناہ دی ہے اور آنحضرت ﷺ خانہ کعبہ میں تشریف لائے اور حجرِ اسود کو بوسہ دیا اور دو رکعت نماز پڑھی۔ (96)

اٹارنی جنرل صاحب نے یہ سوال کرتے ہوئے کئی تاریخی حقائق بھی غلط بیان فرمائے تھے۔ حقیقت یہ تھی کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے پولیس کو اپنی حفاظت کے لیے کہا ہی نہیں تھا بلکہ غیراحمدی علماء کو فرمایا تھا کہ وہ اس مناظرے کے لیے موقع کی مناسبت سے پولیس کا انتظام کر لیں۔ اور یہ بات بھی غلط ہے کہ اس موقع پر حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے پولیس کی حفاظت میں کوئی تقریر کی تھی۔ عملاً اس موقع پر کوئی تقریر ہوئی ہی نہیں تھی۔ اس موقع پر حضرت مسیح موعود علیہ السلام صرف بارہ خدام کے ساتھ جامع مسجد تشریف لے گئے تھے اور وہاں پر پانچ ہزار مخالفین کا مجمع تھا جنہوں نے پتھر اُٹھا رکھے تھے اور خون خوار

آنکھوں سے اس مبارک گروہ کو دیکھ رہے تھے۔ ایسے موقع پر صرف اللہ تعالیٰ کی خاص حفاظت ہی تھی جو اپنے مامور کی حفاظت کر رہی تھی ورنہ ایسے خطرناک مواقع پر پولیس کے چند سپاہی بھی کیا کر سکتے ہیں۔ مخالف علماء نے مناظرہ کرنے کی بجائے وہاں سے چلے جانا مناسب سمجھا تھا۔ جب حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے فرمایا کہ یہ علماء خدا کی قسم کھالیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام مادی جسم کے ساتھ آسمان پر زندہ موجود ہیں۔ تو ان علماء نے یہ جرأت بھی نہیں کی تھی۔

مغرب کے وقفہ کے بعد جب کہ ابھی جماعت کا وفد ہال میں نہیں آیا تھا تو سپیکر اسمبلی اس بات پر اظہارِ ناراضگی کرتے رہے کہ ممبران اکثر غیر حاضر رہتے ہیں۔ سپیکر صاحب نے کہا کہ ممبران نو بجے کے بعد ایک ایک کر کے ہاتھ میں بستہ لے کر کھسکنا شروع ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد جو کارروائی شروع ہوئی تو ایک سوال اس حوالہ سے بھی آیا کہ جماعتِ احمدیہ کے نزدیک حدیث کا کیا مقام ہے اور کیا جماعتِ احمدیہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے ارشادات و الہامات کو حدیث سے زیادہ وقعت دیتی ہے اور اس اعتراض کی تمہید یہ باندھی گئی کہ چونکہ آپ کے نزدیک قرآن کریم کی آیات بھی خدا تعالیٰ کی طرف سے نازل شدہ ہیں اور بانی سلسلہ احمدیہ کے الہامات بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں اس لئے نعوذُ باللہ احمدیوں کے نزدیک ان کا مقام ایک ہے اور اس طرح احمدی حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے الہامات و ارشادات کو نعوذُ باللہ احادیثِ نبویہ سے افضل سمجھتے ہیں۔ یہ صرف ایک بہتان تھا۔ جماعت احمدیہ کا پورا لٹریچر اس کی تردید کر رہا ہے۔ حضور نے اٹارنی جنرل صاحب کو یہ یاد کرایا قرآنِ کریم کے اس ارشاد کے مطابق جماعتِ احمدیہ کا عقیدہ تو یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کا ہر ارشاد اللہ تعالیٰ کی راہنمائی کے نتیجہ میں ہی ہے اور اس کی شان یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى (النجم : 5-4)

ترجمہ : اور وہ خواہشِ نفس سے کلام نہیں کرتا۔ یہ تو محض ایک وحی ہے جو اُتاری جاتی ہے

یہ آیاتِ کریمہ پڑھنے کے بعد حضور نے فرمایا ِ"جو واقعہ میں نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے اور جو ارشاد ہے، وہ اپنے نطق کا نہیں بلکہ خدا تعالیٰ کی تائید کے مطابق آپ کا وہ ارشاد ہے۔"

حضور کا ارشاد رتو واضح تھا لیکن حسبِ سابق اٹارنی جنرل صاحب نے پھر وہی بے بنیاد دہرائی اور کہا:۔

" اور جو خدا تعالیٰ کا ارشاد مرزا صاحب کو ہوا وہ حدیث سے بلند مرتبہ ہے اس کا کہ نہیں۔"

اس پر حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ نے فرمایا" ہر حدیثِ صحیح حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے الہام سے اس لئے بالا ہے کہ اس کا تعلق محمد رسول اللہ ﷺ سے ہے۔"

جب یہ گفتگو آگے چلی تو اٹارنی جنرل صاحب نے ایک مرحلہ پر کہا کہ مجھے تو ممبرانِ اسمبلی کی طرف سے جو سوال آئے اس کو پیش کرنا پڑتا ہے۔

اس اعتراض کے رد کے لیے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کا یہ ارشاد ہی کافی ہے آپ فرماتے ہیں:

"ہماری جماعت کا یہ فرض ہونا چاہئے کہ اگر کوئی حدیث معارض اور مخالفِ قرآن اور سنت نہ ہو تو خواہ کیسے ہی ادنیٰ درجہ کی حدیث ہو اس پر وہ عمل کریں اور انسان کی بنائی ہوئی فقہ پر اس کو ترجیح دیں۔" (97)

اس کارروائی کے دوران اٹارنی جنرل صاحب اور ان کی اعانت کرنے والی ٹیم کو اس مسئلہ کا مسلسل سامنا کرنا پڑ رہا تھا کہ وہ ایک موضوع پر سوالات کا سلسلہ تو شروع کر دیتے تھے لیکن اس موضوع کے بارے میں بنیادی معلومات سے بھی بے خبر ہوتے تھے۔ اب اٹارنی جنرل صاحب نے امتی نبی اور کسی شریعت کے تابع نبی کے مسئلہ پر ایک مرتبہ پھر سوالات شروع کئے۔ جب اپنے جواب میں حضور نے ارشاد فرمایا کہ on the wholeحضرت عیسیٰ علیہ السلام شریعت موسوی کی پابندی کرتے تھے۔ یہ سن کر اٹارنی جنرل صاحب نے ایک بار پھر حیران ہو کر دریافت فرمایا:۔

”یعنی حضرت عیسیٰؑ بھی شرعی نبی نہیں تھے؟“

اس پر حضور نے ایک بار پھر واضح فرمایا کہ حضرت عیسیٰؑ شرعی نبی نہیں تھے۔

اس اجلاس میں ان سوالات اور جوابات کی تکرار ہوتی رہی جن پر پہلے بھی بات ہو چکی تھی۔ ایک موقع پر اٹارنی جنرل صاحب نے یہ سوال اُٹھایا کہ جہاد کے مسئلہ کو چھوڑ کر وہ کون سا خزانہ تھا جو تیرہ سو سال سے مسلمانوں کو نہیں ملا تھا اور مرزا صاحب نے سامنے لا کر رکھ دیا؟

اوّل تو حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے صرف جہاد کے مسئلہ پر ہی مسلمانوں میں رائج غلط خیالات کی اصلاح نہیں فرمائی تھی بلکہ اور بہت سے پہلو تھے جن پر آپ کی مبارک آمد کے ساتھ غلط خیالات کی دھند چھٹنے لگی۔ بہر حال حضور نے قرآنی آیات پڑھ کر فرمایا کہ قرآنِ کریم جہاں ایک کھلی کتاب ہے وہاں یہ کتابِ مکنون بھی ہے۔ پھر حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ نے مختلف پرانے بزرگوں کی مثالیں پڑھ کر سنائیں کہ جن پر ان کے دور کے لوگوں نے اس وجہ سے کفر کے فتوے لگائے کہ آپ وہ باتیں کرتے ہیں جو آپ سے پہلے بزرگوں نے نہیں کیں۔ حضور نے فرمایا کہ اس دور کے تمام مسائل کا حل بھی قرآنِ کریم میں موجود ہے اور فرمایا کہ میں اپنی ذات کے متعلق بات کرنا پسند نہیں کرتا لیکن مجبوری ہے اور پھر بیان فرمایا کہ 1973ء کے دورہ یورپ کے دوران میں نے ایک پریس کانفرنس میں ذکر کیا تھا کہ کمیونزم جو حل آج پیش کر رہا ہے اس سے کہیں زیادہ بہتر علاج قرآنِ کریم نے بیان فرمایا ہے۔ مزید فرمایا کہ کون سے مخفی خزانے تھے جو اس Ageمیں جماعتِ احمدیہ کے ذریعہ ظاہر ہوئے۔ چنانچہ ان کے مطابق میں یہ کہوں گا کہ میرا یہ دعویٰ نہیں کہ پہلی ساری کتب پر

مجھے عبور ہے۔ اگر کسی صاحب کو عبور ہو کہ وہ آج کے مسائل حل کرنے کے لیے پہلی کتب میں سے مواد نکال دیں تو میں سمجھوں گا کہ وہ ٹھیک ہیں۔ جب اس موضوع پر بات چلی تو اٹارنی جنرل صاحب نے سوال کیا کہ کوئی اور مثال دی جائے جو حضرت بانی سلسلہ احمدیہ نے نکتہ بیان کیا ہو اور پہلے علماء نے نہ بیان کیا ہو۔

اس پر حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ نے سورۃ فاتحہ کی تفسیر کی مثال دی اور اس کی کچھ تفصیلات بیان فرمائیں کہ کس طرح حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے سورۃ فاتحہ کی تفسیر کے وہ نکات بیان فرمائے تھے کو پہلے کسی عالم نے بیان نہیں کئے تھے۔ اور اس ضمن میں حضور نے بیان فرمایا کہ کس طرح حضور نے ڈنمارک میں حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے چیلنج کو دہرایا تھا کہ عیسائی اپنی مقدس کتب میں وہ خوبیاں نکال کر دکھائیں جو سورۃ فاتحہ میں موجود ہیں۔ پھر اٹارنی جنرل صاحب اس موضوع پر سوال کرتے رہے کہ قرآنِ کریم سے نیا استدلال کوئی غیر نبی بھی کر سکتا ہے۔ یقیناً تاریخِ اسلام میں بہت سے ایسے علماءِ ربّانی گزرے ہیں جنہوں نے قرآنِ کریم سے استدلال کر کے لوگوں کی ہدایت کا سامان کیا ہے انہیں الہامات بھی ہوتے تھے لیکن یہ خدا کی مرضی ہے کہ کب اس کی حکمتِ کاملہ اس بات کا فیصلہ کرتی ہے کہ دنیا کی اصلاح اور دنیا کو قرآنِ کریم کے نور سے منور کرنے کے لئے نبی کو آنا چاہیئے اور یہ کہ کب وہ دینِ اسلام کی تجدید کے لئے مجدّدین کو دنیا میں بھیجتا ہے۔ یہ ایسی بات نہیں ہے کہ دنیا کی کوئی اسمبلی اور وہ بھی پاکستان کی اسمبلی اس بات کا فیصلہ کرے کہ دنیا میں نبی آنا چاہیئے یا مجدّد کا ظہور ہونا چاہیئے۔

اس کے بعد ایک بار پھر جہاد کے موضوع پر سوالات شروع ہوئے۔ چونکہ اٹارنی جنرل صاحب کے سوالات اس بات کو ظاہر کر رہے تھے کہ جہاد کی قرآنی فلاسفی کے بارے میں ان کا ذہن واضح نہیں ہے۔ اس بات کو واضح کرنے کے لئے حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ نے فرمایا:۔

” ... اسلامی لٹریچر میں اور نبی اکرم ﷺ کے ارشادات میں تین جہادوں کا ذکر ہے۔ایک کو ہمارا لٹریچر کہتا ہے ” جہادِ اکبر“ اور اس کا مفہوم یہ لیا جاتا ہے ” اپنے نفس کے خلاف جہاد ، محاسبہ نفس، self criticism اصلاحِ نفس کی خاطر“ اس کو اسلامی اصطلاح میں”جہادِ اکبر“ کہتے ہیں۔

اور ایک اسلامی اور قرآنِ کریم کی اصطلاح میں آتا ہے” جہادِ کبیر “ اور وہ قرآنِ عظیم اور اسلام کی تبلیغ اور اشاعت کا نام قرآنِ کریم میں آیا ہے: ... (آگے ریکارڈ میں آیت درج نہیں کی گئی)

قرآنِ کریم کو لے کر دنیا میں اس کی اشاعت کا جو کام ہے وہ قرآنی اصطلاح میں ”جہادِ کبیر “ کہلاتا ہے۔

اور ایک جہادِ صغیر اور وہ تلوار کی جنگ یا اب جنگ کے حالات بدل گئے،اب بندوق یا ایٹم بم سے ہونے لگ گئی بہر حال مادی ذرائع سے انسانی جان کی حفاظت کے لئے یا لینے کے لئے تیار ہوجانا یہ ہے جہادِ صغیر ...

قرآنِ کریم کی آیت ہے کہ اس قرآنِ کریم کو لے کے دنیا میں پھیلواور اس ہدایت اور شریعت کو پھیلانے کا جہاد کرو، تبلیغ کا جہاد کرو۔“

حضور نے فرمایا کہ

جہادِ کبیر تو جاری ہے لیکن مسیح موعود علیہ السلام کے زمانے میں جہادِ صغیر کی شرائط پوری نہیں ہوئیں۔ایک سوال کے جواب میں حضور نے فرمایا کہ اگرجہادِ صغیر کی شرائط پوری ہوں تو احمدی بھی باقی مسلمانوں کے ساتھ مل کر لڑیں گے۔جماعتِ احمدیہ کے مخالفین کی طرف سے یہ اعتراض تو بہت کیا جاتا ہے کہ بانی سلسلہ احمدیہ نے یہ کہا کہ اس وقت ہندوستان کی انگریز حکومت کے خلاف جہاد بالسیف جائز نہیں ہے لیکن یہ اعتراض تو پلٹ کر ان پر آتا تھا کہ اس وقت وہ خود کیا کر رہے تھے۔حضور نے پہلی جنگ ِ عظیم کے دور کے حالات بیان فرمائے کہ اس وقت ترکی کی حکومت جرمنی کی اتحادی بن کے اتحادیوں کے خلاف جنگ کر رہی تھی اور دوسری

طرف سعودی خاندان اور شریف مکہ کا خاندان انگریزوں سے بھاری وظیفہ اور اسلحہ لے کر ترکی کی سلطنتِ عثمانیہ کے خلاف سرگرمیوں میں مصروف تھے اور ان کا یہ فتویٰ تھا کہ ترکی کی حکومت کی یہ جنگ جہاد نہیں ہے۔

تاریخ کی ستم ظریفی دیکھئے کہ اب اسی سعودی حکومت سے وظیفے لے کر پاکستان کے مولوی یہ پروپیگنڈا کر رہے تھے کہ نعوذُ باللہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے انگریز حکومت کو خوش کرنے کے لئے یہ فرمایا تھا کہ اس وقت جہادِ صغیر جائز نہیں۔

اس بحث کے دوران اٹارنی جنرل صاحب نے یہ سوال کیا کہ کیا شاہ عبد العزیز صاحب نے ہندوستان کو دارالحرب قرار دیا تھا کہ نہیں؟ حضور نے فرمایا کہ اس بات کا حوالہ کیا ہے کہ شاہ عبدالعزیز صاحب نے ہندوستان کو دارالحرب قرار دیا تھا؟معلوم ہوتا ہے کہ اٹارنی جنرل صاحب اب غلط اور نامکمل حوالوں کو پیش کرنے کی شرمندگی سے عاجز آ چکے تھے۔ ممبران اسمبلی غلط حوالوں کے ساتھ سوال کرتے تھے اور شرمندگی یحییٰ بختیار صاحب کو اُٹھانی پڑتی تھی۔ اب انہوں نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ جماعت کے مخالفین کے دیئے ہوئے حوالے کم سے کم پیش کئے جائیں۔ انہوں نے یہ عجیب جواب دیا

”کوئی بھی نہیں۔ میں اس واسطے کہہ رہا ہوں کہ میں نے ان کے حوالے بند کرادیئے ہیں۔“

اس پر حضور نے فرمایا:۔

”... یہ اس قسم کا سوال ہے جس کا جواب دینے کی ضرورت نہیں۔“

واضح رہے کہ شاہ عبد العزیز صاحب ، حضرت شاہ ولی اللہؒ کے بڑے صاحبزادے تھے لیکن اس موقع پر بھی اٹارنی جنرل صاحب نے غلط مثال پیش کرنے کی نیم دلانہ کوشش کی تھی۔ یہ حقیقت ہے کہ ان کی طرف

ایک فتویٰ منسوب ہے جس میں ہندوستان کے ان علاقوں کو جن پر اس وقت نصاریٰ کی حکومت تھی، دارالحرب قرار دیا تھا۔

(فتاویٰ عزیزی ، از شاہ عبدالعزیز صاحب۔ ناشر سعید کمپنی ص421و422)

یہ مثال اس لئے غیر متعلقہ تھی کہ اس وقت یہ بحث ہو رہی تھی کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے زمانے میں جہاد بالسیف کی شرائط پوری ہو رہی تھیں کہ نہیں اور اس وقت علماء کے فتاویٰ کیا تھے اور شاہ عبد العزیز صاحب تو حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی پیدائش سے قبل ہی1823 ء میں فوت ہو چکے اور یہ فتویٰ تو اس وقت سے بھی پہلے کا ہے اور یہ فتویٰ ان کی وفات سے پہلے کا ہے اور جیسا کہ فتویٰ کے الفاظ ظاہر کرتے ہیں اس وقت انگریز حکومت ہندوستان میں پوری طرح قائم نہیں ہوئی تھی ہر طرف چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم تھیں جو کہ ایک دوسرے سے بر سرِ پیکار تھیں اور یہ بھی حقیقت ہے کہ اس فتویٰ میں فقط دارالحرب کی اصطلاح استعمال ہوئی ہے ، کسی کے خلاف قتال کا فتویٰ نہیں دیا گیا اور نہ خود شاہ عبد العزیز صاحب نے ساری عمر انگریز حکمرانوں کے خلاف کسی قتال میں شرکت کی۔

ابھی یہ موضوع جاری تھا کہ 21/ اگست کی کارروائی ختم ہوئی۔

22 / اگست کی کارروائی

22/ اگست کو بھی اسی موضوع پر گفتگو جاری رہی کہ جہاد بالسیف کا زمانہ اس وقت نہیں ہے۔ کب تک یہ جہاد ملتوی رہے گا۔ ایسا کیوں ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔ زیادہ تر پرانے سوالات ہی دہرائے جا رہے تھے۔ صرف ایک حدیث اس ساری بحث کا فیصلہ کر دیتی ہے۔ اس حدیث میں آنحضرت ﷺ نے مسیح موعود کی آمد کی نشانیاں بیان فرمائیں اور دیگر نشانیوں کے علاوہ آنحضرت ﷺ نے ایک نشانی یَضَعُ الْحَرْبَ کی بھی بیان فرمائی ہے یعنی مسیح موعود کی آمد کے مقاصد میں سے ایک یہ بھی ہو گا کہ وہ جنگوں کا خاتمہ کرے گا۔ (98)

یہ اعتراض بھی جماعتِ احمدیہ کے خلاف بڑے زور و شور سے پیش کیا جاتا ہے کہ جماعتِ احمدیہ جہاد کی قائل نہیں اور یہ ایک اہم رکن اسلام کا ہے اور یہ جماعت اس کی منکر ہے۔ دیگر اعتراضات کی طرح یہ اعتراض بھی معقولیت سے قطعاً عاری ہے۔ اس کا سادہ سا جواب یہ ہے کہ جماعتِ احمدیہ قطعاً جہاد کی منکر نہیں ہے بلکہ قرآنِ کریم اور نبی اکرم ﷺ کے بیان کردہ معیار کے مطابق پوری دنیا میں حقیقی معنوں میں جماعتِ احمدیہ ہی جہاد کر رہی ہے جب کہ جماعتِ احمدیہ پر الزام لگانے والے اس اہم فرض سے مسلسل غفلت برت رہے ہیں۔ لیکن یہ بحث اٹھانے سے قبل یہ دیکھنا ضروری ہے کہ جہاد کہتے کسے ہیں۔ قرآنِ کریم نے اس کے بارے میں کیا تعلیم دی ہے۔ آنحضرت ﷺ نے اس کے بارے میں کیا راہنمائی فرمائی ہے۔ یہ باتیں سمجھے بغیر تو یہ فیصلہ نہیں کیا جا سکتا ہے کہ کون جہاد کا منکر ہے اور کون جہاد کا منکر نہیں ہے۔

22/ اگست کی کارروائی کے شروع میں جب یہ ذکر چلا کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے زمانے میں جیسا کہ آنحضرت ﷺ نے پیشگوئی فرمائی تھی، دین کے نام پر قتال یعنی جہادِ صغیر کی شرائط پوری نہیں ہوتی

تھیں۔ تو اس دوران اٹارنی جنرل صاحب نے یہ انوکھا نکتہ بیان کیا کہ اس دور میں مہدی سوڈانی نے تو قتال کا فتویٰ دیا تھا اور انگریزوں کے خلاف جنگ کی تھی۔ یہ کوئی دلیل نہیں تھی۔ جماعتِ احمدیہ کے نزدیک مہدی سوڈانی کا کوئی فعل سند نہیں۔ اب کتنے مسلمان اس کو مہدی تسلیم کرتے ہیں کہ اس کا فعل اور فتویٰ سند ہو۔ اگر وہ مہدیِ برحق ہوتا تو اس کی تحریک کا یہ انجام نہ ہوتا کہ بالآخر صفر ہوجاتی۔ اس کے علاوہ چند اور حقائق قابلِ توجہ ہیں۔ مہدی سوڈانی توجماعتِ احمدیہ کے قیام سے قبل ہی 1885ء میں انتقال کر گیا تھا۔ البتہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے دورِ ماموریت کے دوران اس کے خلیفہ اور انگریزوں کے درمیان جنگ ہوئی تھی اور اس دور میں جامع ازہر کے علماء نے مہدی سوڈانی اور اس کے فرقہ کے خلاف کفر کا فتویٰ دیا تھا۔ (اسلامی انسائیکلو پیڈیا ص1391)

سب سے پہلے تو یہ دیکھنا چاہئے کہ جہاد کا حکم کب نازل ہوا اور آنحضرت ﷺ نے اپنے عمل سے اس کی کیا تشریح فرمائی۔ یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ جہاد کا حکم آنحضرت ﷺ کی حیاتِ مبارکہ کے مکی دور میں نازل ہو چکا تھا۔ اللہ تعالیٰ سورۃ الفرقان میں ارشاد فرماتا ہے۔

فَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا (الفرقان : 53)

یعنی کافروں کی پیروی نہ کر اور اس کے ذریعہ ان سے ایک بڑا جہاد کر۔

مفسرین اس آیت کریمہ سے یہی مطلب لیتے رہے ہیں کہ اس میں قرآنِ کریم کے ذریعہ جہاد کرنے کا حکم ہے۔ چنانچہ تفسیر کی مشہور کتاب فتح البیان میں یہی لکھا ہوا ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر جہاد سے صرف یہی مراد تھی کہ قتال کیا جائے اور جنگ کی جائے تو نا ممکن تھا کہ اس حکم کے بعد رسولِ کریم ﷺ اور آپ کے صحابہ مکی زندگی میں ہی بلا توقف قتال اور جنگ

شروع نہ کر دیتے۔ جب کہ اس وقت مسلمانوں کی مذہبی آزادی بھی ہر طرح سلب کی جا رہی تھی۔ لیکن ایسا نہیں ہوا اور جب قرآنِ کریم میں قتال کی مشروط اجازت مدنی زندگی میں نازل ہوئی تو مسلمانوں کو اپنے دفاع میں انتہائی مجبوری کی حالت میں تلوار اُٹھانی پڑی۔

پھر مکہ میں نازل ہونے والی سورتوں میں جہاد کرنے والوں کا ذکر بھی مل جاتا ہے۔ چنانچہ سورۃ النحل جو کہ مکہ میں نازل ہوئی تھی میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

ثُمَّ إِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِيْنَ هَاجَرُواْ مِن بَعْدِ مَا فُتِنُواْ ثُمَّ جَاهَدُواْ وَصَبَرُواْ إِنَّ رَبَّكَ مِن بَعْدِهَا لَغَفُورٌرَّحِيْم(النحل 111:)

ترجمہ۔ پھر تیرا رب یقیناً ان لوگوں کو جنہوں نے ہجرت کی بعد اس کے کہ وہ فتنہ میں مبتلا کئے گئے پھر انہوں نے جہاد کیا اور صبر کیا تو یقینا تیرا رب اس کے بعد بہت بخشنے والا (اور) بار بار رحم کرنے والا ہے۔

یہ تو مکی زندگی میں نازل ہونے والی آیت ہے۔ اس وقت بھی مسلمان جہاد کا عظیم فرض ادا کر رہے تھے۔ اگرچہ باوجود سخت آزمائشوں کے قتال نہیں کیا جا رہا تھا۔ جبکہ اس وقت مسلمان جہاں پر رہ رہے تھے وہاں پر مشرکین کی حکومت تھی۔

پھر قرآنِ کریم سے ہی یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ جہاد مال سے بھی کیا جاتا ہے۔ جیسا کہ سورۃ الانفال میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ

وَجَاهَدُواْ بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (الانفال : ۷۳)

یعنی انہوں نے اموال اور جانوں کے ساتھ اللہ کی راہ میں جہاد کیا۔

اس آیتِ کریمہ سے واضح ہو جاتا ہے کہ جہاد مال سے بھی کیا جاتا ہے۔

پھر یہ دیکھنا ضروری ہے کہ رسولِ کریم ﷺ کے اس ضمن میں کیا ارشادات ہیں۔ آنحضرت ﷺ کے ارشاد کے ماتحت مجاہد کسے کہتے ہیں۔

آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے کہ

”اَلْمُجَاھِدُ مَنْ جَاھَدَ نَفْسَه “

یعنی مجاہد وہ ہے جو اپنے نفس سے جہاد کرے۔

(جامع ترمذی ابواب فضائل الجھاد)

پھر رسول کریم ﷺ نے فرمایا۔

” جَاھِدُوا الْمُشْرِکِیْنَ بِاَمْوَالِکُمْ وَ اَنْفُسِکُمْ وَ اَلْسِنَتِکُمْ “

یعنی مشرکین سے اپنے اموال سے اپنی جانوں سے اور اپنی زبانوں سے جہاد کرو۔

(سنن ابی داوٗد باب کراھیۃ ترک الغزو)

پھر رسولِ کریم ﷺ فرماتے ہیں:۔

”اِنَّ مِنْ اَعْظَمِ الْجِھَادِ کَلِمَۃَ عَدْلٍ عِنْدَ سُلْطَانٍ جَائِرٍ“

یعنی ظالم بادشاہ کے سامنے کلمہ حق کہنا جہاد کی ایک سب سے عظیم قسم ہے

(جامع ترمذی باب افضل الجھاد کلمۃ عدل عند سلطان جائر)

ان ارشاداتِ نبویہ سے یہ بات ظاہر ہے کہ جہاد صرف جنگ کرنے کو یا تلوار اُٹھانے کو نہیں کہتے۔ اس کے بہت وسیع معانی ہیں اور ان وسیع معانی کو محض قتال تک محدود کر دینا ایک نادانی ہے بلکہ رسولِ کریم ﷺ نے قتال کو جہادِ صغیر قرار دیا ہے۔ چنانچہ ایک غزوہ سے واپسی پر آنحضرت ﷺ نے فرمایا

"رَجَعْنَا مِنَ الْجِهَادِ الْاَصْغَرِ اِلَی الْجِهَادِ الْاَکْبَرِ"

یعنی ہم چھوٹے جہاد سے بڑے جہاد کی طرف واپس آرہے ہیں۔

(رد المختار علی الدر المختار، کتاب الجہاد)

اور جہاں تک قتال کا تعلق ہے یہ دیکھنا چاہئے کہ شریعت نے اس کے لئے جو شرائط مقرر کی ہیں وہ پوری ہو رہی ہیں کہ نہیں۔ وہ علماء بھی جو جماعت کی مخالفت میں ایڑی چوٹی کا زور لگاتے رہے ہیں، انہوں نے بھی اپنی تحریرات میں یہ شرائط بڑی تفصیل سے بیان کی ہیں۔ اور جب 22/ اگست کو جہاد کے مسئلہ پر بات شروع ہوئی اور اس موضوع پر بات ہو رہی تھی کہ احمدیوں کے نزدیک قتال کی شرائط کیا ہیں۔ اس پر حضور نے فرمایا کہ ابھی ہم فلسفیانہ بات کر رہے ہیں۔ ہمیں یہ بھی تو دیکھنا چاہئے کہ قتال کی شرائط کے بارے میں ہمارے بھائیوں کا کیا فتویٰ ہے۔ پھر آپ نے فرمایا میں مثال کے طور اہلِ حدیث کا فتویٰ بیان کرتا ہوں۔ اور پھر آپ نے اہلِ حدیث کے مشہور عالم نذیر حسین صاحب دہلوی کا فتویٰ سنایا جو انہوں نے انگریز کے دورِ حکومت میں ہی دیا تھا۔ ہم فتاویٰ نذیری سے ہی یہ فتویٰ نقل کر دیتے ہیں۔

"... مگر جہاد کی کئی شرطیں ہیں جب تک وہ نہ پائی جائیں جہاد نہ ہو گا۔

اوّل یہ کہ مسلمانوں کا کوئی امامِ وقت و سردار ہو۔ دلیل اس کی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کلامِ مجید میں ایک نبی کا انبیاءِ سابقین سے قصہ بیان فرمایا ہے کہ ان کی امت نے کہا کہ ہمارا کوئی سردار اور امامِ وقت ہو تو

ہم جہاد کریں۔ اَلَمْ تَرَ اِلَی الْمَلَاِ مِنْ بَنِیْ اِسْرَائِیْلَ مِنْ بَعْدِ مُوْسٰی اِذْ قَالُوْا لِنَبِیٍّ لَّهُمُ ابْعَثْ لَنَا مَلِكًا نُّقَاتِلْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ۔ اَ لْآیۃ۔ اس سے معلوم ہوا کہ جہاد بغیر امام کے نہیں کیونکہ اگر بغیر امام کے جہاد ہوتا تو ان کو یہ کہنے کی حاجت نہ ہوتی کَمَا لَا یخفٰی اور شَرَائِع مِنْ قَبْلِنَا جب تک اس کی ممانعت ہماری شرع میں نہ ہو، حجت ہے۔ کَمَا لَا یَخْفٰی عَلَی الْمَعَاصِرِ بِالْاُصُوْلِ۔ اور حدیث میں آیا ہے کہ امام ڈھال ہے، اس کے پیچھے ہو کر لڑنا چاہئے اور اس کے ذریعہ سے بچنا چاہئے۔ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِنَّمَا الْاِمَامُ جُنَّةٌ یُّقَاتَلُ مِنْ وَّرَآئِهٖ وَ یُتَّقٰی بِهٖ۔ الحدیث رواہ البخاری و مسلم۔ اس سے صراحتًا یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ جہاد امام کے پیچھے ہو کر کرنا چاہئے بغیر امام کے نہیں۔

دوسری شرط کہ اسباب لڑائی کا مثل ہتھیار وغیرہ کے مہیا ہو جس سے کفار کا مقابلہ کیا جاوے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:۔

وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّ مِنْ رِّبَاطِ الْخَیْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَ عَدُوَّكُمْ وَ اٰ خَرِیْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ۔ اَلآیۃ ۔

(ترجمہ)۔ اور سامان تیار کرو ان کی لڑائی کے لئے جو کچھ ہو سکے تم سے، ہتھیار اور گھوڑے پالنے سے اس سے ڈراؤ اللہ کے دشمن کو اور اپنے دشمنوں کو ...

یعنی قوت کے معنی ہتھیار اور سامانِ لڑائی کے ہیں اور فرمایا اللہ تعالیٰ نے

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا خُذُوْا حِذْرَكُمْ فَانْفِرُوْا ثُبَاتًا اَوِ انْفِرُوْا جَمِیْعًا

(ترجمہ)۔ اے ایمان والو! اپنا بچاؤ پکڑو، پھر کوچ کرو جدا جدا فوج یا سب اکٹھے ...

یعنی حذر سے مراد لڑائی ہے۔ مثلاً ہتھیار وغیرہ کا مہیا ہونا ضروری ہے اور حدیثوں سے بھی اس کی تاکید معلوم ہوتی ہے اور ظاہر ہے کہ بغیر ہتھیار کے کیا کرے گا۔

تیسری شرط یہ ہے کہ مسلمانوں کا کوئی قلعہ یا ملک جائے امن ہو کہ ان کا ماویٰ و ملجا ہو چنانچہ قرآن کے لفظ مِنْ قُوَّۃٍ کی تفسیر عکرمہ نے قلعہ کی ہے۔ قَالَ عِکْرمۃ اَلْقُوَّۃُ اَلْحُصُوْنُ اِنْتَھٰی مَا فِی الْمَعَالِمِ التَّنْزِیْلِ لِلْبَغْوِیّ اور حضرت ﷺ نے جب تک مدینہ میں ہجرت نہ کی اور مدینہ جائے پناہ نہ ہوا جہاد فرض نہ ہوا، یہ صراحۃً دلالت کرتا ہے کہ جائے امن ہونا بہت ضروری ہے۔

چوتھی شرط یہ ہے کہ مسلمانوں کا لشکر اتنا ہو کہ کفار کے مقابلہ میں مقابلہ کر سکتا ہو یعنی کفار کے لشکر سے آدھے سے کم نہ ہو ...“

(فتاویٰ نذیریہ جلد سوم ص282۔284)

اس فتویٰ سے ظاہر ہے کہ جہاد امامِ وقت کے حکم اور اس کی اتباع کے بغیر ہو ہی نہیں سکتا اور اگر امام الزمان قتال سے روک رہا ہو تو پھر اس کو جہاد نہیں قرار دیا جا سکتا۔ دراصل یہ اعتراض تو احمدیوں پر ہو ہی نہیں سکتا۔ اس ضمن میں ان کے عقائد تو بہت واضح ہیں۔ اگر الزام آتا ہے تو ان فرقوں پر آتا ہے جن کے عقائد تو یہ تھے کہ قتال فرض ہے اور سو سال انگریز نے ان پر حکومت کی اور وہ محض ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھے رہے۔ بلکہ لاکھوں کی تعداد میں انگریز کی فوج میں شامل ہو کر ان کی طرف سے لڑتے رہے بلکہ اس مقصد کے لئے مسلمانوں پر بھی گولیاں چلاتے رہے اور جب انگریز یہاں سے رخصت ہو گیا تو انہیں یاد آیا کہ انگریز سے لڑنا بہت ضروری تھا اور احمدیوں پر اعتراض شروع کر دیا کہ وہ جہاد کے قائل نہیں۔

اب جماعتِ اسلامی کی مثال لے لیں۔ ان کی طرف سے یہ اعتراض بارہا کیا گیا کہ احمدی جہاد یعنی قتال کے قائل نہیں ہیں۔ انگریز ابھی ہندوستان پہ حکمران تھا کہ جماعتِ اسلامی کی بنیاد رکھی جا چکی تھی۔ اور جماعتِ اسلامی کا اعلان ہی یہ تھا کہ وہ ملک میں حکومتِ الٰہیہ قائم کرنے کے لئے کھڑی ہوئی ہے۔ اور جب اسی دور میں ان کے بانی مودودی صاحب نے اپنے لائحہ عمل کا اعلان کیا تو اس کے الفاظ یہ تھے:۔

"جماعت کا ابتدائی پروگرام اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ ایک طرف اس میں شامل ہونے والے افراد اپنے نفس اور اپنی زندگی کا تزکیہ کریں اور دوسری طرف جماعت سے باہر جو لوگ ہوں (خواہ وہ غیر مسلم ہوں یا ایسے مسلمان ہوں جو اپنے دینی فرائض اور دینی نصب العین سے غافل ہیں) ان کو بالعموم حاکمیتِ غیر اللہ کا انکار کرنے اور حاکمیت رب العالمین کو تسلیم کرنے کی دعوت دیں۔ اس دعوت کی راہ میں جب تک کوئی قوت حائل نہ ہو، ان کو چھیڑ چھاڑ کی ضرورت نہیں۔ اور جب کوئی قوت حائل ہو، خواہ کوئی قوت ہو، تو ان کو اس کے علی الرغم اپنے عقیدہ کی تبلیغ کرنی ہو گی۔ اور اس تبلیغ میں جو مصائب بھی پیش آئیں ان کا مردانہ وار مقابلہ کرنا ہو گا۔"

(مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصہ سوئم صفحہ آخر)

پڑھنے والے خود دیکھ سکتے ہیں کہ جب انگریز حکومت ہندوستان میں موجود تھی اس وقت تک جماعتِ اسلامی کا مسلک یہی تھا کہ اگر تو تبلیغ کی راہ میں کوئی قوت حائل نہیں تو کسی قسم کی چھیڑ چھاڑ تک نہیں کرنی۔ اور اگر قوت حائل بھی ہو تو اس کو تبلیغ کرو اور بس۔ یہ واضح طور پر اس بات کی ہدایت ہے کہ تم نے قتال نہیں کرنا۔

جب اس موضوع پر بات آگے بڑھی تو حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ نے فرمایا کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے یہ تعلیمات پیش فرمائی ہیں کہ یہ نظریہ جس کا عیسائی مناد اس زور و شور سے پرچار کر رہے ہیں کہ اسلام تلوار اور جبر کے زور سے پھیلا ہے سراسر غلط اور خلافِ واقعہ ہے۔ اور اسلام نے تو ہر طرح کے مظالم کا سامنا کر کے یہ تعلیم دی ہے کہ لَآ اِکۡرَاہَ فِی الدِّیۡنِ یعنی دین کے معاملہ میں کسی قسم کا جبر نہیں ہے اور جو لوگ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلا ہے وہ اپنے دعویٰ میں جھوٹے ہیں کیونکہ اسلام کی تاثیرات اپنی اشاعت کے لئے کسی جبر کی محتاج نہیں ہیں اور یہ خیال بھی لغو ہے کہ اب ایسا کوئی مہدی یا مسیح آئے گا جو تلوار چلا کر لوگوں کو اسلام کی طرف بلائے گا۔

اس کے دوران حضورؒ نے فرمایا کہ یہ تصور ہی احمقانہ ہے کہ جبر کے ساتھ عقائد تبدیل کئے جائیں۔ اب معلوم ہوتا ہے کہ اٹارنی جنرل صاحب اس بات سے خوش نہ تھے کہ بحث اس روش کی طرف جائے چنانچہ انہوں نے کہا:۔

”کوئی مسلمان عالم جو ہے وہ جانتا ہے کہ تلوار کے زور سے اسلام کبھی نہیں پھیلایا جا سکتا۔“

پھر انہوں نے کہا کہ اس پر تو کوئی dispute ہی نہیں۔ اس کے بعد انہوں نے اسی بات کا اعادہ ان الفاظ میں کیا۔

” اسلام تلوار کے زور سے کوئی پھیلانا چاہتا ہے یہ غلط conception ہے۔ سب مسلمان جانتے ہیں کہ اسلام میں defensive war ہے۔“

حقیقت یہ ہے کہ دلائل کے دباؤ کی وجہ سے اٹارنی جنرل صاحب خلافِ واقعہ دعویٰ کر رہے تھے ورنہ مسلمانوں میں جو غلط اور فاسد خیالات پھیلائے گئے ہیں، ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اسلام کی اشاعت میں

تلوار کا بہت کچھ ہاتھ ہے اور اسلام صرف دفاع کے لئے جنگ نہیں بلکہ جارحیت کے لئے جنگ کی اجازت بلکہ حکم دیتا ہے۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے ان غلط نظریات کی تردید فرمائی ہے ... کچھ دیر کے بعد ہم مودودی صاحب کا یہ دعویٰ درج کریں گے کہ اسلام کی اشاعت میں تلوار کا نہایت اہم حصہ ہے۔ اس حوالے سے مودودی صاحب اور جماعتِ اسلامی کے خیالات تو واضح ہو جاتے ہیں۔ پاکستان کے مشہور مصنف اور مذہبی شخصیت ڈاکٹر طاہر القادری صاحب کے خیالات ملاحظہ ہوں۔ وہ لکھتے ہیں:

"... جارحیت کا ذکر معذرت خواہانہ انداز میں کرنے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں باطل کا سر کچلنے کے لئے جارحانہ اقدام کے بغیر چارہ ممکن نہیں۔ گھر میں بیٹھ کر اپنے آپ کو صرف مدافعت تک محدود کر دینے سے غلبہ حق کا ہر تصور ہوا میں تحلیل ہو کر رہ جائے گا۔"

(سیرۃ الرسول ﷺ۔ مصنفہ طاہر القادری۔ جلد ہشتم۔ ناشر منہاج القرآن پبلیکیشنز۔ ص63)

پھر لکھتے ہیں :

"بد قسمتی سے دورِ حاضر کے سیرت نگاروں نے مستشرقین کے بے بنیاد اعتراضات سے خائف ہو کر جہاد کو مدافعانہ جنگ سے تعبیر کرنا شروع کر دیا۔"

(سیرۃ الرسول ﷺ۔ مصنفہ طاہر القادری۔ جلد ہشتم۔ ناشر منہاج القرآن پبلیکیشنز۔ ص64)

اس کے بعد طاہر القادری صاحب یہ خوفناک نتیجہ نکالتے ہیں۔

"مسلمانوں کی ساری جنگیں مدافعانہ (defensive) نہیں تھیں۔ محض دفاع کمزوروں کا ہتھیار ہے حالانکہ اسلام کسی کمزوری کا نہیں خیر کی قوتِ کثیر کا نام ہے۔"

(سیرۃ الرسول ﷺ۔ مصنفہ طاہر القادری۔ جلد ہشتم۔ ناشر منہاج القرآن پبلیکیشنز۔ ص65)

ایک اور مصنف میجر غلام نصیر صاحب تو اپنے غیر اسلامی تصورات سے اتنا مغلوب ہوئے کہ جہاد کے بارے میں اپنی تحقیق کا خلاصہ لکھتے ہوئے یہ بھی لکھ گئے :

" قتالِ کفار ہی اصل جہاد ہے۔ ایسے قتال اور ایسے جہاد پر ہمیں فخر ہے۔ اے نبی ﷺ کے وارثو اُٹھو اور مسلمانوں کو دعوتِ قتال دو۔"

(وقت کی پکار۔ الجہاد مصنفہ میجر شیخ غلام نصیر ، ناشر جنگ پبلیکیشنز ص80)

لیکن اب اٹارنی جنرل صاحب ایک مخمصے میں پڑ گئے۔ ایک طرف تو وہ یہ کہہ بیٹھے تھے کہ جبر کے ذریعہ عقائد بدلنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا اور دوسری طرف وہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی اس تعلیم پر اعتراض بھی کرنا چاہتے تھے کہ مہدی اور مسیح کے ظہور کے ساتھ اسلام اپنی حقانیت اور دلائل کے ساتھ پھیلے گا نہ کہ کسی جنگ کے نتیجے میں۔ اب اس مرحلہ پر جو گفتگو ہوئی وہ پیش کی جاتی ہے۔

حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ نے فرمایا کہ مسلمانوں میں جو خونی مہدی کا انتظار ہے وہ ایک ایسے وجود کا انتظار ہے جو کہ امن کا انتظار کئے بغیر جہاد کا اعلان کر دے گا۔

اس پر اٹارنی جنرل صاحب نے فرمایا:۔

"ایک یہ مطلب نہیں لیا جاتا۔ بعض مسلمانوں کا یہ خیال ہے۔ میری سمجھ کے مطابق جب مہدی آئے گا اسلام پھیل جائے گا۔ چونکہ جہاد کفار کے خلاف ہوتا ہے اس لئے کوئی ضرورت نہیں ہوگی جہاد کی۔"

اب اٹارنی جنرل صاحب اس بات کی نفی کر رہے تھے جو انہوں نے چند لمحوں پہلے کی تھی۔ وہ یہ واضح نہیں کر رہے تھے کہ آخر مہدی کے دور میں ان کے نزدیک اسلام کس طرح پھیلے گا۔ اگر وہ یہ کہہ دیتے کہ تبلیغ کے ساتھ پھیلے گا تو حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی بات کی تائید ہو جاتی اور اگر یہ کہتے کہ تلوار کے ساتھ پھیلے گا تو یہ خلافِ عقل ہوتا۔ ان کی بات کا یہی مطلب لیا جا سکتا تھا کہ اسلام کو اپنے پھیلنے کے لئے قتال کی ضرورت ہے اور جب مہدی کے زمانہ میں اسلام پھیل جائے گا تو ایسے جہاد کی ضرورت نہیں رہے گی۔ اس پر حضور نے فرمایا:۔

"وہی پھر کہ اسلام کو تلوار کی ضرورت ہے اپنی اشاعت کے لئے۔"

اس پر اٹارنی جنرل صاحب نے فرمایا:۔

"نہیں میں تلوار کی بات نہیں کر رہا ہوں ... کہ جب مہدی آئے گا تو اس کے بعد اسلام پھیل جائے گا ساری دنیا میں"۔

اس پر حضور نے بات کو واضح کرنے کے لئے پھر سوال دہرایا۔

"کس طرح پھیلے گا۔ وہاں وہ لکھا ہوا ہے ..."

اب اٹارنی جنرل صاحب بے بس تھے انہوں نے چار و نا چار ان الفاظ میں اعتراف کیا۔

"تلوار کے ..."

شاید یہ کہہ کر انہیں خیال آیا کہ وہ ایک نہایت خلافِ عقل بات کہہ رہے ہیں اور انہوں نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑا۔

اس پر حضور نے ایک بار پھر ان کے موقف کی بو العجبی واضح کرنے کے لئے فرمایا:۔

”جبر کے ساتھ وہیں یہ لکھا ہوا ہے۔“

یحییٰ بختیار صاحب نے اب جان چھڑانے کے لئے جماعت کے موقف کا ذکر شروع کیا اور کہا

”نہیں آپ کا concept تو یہ ہے ناں جی کہ جبر کے ساتھ نہیں ہو گا تبلیغ سے ہو گا۔“

یقینا جماعتِ احمدیہ کا موقف یہی ہے اور ہر ذی ہوش کا یہی عقیدہ ہونا چاہئیے اور جماعت اس موقف کو سختی سے ردّ کرتی ہے کہ دین کی اشاعت میں جنگ یا جبر کا کوئی دخل ہونا چاہئے۔ یہ قرآنِ کریم کی تعلیم اور رسولِ کریم ﷺ کے عظیم اسوہ کے خلاف ہے۔ جماعت کے اکثر مخالفین یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ اسلام کی اشاعت کا اور تلوار کا بڑا گہرا تعلق ہے۔ اس اسمبلی میں جماعتِ اسلامی کی نمائندگی بھی موجود تھی۔ ان کے بانی اور قائد کی زبان میں ان کے خیالات درج کرتے ہیں۔ وہ اپنی کتاب ”الجہاد فی الاسلام“ میں تحریر کرتے ہیں:۔

”لیکن جب وعظ و تلقین کی ناکامی کے بعد داعیِ اسلام نے ہاتھ میں تلوار لی ... “

اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ کس دھڑلے سے مودودی صاحب فتویٰ دے رہے ہیں کہ رسولِ کریم ﷺ کا وعظ اور آپ کی تلقین ناکام ہو گئے۔ جماعتِ احمدیہ کا عقیدہ یہ ہے کہ یہ خیال ہی فاسد ہے کہ رسولِ کریم ﷺ کا وعظ اور آپ کی تلقین ناکام ہو گئے۔ دنیا کے کسی اسلحہ کسی قوت میں وہ تاثیر وہ برکت وہ اثر نہیں جو کہ آنحضرت ﷺ کے ارشاد اتِ گرامی میں ہے۔ اگر دنیا فتح ہو سکتی ہے تو آپ کے وعظ و تلقین کے اثر اور اُن کی برکات سے ہی ہو سکتی ہے لیکن بہر حال مودودی صاحب کو حق ہے کہ وہ یہ عقیدہ رکھیں مگر اس کی صحت کو پرکھنے کے لئے ہم قرآنِ کریم کو معیار بناتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

فَذَكِّرْ اِنْ نَّفَعَتِ الذِّكْرٰى (الاعلٰی :10)

ترجمہ: پس نصیحت کر۔ نصیحت بہر حال فائدہ دیتی ہے۔

لیکن مودودی صاحب مصر ہیں کہ نعوذ باللہ رسولِ کریم ﷺ کی نصیحت ناکام ہو گئی۔

پھر اللہ تعالیٰ رسولِ کریم ﷺ کو مخاطب کر کے فرماتا ہے۔

فَذَكِّرْ إِنَّمَا أَنتَ مُذَكِّرٌ لَّسْتَ عَلَيْهِم بِمُصَيْطِرٍ (الغاشیہ : 22، 23)

ترجمہ : پس بکثرت نصیحت کر۔ تو محض ایک بار بار نصیحت کرنے والا ہے تو ان پر داروغہ نہیں ہے۔

قرآنِ کریم تو یہ کہتا ہے لیکن مودودی صاحب لکھتے ہیں کہ نصیحت ناکام ہی ثابت ہوئی۔

بہر حال مودودی صاحب مضمون کو آگے چلا کر لکھتے ہیں کہ جب تلوار ہاتھ میں لی گئی تو تمام موروثی امتیازات کا خاتمہ ہوا۔ اخلاقی قوانین نافذ ہوئے۔ لوگوں کی طبیعتوں سے بدی اور شرارت کا زنگ چھوٹنے لگا، طبیعتوں کے فاسد مادے خود بخود نکل گئے۔ حق کا نور عیاں ہوا۔ تلوار کے یہ معجزے بیان کر کے پھر مودودی صاحب یہ بھیانک نتیجہ نکالتے ہیں:۔

"پس جس طرح یہ کہنا غلط ہے کہ اسلام تلوار کے زور سے لوگوں کو مسلمان بناتا ہے، اسی طرح یہ کہنا بھی غلط ہے کہ اسلام کی اشاعت میں تلوار کا کوئی حصہ نہیں ہے۔ حقیقت ان دونوں کے درمیان ہے اور وہ یہ ہے کہ اسلام کی اشاعت میں تبلیغ اور تلوار دونوں کا حصہ ہے جس طرح ہر تہذیب کے قیام میں ہوتا ہے۔ تبلیغ کا کام تخم ریزی ہے اور تلوار کا کام قلبہ رانی۔ پہلے تلوار زمین کو نرم کرتی ہے تاکہ اس میں بیج کو پرورش کرنے کی

قابلیت پیدا ہو جائے۔ پھر تبلیغ بیج ڈال کر آبپاشی کرتی ہے تاکہ وہ پھل حاصل ہو جو اس باغبانی کا مقصودِ حقیقی ہے۔"

(الجہاد فی الاسلام۔ مصنفہ ابوالاعلیٰ مودودی۔ ناشر ادارہ ترجمان القرآن دسمبر 2007۔ ص174۔ 175)

مودودی صاحب یہ خوفناک عقیدہ پیش کر رہے ہیں کہ کسی کو تبلیغ کرنے سے قبل اس پر تلوار چلانا ضروری ہے تاکہ زمین خوب نرم ہو جائے پھر تبلیغ کچھ فائدہ دے گی ورنہ تبلیغ کا بیج ضائع ہونے کا اندیشہ ہے۔ اسی قسم کے خیالات نے دشمنانِ اسلام کو موقع دیا ہے کہ وہ اسلام کی امن پسند تعلیمات پر حملہ کر سکیں ورنہ ان خیالات کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔

یہ اعتراض بار بار ہوا تھا اوراب بھی ہوتا ہے کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے اس وقت ہندوستان کی انگریز حکومت کی اطاعت کرنے اور قانون کی پیروی کرنے کا ارشاد کیوں فرمایا۔ اٹارنی جنرل صاحب نے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی تحریرات پر اعتراض کرتے ہوئے کہا:۔

"مجھے اس پر تعجب ہوا کہ اسلام کا یہ بھی حصہ ہے کہ انگریز کی اطاعت کرنا۔"

اس پر حضور نے فرمایا:۔

"اسلام کا یہ حصہ ہے کہ عادل حاکم کی خواہ وہ غیر مسلم ہو اور مذہب میں دخل نہ دے اطاعت کی جائے۔"

پہلے یہ دیکھنا چاہئے کہ اس وقت کے باقی مسلمان فرقوں اور سیاسی اور غیر سیاسی تنظیموں کا اور مسلمانوں کا بالعموم کیا موقف تھا۔ کیا وہ اس وقت یہ سمجھتے تھے کہ ہندوستان کی انگریز حکومت سے بغاوت کرنا ان کے مفاد میں ہے یا وہ یہ سمجھتے تھے کہ اس حکومت سے تعاون کرنا اور قانون کی حدود میں رہنا ان کے مفادات

کی حفاظت کے لیے اور ان کی مذہبی آزادی کے لئے ضروری ہے۔ جیسا کہ بعد کے حالات نے ثابت کیا کہ صرف ایک سیاسی جماعت تھی جسے ہندوستان کے مسلمانوں کی نمائندہ سیاسی جماعت کہا جا سکتا تھا اور وہ مسلم لیگ تھی۔ اس کے طے کردہ اغراض و مقاصد پڑھ لیں تو بات واضح ہو جاتی ہے۔ ان میں سے پہلا مقصد ہی یہ تھا کہ ہندوستان کے مسلمانوں میں انگریز حکومت سے وفاداری کے خیالات میں اضافہ کیا جائے اور انہیں قائم رکھا جائے۔ اس کا حوالہ ہم پہلے ہی درج کر چکے ہیں۔ اب یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ اس وقت ہندوستان کے مسلمانوں نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ ہمارا مفاد اسی میں ہے کہ ہم حکومت سے تعاون کریں اور وفاداری کا رویہ دکھائیں بلکہ جیسا کہ پہلے حوالے گزر چکے ہیں وہ تو حکومت سے پر زور مطالبات کر رہے تھے کہ باغیانہ طرز دکھانے والوں کو طاقت کے ذریعہ دبائے اور ان کے جلسوں میں یہ اعلان ہوتا تھا کہ ہم نے تو کبھی حکومت سے مستحکم عقیدت میں کبھی پس و پیش کیا ہی نہیں۔ اس پس منظر میں یہ اعتراض ہی نامعقول ہے کہ جماعتِ احمدیہ نے انگریز حکومت سے تعاون کیوں کیا ؟ اور ان کی تعریف کیوں کی؟ سوال تو یہ اُٹھنا چاہئے کہ ہندوستان کے تمام مسلمانوں نے خود مسلم لیگ نے ان کے بڑے بڑے علماء نے انگریز حکومت سے وفاداری کا بار بار اعلان کیوں کیا؟ اس لیے کہ ان کے آنے سے قبل خاص طور پر اس علاقہ میں جو اب پاکستان ہے مسلمان بہت پسی ہوئی حالت میں زندگی گزار رہے تھے اور ان کی مذہبی آزادی بالکل سلب کی جا چکی تھی اور انگریزوں کی مستحکم حکومت قائم ہونا ان کے حقوق کی بحالی کا باعث بنا تھا۔ ہندوستان کے مسلمانوں کی غالب اکثریت کو انگریزوں سے جہاد کا خیال 1947ء کے بعد آیا تھا جب انگریز برِ صغیر سے رخصت ہو چکا تھا۔ اس سے قبل تو ہندوستان کے لاکھوں مسلمان اور ہندوستان کے دوسرے مذاہب سے تعلق رکھنے والے بھی ، پہلی اور دوسری جنگِ عظیم کے موقع پر فوج میں بھرتی ہو کر انگریزوں کی فوج میں شامل ہو کر ان کی طرف سے جنگ کرنے کے لیے جاتے تھے۔

جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے کہ اٹارنی جنرل صاحب نے کہا تھا کہ مجھے اس بات پر حیرت ہوئی ہے کہ انگریز کی اطاعت کرنا بھی اسلام کا حصہ ہے۔ ہم نے حضور کا جامع جواب بھی درج کر دیا ہے لیکن یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ یہ حیرت بھی1947ء کے بعد شروع ہوئی تھی ورنہ 1947ء سے قبل جماعت احمدیہ کے مخالف علماء اور عام مسلمان اگر ملکہ وکٹوریہ کی جوبلی بھی مناتے تھے تو یہ فتویٰ دیتے تھے کہ اس جوبلی کا جواز قرآن اور سنت میں پایا جاتا ہے۔ جماعت ِ احمدیہ کے اشد مخالف اور اہلِ حدیث کے مشہور لیڈر مولوی محمد حسین بٹالوی صاحب نے ملکہ وکٹوریہ کی جوبلی کے موقع پر لکھا:۔

"جوبلی کے موقع پر اہلحدیث وغیرہ اہل اسلام رعایا برٹش گورنمنٹ نے جو خوشی کی ہے اور اپنی مہربان ملکہ قیصر ہند کی ترقی عمر اور استحکام سلطنت کے لئے دعا کی ہے اس کے جواز پر کتاب و سنت میں شہادت پائی جاتی ہے۔

اس مضمون میں دلائل کتاب و سنت کا بیان دو غرض سے ہوتا ہے۔ ایک یہ کہ گورنمنٹ کو یہ یقین ہو کہ اس موقع پر مسلمانوں نے جو کچھ کیا ہے سچے دل سے کیا ہے اور اپنے مقدس مذہب کی ہدایت سے کیا ہے۔"

(اشاعۃ السنہ۔ جلد 9 نمبر 8۔ ص228۔ مضمون "اہلِ اسلام کی مسرت موقع جوبلی پر شریعت کی شہادت")

اس کے علاوہ مولوی محمد حسین بٹالوی صاحب کے نزدیک شریعت اسلامیہ کی رو سے ملکہ وکٹوریہ کی خوشی کو اپنی خوشی اور ان کے رنج کو اپنا رنج سمجھنا ضروری تھا۔ وہ لکھتے ہیں:۔

"جب ایسی شفیق ملکہ پروردگار نے ہماری خوش قسمتی سے ہماری سلطنت کے واسطے بنائی ہے تو بتائیے کہ عقلاً و عرفاً و شرعاً کیونکر ہم اس کی خوشی کو اپنی خوشی نہ سمجھیں اس کے رنج کو اپنا رنج نہ تصور کریں۔ اگر ہم ایسا نہ کریں تو ہم پر نفرین ہے۔"

(اشاعۃ السنہ۔ جلد10 نمبر 1۔ ص31)

جماعتِ احمدیہ کے ان اشد مخالفین کے نزدیک اگر وہ برطانوی فوج کی فتوحات پر خوشی نہ مناتے تو ان مولویوں کے نزدیک وہ رسول اللہ ﷺ کے پیروکار ہی نہیں کہلا سکتے تھے۔ چنانچہ مولوی محمد حسین بٹالوی صاحب لکھتے ہیں:۔

"آزادی مذہبی جو اس سلطنت میں مسلمانوں کو حاصل ہے وہ بجائے خود ایک مستقل دلیل جوازِ مسرت ہے۔ اس آزادی مذہبی کی نظر سے مسلمانوں کو اس حکومت پر اسی قدر مسرت لازم ہے جس قدر ان کو اپنے مذہب کی مسرت و محبت ہے ...

مسلمان اس سلطنت کو(جس میں ان کو آزادی حاصل ہے پسند نہ کریں اور اس کی فتح و حکومت پر اس خوشی سے جو آنحضرت ﷺ اور مسلمانوں کو فتحِ روم پر ہوئی تھی) بڑھ کر خوشی نہ کریں تو وہ اپنے پیغمبر ﷺ کے پیرو کیونکر کہلا سکتے ہیں۔"

(اشاعۃ السنہ۔ جلد10 نمبر1۔ ص14)

جماعت احمدیہ کے ایک اور اشد مخالف مولوی ظفر علی خان صاحب نے جو کہ مسلم لیگ کے ایک نمایاں لیڈر بھی تھے خود یہ اقرار کیا تھا کہ وہ اور ہندوستان کے تمام مسلمان برطانوی حکومت کو عطیہ خداوندی سمجھتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے 1913ء میں برطانوی جریدے The Outlook میں ایک خط لکھا اور اس میں تحریر کیا

An Indian Muslim looks upon the British Government as a divine dispensation .

یعنی ہندوستان کا مسلمان برطانوی حکومت کو ایک عطیہ خداوندی سمجھتا ہے۔

(The Indian Muslims, compiled by Shan Muhammad, printed by Meenakshi Prakashan, vol.3 p 236)

آخر اس دور میں ہندوستان کے مسلمان بقول ظفر علی خان صاحب کے برطانوی حکومت کو عطیہ خداوندی کیوں سمجھ رہے تھے، یہ جاننے کے لئے ہم آل انڈیا مسلم لیگ کے پہلے اجلاس کا جائزہ لیتے ہیں جو کہ دسمبر 1906 میں یعنی حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی زندگی میں منعقد ہوا۔ اس کے خطبہ صدارت کا ایک حصہ ملاحظہ ہو:

The Mussalmans cannot find better and surer means than to congregate under the banner of Great Britian and to devote their lives and property in its protection. I must confess gentlemen, that we shall not be loyal to the Government for any unselfish reasons; but that it is through regard for our own lives and property, and our own honour and religion that we are impelled to be faithfull to the Government .

(Foundations of Pakistan, by Sharifuddin Pirzada, Vol 1 published by Quad e Azam University p 4)

یعنی مسلمانوں کے پاس اس سے بہتر اور یقینی راستہ اور کوئی نہیں ہے کہ وہ برطانیہ عظمیٰ کے پرچم کے نیچے جمع ہو جائیں اور اپنی زندگیاں اور اپنی جائیدادیں اس کی حفاظت کے لئے وقف رکھیں۔ میں اس بات کو تسلیم کرتا ہوں کہ ہمارا ایسا کرنا خود غرضی سے خالی نہ ہو گا۔ خود ہماری جانوں اور املاک کے لئے ہماری عزت اور مذہب کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم گورنمنٹ کے وفادار رہیں۔

پھر اسی اجلاس میں مسلمان عمائدین یہ اعلان کر رہے تھے:۔

Advantage and every safety of the Mohammadens lay in the loyalty to the Government. So much was their cause bound up with the British Raj that they must be prepared to fight and die for the Government if neccessory.

(Foundations of Pakistan, by Sharifuddin Pirzada, Vol 1 published by Quad e Azam University p 12)

یعنی تمام مسلمانوں کی مفاد اور ان کی حفاظت اسی میں ہے کہ وہ گورنمنٹ کے وفادار رہیں۔ برٹش راج سے ان مفادات اس طرح وابستہ ہیں کہ اگر ضرورت پڑے تو انہیں اس کے لئے لڑنے اور اس راہ میں مرنے کے لئے تیار رہنا چاہئیے۔

یہ تو مسلم لیگ کا پہلا اجلاس تھا۔ جب مسلم لیگ کا دوسرا اجلاس ہوا تو سید علی امام نے اس کے خطبہ صدارت میں کہا:۔

Islam whatever of it that was in India was on the brink of an inglorius annihilation that an inscrutable providence ordained the advent of a power that gave country peace and religious toleration.

(Foundations of Pakistan, by Sharifuddin Pirzada, Vol 1 published by Quad e Azam University p 42)

یعنی مسلم لیگ کے صدر کہہ رہے ہیں کہ ہندوستان میں اسلام کا جو کچھ بھی بچ گیا تھا وہ مکمل طور پر تباہ ہونے کے قریب تھا کہ قدرت نے ایک ایسی طاقت کو یہاں پر حکمران کر دیا جس نے ملک میں امن اور مذہبی رواداری کو قائم کیا۔

مسلمانوں کی نمائندہ سیاسی جماعت کے پلیٹ فارم پر ان خیالات کا اظہار ہو رہا تھا۔ ان مواقع پر تمام ہندوستان سے مسلمانوں کے عمائدین موجود تھے۔ ریکارڈ شائع ہو چکا ہے ہر کوئی پڑھ سکتا ہے۔ کسی ایک نے بھی ان خیالات سے اختلاف نہیں کیا کیونکہ سب کے یہی خیالات تھے کہ اگر برطانوی حکومت ہندوستان میں قائم نہ ہوتی تو مسلمان مکمل طور پر تباہ ہو گئے تھے اور دشمن ہندوستان سے اسلام کو ختم کر دیتا۔ اس کے باوجود اٹارنی جنرل صاحب کی حیرانی کہ اسلام کی رو سے انگریز حکومت کی اطاعت کیسے کی جا سکتی تھی اس بات کا ثبوت ہے کہ یا تو وہ تاریخ سے بالکل ناواقف تھے یا پھر حقائق کا سامنا نہیں کرنا چاہتے تھے۔

اس مرحلہ پر حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ نے ایک اہم تاریخی نکتہ کی طرف توجہ دلائی اور وہ نکتہ یہ تھا کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی زندگی میں تو مخالف مولوی حکومتِ برطانیہ کی خدمت میں بصد ادب عرض کر رہے تھے کہ حضورِ والا! ہم تو آپ کے وفادار اور خدمت گزار ہیں، یہ مرزا غلام احمد (علیہ السلام) آپ کے خلاف بغاوت کی تیاری کر رہا ہے اور اس نے تو آپ کے سلطنت کے زوال کی پیشگوئی بھی کر رکھی ہے۔ حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ نے اس کی مثالیں پڑھ کر سنائیں۔

ہم ایک مرتبہ پھر احمدیت کے اشد ترین مخالف اور اہلحدیث کے مشہور لیڈر مولوی محمد حسین بٹالوی کی مثال درج کرتے ہیں۔ وہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

”گورنمنٹ کو خوب معلوم ہے اور گورنمنٹ اور مسلمانوں کے ایڈووکیٹ اشاعۃ السنہ نے گورنمنٹ کو بارہا جتا دیا ہوا ہے کہ یہ شخص درپردہ گورنمنٹ کا بد خواہ ہے ... صاف ثابت ہوتا ہے کہ وہ اپنے جملہ مخالفینِ مذہب کے مال و جان کو گورنمنٹ ہو خواہ غیر معصوم نہیں جانتا اور ان کے تلف کرنے کی فکر میں ہے۔ دیر ہے تو صرف جمعیت و شوکت کی دیر ہے۔“

(اشاعۃ السنہ جلد18 نمبر5 ص152)

اب پڑھنے والے خود دیکھ سکتے ہیں کہ جب انگریز حکمران تھا تو اس وقت یہ مخالف اس حکومت کو درخواستیں جمع کرا رہے تھے کہ مرزا غلام احمد صاحب قادیانی آپ کے خلاف بغاوت کی تیاری کر رہے ہیں۔ اور جب انگریز چلا گیا تو اب یہ راگ الاپا جا رہا ہے کہ ان کو کھڑا ہی انگریز حکومت نے کیا تھا۔ جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے۔

اس روز جب دوپہر کا وقفہ ہوا تو سپیکر صاحب نے اس بات کا شکوہ کیا کہ کورم ہی پورا نہیں ہوتا اور کورم پورا کرنے میں دو دو گھنٹے لگ جاتے ہیں۔ حالانکہ تقریباً ڈیڑھ سو کی اسمبلی میں کورم پورا کرنے کے لئے صرف چالیس ممبران کی ضرورت تھی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ تمام دعووں کے باوجود حقیقت میں ممبران کو اس کارروائی میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ فیصلہ تو پہلے کئے بیٹھے تھے۔

وقفہ کے بعد حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ نے مشہور شیعہ عالم علی حائری صاحب کا ایک حوالہ پڑھ کر سنایا جس میں انہوں نے سلطنتِ برطانیہ کی تعریف کرنے کے بعد اس سلطنت کے لئے دعا کی تحریک کی تھی اور کہا تھا کہ بادشاہ کا یہ حق ہے کہ رعیت اس کی تعریف میں ہمیشہ رطب اللسان رہے اور کہا تھا کہ رسول اللہ ﷺ نے بھی تو نوشیروان کے عہد سلطنت میں ہونے میں فخر کا اظہار فرمایا تھا۔

اٹارنی جنرل صاحب کو مشکل یہ درپیش تھی کہ وہ یہ ثابت کرنے کے لئے کہ احمدیوں نے خود اپنے آپ کو باقی مسلمانوں سے علیحدہ رکھا ہے، یہ دلیل لائے تھے کہ برطانوی سلطنت کے دور میں احمدیوں نے دوسرے مسلمانوں کے رویہ کے خلاف برطانوی حکومت کی تعریف کی تھی اور اس وقت کی حکومت کی اطاعت اور اس سے تعاون کا فیصلہ کیا تھا اور اب یہ ہو رہا تھا کہ ایک کے بعد دوسرے حوالے سے یہ ثابت ہو رہا تھا کہ اس وقت کے غیر احمدی مسلمان سب سے زیادہ برطانوی حکومت کی تعریف میں زمین آسمان ایک کر رہے تھے اور ان کی اطاعت کو اپنا فریضہ مذہبی سمجھتے تھے۔ فرضی ماضی سے حقائق کی دنیا کی طرف سفر کبھی بھی خوشکن نہیں ہوتا۔ اٹارنی جنرل صاحب ان باتوں کی اہمیت کم کرنے کے لئے کہا کہ

” ... ایسی خوشامد لوگ کرتے رہیں ،میں ان کی بات نہیں کر رہا ... “

اس پر حضور نے انہیں یاد دلایا:۔

” ... حضرات بڑے پائے کے علماء اور اس وقت کے مذہبی لیڈروں کی بات ہو رہی ہے۔ ایسے ویسے کی بات نہیں ہو رہی۔“

لیکن اٹارنی جنرل صاحب کا کہنا تھا کہ ایسے تو چند ہی لوگ ہوں گے۔

اٹارنی جنرل صاحب نے بیچارے علی حائری صاحب پر خواہ مخواہ غصہ نکال رہے تھے اور ان کو خوشامدی کا خطاب دے رہے تھے اور ان کا یہ کہنا بھی ٹھیک نہیں تھا کہ ایسے چند لوگ تھے۔ پوری مسلم لیگ جن الفاظ میں برطانوی سلطنت کی مدح سرائی کر رہی تھی ہم نے اس کی صرف چند مثالیں درج کردی ہیں۔ اب ہم اس ضمن میں ایک اور مثال پیش کرتے ہیں۔ یہ مثال بھی کسی ایسے ویسے شخص کی نہیں ہے بلکہ علامہ اقبال کی ہے۔ علامہ اقبال ،مصورِ پاکستان، شاعرِ مشرق جنہیں پیغمبر خودی بھی کہا جاتا ہے۔ جب 1901ء میں ملکہ وکٹوریہ کا

انتقال ہوا تو علامہ اقبال نے ان کا پورے 110 اشعار کا مرثیہ لکھا اور ماتمی جلسہ میں پڑھ کر سنایا۔ اس کے چند اشعار ملاحظہ ہوں

میت اُٹھی ہے شاہ کی تعظیم کے لئے

اقبال! اُڑ کے خاک سر راہ گزار ہو

آئی ادھر نشاط اُدھر غم بھی آگیا

کل عید تھی تو آج محرم بھی آگیا

کہتے ہیں آج عید ہوئی ہے ہوا کرے

اس عید سے تو موت ہی آئے خدا کرے

اے ہند تیرے چاہنے والی گزر گئی

غم میں تیرے کراہنے والی گزر گئی

ہو ممات میں حیات ، ممات اسکا نام ہے

صدقے ہو جس پر خضر وفات اس کا نام ہے

ہلتا ہے جس سے عرش یہ رونا اسی کا ہے

زینت تھی جس سے تجھ کو یہ جنازہ اسی کا ہے

جب یہ دردناک مرثیہ شائع ہوا تو اس کے سرورق پر یہ لکھا تھا

اشکِ خون

یعنی ترکیبِ بند

جو حضور ملکہ معظمہ مرحومہ محترمہ کے انتقالِ پُر ملال پر مسلمانانِ لاہور کے ایک ماتمی جلسہ میں پڑھا گیا۔

از خاکسار اقبال

(ابتدائی کلامِ اقبال بہ ترتیب مہ و سال۔ مرتبہ ڈاکٹر گیان سنگھ۔ ناشر اقبال اکادمی پاکستان۔ ص 89 تا 95)

ان اشعار کو پڑھ کر اٹارنی جنرل صاحب کا یہ دعویٰ بے بنیاد معلوم ہوتا ہے کہ وہ صرف چند مسلمان علماء تھے جو کہ انگریز حکومت کی تعریف کر رہے تھے۔ حقیقت یہ تھی کہ ایک خوفناک دور کے بعد ایک مستحکم حکومت ہندوستان میں قائم ہوئی تھی اور اس کے قیام سے مسلمانوں کی مذہبی آزادی بحال ہوئی تھی ان کو ایک دردناک عذاب سے نجات ملی تھی۔ اس وقت سب مسلمان ہندوستان میں برطانوی حکومت کے قیام کا خیر مقدم کر رہے تھے اور اس کے قیام کو اپنی بقاء کے لئے ضروری سمجھتے تھے۔

اصل میں مسئلہ یہ ہے کہ آج کے دور میں بالخصوص پاکستان میں لوگوں کا یہ خیال پختہ ہو گیا ہے کہ ان کے مطابق جب مہدی موعود کا ظہور ہو گا تو وہ جنگ کے ذریعہ کفار کو محکوم بنا لیں گے اور سب مسلمان ہو جائیں گے۔ اٹارنی جنرل صاحب اس بات پر بہت حیرت کا اظہار کر رہے تھے کہ یہ کس طرح ممکن ہے کہ مہدی کا ظہور ہوتا ہے اور وہ کہتا ہے کہ جو اس وقت حکومت قائم ہے اس کی اطاعت کرو، باغیانہ رویہ اختیار نہ کرو، امن میں خلل نہ ڈالو، اسلام کو تبلیغ اور پیار سے پھیلاؤ اور ان خیالات کی تشہیر دوسرے ممالک میں بھی کرتا ہے۔ یہاں اس دلچسپ حقیقت کا ذکر ضروری ہے کہ جماعتِ احمدیہ کے مخالفین کے بنیادی عقائد بھی حکومتوں کی تبدیلی کے ساتھ ہی تبدیل ہوجاتے ہیں۔ جب انگریز یہاں حکمران تھا تو مہدی کے ظہور کے بارے

میں جماعت احمدیہ کے مخالفین کا کیا اعلان کر رہے تھے؟ ہم اہل حدیث کے مشہور لیڈر اور جماعتِ احمدیہ کے اشد مخالف مولوی محمد حسین بٹالوی صاحب کی مثال پیش کرتے ہیں۔ انہوں نے اس دور میں ایک مضمون "آسمانی مسیح اور اس کا رفیق مہدی اور گورنمنٹ انگلشیہ۔" لکھا اور اس میں تحریر کیا

"اس مضمون میں ہم کو آسمانی مسیح اور اس کے رفیق مہدی کی نسبت اہلِ اسلام کا خیال بیان کر کے یہ ظاہر کرنا مدِ نظر ہے کہ یہ خیال عیسائی گورنمنٹِ انگلشیہ کے لئے خطرناک نہیں ہے بلکہ اس خیال کے برخلاف زمینی مسیح (حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی طرف اشارہ کر رہے ہیں) اور اس کے مثیل و ہمعصر و ہم سیرت مہدی کی آمد کا نیا خیال گورنمنٹِ انگلشیہ اور ہر ایک گورنمنٹ کے لئے (اسلامی ہی کیوں نہ ہو) پر خطر ہے۔"

(اشاعة السنہ۔ نمبر 3 جلد 12۔ ص 73)

اور پھر مسیح کی آمدِ ثانی کے اسلامی تصور کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

"... اس مشن کو پورا کرنے میں وہ زمینی تدبیروں اور اور انسانی سازشوں کے محتاج نہ ہوں گے اور میدانِ جنگ و جدال و خون ریزی و قتال آراستہ کر کے تلوار سے کام نہ لیں گے بلکہ اپنی روحانی طاقتوں اور آسمانی نشانوں کے ذریعہ اس مشن کو پورا کریں گے۔ ان کے وقت میں لڑائی بالکل موقوف ہو گی۔ تلوار اس وقت میں جنگ کے کام سے بیکار ہو جائے گی صرف کھیتی کاٹنے کے کام میں آئیں گی۔"

(اشاعة السنہ۔ نمبر 3 جلد 12۔ ص 80)

ان حوالوں کا موازنہ ان خیالات سے کریں جن کا پرچار آج کل کر رہے ہیں تو فرق اور اس کی وجہ صاف ظاہر ہو جاتی ہے۔

بہر حال اسی موضوع پر بات ہو رہی تھی۔ حضرت خلیفة المسیح الثالثؒ نے فرمایا:۔

” مسیح نے کسرِ صلیب کرنی تھی۔ وہ کی اور ہو رہی ہے ... جب جماعتِ احمدیہ اپنے زمانے کے تمام بڑے بڑے علماء سے اتفاق کرتی ہے تو وہ وجہ اعتراض بنا لیا جاتا ہے۔ اس زمانے کے بڑے بڑے بزرگ علما نے جو فتوے دیئے، جماعتِ احمدیہ کا فتویٰ اس سے مختلف نہیں۔ تو اگر ہم اتفاق کریں تب بھی زیرِ عتاب اگر ہم اختلاف کریں تب بھی زیرِ عتاب۔ یہ مسئلہ ہماری سمجھ سے ذرا اونچا نکل گیا ... “

اس کے بعد حضرت خلیفة المسیح الثالثؒ نے حوالے پڑھ کر سنائے کہ کس طرح جب کسی سمت سے اسلام پر حملہ ہوا تو اس وقت حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے ایک فتح نصیب جرنیل کی طرح اسلام کا کامیاب دفاع کیا۔ جب عیسائی پادری اسلام پر حملہ کرتے تھے تو سب سے آگے حضرت مسیح موعود علیہ السلام بڑھ کر ان کا مقابلہ کرتے اور حضورؒ نے تفصیل سے بیان فرمایا کہ تاریخ میں جب بھی مسلمانوں کے حقوق کی خاطر آواز اُٹھانے اور جد وجہد کرنے کا وقت آیا تو جماعتِ احمدیہ ہمیشہ صف اول میں کھڑے ہوکر قربانیاں دیتی رہی تھی ۔ ابھی حضور یہ واقعات مرحلہ وار بیان فرما رہے تھے اور ابھی مسئلہ کشمیر اور مسئلہ فلسطین کے لیے مسلمانوں کی خدمات کا ذکر ہونا تھا کہ اس روز کی کارروائی کا وقت ختم ہوا۔

23/ اگست کی کارروائی

اس روز کارروائی شروع ہوئی اور ابھی حضور انور ہال میں تشریف نہیں لائے تھے کہ ممبرانِ اسمبلی نے اپنے کچھ دکھڑے رونے شروع کئے۔ ایک ممبر اسمبلی صاحبزادہ صفی اللہ صاحب نے یہ شکوہ کیا کہ پہلے یہ فیصلہ ہوا تھا کہ مرزا ناصر احمد لکھا ہوا بیان نہیں پڑھیں گے سوائے اس کے کہ وہ مرزا غلام احمد یا مرزا بشیر الدین کا ہو لیکن وہ کل ایک کاغذ سے پڑھ رہے تھے اور یہ ظاہر نہیں ہوتا تھا کہ یہ حوالہ کس کا ہے؟ دوسری بات انہوں نے یہ کہی کہ اٹارنی جنرل صاحب ایک چھوٹا سا سوال کرتے ہیں اور یہ جواب میں ساری تاریخ اپنی صفائی کے لیے پیش کر دیتے ہیں۔ جہاں تک صفی اللہ صاحب کی پہلی بات کا تعلق ہے تو شاید انہیں بعض باتیں سمجھنے میں دشواری پیش آ رہی ہو اور دوسری بات بھی عجیب ہے۔ اعتراض جماعتِ احمدیہ پر ہورہے تھے۔ کچھ اعتراضات ایسے تھے کہ ان کا صحیح تاریخی پس منظر پیش کرنا ضروری تھا۔ کوئی بھی صاحبِ عقل اس بات کی اہمیت سے انکار نہیں کر سکتا کہ بہت سی تحریروں اور واقعات کو سمجھنے کے لیے ان کے صحیح پس منظر کا جاننا ضروری ہے۔ اصل مسئلہ یہ تھا کہ اعتراض تو پیش کیے جا رہے تھے لیکن جوابات سننے کی ہمت نہیں تھی۔ ایک اور ممبر ملک سلیمان صاحب نے کہا کہ کارروائی کی جو کاپی دی گئی ہے اس پر Ahmadiya issue لکھا ہوا ہے ، جب کہ یہ احمدی ایشو نہیں بلکہ قادیانی ایشو ہے۔ یہ ہم نے فیصلہ نہیں کیا کہ یہ احمدی ایشو ہے۔ اور شاہ احمد نورانی صاحب نے اس کی تائید کی۔ گویا یہ بھی پاکستان کی قومی اسمبلی کا حق تھا کہ وہ ایک مذہبی جماعت کا نام اس کی مرضی کے خلاف تبدیل کر دیں۔ لیکن اس وقت سپیکر صاحب نے اس خلافِ عقل اعتراض پر کوئی توجہ نہیں دی۔

جب کارروائی شروع ہوئی تو حضور نے قدرے تفصیل سے یہ تفاصیل بیان کرنی شروع کیں کہ کس طرح حضرت خلیفۃ المسیح الثانی اور جماعتِ احمدیہ نے ہمیشہ مسلمانوں میں اتحاد کی کوششیں کیں اور ان کے مفادات کے لیے بے لوث خدمات سرانجام دیں۔ جب سائمن کمیشن کا مرحلہ آیا اور حضور نے اس صورتِ حال پر تبصرہ تحریر فرمایا تو اخبار ''سیاست'' نے لکھا کہ اس ضمن میں حضرت خلیفۃ المسیح الثانی نے جو خدمات سرنجام دی ہیں وہ منصف مزاج مسلمان اور حق شناس انسان سے خراج تحسین وصول کرتی ہیں۔ جب اہلِ فلسطین کے حقوق کے لئے حضور نے الکفر ملة واحدة تحریر فرمایا تو عرب دنیا کے کئی اخبارات نے اسے خراجِ تحسین پیش کیا۔ حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ نے اس کے حوالے پڑھ کر سنائے۔ اٹارنی جنرل صاحب یہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہے تھے کہ جماعتِ احمدیہ نے ہمیشہ اپنے آپ کو مسلمانوں اور اپنے ہم وطنوں کی امنگوں سے ان کی جدوجہد سے علیحدہ رکھا ہے۔ حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ نے اس کے جواب میں جماعت احمدیہ کے اشد ترین مخالف مولوی ثناء اللہ امرتسری صاحب کا ایک حوالہ پڑھ کر سنایا۔ ایک مرتبہ ہندوستان کی آزادی کے بارے میں حضرت خلیفة المسیح الثانی کا خطبہ الفضل میں شائع ہوا۔ اس کا حوالہ دے کر مولوی ثناء اللہ امرتسری صاحب نے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے فرمودات پر اعتراضات تو کئے لیکن اس کے ساتھ انہیں یہ اعتراف بھی کرنا پڑا:

''یہ الفاظ کس جرأت اور غیرت کا ثبوت دے رہے ہیں۔ کانگرسی تقریروں میں اس سے زیادہ نہیں ملتے۔ چالیس کروڑ ہندوستانیوں کو غلامی سے آزاد کرانے کا ولولہ جس قدر خلیفہ جی کی اس تقریر میں پایا جاتا ہے وہ گاندھی جی کی تقریر میں بھی نہیں ملے گا۔''

(اہلحدیث۔ 6/ جولائی 1945ء۔ ص 4)

سوالات کرنے والے نامکمل حوالے پیش کر کے یہ ثابت کرنے کی لاحاصل کوشش کر رہے تھے کہ جب پاکستان کے قیام کے لئے جدوجہد ہو رہی تھی تو احمدیوں نے اس کی مخالفت کی تھی۔ حالانکہ جس مقصد کے لئے سپیشل کمیٹی کا اجلاس ہو رہا تھا، اس کا اس معاملے سے دور کا بھی تعلق نہیں تھا۔ حضور نے اس دور میں شائع ہونے والی ایک کتاب کا یہ حوالہ پڑھ کر سنایا۔ یہ کتاب محمد ابراہیم میر سیالکوٹی صاحب نے مسلم لیگ کی تائید میں لکھی تھی۔ واضح رہے کہ اس کتاب کی دیگر عبارات ظاہر کر دیتی ہیں کہ وہ عقیدے کے اعتبار سے جماعتِ احمدیہ سے شدید اختلاف رکھتے تھے۔ اس میں وہ لکھتے ہیں:۔

" ... حافظ محمد صادق سیالکوٹی نے احمدیوں سے موافقت کرنے کے متعلق اعتراض کیا ہے اور ایک اور امرتسری شخص نے بھی پوچھا ہے۔ سو ان کو معلوم ہو اوّل تو میں احمدیوں کی شرکت کا ذمہ دار نہیں ہوں۔ کیونکہ میں نہ تو مسلم لیگ کا کوئی عہدیدار ہوں اور نہ ان کے یا کسی دیگر کے ٹکٹ پر ممبری کا امیدوار ہوں کہ اس کا جواب میرے ذمہ ہو۔ دیگر یہ کہ احمدیوں کا اسلامی جھنڈے کے نیچے آجانا اس بات کی دلیل ہے کہ واقعی مسلم لیگ ہی مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت ہے ...

ہاں اس وقت مسلم لیگ ہی ایک ایسی جماعت ہے جو خالص مسلمانوں کی ہے۔ اس میں مسلمانوں کے سب فرقے شامل ہیں۔ پس احمدی صاحبان بھی اپنے آپ کو ایک اسلامی فرقہ جانتے ہوئے اس میں شامل ہو گئے جس طرح کے اہلحدیث اور حنفی اور شیعہ وغیرہم شامل ہوئے۔"

(پیغام ہدایت در تائید پاکستان و مسلم لیگ ، مرتبہ محمد ابراہیم میر سیالکوٹی ، شائع کردہ ثنائی پریس ، ص112و113)

ملاحظہ کیجئے اس وقت جماعت کے مخالفین یہ اعتراض اُٹھا رہے تھے کہ احمدی کیوں مسلم لیگ میں شامل ہوتے ہیں اور اب یہ دعویٰ کر کے اعتراض کیا جا رہا تھا کہ احمدیوں نے اس وقت اپنے آپ کو مسلم لیگ سے علیحدہ رکھا تھا۔

جب یہ ذکر بڑھتا ہوا فرقان بٹالین کے ذکر تک پہنچا تو یہ صاف نظر آ رہا تھا کہ سوالات کرنے والوں نے جو تاثرات قائم کرنے کی کوشش کی تھی وہ اس ٹھوس بیان کے آگے دھواں ہو کر غائب ہو رہے تھے۔ جب پاکستان خطرے میں تھا تو سب سے پہلے پاکستانی احمدیوں نے رضاکارانہ طور پر اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کیا تھا۔ آج اسمبلی میں جو جماعتیں سب سے زیادہ جماعتِ احمدیہ کی مخالفت میں پیش پیش تھیں، اس وقت ان میں سے کسی کو بھی یہ توفیق نہیں ہوئی تھی کہ اپنے ملک کے دفاع کے لئے آگے آتی۔

اٹارنی جنرل صاحب نے کہا کہ آپ سے یہ سوال نہیں کیا گیا۔ اس طرح باہر کی باتیں آ جائیں گی۔ حضور نے اس پر فرمایا کہ ٹھیک ہے۔ مَیں یہ بیان بند کر دیتا ہوں۔

لیکن حقیقت یہ تھی کہ جماعتِ احمدیہ پر جس قسم کے اعتراضات کیے گئے تھے ان کے پیشِ نظر یہ تفصیلات بیان کرنا ضروری تھیں اور جب آخر میں اس وقت جب کہ جماعت کا وفد موجود نہیں تھا تو جماعت کے مخالفین نے فرقان بٹالین کے حوالے سے کافی اعتراضات اُٹھائے۔ انصاف کا تقاضا تو یہ تھا کہ یہ اعتراض اس وقت اُٹھائے جاتے جب جماعت کا وفد وہاں موجود تھا تاکہ ان کا جواب بھی دیا جاسکتا۔ پھر اٹارنی جنرل صاحب نے کہا کہ اگر آپ سمجھتے ہیں کہ آپ کے موقف کی وضاحت کے لیے ان کا بیان کرنا ضروری ہے تو آپ بیان کر دیں۔ اس پر حضور نے اہلِ کشمیر کے لیے جماعتِ احمدیہ کی بےلوث خدمات کا خلاصہ بیان فرمایا۔ اس کے بعد

جو سوالات شروع ہوئے تو وہ انہی سوالات کا تکرار تھا جو پہلے بھی کئی دفعہ ہو چکے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اٹارنی جنرل صاحب اس موہوم امید پر انہیں دہرا رہے تھے کہ شاید جوابات میں کوئی قابلِ گرفت بات مل جائے۔

اعتراض اُٹھانے والوں نے اپنی طرف سے یہ غیر متعلقہ اور خلافِ واقعہ اعتراض تو اُٹھا دیا تھا کہ احمدیوں نے ہمیشہ خود کو مسلمانوں سے ہر طرح علیحدہ رکھا ہے لیکن جب حقائق سنائے گئے تو یہ ان کے لئے ناقابلِ برداشت ہو رہا تھا۔ جب مغرب کے وقفہ کے بعد اجلاس دوبارہ شروع ہوا تو مولوی عبدالحق صاحب نے ان الفاظ میں اپنے دکھڑے رونے شروع کئے۔

" جی گزارش یہ ہے کہ کل دو گھنٹے تقریباً اس نے تقریر کی اور آج بھی۔ وہ تو اپنی تاریخ پیش کر رہے ہیں یا ریکارڈ کرا رہے ہیں۔ ہمارا تو اٹارنی جنرل صاحب کا یہ سوال تھا کہ انگریزوں کی وفاداری کی جو تم نے پیش کیا ہے تو اس کی کیا وجہ ہے ؟ یا مسلمانوں کو تم کافر اور پکا کافر کہتے ہو، جنازے کی نماز میں شرکت نہیں کرتے، شادی نہیں کرتے، عبادت میں شریک نہیں ہوتے۔ اب وہ کہتے ہیں ہم نے مسلمانوں کے ساتھ نہیں کہا۔ یہ تو ایسا ہے کہ جیسا ایک شخص کسی کو کہے " یہ چیز کیا ہے ؟" وہ کہتا ہے "کتا"۔ اب وہ کہتا ہے میں پانی بھی اس کو دیتا ہوں، روٹی بھی دیتا ہوں، جگہ بھی دیتا ہوں۔ مقصد تو اصل وہی ہے کہ جو چیز ان سے پوچھی جائے ہمارے اٹارنی جنرل صاحب اس کا جواب دیں اور بس..."

مولوی صاحب کا شکوہ مضحکہ خیز ہونے کے علاوہ ناقابلِ فہم بھی تھا۔ نہ معلوم بیچارے کیا کہنا چاہتے تھے؟

ایک سوال یہ دہرایا گیا کہ باؤنڈری کمیشن کے سامنے جماعت نے اپنا میمورنڈم کیوں پیش کیا؟ جیسا کہ پہلے ذکر آ چکا ہے کہ برصغیر کی آزادی کے وقت صوبہ پنجاب کی تقسیم کے لئے جو کمیشن قائم ہوا تھا اس کے روبرو جماعتِ احمدیہ کا ایک میمورنڈم بھی پیش ہوا تھا۔ اس کا کچھ جواب پہلے ہی آ چکا ہے کہ ایسا مسلم لیگ کی

مرضی سے ان کے کیس کی تائید کرنے کے لئے کیا گیا تھا۔ اس مرحلہ پر اٹارنی جنرل صاحب نے اس کمیشن کے ایک جج جسٹس منیر صاحب کے ایک مضمون کا حوالہ پڑھ کر اعتراض اُٹھانے کی کوشش کی۔

جسٹس منیر صاحب نے 1964ء میں پاکستان ٹائمز میں ایک مضمون لکھا جس کا ایک پیراگراف جماعت احمدیہ کے میمورنڈم کے بارے میں تھا۔ اٹارنی جنرل صاحب نے یہ حوالہ پڑھ کر سنایا اور کہا کہ ہم چوہدری ظفراللہ خان صاحب کی خدمات کا اعتراف تو کرتے ہیں لیکن جسٹس منیر کے اس مضمون سے جماعت احمدیہ کے میمورینڈم کے بارہ میں منفی تاثر ابھرتا ہے۔

ہم جسٹس محمد منیر صاحب کے اس مضمون کا متعلقہ حصہ من و عن درج کر کے ان میں تحریر کئے گئے حقائق کا تجزیہ پیش کریں گے۔ جسٹس منیر صاحب لکھتے ہیں۔

"In connection with this part of the case I cannot refrain from mentioning an extremely unfortunate circumstance. I have never understood why the Ahmadis submitted a seperate representation. The need for such a representation could arise only if the Ahmadis did not agree with the Muslim league case- itself a regrettable possibility. Perhaps they intended to reinforce the Muslim League's case but in doing so they gave the facts and figures for different parts of Garh Shankar, thus giving prominence to the fact that in the area between River Bein and River Basanter the non-Muslims constituted a majority and providing arguement for the contention that if the area between rivers Ujh and Bein went to India, the area between the Bein

River and the Basanter river would automatically go to India. As it is this area has remained with us but the stand taken by the Ahmadi's did create considerable embarrassment for us in the case of Gurdaspur".

(Pakistan Times,June 24, 1964, article ' Days to Remember by M. Munir)

اب ہم مندرجہ بالا حوالے کے مختلف مندرجات کا جائزہ لیتے ہیں۔ اس کے پہلے حصہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جسٹس محمد منیر صاحب یہ تحریر فرما رہے ہیں کہ انہیں پورے وثوق سے اس بات کا علم نہیں کہ احمدیوں کے میمورنڈم کا مقصد کیا تھا ؟ کیا وہ مسلم لیگ کے کیس کی تائید کر رہے تھے یا معاملہ اس کے برعکس تھا۔ ایک پہلو تو ہم وضاحت سے بیان کر چکے ہیں کہ اس میمورنڈم کی پہلی سطر سے ہی یہ بات واضح ہو جاتی تھی کہ جماعت احمدیہ کے اس میمورنڈم کا مقصد کیا تھا اور بعد کے مندرجات جو کہ اب شائع ہوچکے ہیں اور ہر کوئی ان کا مطالعہ کر سکتا ہے، اس بات کو بالکل واضح کر دیتے ہیں کہ یہ سارا میمورنڈم مسلم لیگ کے کیس کی تائید کے لئے پیش کیا گیا تھا۔ اگر حقیقت میں جسٹس محمد منیر صاحب کو اس معاملہ میں ابہام رہ گیا تھا تو اس سے صرف ایک ہی نتیجہ نکل سکتا ہے کہ انہوں بحیثیت جج تمام متعلقہ کاغذات کا مطالعہ نہیں کیا تھا لیکن ایسا بھی نہیں ہو سکتا کیونکہ جیسا کہ ہم حوالہ درج کر چکے ہیں کہ انہوں خود 1953ء کی تحقیقاتی عدالت کی رپورٹ میں یہ تحریر فرمایا تھا کہ وہ اس وقت احمدیوں کے پاس اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں تھا کہ قادیان کو پاکستان میں شامل کرانے کے لئے کوشش کریں۔ ان کی پہلی تحریر دوسری تحریر کی تردید کر رہی ہے۔

دوسرے یہ مضمون تین اقساط میں شائع ہوا تھا جو حوالہ ہم نے پیش کیا ہے وہ تیسری قسط کا ہے اور اس کی پہلی قسط میں جسٹس منیر صاحب نے تحریر فرمایا تھا کہ چوہدری ظفراللہ خان صاحب نے مسلم لیگ اور جماعت

احمدیہ کا کیس پیش کیا تھا۔ یہ بات بالکل غلط ہے۔ حضرت چوہدری ظفر اللہ خان صاحب نے مسلم لیگ کا کیس پیش کیا تھا اور مکرم شیخ بشیر احمد صاحب نے جماعت احمدیہ کا کیس پیش کیا تھا۔ اس بنیادی غلطی سے ہی یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ یا تو جس وقت یہ مضمون لکھا گیا اس وقت لکھنے والی کی یادداشت اس کا ساتھ نہیں دے رہی تھی یا پھر وہ عمداً حقائق کو مسخ کر کے پیش کر رہے تھے۔

یہ سوال ضرور اہم ہے کہ آخر جماعت احمدیہ نے میمورنڈم کیوں پیش کیا؟ تو یہ میمورنڈم بھی مسلم لیگ کے کہنے پر اس کے کیس کو مضبوط کرنے کے لئے پیش کیا گیا تھااور جو بھی اس کی شائع شدہ کارروائی کو پڑھے گا اس پر یہ حقیقت کھل جائے گی۔ کانگرس کے کیس کو مضبوط کرنے کے لئے سکھوں کی طرف سے یہ موقف پیش کیا گیا تھا کہ لاہور اور مغربی پنجاب میں ان کے بہت سے مقدس مقامات موجود ہیں اور چونکہ زیادہ تر سکھ مشرقی پنجاب میں آباد ہیں اور ہندوستان میں شامل ہو رہے ہیں اس لئے یہ ضروری ہے کہ جن اضلاع میں سکھوں کے مقدس مقامات ہیں وہ پاکستان کا نہیں بلکہ ہندوستان کا حصہ بنائے جائیں اور اس کے مقابل پر مسلم لیگ کی طرف سے یہ موقف پیش کیا گیا تھا کہ اس کلیہ کے تحت تو جن اضلاع میں مسلمانوں کے مقدس مقامات ہیں خاص طور پر جو اضلاع متنازع ہیں انہیں لازمی پاکستان میں شامل کرنا چاہیئے۔ خاص طور پر جبکہ ان کی اکثریت بھی مسلمان ہے اور جماعت احمدیہ کے میمورنڈم میں ایک یہ اہم پہلو بھی اجاگر کیا گیا تھا اور اس قسم کا میمورنڈم مسلم لیگ نے صرف جماعت احمدیہ کی طرف سے پیش نہیں کرایا تھا بلکہ اس قسم کا میمورنڈم مسلمانان بٹالہ نے صدر مسلم لیگ بٹالہ کی وساطت سے پیش کیا تھا جس میں دیگر دلائل کے علاوہ یہ دلیل بھی پیش کی گئی تھی کہ تحصیل بٹالہ میں مسلمانوں کے بہت سے مزارات اور مقدس مقامات ہیں اور اس میمورنڈم میں ایک حصہ یہ بھی تھا اگر مذہبی مقدس مقامات اور مزارات کو فیصلہ میں مد نظر رکھا جا رہا ہے تو پھر مسلمانوں میں ایک فرقہ

قادیانی بھی ہیں جن کے بانی قصبہ قادیان سے ہیں اور اس کے ایک ایک ذرہ سے ان کی تاریخ وابستہ ہے اور قادیانی بڑے واضح الفاظ میں پاکستان کے حق میں رائے دے چکے ہیں۔

(The Partition of Punjab A Compilation of Official Documents Vol.1 p470-473)

اس میمورنڈم میں لفظ قادیانی کا استعمال ہی اس بات کو واضح کر دیتا ہے کہ اس کی تیاری میں کسی احمدی کا ہاتھ نہیں تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں میں سے مسلم لیگ کے علاوہ اور کئی مسلمان گروہوں سے مسلم لیگ کے کیس کو مضبوط بنانے کے لئے میمورنڈم پیش کرائے گئے تھے۔ مثلاً پنجاب مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن نے اپنا علیحدہ میمورنڈم پیش کیا تھا مسلمانان بٹالہ نے مسلم لیگ تحصیل بٹالہ کے صدر کی وساطت سے علیحدہ میمورنڈم پیش کیا تھا۔ لدھیانہ کی مسلم لیگ نے اپنا علیحدہ میمورنڈم پیش کیا تھا۔ جالندھر کی مسلم لیگ نے اپنا علیحدہ میمورنڈم پیش کیا تھا۔ انجمن مغلیہ نے اپنا علیحدہ میمورنڈم پیش کیا تھا، ینگ مین مسلم ایسوسی ایشن نے اپنا علیحدہ میمورنڈم پیش کیا تھا، تحصیل جالندھر کی مسلم راجپوت ایسوسی ایشن نے علیحدہ اور مسلم راجپوت کمیٹی گڑھ شنکر اور نواں شہر نے علیحدہ میمورنڈم پیش کیا، انجمن مدرسۃ البنات جالندھر نے علیحدہ میمورنڈم پیش کیا۔ اس پس منظر میں جماعتِ احمدیہ کو الزام دینا کہ اس نے ایسا میمورنڈم کیوں پیش کیا، ایک بے معنی بات ہے۔

(The Partition of Punjab A Compilation of Official Documents Vol.1 p474-477)

اور یہ میمورنڈم مسلم لیگ کے کیس مضبوط کرنے کے لئے اور ان کی حمایت کے لئے پیش کئے گئے تھے۔ اسی طرح سکھوں کی طرف سے ایک مجموعی میمورنڈم پیش کیا گیا تھا اور اس کی تائید میں سکھوں کے

بعض گروہوں نے اپنے علیحدہ میمورنڈم پیش کئے تھے اور اگرچہ کانگریس نے اپنا میمورنڈم پیش کیا تھا مگر کئی ہندو تنظیموں نے اپنے علیحدہ میمورنڈم اس کی تائید میں پیش کئے تھے۔

پھر جسٹس منیر صاحب نے اپنے مضمون میں لکھا تھا کہ احمدیوں نے گڑھ شنکر کے مختلف علاقوں کے مختلف اعداد و شمار پیش کئے تھے جس کی وجہ سے مسلم لیگ کا کیس کمزور ہوا تھا۔ اب تو جماعتِ احمدیہ کا میمورنڈم شائع ہو چکا ہے اور ہر کوئی اس حقیقت کا جائزہ لے سکتا ہے جماعتِ احمدیہ کے میمورنڈم میں گڑھ شنکر کے اعداد و شمار شامل ہی نہیں تھے۔ البتہ مسلم لیگ کی طرف سے گڑھ شنکر کی مذہب وار آبادی کے اعداد و شمار پیش کئے گئے تھے اور وہ اس شائع شدہ کارروائی کی دوسری جلد کے صفحہ 556 پر موجود ہیں۔ جہاں تک اس دعویٰ کا تعلق ہے کہ جماعت احمدیہ کے میمورنڈم سے کانگریس کو علم ہوا تھا کہ بین اور بسنتر نالہ کے درمیان غیر مسلموں کی اکثریت ہے تو یہ دعویٰ ہی مضحکہ خیز ہے کیونکہ اس کارروائی کا سرسری مطالعہ ہی بتا دیتا ہے کہ کانگریس کو بخوبی علم تھا کہ کہاں کہاں کون سا گروہ اکثریت میں ہے۔ البتہ اس کارروائی کی تیسری جلد کے صفحہ 201 پر جسٹس مہرچند کے فیصلے میں اس علاقے کے حوالے سے جماعت احمدیہ کے جمع کرائے گئے نقشہ کا حوالہ ہے اور جماعت احمدیہ نے یہ نقشہ اس لئے پیش کیا تھا کیونکہ جسٹس دین محمد صاحب نے جو کہ مسلم لیگ کے نامزد کردہ جج تھے انہوں نے جماعت احمدیہ کے وکیل مکرم شیخ بشیر احمد صاحب سے کہا تھا کہ وہ یہ نقشہ کمیشن میں جمع کرائیں جس میں مختلف مذاہب کی اکثریت والے متصل علاقے دکھائے گئے ہوں۔ اب کسی طرح بھی اس پر جماعت احمدیہ کو متہم کرنا ایک خلاف عقل بات ہے۔ ورنہ جماعت احمدیہ کے میمورنڈم میں تو صرف یہ نکتہ اُٹھایا گیا تھا کہ ضلع، تحصیل یا اس سے کوئی بھی چھوٹا یونٹ لے لیں قادیان پاکستان کے مسلم اکثریت علاقہ سے متصل ہے اور اسے پاکستان میں شامل ہونا چاہئے۔ یہ نقشہ تو جسٹس دین محمد صاحب کے کہنے پر جمع کروایا گیا تھا

اور یہ حقیقت بھی پیشِ نظر رہنی چاہئے کہ جیسا کہ جسٹس منیر صاحب نے لکھا ہے کہ ان دو نالوں کے درمیان کا حصہ پاکستان میں ہی شامل کیا گیا تھا۔

ایک سوال یہ کیا گیا کہ 1974ء کے فسادات کے دوران حضرت چودھری ظفراللہ خان صاحب نے بین الاقوامی تنظیموں سے یہ اپیل کیوں کی تھی کہ وہ پاکستان میں جا کر دیکھیں کہ احمدیوں پر کیا مظالم ہو رہے ہیں۔ اب جب کہ اس کارروائی پر کئی دہائیاں گزر چکی ہیں یہ سمجھنا زیادہ آسان ہے کہ یہ سوال بھی خلافِ عقل تھا۔ خواہ وہ پارٹی ہو جس سے اٹارنی جنرل صاحب وابستہ تھے یا وہاں پر موجود دوسری سیاسی پارٹیاں ہوں ان سب نے بارہا بین الاقوامی تنظیموں سے یہ اپیل کی کہ وہ پاکستان میں آ کر دیکھیں کہ وہاں ان پر کیا کیا مظالم ہو رہے ہیں۔ کئی اہم مواقع پر بین الاقوامی مبصرین منگوائے گئے ہیں۔ کئی مرتبہ ملک کے اندرونی مذاکرات میں بیرونی گروہوں کی اعانت لی گئی ہے۔ یہ ایک لمبی اور تکلیف دہ تاریخ ہے اور یہ حقائق معروف ہیں۔ بعد میں اسی پیپلزپارٹی نے جس کی حکومت کی طرف سے اٹارنی جنرل صاحب سوالات کر رہے تھے، اقوامِ متحدہ سے اپیل کی کہ وہ اس کی چیئر پرسن اور ملک کی سابق وزیرِ اعظم بینظیر بھٹو صاحبہ کے قتل کی تحقیقات کرے حالانکہ اس وقت ملک میں پیپلز پارٹی کی ہی حکومت ہے۔

اس مرحلہ پر اٹارنی جنرل صاحب نے یہ عجیب نکتہ اُٹھایا کہ جب ہندوستان کے مسلمانوں پر ظلم ہوئے اس وقت تو چوہدری ظفراللہ خان صاحب نے کوئی اپیل نہیں کی۔ اس تبصرے سے ظاہر ہوتا ہے کہ اٹارنی جنرل صاحب اور ان کی اعانت کرنے والے ممبرانِ اسمبلی پاکستان کی تاریخ سے زیادہ واقف نہیں تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب آزادی کے وقت فسادات ہوئے اور ہندوستان میں بسنے والے مسلمانوں پر بھی مظالم کئے گئے تو حضرت چوہدری ظفر اللہ خان صاحب ہی نے اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل میں اس کے متعلق آواز بلند کی تھی اور

ثبوتوں کے ساتھ ان مظالم کی تفاصیل سلامتی کونسل کے سامنے رکھی تھیں۔ کوئی بھی سلامتی کونسل کے ریکارڈ سے اس بات کی تصدیق کر سکتا ہے۔

پھر یہ فرسودہ اور بالکل غلط الزام دہرانے کی کوشش کی گئی کہ جماعتِ احمدیہ کے عقائد کے مطابق حضرت مسیح موعود علیہ السلام کا درجہ نعوذُ باللہ آنحضرت ﷺ کے برابر ہے۔ جماعتِ احمدیہ کے محضرنامہ میں ہی اس الزام کو بالکل غلط ثابت کر دیا گیا ہے۔ ایک بار پھر یہ ثابت کرنے کی کوشش میں اٹارنی جنرل صاحب نے چشمہ معرفت کا یہ حوالہ پڑھ کر سنایا

"یعنی خدا وہ خدا ہے جس نے اپنے رسول کو ایک کامل ہدایت اور سچے دین کے ساتھ بھیجا تا اُس کو ہر ایک قسم کے دین پر غالب کر دے یعنی ایک عالم گیر غلبہ اُس کو عطا کرے اور چونکہ وہ عالم گیر غلبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ظہور میں نہیں آیا اور ممکن نہیں کہ خدا کی پیش گوئی میں کچھ تخلّف ہو اس لیے اس آیت کی نسبت اُن سب متقدمین کا اتفاق ہے جو ہم سے پہلے گزر چکے ہیں کہ یہ عالم گیر غلبہ مسیح موعود کے وقت میں ظہور میں آئے گا۔ کیونکہ اس عالم گیر غلبہ کے لئے تین امر کا پایا جانا ضروری ہے جو کسی پہلے زمانہ میں وہ پائے نہیں گئے۔"

("چشمہ معرفت" تصنیف 15 مئی 1908۔ روحانی خزائن جلد 23 صفحہ 90-91)

اپنی طرف سے یہ اعتراض اُٹھایا جا رہا تھا کہ بانی سلسلہ احمدیہ نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ غالب غلبہ میرے زمانے میں ہو گا اور آنحضرت ﷺ کے زمانے میں نہیں ہوا تھا اور اس طرح آپ نے نعوذُ باللہ آنحضرت ﷺ پر فضیلت کا دعویٰ کیا ہے۔ لیکن ایک بار پھر بڑی چالاکی سے نامکمل عبارت پیش کی گئی اور جو عبارت پڑھی گئی اس سے قبل لکھی گئی آیتِ کریمہ کا ذکر نہیں کیا گیا کیونکہ اس سے اصل مضمون واضح ہو جاتا تھا۔ حضرت

خلیفۃ المسیح الثالثؒ نے اسی وقت ساری عبارت پڑھ کر سارا مضمون بیان فرمایا جس سے یہ اعتراض خود بخود غلط ثابت ہو جاتا تھا۔ اس سے قبل کی عبارت یہ ہے۔

وہ خدا جس کو کسی نے بھی نہیں دیکھا اُس پر یقین لانے کے لئے بہت گواہوں اور زبردست شہادتوں کی حاجت ہے جیسا کہ دو آیتیں قرآن شریف کی اس واقعہ پر گواہ ہیں۔ اور وہ یہ ہیں:۔

وَإِن مِّنْ أُمَّةٍ إِلَّا خلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ (فاطر :25)

فَكَيْفَ إِذَا جِئْنَا مِن كُلِّ أُمَّةٍ بِشَهِيْدٍ ۔ (النساء : 42)

یعنی کوئی قوم نہیں جس میں ڈرانے والا نبی نہیں بھیجا گیا یہ اس لئے کہ تا ہر ایک قوم میں ایک گواہ ہو کہ خدا موجود ہے اوروہ اپنے نبی دنیا میں بھیجا کرتا ہے۔ اور پھر جب اُن قوموں میں ایک مُدّت دراز گذرنے کے بعد باہمی تعلقات پیدا ہونے شروع ہوگئے اور ایک ملک کا دوسرے ملک سے تعارف اور شناسائی اور آمد و رفت کا کسی قدر دروازہ بھی کھل گیا اور دُنیا میں مخلوق پرستی اور ہر ایک قسم کا گناہ بھی انتہا کو پہنچ گیا۔ تب خدا تعالیٰ نے ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سیدنا حضرت محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وسلم کو دنیا میں بھیجا تا بذریعہ اس تعلیم قرآنی کے جو تمام عالم کی طبائع کے لئے مشترک ہے دنیا کی تمام متفرق قوموں کو ایک قوم کی طرح بناوے اور جیسا کہ وہ واحد لا شریک ہے اُن میں بھی ایک وحدت پیدا کرے اور تا وہ سب مل کر ایک وجود کی طرح اپنے خدا کو یاد کریں اور اس کی وحدانیت کی گواہی دیں اور تا پہلی وحدت قومی جو ابتدائے آفرینش میں ہوئی اور آخری وحدت اقوامی جس کی بنیاد آخری زمانہ میں ڈالی گئی یعنی جس کا خدا نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مبعوث ہونے کے وقت میں ارادہ فرمایا۔ یہ دونوں قسم کی وحدتیں خدائے واحد لا شریک کے وجود اور اس کی وحدانیت پر دوہری شہادت ہو کیونکہ وہ واحد ہے اس لئے اپنے تمام نظام جسمانی اور روحانی میں وحدت کو

دوست رکھتا ہے۔ اور چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا زمانہ قیامت تک ممتد ہے اورآپ خاتم الانبیاء ہیں اِس لئے خدا نے یہ نہ چاہا کہ وحدت اقوامی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں ہی کمال تک پہنچ جائے کیونکہ یہ صورت آپ کے زمانہ کے خاتمہ پر دلالت کرتی تھی۔ یعنی شبہ گذرتا تھا کہ آپ کا زمانہ وہیں تک ختم ہوگیا کیونکہ جو آخری کام آپ کا تھا وہ اسی زمانہ میں انجام تک پہنچ گیا۔ اس لئے خدا نے تکمیل اس فعل کی جو تمام قومیں ایک قوم کی طرح بن جائیں اور ایک ہی مذہب پر ہوجائیں۔ زمانہ محمدی کے آخری حصہ میں ڈال دی جو قرب قیامت کا زمانہ ہے اور اس تکمیل کے لئے اسی اُمّت میں سے ایک نائب مقرر کیاجو مسیح موعود کے نام سے موسوم ہے اور اُسی کا نام خاتم الخلفاء ہے۔

پس زمانہ محمدی کے سر پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور اُس کے آخر میں مسیح موعود ہے اور ضرور تھا کہ یہ سلسلہ دُنیا کا منقطع نہ ہو جب تک کہ وہ پیدا نہ ہولے کیونکہ وحدت اقوامی کی خدمت اُسی نائب النبوت کے عہد سے وابستہ کی گئی ہے اور اسی کی طرف یہ آیت اشارہ کرتی ہے اوروہ یہ ہے۔

هُوَ الَّذِیْ أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهِ (التوبة : 33)

اس ساری عبارت میں تو آنحضرت ﷺ کی بے مثال فضیلت کا ذکر ہے۔ اس میں تو بیان کیا گیا ہے کہ آپ کا زمانہ تو قیامت تک چلے گا اور قیامت تک آپ کا فیضان جاری رہے گا۔ مکمل حوالہ پڑھنے کے بعد حضور مندرجہ بالا آیتِ کریمہ کی تفسیر پر جو سورۃ صف کی دسویں آیت ہے ایک لطیف بحث اُٹھائی۔ اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ ”وہ (خدا) ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا ہے تا کہ اسے تمام ادیان پر غالب کر دے“۔ آپ نے سابقہ معتبر تفاسیر کے حوالوں سے یہ ثابت کیا کہ یہ مضمون جب بھی قرآنِ کریم میں بیان ہوا ہے تو مفسرین نے اس سے یہ مراد لی ہے کہ تمام ادیان پر غالب آنے کی پیشگوئی نزول عیسیٰ

علیہ السلام کے وقت پوری ہوگی۔ آپ نے اس ضمن میں تفسیرِ ابن جریر، تفسیرِ حسینی اور غرائب القرآن کی مثالیں پیش کیں کہ ان تینوں تفاسیر میں یہ لکھا ہے کہ عالمگیر غلبے کا یہ وعدہ نزول عیسیٰؑ کے وقت پورا ہوگا۔ اس پس منظر میں دیکھا جائے تو حضرت مسیح موعود علیہ السلام وہی مضمون بیان فرمارہے ہیں جنہیں سابقہ مفسرین چودہ سو سال سے بیان کرتے رہے ہیں۔ اس پر کسی قسم کا اعتراض نہیں اُٹھایا جا سکتا۔

اب یوں معلوم ہوتا تھا کہ محض وقت گزارنے کے لئے سوالات کئے جا رہے ہیں۔ طے شدہ موضوع پر تو کارروائی شروع ہی نہیں ہوئی تھی لیکن اب تو نا قابلِ فہم صورتِ حال پیدا ہو رہی تھی۔ اٹارنی جنرل صاحب نے سوال کیا کہ کیا مرزا صاحب کو یکلخت نبوت ملی تھی یا تدریجاً ملی تھی اور کیا کسی اور نبی کو تدریجاً نبوت ملی تھی اور اس کے ساتھ کہا کہ یہ سوال مولوی ہزاروی صاحب کی طرف سے کیا گیا ہے۔

جواب کی طرف تو بعد میں آتے ہیں لیکن یہاں ہر شخص یہ سوچنے پر مجبور ہو گا کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کو اپنے دعاوی کے بارے میں الہامات تدریجاً ہوئے تھے یا یکلخت اس کا قومی اسمبلی یا اس کارروائی سے کیا تعلق تھا؟ وہ کیوں فکر مند ہو رہے تھے؟

اس کے جواب میں حضور نے یہ پُر معرفت نکتہ بیان فرمایا کہ نبی اکرم ﷺ پر آیتِ خاتم النبیّین نبوت کے سترہویں سال نازل ہوئی تھی۔ مقامِ خاتم النبیّین آنحضرت ﷺ کو سب انبیاء میں ممتاز کرتا ہے اور آپ کے زمانہ نبوت کے آغاز کے سترہ سال کے بعد اس کے بارے میں وحی نازل ہوئی تھی۔ اگر کوئی ناسمجھ یہ اعتراض کر بیٹھے کہ پہلی وحی میں آپ پر کیوں نہ واضح کر دیا گیا کہ آپ اس مقام پر فائز ہیں تو یہ اعتراض بالکل بے بنیاد ہو گا۔

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ اوائل میں اللہ تعالیٰ نے آنحضرت ﷺ کو سچی خوابیں دکھائی تھیں اور پھر غارِ حراء میں آپ پر جبرائیلؑ نازل ہوئے۔

(صحیح بخاری۔ کتاب کیف بدء الوحی)

اس پر کوئی یہ اعتراض نہیں کر سکتا کہ پہلے دن ہی آپ پر جبرائیل کیوں نہیں نازل ہوا؟ اسی طرح پہلی وحی میں آپ کو انذار کرنے کا حکم نہیں ملا تھا۔ یہ حکم بعد میں نازل ہوا اور آپ نے اللہ تعالیٰ کا پیغام دوسروں تک پہنچایا۔ کیا اس پر کوئی اعتراض کر سکتا ہے کہ پہلی وحی میں ہی آپ کو حکم کیوں نہ دیا گیا کہ آپ نے دنیا کو انذار کرنا ہے؟ ایسا اعتراض معقولیت سے بالکل عاری ہوگا۔ حضور نے اس امر کی نشاندہی فرمائی کہ کائنات کی ہر چیز کی نشو و نما میں ہمیں تدریج نظر آتی ہے۔

یہ اعتراض کفار مکہ نے بھی کیا تھا جس کا ذکر قرآن کریم کی سورۃ الفرقان آیت 33 میں

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْآنُ جُمْلَةً وَاحِدَةً

اور وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا وہ کہیں گے کہ اس پر قرآن کریم ایک دفعہ کیوں نہ اتارا گیا۔

اب اٹارنی جنرل صاحب نے اس اعتراض کو وزنی بنانے کے لئے کہا کہ "براہین احمدیہ حصہ پنجم" کے صفحہ 54 پر لکھا ہے:

" اور یہ الہامات اگر میری طرف سے اس موقع پر ظاہر ہوتے جبکہ علماء مخالف ہوگئے تھے وہ لوگ ہزار ہا اعتراض کرتے لیکن ایسے موقع پر شائع کیے گئے جبکہ یہ علماء ہمارے موافق تھے یہی سبب باوجود اس قدر جوش کے ان الہامات پر انہوں نے اعتراض نہیں کیا چونکہ وہ ایک دفعہ اس کو قبول کر چکے تھے اور سوچنے پر ظاہر ہو

گیا کہ میرے دعویٰ مسیح موعود ہونے کی بنیاد انہی الہامات سے پڑی ہے اور انہی میں میرا نام خدا نے عیسٰی رکھا اور جو مسیح موعود کے حق میں آیات تھیں وہ میرے حق میں بیان دیں۔ اگر علماء کو خبر ہوتی کہ ان الہامات میں اس شخص کا مسیح ہونا ثابت ہے تو کبھی قبول نہیں کرتے خدا کی قدرت انہوں نے قبول کرلیا اور اس پیچ میں پھنس گئے۔"

"براہین احمدیہ حصہ پنجم" صفحہ 54 (طبع اوّل)۔ اور صفحہ 54 (روحانی خزائن جلد 21) پر اس قسم کی کوئی عبارت نہیں ملی۔

اس مرحلہ پر وقفہ ہوا اور نو بجے کے بعد جب کارروائی شروع ہوئی تو جماعت کے وفد کے آنے سے پہلے یہ بحث شروع ہوئی کہ یہ کارروائی کب تک چلے گی اور پھر چھ ممبران کا تعین ہوا جو ابھی مزید سوالات پوچھنا چاہتے تھے۔ شاہ احمد نورانی صاحب نے کہا کہ ابھی دو چار روز اور چلا لیں۔ اس پر سپیکر صاحب نے اصرار کیا کہ نہیں اب اس کو ختم کیا جائے اور یہ دو چار روز اور نہیں چلے گا یہ حتمی بات ہے۔

اس مرحلہ پر حضور ہال میں تشریف لائے اور ان کی آپس کی بحث ختم ہوئی۔ اٹارنی جنرل صاحب نے آغاز میں ان حوالوں کا ذکر کر کے جو وقفہ سے پہلے پیش ہوئے تھے اور جن کو چیک کرنا تھا کہا کہ آپ نے کچھ جوابات دینے تھے۔ اس پر حضور نے جواب دیا کہ میں دس منٹ میں کیا کر سکتا تھا اور اس وقت کتاب نہیں تھی۔ اس پر اٹارنی جنرل صاحب نے یہ انکشاف فرمایا:۔

"اس میں بھی وہ کہہ رہے ہیں کہ وہ page بھی ان کا غلط ہے۔ پتہ نہیں کیا۔ وہ بھی دیکھ لیں گے اس میں۔ یہاں نہیں ہے ان کے پاس ورنہ میں دے دیتا۔"

یعنی ابھی اپنی طرف سے دلیل کے طور پر ایک حوالہ پیش کیااور کچھ ہی دیر میں وہ کھسیانے ہو کر کہہ رہے تھے وہ تو غلط تھا۔ اب یحییٰ بختیار صاحب نے یہ دقیق نکتہ بیان فرمایا کہ

” بعض دفعہ Page ٹھیک ہوتا ہے کتاب غلط ہوتی ہے۔ کچھ پتہ نہیں ہوتا اس پر۔ میرے لئے بڑی مشکل ہو جاتی ہے۔ کیونکہ آپ بھی difficulty ہے اتنی کتابوں میں trace کرنا ... “

اب اٹارنی جنرل صاحب کے واویلے میں بیچارگی نمایاں ہوتی جا رہی تھی۔ کارروائی ختم ہو رہی تھی اور اب تک حوالوں کا مسئلہ حل نہیں ہو سکا تھا۔

اب تک حوالہ جات کے معاملہ میں جو غلطیاں ان سے ہو چکی تھیں اس پس منظر میں اس پر تبصرہ کی ضرورت نہیں۔ پھر ان کی گفتگو کا سلسلہ کچھ بے ربط سا ہو گیا وہ یہ کہہ رہے تھے کہ آپ غدر 1857ء کی جنگ کو جہاد نہیں سمجھتے۔ اس میں بہت سے بچوں کو اور عورتوں کو مارا گیا تھا لیکن 1947ء میں آزادی کے وقت بھی تو بہت سے بچوں اور عورتوں کو فسادات کے دوران مارا گیا تھا۔ یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ اس منطق سے کیا نتیجہ نکالنے کی کوشش کر رہے تھے۔ آخر وہ 1857ء کی جنگ سے ایک صدی سے بھی زیادہ عرصہ گزرنے کے بعد جماعتِ احمدیہ کے وفد سے اس کے بارے میں کوئی فیصلہ کیوں کرانا چاہ رہے تھے۔ حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ نے فرمایا کہ اُس وقت کن لیڈروں نے ان واقعات کو سراہا تھا اور Condemn نہیں کیا تھا۔ اگر ان کے نام مجھے پتہ چل جائیں تو میں ممنون ہوں گا۔

بات آگے چلی تو اٹارنی جنرل صاحب نے چشمہ معرفت کا ایک حوالہ پڑھنے کی کوشش کی اور پھر خود ہی کہا کہ یہ حوالہ تو غلط ہے۔ پھر چشمہ معرفت کے صفحہ 39 پر لکھا ہے کہ ” ایسی بات غلط ہے کہ زبان ایک ہو وحی

کسی اور ... " اور پھر انہوں نے حوالے کی عبارت ادھوری چھوڑ دی۔ پہلے ایڈیشن میں یا روحانی خزائن کے ایڈیشن میں مذکورہ صفحہ پر یہ الفاظ یا معنوی طور پر یہ عبارت درج نہیں ہے۔

اب اٹارنی جنرل صاحب کو اس بات کا قرار کرنا پڑ رہا تھا کہ انٹ شنٹ حوالوں کی بنیاد پر سوالات کا سلسلہ بند کرنا پڑے گا۔ انہوں نے کہا:۔

"I will be rerquesting the members, after this to give up. Now most of them have been asked one way or other.

اب سپیکر صاحب کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ انہوں نے بھی کہا کہ میں اٹارنی جنرل صاحب سے درخواست کروں گا کہ وہ باقی حوالہ جات گواہ کو دے دیں تاکہ کل اس کا جواب آجائے۔ چنانچہ چاروناچار انہوں نے حوالوں کی فہرست لکھوانی شروع کی۔ ابھی حوالہ کی عبارت نہیں پڑھی جا رہی تھی۔ صرف صفحات کے نمبر لکھوائے جا رہے تھے۔

یہ بات قابلِ ملاحظہ ہے کہ اتنے روز کی بحث کے بعد جب کارروائی اپنے اختتام کو پہنچ رہی تھی تو سوالات کرنے والے قابل حضرات کے وکیل کو متعلقہ حوالے بھی نہیں مل رہے تھے۔ اور بعض اوقات تو یہ تاثر ملنے لگتا تھا کہ شاید ان کے ذہن میں ہے کہ یہ بھی جماعتِ احمدیہ کے وفد کی ذمہ داری ہے کہ ان کے کام کے حوالے تلاش کر کے ان کی خدمت میں پیش کرے تا کہ پاکستان کی قومی اسمبلی بسہولت اپنے اعتراضات کو پیش کر سکے۔

کارروائی کا آخری دن

کارروائی اپنے اختتام کو پہنچ رہی تھی اور اب تک اصل موضوع یعنی ختمِ نبوت پر سوالات شروع ہی نہیں ہوئے تھے۔ شاید کسی ذہن میں یہ امید ہو کہ آخری دن تو موضوع پر بات ہو گی لیکن افسوس ایسا نہیں ہوا۔ ممبرانِ اسمبلی آخری روز بھی یہ ہمت نہیں کر سکے کہ ادھر اُدھر کی باتوں کو چھوڑ کر اُس موضوع پر بحث کریں جس کا تعین خود انہوں نے کیا تھا۔ پہلے حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ نے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے کچھ فارسی اشعار پڑھ کر ان کا مطلب بیان فرمایا۔ ان اشعار پر پہلے اعتراض کیا گیا تھا۔ اس کے بعد حضور نے اس اعتراض کا جواب شروع فرمایا جو اس بات پر کیا گیا تھا کہ فروری 1899 ء کو جب ڈپٹی کمشنر گورداسپور کی عدالت میں مقدمہ چل رہا تھا تو حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے عدالت کے کہنے پر ایک نوٹس پر دستخط فرمائے کہ آئندہ سے میں کسی کی موت کی پیشگوئی شائع نہیں کروں گا اور یہ ایک نبی کی شان کے مطابق نہیں ہے۔ اس واقعہ کا پس منظر یہ تھا کہ انگریز حکومت کے ایک پولیس افسر نے ڈپٹی کمشنر گورداسپور کو لکھا کہ ایک گزشتہ مقدمہ میں مرزا غلام احمد کو سابق ڈپٹی کمشنر ڈگلس صاحب نے یہ کہا تھا کہ وہ آئندہ سے ایسی پیشگوئیاں شائع نہ کریں جس سے نقضِ امن کا اندیشہ ہو لیکن اب انہوں نے اس کی خلاف ورزی شروع کر دی ہے۔ اور اس کی تائید میں مولوی محمد حسین بٹالوی صاحب نے بھی ڈپٹی کمشنر کو درخواست دی کہ مجھے خطرہ ہے کہ مرز ا غلام احمد کے پیروکار مجھے نقصان پہنچائیں گے۔ اور آخر میں عدالت نے مولوی محمد حسین بٹالوی کی اشتعال انگیز تحریروں کو بھی دیکھا۔ اور مقدمہ کے آخر میں محمد حسین بٹالوی صاحب کو فہمائش کی گئی کہ وہ آئندہ تکفیر اور بد زبانی سے باز رہیں۔ مقدمہ کے آخر میں عدالت نے فریقین سے ایک تحریر پر دستخط کرائے کہ آئندہ کوئی فریق

اپنے مخالف کی نسبت موت وغیرہ کسی دل آزار مضمون کی پیشگوئی نہ کرے۔ کوئی کسی کو کافر اور دجال اور مفتری نہ کہے۔ بد گوئیوں اور گالیوں سے مجتنب رہیں۔

اس اعتراض کے جواب میں حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ نے فرمایا کہ اس واقعہ سے بہت پہلے 1886ء میں ہی حضرت مسیح موعود علیہ السلام اپنے اس طریق کا اعلان فرما چکے تھے کہ وہ کسی کی موت کی پیشگوئی اس وقت تک شائع نہیں فرماتے تھے جب تک اُس شخص کی طرف سے اس بابت اصرار نہ ہو اور اس کے ثبوت کے طور پر حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ نے 20/فروری 1886ء کے اشتہار کی عبارت پیش فرمائی اور اگر آپ نے عدالت میں اس تحریر پر دستخط فرمائے تو یہ آپ کے طریق کے مطابق ہی تھا۔

پھر اس کے بعد اٹارنی جنرل صاحب نے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی بعض پیشگوئیوں کے متعلق کچھ سوالات اُٹھائے اور حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ نے مولوی ثناء اللہ صاحب کو دعوتِ مباہلہ اور عبد اللہ آتھم اور محمدی بیگم کی پیشگوئیوں کے متعلق تفاصیل بیان فرمائیں۔

مولوی ثناء اللہ کے متعلق حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ نے فرمایا کہ جب حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے اُس کے متعلق اشتہار شائع فرمایا تو اُس نے بجائے اس کو قبول کرنے کے اس طریقہ کار کو منظور کرنے سے انکار کر دیا۔ ہم یہاں مولوی ثناء اللہ کی اس تحریر کے کچھ حوالے پیش کرتے ہیں جو کہ انہوں نے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے اشتہار کے جواب میں تحریر کی تھی اس کا ایک حصہ حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ نے قومی اسمبلی کی سپیشل کمیٹی میں بھی پڑھ کر سنایا تھا۔ مولوی صاحب لکھتے ہیں۔

”(اوّل) یہ کہ اس دعا کی منظوری مجھ سے نہیں لی۔ اور بغیر میری منظوری کے اس کو شائع کیا۔“

پھر لکھتے ہیں:۔

"یہ تحریر تمہاری مجھے منظور نہیں اور نہ کوئی دانا اس کو منظور کر سکتا ہے۔"

اپنے اس مضمون کا اختتام مولوی صاحب ان الفاظ پر کرتے ہیں۔

"مرزائیو! تمہارا گرو اور تم کہا کرتے ہو کہ مرزا صاحب منہاجِ نبوت پر آئے ہیں۔ کسی نبی نے بھی اس طرح اپنے مخالفوں کو فیصلہ کرنے کی طرف بلایا ہے؟ بتلاؤ تو انعام لو ورنہ منہاجِ نبوت کا نام لیتے ہوئے شرم کرو۔ شیم ۔شرم۔ شیم"۔

(اہلحدیث 26 اپریل 1907ص 5,6)

ان حوالوں سے صاف ثابت ہو جاتا تھا کہ مولوی صاحب نے خود ہی گریز کر کے اپنی جان بچائی تھی اور دعا کی اس دعوت کو قبول نہیں کیا تھا۔

سوالات کرنے والے بد ترین بوکھلاہٹ کا شکار تھے۔ جب مولوی ثناء اللہ صاحب کے یہ حوالے سامنے رکھے گئے تو کچھ دیر لایعنی بحث کرنے کے بعد اٹارنی جنرل صاحب نے سوال کیا تو کیا کیا؟ سوال یہ تھے

"اور پھر اس کے بعد یہ بھی کہا جاتا ہے کہ مرزا صاحب کی وفات ہیضے سے ہوتی۔"(شاید ہوئی تھی) کہنا چاہتے تھے۔

ذرا تصور کریں سپیشل کمیٹی نے یہ طے کرنا تھا کہ جو شخص آنحضرت ﷺ کو آخری نبی نہیں مانتا اس کا اسلام میں Status کیا ہے۔ اور آخری دن اصل موضوع پر آنے کی بجائے سوال یہ کیا جا رہا ہے کہ حضرت بانی سلسلہ احمدیہ کی وفات کس بیماری سے ہوئی تھی؟ ہیضے سے ہوئی تھی یا کسی اور بیماری سے ہوئی تھی۔ حضور کو

اسہال کی بیماری تھی جو کہ جب کام کا شدید دباؤ ہو تو یہ تکلیف اور شدید ہو جاتی تھی اور اس بیماری کا حملہ پہلے بھی کئی مرتبہ ہو چکا تھا اور حضور کی مبارک زندگی میں ہی اس تکلیف کا ذکر جماعت کے اخبارات اور کتب میں بار بار آ چکا تھا۔

(الحکم 24/ جولائی 1901ء۔ ص 10,11 اور تریاق القلوب۔ روحانی خزائن جلد 15 ص 208)

ہیضہ کی طرز یہ بالکل نہیں ہوتی کہ سالہاسال وقفوں سے اس کی علامات ظاہر ہوتی رہیں ایسا ulceratice colitis جیسی بیماریوں میں ہوتا ہے۔ ہیضہ میں مرض چند دن میں ترقی کرکے شدید ہوجاتا ہے اور پھر مریض کی موت ہو جاتی ہے یا پھر اس کے جسم میں روبصحت ہو کے اس کے خلاف قوتِ مدافعت پیدا ہو جاتی ہے۔ اور کسی حدیث میں یہ نہیں لکھا کہ کسی مامور یا ولی اللہ کی وفات ہیضہ سے نہیں ہو سکتی اگر کچھ لکھا ہے تو یہ لکھا ہے کہ پیٹ کی بیماری سے مرنے والا شہید ہے۔

(صحیح بخاری۔ باب الشھادت سبع سوی القتل)

پھر اٹارنی جنرل صاحب نے یہ سوال اُٹھایا کہ احمدیوں نے کہا تھا کہ مذہباً ترکوں سے ہمارا کوئی تعلق نہیں اور اٹارنی جنرل صاحب نے کوئی حوالہ پڑھ کر غلطیوں میں اضافہ کرنے کی کوشش تو نہیں کی البتہ یہ ضرور کہا کہ جہاں تک مجھے یاد ہے کہ یہ کہا گیا تھا کہ ہم ترکی کے سلطان کو مذہباً خلیفہ نہیں مانتے۔ اب یہ بات ظاہر ہے کہ پہلی اور دوسری بات میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اور صاف ظاہر ہے احمدی خلافتِ احمدیہ سے وابستہ ہیں اور وہ ترکی کے سلطان کو خلیفہ کیوں ماننے لگے۔ اور تو اور پاکستان میں غیر احمدی مسلمانوں سے پوچھ لیں کہ ان میں سے کتنے ترکی کے سلطان کو خلیفہ راشد سمجھتے ہیں، ایسا آدمی ڈھونڈے سے بھی نہیں ملے گا۔ اور پھر یہ

سوال اُٹھایا کہ جب پہلی جنگِ عظیم کے دوران بغداد پر انگریزوں کا قبضہ ہوا ہے تو قادیان میں چراغاں جلائے گئے تھے کہ نہیں۔

یہ اعتراض بھی بار بار کیا جاتا ہے کہ جب پہلی جنگِ عظیم میں انگریز افواج نے بغداد پر قبضہ کیا تو قادیان میں چراغاں کیا گیا تھا۔ پہلی بات یہ ہے کہ چراغاں بغداد کی فتح پر نہیں ہوا تھا بلکہ جب اتحادیوں نے جرمنی کو شکست دی ہے اور پہلی جنگِ عظیم کا خاتمہ ہوا ہے اس وقت ہوا تھا۔ بغداد پر قبضہ مارچ 1917ء میں اور پہلی جنگِ عظیم کا خاتمہ 1918ء کے آخر میں ہوا تھا اور صرف قادیان میں نہیں بلکہ پورے ہندوستان میں کئی مقامات پر یہ چراغاں کیا گیا تھا لیکن یہ اعتراض اُٹھانے والے اپنی دانست میں بہت بڑا اعتراض اُٹھاتے ہیں۔ جب ہم نے انٹرویو کے دوران صاحبزادہ فاروق علی خان صاحب سے اس سوال کا ذکر کیا تو انہوں نے کہا کہ مجھے یہ سوال یاد ہے اور یہ سوال کرنے کی وجہ یہ تھی کہ اس سے یہ ثابت ہوتا تھا کہ احمدیوں نے ہمیشہ اپنے آپ کو دوسرے مسلمانوں سے علیحدہ رکھا ہے اور مسلم دنیا کے ساتھ منسلک نہیں ہوتے تھے۔ اس لئے اس کے Downfall کو Welcome کیا۔ پہلی بات یہ ہے کہ جب جنگِ عظیم کا خاتمہ ہوا تو ترکی کی سلطنت عثمانیہ کو پہلے ہی شکست ہو چکی تھی اور اس موقع پر ترکی کی شکست پر نہیں بلکہ جرمنی کی شکست پر جشن منایا گیا تھا اور اگر ہم یہ معیار تسلیم کرلیں کہ پہلی جنگِ عظیم میں جس کی ہمدردیاں انگریزوں کے ساتھ تھیں وہ اپنے آپ کو مسلمانوں سے علیحدہ رکھنا چاہتا تھا اور یہ اتنا بڑا جرم ہے کہ اس کو قانونِ پاکستان میں غیر مسلم قرار دینے کی ایک وجہ بن سکتا ہے تو ہمیں یہ دیکھنا پڑے گا کہ پہلی جنگِ عظیم کے دوران ہندوستان کے مسلمانوں میں سے کس کس کی ہمدردیاں انگریزوں کے ساتھ تھیں۔ پھر اسی کلیہ کی رو سے یہ بھی ماننا پڑے گا کہ ان کے متعلق بھی یہی خیالات روا رکھے جائیں۔

جب 1914ء میں پہلی جنگِ عظیم کا آغاز ہوا تو مسلمانانِ برِ صغیر کا ردِّ عمل کیا تھا، اس کا اندازہ اس مواد سے لگایا جا سکتا ہے جو کہ پنجاب یونیورسٹی کی ریسرچ سوسائٹی آف پاکستان نے ایک کتاب میں جمع کیا ہے۔ جب پہلی جنگِ عظیم کا آغاز ہوا تو پنجاب کی Legislative Council نے متفقہ طور پر ایک قرارداد منظور کی۔ اس کونسل میں مسلمان، ہندو اور سکھ نمائندگان شامل تھے۔ اس قرارداد میں یہ درج تھا کہ ہم ایمپائر کے بادشاہ کو اپنی وفاداری کا یقین دلاتے ہیں اور یہ یقین دلاتے ہیں کہ ایمپائر کے دشمنوں کے خلاف جو بھی مدد درکار ہو گی یہ صوبہ اس کو فراہم کرے گا۔

(A Book of Readings on the History of the Punjab 1799-1947 by Imran Ali Malik, Published by Research Society of the Punjab 1985 p321)

جہاں تک مسلمانوں کے علیحدہ ردِّ عمل کا تعلق ہے تو اس کتاب میں اس کے متعلق پہلی خبر یہ درج ہے۔ جب پہلی جنگِ عظیم کا آغاز ہوا تو لاہور میں مسلمانوں کا ایک جلسہ منعقد ہوا اور منتظمین کی طرف سے اس جلسہ کی غرض یہ بیان کی گئی کہ

" ملکہ معظم جارج پنجم دام اقبالہا کے حضور میں مسلمانانِ لاہور و پنجاب کی طرف سے اظہارِ وفاداری و عقیدت کیا جائے اور پروردگارِ عالم کی درگاہ میں سرکارِ انگلشیہ کی فتح و نصرت کے واسطے دعا کی جائے۔ نیز مسلمانانِ پنجاب کی طرف سے گورنمنٹ کو یقین دلایا جاوے کہ مسلمانوں کا ہر فرد و بشر سرکارِ عالیہ کی ہر قسم کی امداد و خدمت کے واسطے تیار ہے۔"

اس میں ایک قرارداد پیش کی گئی۔ اس قرار داد میں کہا گیا تھا کہ :

”مسلمانان لاہور کا یہ عام جلسہ جو بسرپرستی انجمنِ اسلامیہ پنجاب لاہور منعقد کیا گیا ہے۔ مسلمانانِ پنجاب کی طرف سے اپنی گورنمنٹ اور حضور شہنشاہ معظم کی خدمت میں ایک غیر متزلزل مکمل وفادار ہے۔ اور عقیدت شعاری کا اظہار کرتا ہے۔ اور سلطنت کی حفاظت میں اپنی خدمت اور تمام ذرائع پیش کرتا ہے۔“

اور اس قرارداد کی حمایت میں بہت سے معززین نے تقاریر کیں جن میں سے ایک نام ڈاکٹر اقبال صاحب بار ایٹ لاء کا بھی تھا۔ اس کے بعد مولوی غلام اللہ صاحب کی طرف سے دوسرا ریزولیشن یہ پیش کیا گیا کہ ہم سب مسلمانوں پر یہ فرض ہے کہ سرکار کی فتح و نصرت کے لئے دعائیں مانگیں۔ چنانچہ یہ قرارداد بھی منظور کی گئی کہ تمام مساجد میں سرکار کی فتح و نصرت کے لئے دعائیں مانگی جائیں۔

اس کے علاوہ بہت سے علماء نے بھی اس موقع پر مختلف جلسوں سے خطاب کئے۔ مذکورہ کتاب میں اس کی مثالیں درج ہیں۔ ایک مولوی صاحب، مولوی نظر حسین صاحب نے گوجرانوالہ میں جلسہ عام سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ سلطنتِ برطانیہ نے محض حقوق اور انصاف کی طرفداری کے لئے اس جنگ میں حصہ لیا ہے۔ چونکہ ہر مسلمان پر انصاف کی حمایت فرض ہے اس لیے ہم کو اپنے بادشاہ اور گورنمنٹ کی امداد اور جان نثاری لازمی ہے۔ ان مولوی صاحب نے پُر جوش آواز میں اعلان کیا کہ اگر گورنمنٹ عالیہ قبول کرے تو وہ سب سے پہلے بطور والنٹیئر میدانِ جنگ میں جانے کے لئے تیار ہیں اور دیگر حاضرین نے بھی پُر جوش الفاظ میں اپنے جان و مال گورنمنٹ کی خدمت میں نثار کرنے کی آمادگی ظاہر کی۔

(A Book of Readings on the History of the Punjab 1799-1947 by Imran Ali Malik, Published by Research Society of the Punjab 1985 p328-329)

اس وقت یہ افواہیں گرم تھیں کہ شاید ترکی جرمنی کا اتحادی بن کر برطانیہ کے خلاف میدانِ جنگ میں کود پڑے۔ اس پس منظر میں 16 / ستمبر 1914ء کو انجمنِ اسلامیہ پنجاب کا ایک پبلک جلسہ لاہور میں منعقد ہوا اس میں دیگر قرار دادوں کے علاوہ یہ قرارداد بھی منظور کی گئی کہ ہم امید رکھتے ہیں کہ اس جنگ میں مدبران ترکی بے تعلقی کا مسلک اختیار کئے رہیں گے اور ایک اور قرارداد یہ بھی منظور کی گئی کہ اگر

”ٹرکی خدانخواستہ اس جنگ میں دشمن کے ساتھ ہو جائے تو بھی مسلمانانِ ہند تاجِ برطانیہ کے ساتھ اپنے مستقیم وفا شعاروں اور مستقل اطاعت گزاری پر قائم رہیں گے۔“

اور یہ دعائیہ قرار داد بھی منظور ہوئی کہ

”یہ جلسہ قادرِ مطلق سے دعا کرتا ہے کہ وہ ٹرکی کو سب سے بڑی سلطنتِ اسلامی زمانہ حال کے خلاف جنگ میں آنے سے باز رکھے۔“

(A Book of Readings on the History of the Punjab 1799-1947 by Imran Ali Malik, Published by Research Society of the Punjab 1985 p330-331)

لیکن ہندوستان کے مسلمانوں کی تمام خواہشات کے برعکس اکتوبر 1914ء میں ترکی کی سلطنتِ عثمانیہ نے جرمنی اور آسٹریا کی حمایت میں جنگ میں شامل ہونے کا اعلان کر دیا۔ دوسری طرف برطانیہ، فرانس اور روس تھے اور بعد میں اٹلی اور امریکہ بھی ان اتحادیوں کے ساتھ مل گئے۔ چونکہ اس دور میں ترکی کی سلطنتِ عثمانیہ مسلمانوں کی سب سے بڑی سلطنت تھی اور اس کے بادشاہ خلیفہ کہلاتے تھے ان وجوہات کی بنا پر عموماً مسلمانوں میں اس سلطنت کے ساتھ اور ان کے بادشاہ کے ساتھ عمومی ہمدردی پائی جاتی تھی۔ لیکن جب ترکی نے برطانیہ

کے خلاف جنگ میں شامل ہونے کا اعلان کیا تو مسلمانوں کا ردِ عمل کیا تھا اس کا اندازہ ان مثالوں سے ہوتا ہے۔

مولانا محمد علی جوہر کے اخبار کامریڈ نے لکھا کہ انہیں ترکی سے ہمدردی ہے اور اس طرح ترکی کا برطانیہ کے مقابلے پر آنا تکلیف دِہ بھی ہے لیکن پھر واضح الفاظ میں مسلمانوں کے بارے میں لکھا کہ

”ان کے جذبات کچھ بھی ہوں اس معاملے میں ان کا راستہ سیدھا سادا ہے انہیں اپنے ملک اور اپنے بادشاہ کے بارے میں اپنے فرائض کے بارے میں ذرہ بھر شبہ نہیں ہے۔ ہم ایک سے زیادہ مرتبہ بغیر کسی جھجک کے یہ اظہار کر چکے ہیں کہ ترکی اور برطانیہ کی جنگ کی صورت میں ہندوستان کے مسلمانوں کا رویہ کیا ہوگا۔ اس کو دہرانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ جہاں تک ہندوستان کے مسلمانوں کے نقطہ نظر کا تعلق ہے، چونکہ وہ ہز مجسٹی کنگ ایمپرر کے وفادار اور امن پسند رعایا ہیں ہمیں اعتماد ہے کہ مزید کسی یقین دہانی کی ضرورت نہیں ہے۔ ان کے جذبات پر بہت بوجھ ہے لیکن وہ یہ بات نہیں بھول سکتے کہ وہ ہندوستان کی آبادی کا ایک بہت بڑا اور بہت ذمہ دار حصہ ہیں اور تاجِ برطانیہ کی رعایا ہیں۔ اس بحران میں ترکی کا معاملہ کچھ بھی ہو ہندوستان کے مسلمان اس بات سے بخوبی آگاہ ہیں کہ یہ کوئی مذہبی معاملہ نہیں ہے۔“

(The Indian Muslims, A documentary Record 1900-1947 Vol 5, Compiled by Shan Muhammad, published by Menakshi Prakashan New Dehli p12)

پھر مولانا محمد علی جوہر نے کامریڈ کی ایک اشاعت میں پہلی جنگِ عظیم کے حالات کا تجزیہ کر کے لکھا کہ

اگر ان حالات میں برطانوی گورنمنٹ ہمیں سیلف گورنمنٹ بھی دے دے تو ہم نہایت عاجزی سے اس کو لینے

سے انکار کر دیں گے کہ یہ اس کا وقت نہیں ہے۔ مراعات کا مطالبہ اور ان کو تسلیم کرنے کا وقت امن کا زمانہ ہے۔ ہم روس کے پولش نہیں ہیں ہمیں کسی رشوت کی ضرورت نہیں ہے۔

(The Indian Muslims, A documentary Record 1900-1947 Vol 5, Compiled by Shan Muhammad, published by Menakshi Prakashan New Dehli p38)

اگر ہم صرف پنجاب کی ہی مثال لیں تو یہاں پر لاہور، جہلم اور ملتان اور دیگر مقامات پر بڑے بڑے جلسے ہوئے اور مسلمانوں سمیت اہلِ پنجاب نے ایک طرف تو اس بات پر اظہارِ افسوس کیا کہ ترکی جنگ میں شامل ہو گیا ہے اور دوسری طرف انگریز حکومت کو اپنی وفاداری کا یقین دلایا۔ اس کے علاوہ حکومت کی جنگی مہمات کے لئے کثیر قرضہ بھی جمع کیا گیا۔ یہ قرضہ دینے والوں میں اہم شخصیات کے علاوہ عام لوگ بھی شامل تھے۔

یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ جب جنگ اپنے آخری سال میں داخل ہو چکی تھی تو کلکتہ میں آل انڈیا مسلم لیگ کا اجلاس30/ دسمبر 1917ء سے لے کر یکم جنوری 1918ء تک منعقد ہوا۔ اس اجلاس میں جو پہلی قرارداد منظور کی گئی وہ یہ تھی:

The All India Muslim League notes with deep satisfaction the steadfast loyalty of the the Muslim community to the British Crown during the present crisis through which the Empire is passing, and it assures the Government that it may continue to rely upon the loyal support of the Mussalmans and prays that this assurance may be conveyed to H.M the King Emperor

یعنی آل انڈیا مسلم لیگ اس بات پر اظہارِ اطمینان کرتی ہے کہ مسلمان اس بحران کے دوران جس میں سے ایمپائر گزر رہی ہے ثابت قدمی کے ساتھ تاجِ برطانیہ کے وفادار رہے ہیں اور وہ گورنمنٹ کو اس بات کا یقین دلاتی ہے کہ وہ مسلمانوں کی وفادارانہ حمایت پر انحصار جاری رکھ سکتی ہے۔ اور اس بات کی درخواست کرتی ہے کہ یہ یقین دہانی شاہِ معظم تک پہنچا دی جائے۔

اور ریکارڈ سے اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ جب یہ قرارداد منظور کی گئی تو دیگر عمائدینِ مسلم لیگ کے علاوہ قائد اعظم محمد علی جناح بھی بمبئی مسلم لیگ کے نمائندے کی حیثیت سے اجلاس میں موجود تھے۔

(The Indian Muslims, A documentary Record 1900-1947 Vol 5, Compiled by Shan Muhammad, published by Menakshi Prakashan New Dehli p145,149)

اور پھر ستمبر 1918ء میں راجہ صاحب محمود آباد کی صدارت میں مسلم لیگ کا ایک اجلاس بمبئی میں منعقد ہوا۔ اور ریکارڈ سے یہ بات ظاہر ہے کہ اس اجلاس میں بھی قائدِ اعظم محمد علی جناح موجود تھے۔ اس اجلاس میں پہلی قرارداد جو متفقہ طور پر منظور کی گئی وہ یہ تھی۔

The All India Muslim League tenders its most loyal homage to his majesty The King Emperor and assures the Government of the steadfast and continued loyalty of the Muslim community of India throughout the present crisis.

آل انڈیا مسلم لیگ شاہِ معظم کی خدمت میں نہایت وفادارانہ تعظیم پیش کرتی ہے اور حکومت کو اس بات کا یقین دلاتی ہے کہ ہندوستان کے مسلمان اس بحران میں ثابت قدمی کے ساتھ اپنی وفاداری جاری رکھیں گے۔

(The Indian Muslims, A documentary Record 1900-1947 Vol 5, Compiled by Shan Muhammad, published by Menakshi Prakashan New Dehli p184,189)

ان اجلاسات میں حکومت کے کئی فیصلوں سے اظہارِ اختلاف بھی کیا گیا اور حکومت کے بعض فیصلوں پر تنقید بھی کی گئی لیکن مذکورہ بالا قراردادوں سے یہ بات صاف ظاہر ہے کہ اس جنگِ عظیم کے دوران مسلم لیگ کی یہ پالیسی ہر گز نہیں تھی کہ مسلمانوں میں بغاوت کے خیالات پیدا کئے جائیں یا کسی بھی رنگ میں جنگ کے معاملے میں انگریز حکومت سے عدم تعاون کیا جائے۔ مندرجات بہت واضح ہیں کسی تشریح کی ضرورت نہیں ہے۔ اس وقت قوم کے قائدین نے قوم کے مفادات میں اسی راہ کو سب سے زیادہ مناسب سمجھا تھا۔ اور تاریخ گواہ ہے کہ یہ قائدِ اعظم جیسے دور اندیش سیاستدانوں کی ذہانت تھی کہ انہوں نے مسلمانوں کو ایک پر امن بالغ نظر اور حقیقت پسندانہ روش پر چلایا اور کسی قسم کے فتنہ فساد میں ڈال کر ان کو ابتلاؤں میں مبتلا نہیں کیا۔

یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ بعد میں جب پہلی جنگِ عظیم کے دوران مہتمم دارالعلوم دیوبند محمد احمد صاحب کو یہ خبر ملی کہ مکہ میں ترکی کے حامیوں نے میٹنگ کی ہے اور انکی ملاقات انور پاشا سے ہوئی ہے اور انہوں نے یہ منصوبہ بنایا ہے کہ ہندوستان میں بغاوت کو اُبھارا جائے اور اس میٹنگ میں ان کے مدرسہ کے ایک استاد محمود حسن بھی موجود تھے تو مہتمم دارالعلوم دیوبندنے مخبری کرتے ہوئے یہ تفصیلات انگریز حکومت کو بھجوا دیں۔

(The Indian Muslims, A documentary Record 1900-1947 Vol 5, Compiled by Shan Muhammad, published by Menakshi Prakashan New Dehli p53)

بعد میں جب محمود حسن واپس ہندوستان آ رہے تھے تو اس مخبری کی بنا پر شریف حسین والیِ مکہ نے انگریزوں کے ایماء پر انہیں گرفتار کر لیا اور انہیں انگریزوں کے حوالے کر دیا اور انگریزوں نے انہیں مالٹا بھجوا

دیا۔ دوسری طرف مسلم لیگ کے اکابرین کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ محمود حسن صاحب کو کیوں گرفتار کیا گیا ہے۔ وہ اس مخبری سے لا علم تھے چنانچہ انہوں نے جنوری 1918ء کے اجلاس میں اس بات کا اظہار کیا کہ یہ شخص اس قسم کا آدمی نہیں ہے کہ حکومت کے خلاف کسی سرگرمی میں حصہ لے۔

(The Indian Muslims, A documentary Record 1900-1947 Vol 5, Compiled by Shan Muhammad, published by Menakshi Prakashan New Dehli p113)

اور اس جنگ میں لاکھوں ہندوستانی مسلمان سپاہی انگریزوں کی فوج میں بھرتی ہو کر ان کی طرف سے لڑ رہے تھے۔ اب کیا اس صورت میں ہندوستان کے مسلمان اس فوج کی شکست یا اپنے بھائیوں کے گرفتار ہونے یا ہلاک ہونے کے خواہشمند رہتے۔ لیکن اس ضمن میں دو باتیں قابلِ توجہ ہیں۔ ایک تو یہ کہ اس جنگ میں ہندوستان کے غیر از جماعت مسلمانوں کی ہمدردیاں کس کے ساتھ تھیں اور دوسرے یہ کہ انگریزوں نے بغداد اور دوسرے عرب علاقوں پر قبضہ کن کے تعاون سے کیا تھا۔ جہاں تک پہلے سوال کا تعلق ہے تو تاریخ کے سرسری مطالعہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے اس جنگ میں ہندوستان کے مسلمان پوری طرح سے برطانیہ کا ساتھ دے رہے تھے۔ اور ان میں سے لاکھوں نے تو فوج میں بھرتی ہو کر برطانیہ کی طرف سے جنگ میں حصہ بھی لیا تھا۔ اگر ہم صرف پنجاب کا ہی جائزہ لیں تو اس صوبہ کے مسلمانوں نے لاہور سمیت صوبہ کے کئی شہروں میں بڑے بڑے جلسے منعقد کیے تھے جن میں انگریز حکومت سے وفاداری کا اعادہ کیا تھا اوران کی کامیابی کے لیے دعائیں مانگی تھیں۔ مثلاًایک بڑا جلسہ 12 / اگست 1914ء کو لاہور میں منعقد ہوا تھا اور اس کی رپورٹ کے مطابق اس میں مسلمانانِ پنجاب کی طرف سے اظہارِ وفاداری اور عقیدت کیا گیا اور سرکارِ انگلشیہ کی فتح اور نصرت کے لیے دعائیں مانگی گئیں اور یہ ریزولیشن منظور کیا گیاجس میں حکومت کو پنجاب کے مسلمانوں کی طرف سے ”غیر متزلزل وفاداری اور عقیدت شعاری“کا یقین دلایا گیا اور ”سلطنت کی حفاظت کے لیے اپنے تمام ذرائع

اور خدمات کو پیش کیا گیا۔"اس ریزولیشن کی بھرپور تائید میں تقریر کرنے والوں میں ایک نمایاں نام علامہ اقبال کا بھی تھااور تو اور مولوی حضرات مساجد میں جلسے کر رہے تھے اور یہ اظہار کر رہے تھے کہ ہم پر اپنے بادشاہ اور گورنمنٹِ انگلشیہ کی وفاداری لازمی ہے بلکہ بعض علماء نے تو یہ بھی اعلان کیا کہ اگر حکومت منظور کرے تو وہ سب سے پہلے بطور رضاکار میدانِ جنگ میں جانے کو تیار ہیں۔ اس وقت جبکہ ابھی ترکی جنگ میں شامل نہیں ہوا تھا مسلمانوں کی تنظیمیں یہ قراراداديں منظور کر رہی تھیں کہ ترکی غیر جانبدار رہے لیکن جب ترکی نے جرمنی کے ساتھ مل کر جنگ میں شمولیت کا اعلان کر دیا تو مسلمانوں نے جلسے کر کے اس بات کا واضح اعلان کر دیا کہ اس سے ہندوستان کے مسلمانوں کی وفاداری پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔ علاوہ ازیں مسلم لیگ کی طرف سے بھی وائسرائے کو وفاداری کا ریزولیشن بھجوایا گیا اور اس کے جواب میں وائسرائے نے تار دیا کہ ہمیں ہمیشہ یہ خیال رہا ہے کہ ہم تمام حالات میں ہندوستان کے مسلمانوں کی وفاداری پر بھروسہ کر سکتے ہیں (99)۔ یہ سب حقائق حکومتِ پاکستان کے ماتحت اداروں کی شائع کردہ کتب میں بھی موجود ہیں۔ اس پس منظر کی موجودگی میں یہ اعتراض کہ قادیان میں چراغاں ہوا تھا کہ نہیں ایک مضحکہ خیز اعتراض ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس وقت ہندوستان کے مسلمانوں کی اکثریت کی ہمدردیاں انگریز حکومت کے ساتھ تھیں اور اس جنگ میں مسلم لیگ بھی انگریز حکومت کی حمایت کر رہی تھی اور مسلمانوں کو حکومت کا وفادار رہنے کی تلقین کر رہی تھی۔ دیوبند کے مہتمم انگریزوں کو مخبری بھی کر رہے تھے۔ مسلمان بڑی تعداد میں فوج میں شامل ہو کر ترکی کی فوج کے خلاف لڑ رہے تھے اور ان پر گولیاں چلا رہے تھے۔ اور ہندوستان کے بہت سے مسلمان اس جنگ میں سلطنتِ برطانیہ کی طرف سے لڑتے ہوئے مارے بھی گئے۔ اگر قادیان میں چراغاں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ احمدی اپنے آپ کو امتِ مسلمہ سے علیحدہ رکھنا چاہتے تھے تو پھر ان ناقابلِ تردید شواہد

سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ ہندوستان کے تمام مسلمان، ہندوستان کے علماء اور مسلم لیگ ، یہ سب اپنے آپ کو امتِ مسلمہ سے علیحدہ رکھنا چاہتے تھے۔

ایک مرحلہ پر جب کہ اٹارنی جنرل صاحب نے یہ کہا کہ جو Annexures دیئے جا رہے ہیں وہ بھی پرنٹ ہو کر ممبران کو دیئے جا رہے ہیں۔ اس پر حضور نے ارشاد فرمایا:۔

”صرف ہمیں اندھیرے میں رکھ رہے ہیں۔ ہمیں بھی تو ایک کاپی ملنی چاہئیے۔“

اس پر یحیٰ بختیار صاحب نے کہا:۔

”نہیں آپ تو یہاں بیٹھے ہیں آپ کے سامنے سب کچھ ہوا۔“

اس پر حضور نے ممبرانِ اسمبلی کے بارے میں فرمایا:۔

”یہ نہیں بیٹھے یہاں؟“

اس پر اٹارنی جنرل صاحب نے یہ عذر پیش کیا:۔

”نہیں وہ کمیٹی کا آرڈر ہے۔ میں تو ... یہ سیکریٹ ہے وہ نہیں چاہتے وہ پبلک ... “

حضور نے فرمایا کہ ہماری طرف سے کمیٹی کو یہ درخواست ہے۔ اس پر انہوں نے فرمایا کہ کمیٹی اس پر غور کرے گی۔ حقیقت یہ ہے کہ گواہ کا بیان خواہ وہ عدالت میں ہو یا پارلیمنٹ میں، طریقہ یہ ہے کہ وہ اس کو پڑھ کر تسلیم کر کے دستخط کرتا ہے لیکن اس وقت اس طریقہ کو نظر انداز کر کے جماعت کے وفد کو اس کے بیان کا تحریری ریکارڈ دکھایا بھی نہیں جا رہا تھا۔

جب وقفہ کے بعد کارروائی دوبارہ شروع ہوئی اور ابھی حضور ہال میں تشریف نہیں لائے تھے کہ رکن اسمبلی احمد رضا خان قصوری صاحب نے سپیکر کو مخاطب کر کے کہا کہ آج جب وہ وقفہ کے دوران اپنے گھر جا رہے تھے تو ایک جیپ سے ان پر فائرنگ کی گئی ہے۔ گو وہ یہ بتانے کی پوزیشن میں نہیں تھے کہ ان پر یہ قاتلانہ حملہ کرنے والا کون تھا؟ اور انہوں نے یہ بھی کہا کہ انہوں نے اس کی ایف آئی آر تھانے میں درج کرادی ہے لیکن ان دنوں کے اخبارات میں اس کا ذکر کوئی نہیں ہے۔ یہ بات قابل غور ہے کہ اس کے بعد ان پر ایک اور قاتلانہ حملہ بھی ہوا تھا اور اس قاتلانہ حملہ میں ان کے والد نواب محمد احمد خان صاحب گولیاں لگنے سے جان بحق ہوگئے تھے۔ اور اس کا الزام اس وقت کے وزیرِ اعظم ذوالفقار علی بھٹو صاحب پر لگایا گیا تھا اور جب ان کا تختہ الٹنے کے بعد ان پر اس کا مقدمہ چلایا گیا تو انہیں پھانسی کی سزا سنائی گئی۔ اور اس کے بعد انہیں پھانسی دے دی گئی۔ اس بات کا ذکر پہلے بھی آ چکا ہے کہ جب پہلے دن اسمبلی میں جماعتِ احمدیہ کے خلاف ہونے والے فسادات پر بحث ہوئی تو وزیرِ اعظم کے منہ سے ایسا جملہ نکلا تھا جو ان کے خلاف اس مقدمہ قتل کے دوران بار بار پیش کیا گیا اور جب جماعتِ احمدیہ کا وفد آخری روز سوالات کا جواب دے رہا تھا تو ایک ایسے شخص نے یہ دعویٰ کیا کہ مجھ پر قاتلانہ حملہ کیا گیا ہے، جس کو قتل کروانے کی کوشش کے الزام میں ذوالفقار علی بھٹو صاحب کو سزائے موت دی گئی۔

جب کارروائی شروع ہوئی تو اٹارنی جنرل صاحب کی بجائے مولوی ظفر احمد انصاری صاحب نے سوالات کرنے شروع کئے۔ کچھ پرانے حوالوں پر بات کرنے کے بعد مولوی ظفر احمد انصاری صاحب نے اس الزام کے متعلق سوالات شروع کیے کہ نعوذُباللہ احمدیوں نے قرآنِ کریم میں تحریف کی ہے۔ اس کے ساتھ یہ بات بھی سامنے آئی کہ چیئرمین کمیٹی اور اٹارنی جنرل اس بات پر کچھ زیادہ آمادہ نہیں دکھائی دیتے تھے کہ جماعت احمدیہ کی طرف سے حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ کے علاوہ اور کوئی ممبر وفد کسی سوال کا جواب دے۔ حضرت خلیفۃ المسیح

الثالثؒ نے دوران کارروائی فرمایا تھا کہ بعض سوالات کا جواب مولانا ابوالعطاء صاحب دیں گے۔ بیشتر اس کے کہ تحریفِ قرآن مجید کے متعلق سوالات شروع ہوئے حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ نے کچھ اصولی باتیں بیان فرمائیں۔ حضور نے قرآنی تفسیر کے سات معیار بیان فرمائے۔

آپ نے پہلا معیار یہ بیان فرمایا کہ چونکہ قرآنِ کریم میں کوئی تضاد نہیں اس لیے قرآنِ کریم کی کسی آیت کی کوئی ایسی تفسیر نہیں کی جا سکتی جو کہ کسی اور آیت کے مخالف ہو۔ دوسرا معیار آنحضرت ﷺ کی وہ صحیح احادیث ہیں جن میں قرآنی آیات کی تفسیر بیان کی گئی ہے اور تیسرا معیار یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کے صحابہؓ نے جو تفسیر کی ہے اسے ترجیح اس لیے دینی پڑے گی کیونکہ صحابہؓ کو آنحضرت ﷺ کی صحبت سے ایک لمبا عرصہ فیض اٹھانے کا موقع ملا تھا۔ اسی طرح چوتھا معیار یہ ہے کہ سلفِ صالحین نے جو تفسیر بیان کی ہے اسے بھی ہم قدر کی نگاہ سے دیکھیں گے۔ پانچواں معیار عربی لغت ہے۔ اور یہ مدِ نظر رہے کہ بعض دفعہ ایک لفظ کے کئی معنی ہوتے ہیں۔ چھٹا معیار یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کے قول و فعل میں کوئی تضاد ممکن نہیں ہے۔ اگر کوئی تفسیر ایسی کی جا رہی ہے جو کہ خدا تعالیٰ کے اس فعل کے مخالف ہے جو سائنس کے ذریعہ ہمیں معلوم ہوا ہے تو یہ تفسیر رد کرنے کے قابل ہے اور ایک اصول حضور نے یہ بیان فرمایا کہ ہر نئے زمانے میں نئے مسائل پیدا ہوتے رہیں گے اور قرآنِ کریم ان نئے مسائل کے حل کے لیے بھی راہنمائی کرتا ہے۔ اس لیے ہم یہ کبھی نہیں کہہ سکتے کہ قرآن کریم کے جتنے مطالب تھے سب سامنے آ گئے ہیں اور اب کوئی اور نئے مطالب سامنے نہیں آئیں گے۔ حضور کے اس لطیف بیان کے بعد مولوی ظفر احمد صاحب انصاری نے تحریف پر سوالات شروع کیے۔ اور پہلا سوال یہ کیا کہ:

حضرت مسیح موعود علیہ االسلام کی کتاب ازالہ اوہام میں سورۃ حج کی آیت 53 وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَلَا نَبِیٍّ ... الخ اور کہا کہ جو کتاب جماعت احمدیہ نے شائع کی ہے اس میں قَبْلِكَ کا لفظ نہیں ہے۔ اب یہ نا

معقول اعتراض ہے اسے سہوِ کتابت تو کہا جا سکتا ہے لیکن کسی طرح تحریف نہیں کہا جاسکتا۔ جماعتِ احمدیہ کی طرف سے سو سے زائد مرتبہ قرآنِ کریم شائع کیا گیا ہے اور ان میں سے کسی میں بھی یہ آیت بغیر قَبْلِكَ کے لفظ کے موجود نہیں اور ازالہ اوہام جب روحانی خزائن کے نام سے شائع کی گئی تو اس میں بھی یہ آیت درست موجود ہے، حضور نے ان امور کی نشاندہی فرمائی۔ اس گفتگو کے دوران حضور نے فرمایا کہ جماعتِ احمدیہ کی طرف سے لاکھوں کی تعداد میں قرآنِ کریم شائع کیا گیا ہے اور ان سب میں یہ آیت صحیح درج ہے۔ اگر ایک کتاب میں ایک دو الفاظ شائع ہونے سے سہواً رہ گئے ہیں تو یہ سہو کتابت ہی ہو سکتی ہے، تحریف ہر گز نہیں ہو سکتی۔ مولوی ظفر انصاری صاحب نے اس بارے میں جو موقف بیان فرمایا اس کے ایک ہی جملے سے ان کی ذہنی کیفیت کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔ انہوں نے کہا:۔

"... آپ کے ہاں سے جو قرآنِ کریم چھپا ہوا چل رہا ہے اس میں کیا ہے۔ وہ میں نے نہیں دیکھا۔ ہے یا نہیں میں نہیں کہہ سکتا..."

گویا مولوی صاحب اسمبلی میں یہ الزام لگا رہے ہیں کہ احمدیوں نے نعوذُباللہ قرآنِ کریم میں تحریف کر دی ہے اور خود تسلیم کر رہے ہیں کہ انہوں نے جماعت کے شائع کردہ قرآنِ کریم دیکھے ہی نہیں۔ اس کے باوجود موصوف کا خیال تھا کہ انہیں یہ حق حاصل ہے کہ وہ جماعتِ احمدیہ پر قرآنِ کریم میں تحریف کرنے کا الزام لگائیں۔

اور خود غیر احمدیوں کے شائع کردہ قرآنِ کریم کے کئی نسخوں میں سہوِ کتابت کئی جگہ پر پائی جاتی ہے اور تو اور اب جو اس سپیشل کمیٹی کی کارروائی شائع کی گئی ہے، اس میں 7/ اگست کی کارروائی کے صفحہ 402 پر سورۃ بقرہ کی آیت 112 کا پہلا لفظ ہی غلط لکھا ہوا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ سہوِ کتابت ہے اس طرح کارروائی شائع کرنے

والے پر تحریفِ قرآن کا الزام تو نہیں آتا۔ اسی طرح احمد رضا خان بریلوی صاحب کے ”الملفوظ“ حصہ اول ص88 پر سورۃ الجن آیت 67و68 غلط درج ہے۔ فتاویٰ دارالعلوم دیوبند جلد پنجم ص130 پر آلِ عمران کی آیت49 غلط درج ہے اور مولوی اشرف علی تھانوی صاحب کی کتاب ”بہشتی زیور“ میں سورۃ کہف کی آیت 31 غلط درج ہے۔ (ملاحظہ کیجئے ایڈیشن ناشر شیخ غلام علی اینڈ سنز، نومبر 1953ص5)۔ ان کے علاوہ اس کی بیسیوں مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔

پھر دوبارہ اس موضوع پر سوالات شروع ہوئے تو ظفرا حمد انصاری صاحب نے یہ بیان کرنا شروع کیا کہ مرزا بشیر الدین محمود صاحب کا جو انگریزی ترجمہ قرآن ہے۔ Commentary کے ساتھ۔ ابھی وہ بات مکمل نہیں کر پائے تھے کہ حضور نے فرمایا کہ حضرت خلیفۃالمسیح الثانی کا کوئی انگریزی ترجمہ قرآن موجود نہیں ہے لیکن مولوی صاحب یہ بات دہرانے کے باوجود بات سمجھ نہیں پائے اور کہنے لگے کہ انہوں نے ترجمہ کیا ہے:۔

And they have firm faith in what is yet to come

ان کی مراد یہ تھی کہ سورۃ بقرۃ کی پانچویں آیت کے آخری حصہ کا یہ ترجمہ کیا گیا ہے جو کہ غلط ہے۔ گویا ان کے نزدیک آخرۃ کے لفظ کا ترجمہ صرف روز قیامت کے بعد کا وقت ہی ہو سکتا ہے۔ عربی لغت کے اعتبار سے یہ اعتراض بے بنیاد ہے کیونکہ اُخر کا لفظ اوّل کے مقابل پر استعمال ہوتا ہے اور آخرت کے علاوہ اس آیت میں سیاق و سباق کے لحاظ سے اس کا مطلب بعدمیں ظاہر ہونے والے واقعات بھی ہو سکتے ہیں۔ مولوی ظفر انصاری صاحب کو اس موضوع پر گرفت نہیں تھی لیکن وہ اپنی طرف سے دلیل کے طور پریہ حوالے پیش کر رہے تھے کہ بہت مسلمان اور عیسائی مترجمین نے جب اس آیتِ کریمہ کا انگریزی میں ترجمہ کیا تو اس میں

لفظ ” آخرۃ “ کا ترجمہ hereafter کیا ہے۔ یہاں وہ اپنی بات کی نفی خود ہی کر گئے۔ hereafter کا مطلب اگلا جہاں نہیں بلکہ اس کا مطلب ہے from now on یا after now

(دیکھئے International Readers Dictionary)

حضور نے اس کے جواب میں قرآنِ کریم، لغت عربی اور تفاسیر سے اس لفظ کے مطالب پر روشنی ڈالی۔ اس مرحلہ پر لاچار ہو کر مولوی ظفر انصاری صاحب یہ بحث اُٹھانے کی کوشش کر رہے تھے کہ پرانے مفسرین نے اس آیت کا یہ مطلب نہیں لیا۔ اس پر حضور نے فرمایا:۔

” اگر آپ کے اس بیان کا یہ مفہوم ہے کہ مفسرین جو پہلے گزر چکے ان کے علاوہ قرآن کریم کی کوئی تفسیر نہیں ہو سکتی تو ہم یہ عقیدہ نہیں رکھتے ... “حضور نے واضح فرمایا کہ نہ صرف قرآنِ کریم کی آیات کے نئے مطالب بیان کئے جا سکتے ہیں بلکہ امتِ مسلمہ کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں الہام اور اللہ تعالیٰ سے مکالمہ مخاطبہ کا دروازہ کبھی بند نہیں ہوتا اور امتِ مسلمہ کے تمام صلحاء اور اولیاء کا یہی عقیدہ رہا تھا۔ اس پر مولوی ظفر انصاری صاحب یہ عجیب نظریہ پیش کر رہے تھے کہ صوفیاء سے مکالمہ مخاطبہ تو اور بات ہے لیکن اب شریعت اسلامی میں ”وحی“ کی ایک اصطلاح بن گئی ہے۔ اب اس کے معنی متعین ہو گئے ہیں اور انگریزی کی ڈکشنری میں بھی یہی لکھا ہے۔ ذرا ملاحظہ کیجئے کہ قرآنِ کریم میں تو یہ لکھا ہے کہ وحی تو شہد کی مکھی کو بھی ہوتی ہے اور نیک عورتوں کو بھی ہو سکتی ہے، لیکن مولوی صاحب مصر ہیں کہ اب یہ ایک اور قسم کی اصطلاح بن گئی ہے اور دلیل کیا لائے کہ انگریزی کی ڈکشنری میں بھی یہی لکھا ہے۔

اس کے بعد مولوی ظفر انصاری صاحب نے کچھ مثالیں دے کر یہ اعتراض اُٹھایا کہ مرزا صاحب نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ انہیں قرآنی آیات الہام ہوئی ہیں۔ اس سے وہ دو نتائج نکال رہے تھے۔ ایک تو یہ کہ یہ ٹھیک

نہیں کہ قرآنی آیات امت میں کسی کو الہام ہوں اور دوسرے اس سے یہ مطلب نکلتا ہے کہ جو آیات آنحضرت ﷺ کی شان میں تھیں بانی سلسلہ عالیہ احمدیہ نے انہیں اپنے اوپر چسپاں کیا ہے۔ اس اعتراض سے یہی تاثر ملتا ہے کہ معترض کو اسلامی لٹریچر پر کچھ زیادہ دسترس نہیں ہے کیونکہ تاریخِ اسلام ان مثالوں سے بھری پڑی ہے کہ امت کے مختلف اولیاء کو قرآنی آیات الہام ہوئیں۔ تو اس طرح یہ اعتراض ان سب عظیم اولیاء پر بھی اُٹھتا ہے۔

اگر وہاں پر موجود مخالفین کے ذہن میں یہ خیال تھا کہ یہ اعتراض اُٹھا کر انہوں نے کوئی بڑا تیر مارا ہے تو یہ خوش فہمی جلد دور ہو گئی۔ حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ نے فرمایا کہ ”جہاں تک آیات قرآنی بطور وحی کے امت پر نازل ہونے کا تعلق ہے، ہمارا امتِ مسلمہ کا لٹریچر اس سے بھرا پڑا ہے۔“ اس کے بعد حضور نے اس کی مثالیں دینے کا سلسلہ شروع کیا۔ حضور نے پہلی مثال حضرت سید عبدالقادر جیلانیؒ کی دی۔

اس کے بعد حضور نے عبداللہ غزنوی صاحب کی مثالیں دینی شروع کیں کہ انہیں بھی بہت سی قرآنی آیات الہام ہوئی تھیں۔ چونکہ ابتداء ہی سے یہ واضح ہوتا جا رہا تھا کہ یہ ایک بے وزن اعتراض کیا گیا ہے، اس لیے سپیکر صاحب نے یہی مناسب سمجھا کہ اس جواب کو کسی طرح مختصر کیا جائے۔ انہوں نے دریافت کیا کہ

So the answer is

اس پر حضور نے یہ اصولی موقف بیان فرمایا:۔

”میں Accept کرتا ہوں۔ امتِ مسلمہ کے عام اصول کے مطابق Accepted قرآنِ کریم کی آیات امت کے اولیاء پر نازل ہو سکتی ہیں۔“

اس پر سپیکر صاحب نے کہا کہ سوال کا جواب دے دیا گیا ہے اگلا سوال کریں۔ لیکن حضور نے فرمایا کہ وہ کچھ مثالیں اور پڑھناچاہتے ہیں۔ سپیکر صاحب نے اتفاق کیا اور اس پر حضور نے عبد اللہ غزنوی صاحب کو ہونے والے مزید الہامات پڑھے جو قرآنی آیات پر مشتمل تھے۔ حضرت شیخ عبد القادر جیلانیؒ قرآنِ کریم ایک آیت جو حضرت یوسف کے بارے میں تھی یعنی إِنَّكَ الْيَوْمَ لَدَيْنَا مِكِيْنٌ أَمِيْن (یوسف : 55) الہام ہوئی۔ (فتوح الغیب ،ناشر محمد تقی محمد زکی، مقالہ 28 ص 57)۔ اسی طرح کتاب ” سوانح عمری مولوی عبداللہ غزنوی المرحوم و مکتوبات“ جو ان کے بیٹوں نے شائع کرائی تھی ،اس کے صفحہ 35و36 پر مولوی صاحب کے کئی الہامات درج ہیں اور ان میں سے وہ آیات بھی ہیں جو رسول اللہ ﷺ کو مخاطب کر کے نازل ہوئی تھیں۔ ان میں سورۃ کہف آیت 29 اور سورۃ القیامۃ کی آیت 19 اور سورۃ نازعات آیت نمبر 41 شامل ہیں۔

اور یہ بات صرف حضرت سید عبد القادر جیلانی یا عبد اللہ غزنوی صاحب تک محدود نہیں تھی بلکہ اسلامی تاریخ میں ایسے بہت سے اولیاء گزرے ہیں جنہوں نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ ان پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی نازل ہوئی ہے۔ مثلاً علمِ حدیث کے مشہور امام حضرت احمد بن حنبلؒ نے فرمایا ہے کہ انہیں نہ صرف وحی ہوئی بلکہ وحی لانے والا جبرئیل تھا۔

(الشفاء۔ بتعریف حقوق المصطفیٰ تالیف عیاض بن موسیٰ ناشر عبد التواب ص13)

اب مولوی ظفرا نصاری صاحب کی گلو خلاصی کے لیے اٹارنی جنرل صاحب سامنے آئے اور یہ غیر متعلقہ سوال کر کے موضوع بدلنے کی کوشش کی کہ الہام اور وحی میں کیا فرق ہے۔ اس سوال کی بنیاد یہ ہے کہ بہت سے علماء نے یہ غلط فہمی پھیلائی ہے کہ وحی تو صرف نبی کو ہو سکتی ہے اور رسولِ کریم ﷺ کے بعد کسی کو وحی نہیں ہو سکتی۔ حالانکہ قرآنِ کریم کے مطابق تو شہد کی مکھی کو بھی اللہ تعالیٰ وحی کرتا ہے اور حضرت

موسیٰؑ کی والدہ کو بھی وحی ہوئی تھی۔ اس پر حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ نے تفصیل سے یہ مضمون سمجھانا شروع کیا اور فرمایا کہ ہم نے وسیع مواد جمع کیا ہے جس کے مطابق امت کے بہت سے سلف صالحین نے یہ دعویٰ کیا یہ کہ انہیں وحی کے اعزاز سے نوازا گیا ہے اور پھر حضور نے فرمایا کہ اب تو ایک اخبار میں یہ فتویٰ بھی چھپ گیا ہے کہ کسی مسلمان کو سچی خواب بھی نہیں آ سکتی۔ اس قسم کی باتوں سے اسلام کو نقصان پہنچتا ہے۔ لیکن اٹارنی جنرل صاحب نے یہ سوال دہرایا کہ مرزا صاحب کو الہام ہوتا تھا یا وحی ہوتی تھی۔ حضور نے اس کا جواب ایک خاص انداز سے دیا آپ نے فرمایا کہ اس کا جواب میں دوں یا صحیح مسلم میں درج آنحضرت ﷺ کی حدیث شریف دے اور پھر آپ نے حضرت نواس بن سمعانؓ کی بیان فرمودہ وہ حدیث بیان فرمائی جو کہ صحیح مسلم کتاب الفتن باب ذکر الدجال میں مذکور ہے۔ اس حدیث میں ہے کہ رسولِ کریم ﷺ نے فرمایاہے کہ اللہ تعالیٰ آخری زمانہ میں مبعوث ہونے والے حضرت عیسیٰؑ کووحی کرے گا کہ میں نے ایسے لوگ برپا کیے ہیں کہ کسی کو ان سے جنگ کی طاقت نہیں اس لیے تم میرے بندوں کو پہاڑ کی طرف لے جاؤ۔

اب اس سے یہ واضح ہو گیا کہ خود آنحضرت ﷺ نے یہ فرمایا تھا کہ آپ کے بعد مسیح موعودؑ کو وحی ہو گی اور قرآنِ کریم تو یہ کہہ رہا ہے کہ شہد کی مکھی کو بھی وحی ہوتی ہے اور صرف حضرت سید عبدالقادر جیلانی اور عبد اللہ غزنوی صاحب ہی نہیں امتِ مسلمہ کے اولیاء نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ انہیں قرآنی آیات وحی ہوئیں ہیں۔ مثلاً حضرت محی الدین ابن عربی نے اپنی کتاب فتوحاتِ مکیہ میں تحریر کیا ہے کہ ان پر آیت قُلْ اٰمَنَّا بِاللّٰہِ وَ مَا اُنْزِلَ عَلَیْنَا وَمَا اُنْزِلَ عَلٰی اِبْرَاھِیْمَ وَ اِسْمٰعِیْلَ وَ اِسْحٰقَ وَ یَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَا اُوْتِیَ مُوْسٰی وَ عِیْسٰی۔۔۔ نازل ہوئی اور پھر لکھتے ہیں کہ اس آیت کو میرے لیے ہر علم کی کنجی بنایا گیا اور میں نے جان لیا کہ میں ان تمام انبیاء کا مجموعہ ہوں جن کا اس آیت میں ذکر کیا گیا ہے (100)۔ تذکرۃ الاولیاء میں درج ہے کہ حضرت عبد اللہ بن مبارکؒ کو آیت اَوْفُوْا بِالْعَهْدِ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلًا الہام ہوئی۔ تو اب یہ حق کس کو حاصل

ہے کہ یہ کہے کہ اب کسی کو وحی نہیں ہو سکتی۔ لیکن مولوی ظفر انصاری صاحب کا خیال تھا کہ انہیں یہ حق حاصل ہے۔ انہوں نے کہا کہ یہ ٹھیک ہے کہ شہد کی مکھی کو بھی وحی ہو تی ہے لیکن اب اصطلاحِ شریعت میں اس کے خاص معنی متعین ہو گئے ہیں۔ یہ بھی ایک خوب نکتہ تھا یعنی قرآنِ کریم ایک لفظ کے واضح طور پر کئی مطالب بیان کر رہا ہے اور مولوی حضرات مصر ہیں کہ نہیں اب ہماری شریعت میں اس کے ایک خاص معنی متعین ہو گئے ہیں۔ اور اب یہی چلیں گے۔ اس کے بعد انہوں نے لغت کا سہارا لے کر اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اور یہ کوشش خود اتنی بے وزن تھی کہ انہوں نے عربی میں قرآنی اصطلاح کا مطلب بیان کرنے کے لیے اردو کی لغت فرہنگِ آصفیہ کا حوالہ پیش کر دیا۔ اس پر حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ نے ارشاد فرمایا کہ اردو کی ضرورت نہیں بہت سے الفاظ عربی میں ایک معنی میں استعمال ہوتے ہیں اور اردو میں دوسرے معنی میں استعمال ہوتے ہیں۔

قرآنی الفاظ کی سب سے معتبر لغت مفرداتِ امام راغب میں وحی کا مطلب ان الفاظ سے بیان ہونا شروع ہوتا ہے۔ اَلْوَحْیُ کے اصل معنی اشارہ سریعہ کے ہیں اور اس کے معنی سرعت کو متضمن ہونے کی وجہ سے ہر تیز رفتار معاملہ کو "امر وحی" کہا جاتا ہے اور المنجد میں وحی کا مطلب یہ لکھا ہے "لکھا ہوا، پیغام، الہام، الہام کردہ چیز، انبیاء کی وحی، رمز، اشارہ"۔ لفظ وحی ان سب پر اطلاق پاتا ہے اور خود قرآنِ کریم میں وحی کا لفظ اشارہ کے معنوں میں بھی استعمال ہوا ہے۔

اب سپیکر صاحب نے مولوی صاحب کے سوالات کی ڈولتی ہوئی ناؤ کو کوئی سمت دینے کے لئے کہا کہ پہلے وہ تحریف قرآن پر سوالات مکمل کر لیں لیکن اب مولوی صاحب اِدھر کا رخ نہیں کر رہے تھے۔ مولوی صاحب نے پھر لمبی چوڑی بے جوڑ بحث شروع کر دی۔ کبھی وہ وحی اور الہام کی بحث میں پڑتے اور کبھی یہ کہتے کہ ہم صرف قرآنِ کریم کو مانتے ہیں اور قادیانی اس کے علاوہ مرزا صاحب کے الہامات کو بھی مانتے ہیں۔ سپیکر

صاحب نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی وہ ایسے سوال کو دہرا رہے ہیں جو پہلے ہی ہو چکا ہے لیکن وہ مصر تھے کہ میں Duplicate سوال کروں گا۔ آخر انہوں نے پھر ایک سوال شروع کیا اور اپنی طرف سے حوالہ پڑھنا شروع کیا۔ حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ نے دریافت فرمایا کہ یہ حوالہ کہاں کا ہے۔ اس پر انہوں نے الفضل کا حوالہ دیا۔ اس پر حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ نے فرمایا کہ آپ کے ہاتھ میں تو الفضل کا کوئی شمارہ ہے ہی نہیں۔ آپ ایک کتاب سے یہ حوالہ پڑھ رہے ہیں اور یہاں پر یہ تجربہ پہلے بھی ہو چکا ہے کہ حوالہ در حوالہ پڑھا جاتا ہے اور وہ غلط نکلتا ہے۔ اس پر مولوی صاحب نے اعتراف کیا کہ وہ سلسلہ کے مخالف الیاس برنی صاحب کی کتاب سے یہ حوالہ پڑھ کر سنا رہے ہیں۔ سپیکر صاحب نے کہا کہ آپ کا سوال کیا ہے۔ اس پر بڑی مشکل سے مولوی ظفر انصاری صاحب کے ذہن سے یہ سوال برآمد ہوا کہ جو کہ در حقیقت سوال تھا ہی نہیں اور وہ یہ تھا کہ قرآن جو ہمارے پاس ہے یہ مکمل ہے اور اس پر ایمان لانا اور اس کی اتباع کرنا کافی ہے۔ اس پر حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ نے قرآنِ کریم کو ہاتھ میں لے کر فرمایا ”یہ قرآنِ کریم جو میں نے ہاتھ میں پکڑا ہوا ہے، اس کو گواہ بنا کر میں اعلان کرتا ہوں۔ سوائے اس قرآن کے ہمارے لئے کوئی کتاب نہیں۔“

اس پر مولوی صاحب نے موضوع بدلا اور اس اعتراض پر آ گئے کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے صحابہ کے متعلق صحابہ کا لفظ کیوں استعمال کیا جاتا ہے؟ پھر انہوں نے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے اس مصرعہ پر اعتراض کیا ع یہی ہیں پنجتن جن پر بنا ہے۔

اس پر حضور نے فرمایا کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کو وحی کے ذریعہ بتا دیا گیا تھا کہ ان کے آباء کی نسل کاٹی جائے گی اور اب حضرت مسیح موعود علیہ السلام سے نسل چلے گی۔ اس سے زیادہ اس کا کوئی مطلب نہیں ہے۔

اس کے بعد ظفر انصاری صاحب کچھ اور ایسے اعتراضات پیش کرتے رہے جو کہ ایک عرصہ سے جماعتِ احمدیہ کے مخالفین کر رہے تھے۔ مثلاً یہ کہ کیا احمدی حج کا مقام اپنے جلسہ سالانہ کو دیتے ہیں، اس کے جواب میں حضور نے فرمایا کہ احمدیوں کے نزدیک حج ہر صاحبِ استطاعت پر فرض ہے۔ پھر یہ عجیب اعتراض کیا کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کو بیت الذکر اور بیت الفکر کے متعلق یہ الہام ہوا تھا کہ جو اس میں داخل ہو گا وہ امن میں آ جائے گا۔ جب کہ مسلمانوں کے نزدیک مکہ مکرمہ امن کا مقام ہے اور یہ مقام مکہ مکرمہ کو حاصل ہے۔ اس کے جواب میں حضورؒ نے فرمایا کہ آپ یہ کہتے ہیں کہ رسولِ کریم کی بعثت صرف اس لیے تھی کہ صرف ایک چھوٹی سی جگہ کو امن کا مقام بنا دیا جائے لیکن ہم یہ کہتے ہیں کہ مکہ تو صرف ایک Symbol ہے اور وہ ایک نمونہ ہے اور ہمیں حکم ہے کہ جگہ جگہ وہ مقامات بناؤ جہاں پر داخل ہونے والے امن میں آجائیں۔ لیکن اب یہ تھا کہ جب حضور اس کا جواب دے دیتے تو سپیکر صاحب فوراً اگلا سوال پوچھنے کا کہتے اور مجبوراً مولوی صاحب کو آگے چلنا پڑتا۔

جب اٹارنی جنرل صاحب کی جگہ مولوی صاحب کو سوالات کے لیے سامنے لایا گیا تو وجہ یہ بیان کی گئی تھی کہ اٹارنی جنرل صاحب چونکہ عربی صحیح نہیں بول سکتے اس لیے کچھ سوالات مولوی صاحب پیش کریں گے ۔ لیکن حقیقت یہ تھی کہ مولوی صاحب اکثر سوالات وہ کر رہے تھے جن میں عربی بولنے کی کوئی ضرورت ہی نہیں تھی۔ مشہور ہے کہ مخالفین کو یہ شک ہو گیا تھا کہ اٹارنی جنرل صاحب سوالات سے جماعت کو مطلع کر دیتے ہیں، اسی لئے حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ فوراً سوال کا جواب دے دیتے ہیں۔ اس لیے اپنی طرف سے مخالفین نے یہ چال چلی تھی کہ اب ان میں سے کوئی براہِ راست یہ سوالات کرے۔ لیکن خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ جو سوالات اب کیے جا رہے تھے ان میں سے اکثر کے متعلق لکھا ہوا مواد جماعت کے وفد کے پاس موجود تھا اس لیے مولوی صاحب کو پاؤں جمانے کا موقع بھی میسر نہیں آ رہا تھا۔

اس مرحلہ پر سپیکر صاحب نے جماعت کے وفد کو کہا کہ وہ کمیٹی روم میں دس منٹ انتظار کریں اور کارروائی لکھنے والوں کو بھی باہر جانے کا کہا۔ اس دوران کارروائی لکھی نہیں گئی۔ اس لیے خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ اس دوران کیا بات ہوئی۔ جب دس منٹ کے بعد کارروائی دوبارہ شروع ہوئی تو مولوی ظفر انصاری صاحب نے ایک مختصر سوال یہ کیا کہ دمشق اور قادیان میں کیا مماثلت ہے اور اس کے بعد اٹارنی جنرل صاحب نے اس کارروائی کا آخری سوال کیا۔ انہوں نے کہا کہ مرزاصاحب میں آپ کی توجہ محضر نامے کے صفحہ 189 کی طرف دلاتا ہوں۔ اور اٹارنی جنرل صاحب نے کہا کہ بعض ممبران محسوس کر رہے ہیں کہ اس کی Relevance کیا ہے۔ پھر انہوں نے محضر نامے کے آخر پر درج حضرت مسیح موعود کی پر شوکت تحریر کا شروع کا حصہ پڑھا جو یہ تھا:۔

”اے لوگو تم یقیناً سمجھ لو کہ میرے ساتھ وہ ہاتھ ہے جو اخیر تک مجھ سے وفا کرے گا۔ اگر تمہارے مرد اور تمہاری عورتیں اور تمہارے جوان اور تمہارے بوڑھے اور تمہارے چھوٹے اور تمہارے بڑے سب مل کر میرے ہلاک کرنے کے لیے دعائیں کریں یہاں تک کہ سجدے کرتے کرتے ناک گل جائیں اور ہاتھ شل ہو جائیں تب بھی خدا ہر گز تمہاری دعا نہیں سنے گا ... “

یہ حصہ پڑھ کر اٹارنی جنرل صاحب نے سوال کیا کہ یہ کوئی دھمکی ہے یا اپیل ہے۔ اس کی Relevance کیا ہے۔ اس پر حضور نے فرمایا کہ

یہ دھمکی نہیں یہ خواہش بھی نہیں۔ آپ سمجھ لیں خود کہ کیوں مَیں یہ لفظ استعمال کر رہا ہوں۔ یہ دھمکی بھی نہیں یہ خواہش بھی نہیں۔ یہ صرف ایک عاجزانہ التماس کی گئی ہے کہ تم اپنے اور میرے درمیان جو اختلاف ہے اسے خدا تعالیٰ پر چھوڑ دو۔ میرا یہ عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ پر جب تم چھوڑو گے تو میری دعائیں قبول ہوں

گی اور میں کامیاب ہوں گا اور تمہاری دعائیں قبول نہیں ہوں گی اور جس مقصد غلبہ اسلام کے لیے کھڑا کیا گیا ہے مجھے وہ پورا ہو گا اور اسلام ساری دنیا پر غالب آجائے گا۔

اس کے بعد اٹارنی جنرل صاحب نے یہ کہا کہ اب ان کے سوالات ختم ہو گئے ہیں اور حضور سے کہا کہ آپ کسی سوال کے متعلق کچھ اور کہنا چاہیں تو کہہ سکتے ہیں۔ اس پر حضور نے فرمایا کہ

"شکایت، کوئی شکوہ یا گلہ نہیں، میں ویسے حقیقت بیان کرنے لگا ہوں کہ گیارہ دن مجھ پر جرح ہوئی ہے۔ دو دن پہلے۔ گیارہ دن جرح کے ہیں اور جس کا مطلب یہ ہے کہ قریباً ساٹھ گھنٹے مجھ پر سوال پہلے بتا کر کے جرح کی گئی ہے اور میرے دماغ کی کیفیت یہ ہے، نہ دن کا مجھے پتہ نہ رات کا مجھے پتہ ہے۔ میں نے اور بھی کام کرنے ہوتے ہیں۔ عبادت کرنی ہے دعائیں کرنی ہیں۔ سارے کام لگے ہوئے ہیں ساتھ ...

میں صرف ایک بات آپ کی اجازت سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے یہ کرنا چاہتا ہوں کہ اگر دل کی گہرایاں چیر کر میں آپ کو دکھا سکوں تو وہاں میرے اور میری جماعت کے دل میں اللہ تعالیٰ جب کہ اسلام نے اسے پیش کیا ہے دنیا کے سامنے اور حضرت خاتم الانبیاء محمد ﷺ کی محبت اور عشق کے سوا کچھ نہیں پائیں گے۔ شکریہ"

اس کے بعد ایک بار پھر اٹارنی جنرل صاحب نے کہا کہ اب ان کے پاس اور کوئی سوال نہیں ہے۔ اور سپیکر صاحب نے تمام لوگوں کا شکریہ ادا کیا کہ انہوں نے صبر و تحمل سے کارروائی میں حصہ لیا اور کہا کہ وہ تمام حوالے جو دیئے گئے ہیں یا quote کئے گئے ہیں اور اب تک پیش نہیں کئے گئے وہ دو تین دن میں پہنچا دیئے جائیں اور کہا کہ وفد کو وضاحت کے لئے دوبارہ طلب کیا جا سکتا ہے یا تحریری طور پر کچھ وضاحتیں مانگی جا سکتی ہیں۔ اٹارنی جنرل صاحب کا خیال تھا کہ دوبارہ طلب کرنے کی نوبت نہیں آئے گی۔

اور ایک بار پھر بڑے اصرار سے کہا کہ اس کارروائی کو خفیہ رکھنا چاہئے اور اس طرح یہ تاریخی کارروائی ختم ہوئی۔ غیر مبائع احمدی احباب پر سوالات اس کے بعد 26/اگست سے شروع ہوئے۔

چند اہم نکات کا اعادہ

پڑھنے والے اس کارروائی کا خلاصہ پڑھ چکے ہیں۔ یہ کارروائی اپنی مثال آپ ہی ہے۔ آئندہ آنے والے وقت میں اس کے متعلق بہت کچھ لکھا اور کہا جائے گا۔ ہم ساتھ کے ساتھ اہم امور کے متعلق اپنا نقطہ نظر بھی بیان کرتے آئے ہیں لیکن مناسب ہو گا کہ کچھ اہم نکات کا خلاصہ ایک بار پھر پیش کر دیں۔

(ا) غلط حوالے

یہ بات بالکل سمجھ میں نہیں آتی کہ اس تواتر کے ساتھ یحیٰی بختیار صاحب نے یا یوں کہنا زیادہ مناسب ہو گا کہ انہیں سوالات مہیا کرنے والے ممبران اور علماء نے اتنے غلط حوالے کس طرح مہیا کئے۔ علماء اور وکلاء کی ایک لمبی چوڑی ٹیم دن رات کام کر رہی تھی۔ ان کو لائبریرین اور عملہ بھی مہیا تھا اور انہیں تیاری کے لئے کافی وقت بھی دیا گیا تھا۔ جماعتِ احمدیہ کے وفد کو معلوم ہی نہیں ہوتا تھا کہ کیا سوال کیا جائے گا جبکہ سوال کرنے والے اپنی مرضی سے سوالات کرتے تھے اور انہیں مرضی کے سوالات تیار کرنے کے لئے ایک لمبا عرصہ بھی ملا تھا۔ پھر بھی مسلسل ان کے پیش کردہ حوالے غلط نکلتے رہے اور یہ عمل اتنے دن بغیر کسی وقفہ کے جاری رہا۔ اگر سوالات میں پیش کئے گئے حوالے اس طرح غلط نکل رہے ہوں تو سوالات کی کوئی حیثیت ہی نہیں رہتی۔ نہ معلوم اللہ تعالیٰ کی طرف سے کیا تصرف تھا کہ آخر تک یہ لوگ اس بنیادی نقص کو دور ہی نہ کر سکے۔ جب ہم نے اس بارے میں ڈاکٹر مبشر حسن صاحب سے سوال کیا تو انہوں نے کمال قولِ سدید سے جواب دیا:۔

”یہ ہوا ہی کرتے ہیں دن رات ہوتا ہے۔ یحیٰ بختیار بیوقوف آدمی تھا۔ بالکل جاہل اور اس کو تو جو کسی نے لکھ کر دے دیا اس نے وہ کہہ دیا۔“

جب یہ سوال اس اضافہ کے ساتھ دہرایا گیا جب ان کو عملہ اور دیگر سہولیات بھی میسر تھیں تو پھر بار بار یہ غلطیاں کیوں ہوئیں تو اس پر جو سوال و جواب ہوئے وہ درج کئے جاتے ہیں۔

ڈاکٹر مبشر حسن صاحب :ارے بابا! وہ کارروائی ساری Fictitious(بناوٹی) تھی۔

سلطان : وہ اسمبلی کی کارروائی ساری Fictitious تھی؟

ڈاکٹر مبشر حسن صاحب:فیصلہ پہلے سے ہوا ہوا تھا کہ کیا کرنا ہے۔

سلطان:So there was no need to bother

ڈاکٹر مبشر حسن صاحب: No need to bother

ہم نے یہ سوال پروفیسر غفور صاحب کے سامنے بھی رکھا کہ اس کارروائی کے دوران جب سوالات پیش کئے جا رہے تھے تو ان میں پیش کردہ حوالے اس تواتر سے غلط کیوں ہو رہے تھے۔ تو انہوں نے جواب دیا کہ میرے خیال میں یہ سوالات قادیانیوں کی کتابوں پرBase کر کے کئے گئے تھے اور ان دونوں(یعنی دونوں وفود نے) میں سے کسی نے بھی اسے چیلنج نہیں کیا۔ اور پھر یہ ذکر شروع کر دیا کہ احمدیوں نے ہی روزِ اوّل سے اپنے آپ کو مسلمانوں سے علیحدہ رکھا ہے۔ جب یہ بات ختم ہوئی تو میں نے پھر یہ غلط حوالوں کے بارے میں عرض کی۔ اس پر انہوں نے کہا:۔

” میں نے بتایا آپ کو کہ ریفرنسز (References) کو کبھی چیلنج نہیں کیا کسی نے ... “

ہم نے حیران ہو کر پھر یہ سوال دہرایا کہ کیا سپیکر نے حوالہ جات کے بارے میں تنبیہ نہیں کی تھی۔ اس پر انہوں نے پھر کہا:۔

"بالکل نہیں۔ میں بتا رہا ہوں کہ Original کتابیں وہاں موجود تھیں ..."

پھر سہ بارہ سوال پر بھی انہوں نے انکار کیا کہ کوئی حوالہ غلط نہیں نکلا۔

ہم نے ساری کارروائی کا جائزہ لے لیا اور اس میں حوالوں کی جو حالت تھی اس کا بھی تفصیلی جائزہ لیا۔ اب ہم پروفیسر غفور صاحب کے اس دعویٰ کو دیکھتے ہیں تو ہمیں تین صورتوں میں سے ایک کو تسلیم کرنا پڑتا ہے

1)۔ ایک تو یہ کہ پروفیسر غفور صاحب ساری کارروائی سے غیر حاضر رہے لیکن یہ تسلیم نہیں کیا جا سکتا کیونکہ کارروائی میں ان کی شرکت کا ثبوت بہر حال موجود ہے۔

2)۔ یا پھر یہ ماننا پڑے گا کہ وہ جسمانی طور پر تو وہاں پر موجود تھے لیکن ذہنی طور پر وہاں سے مکمل طور پر غیر حاضر تھے۔

3)۔ تیسری صورت یہی ہو سکتی ہے کہ پہلے تو یہ کوشش کی گئی کہ جماعتِ احمدیہ کے وفد سے یہ بات نکلوائی جائے کہ احمدی باقی فرقوں کو غیر مسلم سمجھتے ہیں لیکن جب اس میں کامیابی نہیں ہوئی تو کارروائی کو شائع ہونے سے روک دیا گیا اور اس غلط بیانی سے کام لیا گیا کہ دراصل احمدیوں نے باقی فرقوں کو غیر مسلم کہا تھا اس لئے ہم اس بات پر مجبور ہوئے کہ انہیں غیر مسلم قرار دیں اور پاکستانی قوم کو دھوکا دیا گیا اور انہیں مسلسل جھوٹ سنایا گیا یعنی آخر میں وہی بات آجاتی ہے جو مبشر حسن صاحب نے فرمائی تھی کہ اس قوم کا کوئی حق نہیں۔ اس قوم کا بس یہی حق ہے کہ وہ غلامی کرے۔ ہم اس کا ذکر کچھ ٹھہر کر کریں گے لیکن پروفیسر غفور صاحب کی یہ بات بالکل غلط نکلی کہ ان حوالوں کو کبھی چیلنج ہی نہیں کیا گیا۔ جماعتِ احمدیہ کے وفد کی طرف سے بار بار یہ

ثابت کیا گیا تھا کہ بہت سے جعلی حوالے پیش کئے جا رہے ہیں۔ ایک مرتبہ تو مخالفین اس حد تک گر گئے کہ جعلی فوٹو کاپی پیش کر کے کام نکالنا چاہا۔ یہ پاکستان کی پارلیمانی تاریخ کا سیاہ ترین باب ہے۔

ہم نے یہ سوال صاحبزادہ فاروق علی خان صاحب سے دریافت کیا کہ قومی اسمبلی کی کارروائی میں پیش کئے گئے بہت سے حوالہ جات غلط کیوں تھے۔ اس پر انہوں نے کہا:۔

”اصل میں تو Responsibility یحیٰ بختیار کی تھی ناں۔ جرح اس نے کرنی تھی۔ سوال اس نے پوچھنا تھا۔ اگر اس کو Proper Assisstance ملتی تو یہ نہ ہوتا۔“

پھر اس پر انہوں نے یہ اضافہ کیا:۔

”اور یحیٰ بختیار لیتا بھی نہیں تھا۔ یہ بھی مصیبت ہے …“

(2) کارروائی کو خفیہ کیوں رکھا گیا؟

اب یہ سوال رہ جاتا ہے کہ اگر اس وقت حالات کو دیکھتے ہوئے یہ فیصلہ کر بھی لیا گیا تھا کہ اس کارروائی کو بند کمرے میں کیا جائے تو بعد میں اس کو منظرِ عام پر کیوں نہیں لایا گیا جبکہ اس فیصلہ کے بعد بھٹو صاحب نے یہ وعدہ بھی کیا تھا کہ کچھ عرصہ کے بعد اس کارروائی کو منظرِ عام پر لایا جائے گا اور بہت سے ممبران قومی اسمبلی اس کو اپنے کارنامے کے طور پر بھی بیان کرتے رہے تو ان کی بھی خواہش ہونی چاہئے تھی کہ اس کارنامے کو دنیا کے سامنے لایا جائے لیکن ایسا نہ کیا گیا اور جماعتِ احمدیہ کے علاوہ کسی اور گروہ نے اس کو منظرِ عام پر لانے کا مطالبہ بھی نہیں کیا۔

جب ہم نے یہ سوال ڈاکٹر مبشر حسن صاحب سے کیا کہ پھر یہ کارروائی بعد میں شائع کیوں نہ کی گئی تو ان کا جواب یہ تھا۔

”ڈاکٹر مبشر حسن صاحب:(مسکراتے ہوئے)اگر کرنی ہوتی تو خفیہ کیوں ہوتی۔

سلطان: تو مطلب قوم کا حق تو ہے ناں کہ وہ جانے اندر کیا ہوا۔

ڈاکٹر مبشر حسن صاحب: قوم کا کوئی حق نہیں۔ قوم کا حق ہے غلامی میں رہنا اور حکم بجا لانا۔

اس کارروائی کو خفیہ کیوں رکھا گیا اس کے بارے میں 1985ء میں حضرت خلیفۃ المسیح الرابعؒ نے فرمایا:۔

”1974 میں حکومت نے اپنے فیصلے کے دوران جماعت کو موقع تو دیا اور چودہ دن قومی اسمبلی میں سوال و جواب ہوتے رہے۔ جماعت نے اپنا موقف تحریری طور پر بھی پیش کیا لیکن ساتھ ہی چونکہ وہ بڑی ہوشیار اور چالاک حکومت تھی اس نے قومی اسمبلی کی کارروائی کے دوران ہی یہ محسوس کر لیا تھا کہ اگر یہ باتیں عام ہو گئیں اور سوال و جواب پر مشتمل اسمبلی کی کارروائی اوراس کی جملہ روئیداد دنیا کے سامنے پیش کر دی گئی تو حکومت کا مقصد حل نہیں ہو سکے گا بلکہ برعکس نتیجہ نکل سکتا ہے ......

چنانچہ اس وقت کی حکومت نے اس خطرہ کی پیش بندی اس طرح کی کہ جماعت کو قانوناً اور حکماً پابند کیا گیا کہ قومی اسمبلی میں جو بھی کارروائی ہو رہی ہے اس کا کوئی نوٹ یا کوئی ریکارڈنگ اپنے پاس نہیں رکھیں گے اور یہ فیصلہ بھی کیا گیا کہ حکومت اس کارروائی کو دنیا میں ظاہر نہیں ہونے دے گی۔“

(خطبات طاہر جلد 4 ص56)

ایک طرف تو اس کارروائی کو سرکاری طور پر خفیہ رکھا گیا۔ دوسری طرف جماعت کے مخالفین کی طرف سے جعلی کارروائی شائع کرائی گئی۔ اور اس میں جگہ جگہ تحریف بھی کی گئی۔ یہ مضمون اپنی ذات میں علیحدہ کتاب کا تقاضا کرتا ہے لیکن صرف حجم کا فرق ہی ثابت کر دیتا ہے کہ اس کارروائی میں جماعت کے مخالفین کو بد ترین شکست کا سامنا کرنا پڑا تھا اور مسلسل شرمندگی اُٹھانی پڑی تھی۔ مجلس تحفظِ ختم نبوت کی طرف سے یہ کارروائی " پارلیمنٹ میں قادیانی شکست " کے نام سے شائع کی گئی اور اس کے مرتب مولوی اللہ وسایا صاحب تھے۔ اس کے ٹائٹل پر ہی یہ دعویٰ درج ہے کہ

" قومی اسمبلی میں قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دیئے جانے کی مکمل روداد"

اور ملاحظہ کیجئے کہ اس کتاب میں جماعتِ احمدیہ مبایعین پر ہونے والے سوالات اور ان کے جوابات صرف180 صفحات پر آگئے ہیں۔ اور جب یہ کارروائی شائع ہوئی تو اس میں جماعتِ احمدیہ مبایعین پر ہونے والے سوالات اور ان کے جوابات ایسے ہی 1506 صفحات پر شائع ہوئے ہیں۔ اس سے ایک ہی نتیجہ نکلتا ہے اور وہ یہ کہ 80 فیصد کارروائی میں مخالفین کی طرف سے اُٹھائے گئے سوالات کا وہ حشر ہوا تھا کہ یہ مخالفین اسے تحریف کر کے بھی شائع نہیں کر سکتے تھے کیونکہ اس صورت میں انہیں شدید شرمندگی اُٹھانی پڑتی تھی اور باقی20 فیصد بھی بیچارے تحریف کر کے ہی شائع کر سکے اور اس کا نام "مکمل کارروائی" رکھ کر جھوٹا دعویٰ پیش کیا۔ اگر انہیں کسی قسم کی بھی کامیابی نصیب ہوئی تھی تو یہ ناممکن تھا کہ یہ خود ہی اپنی فتح کا حال چھپاتے اور جماعت احمدیہ کی طرف سے پیش کردہ "محضر نامہ " میں دلائل اتنے مضبوط تھے کہ اب بھی قومی اسمبلی کی طرف سے جو کارروائی شائع کی گئی اس میں اس محضر نامہ کو شائع نہیں کیا گیا۔ حالانکہ اسے اس سپیشل کمیٹی میں پڑھا گیا تھا اور یہ اس کی کارروائی کا حصہ تھا اور رہے مولوی صاحبان ، انہیں تو اپنی کتاب میں اس کو شائع کرنے میں اپنی موت نظر آ رہی تھی۔

(3) غیر متعلقہ سوالات

جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ راہبر کمیٹی نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ پوری قومی اسمبلی پر مشتمل ایک سپیشل کمیٹی سپیکر کی صدارت میں کارروائی شروع کرے گی اور یہ فیصلہ کرے گی کہ جو شخص آنحضرت ﷺ کو آخری نبی نہیں مانتا اس کا اسلام میں Status کیا ہے؟ لیکن ساری کارروائی سے گزر جائیں اس موضوع پر سوالات ہوئے ہی نہیں۔ جب بھی گفتگو اس موضوع کے قریب آنے لگتی تو پھر سوال کرنے والے گریز کا راستہ اختیار کر لیتے۔ اب اس بات کا کہ احمدیوں کی آبادی پاکستان میں کتنی ہے، پہلی جنگِ عظیم کے اختتام پر قادیان میں چراغاں ہوا تھا کہ نہیں۔ باؤنڈری کمیشن میں جماعت کا موقف کیا تھا، حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی وفات کس بیماری سے ہوئی، حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے کون سے جلسے میں پولیس موجود تھی کہ نہیں تھی۔ ان سب باتوں کا مسئلہ ختمِ نبوت سے کیا تعلق تھا۔ ان جیسے سوالات کا زیر بحث موضوع سے کوئی تعلق بنتا ہی نہیں۔ یہ تو پوچھا ہی نہیں گیا کہ اگر کوئی شخص آنحضرت ﷺ کے بعد امتی نبی کی آمد کا قائل ہے تو کیا اس بنا پر اس شخص کو غیر مسلم کہا جا سکتا ہے کہ نہیں؟ ساری کارروائی غیر متعلقہ سوالات اور غلط حوالوں کے گرد گھومتی رہی تھی۔ آخر یہ سوال تو لازماً اُٹھتا ہے کہ اصل موضوع سے گریز کیوں کیا گیا؟ اس کی بظاہر وجہ تو یہ نظر آتی ہے کہ جب جماعتِ احمدیہ کے محضرنامے کو دیکھا گیا اور مولوی حضرات کے پیش کردہ موقف بھی پڑھے گئے تو فیصلہ یہی کیا گیا کہ اصل موضوع کو نہ چھیڑنے میں ہی ہماری عافیت ہے اور تو کوئی وجہ سمجھ نہیں آتی۔ چنانچہ اتنے دن بند دروازوں کے پیچھے غیر متعلقہ سوالات میں وقت ضائع کر کے خفت سے بچنے کی کوشش کی گئی اور پھر اس کارروائی کو شائع بھی نہیں ہونے دیا کہ اس کارروائی کو چلانے والوں کی علمی قابلیت کا راز فاش نہ ہو جائے۔ اگر اصل موضوع پر بھی سوالات کا سلسلہ چلتا اور کچھ غیر متعلقہ سوالات بھی ہو جاتے تو یہ بات پھر بھی کچھ قابلِ درگزر ہوتی۔ لیکن یہاں تو عملاً یہ ہوا کہ ساری کارروائی ہی غیر متعلقہ موضوعات پر ہوتی رہی۔ ہم نے

جب اس بابت پروفیسر غفور صاحب سے سوال کیا تو پہلے تو وہ سوال کو سمجھ نہیں پائے اور ہم سے دریافت کیا کہ آپ کو کیسے معلوم ہے کہ یہ سوالات کئے گئے۔ جب ہم نے غیر متعلقہ سوالات کی مثالیں دے کر سوال کو واضح کیا تو ان کا جواب تھا۔

”یہ Relevant چیزیں نہیں ہیں۔ Relevant چیزیں بالکل دوسری ہیں۔

Relevant چیزیں وہی ہیں کہ قادیانیوں کا Status کیا ہے؟ ان کی پوزیشن کیا ہے؟ ختم نبوت کے معاملے میں ان کا اپنا عقیدہ کیا ہے؟ یہی چیزیں Relevant تھیں۔ اسی پر بحث ہوئی ہے ساری۔“

ان کے جواب سے ظاہر ہے کہ ان کے نزدیک جن سوالات کا ہم نے حوالہ دیا تھا وہ ان کے نزدیک بھی متعلقہ سوالات نہیں تھے۔ جب کہ یہ سوالات بار بار اس کارروائی کے دوران کئے گئے تھے۔ لیکن پڑھنے والے خود دیکھ سکتے ہیں کہ ان کا یہ کہنا درست نہیں کہ Relevant موضوعات پر ساری بحث ہوئی تھی۔ ہم اس ساری بحث کو بیان کر چکے ہیں۔ ان میں سے اکثر سوالات تو مقررہ موضوع سے دور کا تعلق بھی نہیں رکھتے۔ البتہ جب یہ سوال ہوا کہ احمدی حضرت مسیح موعود علیہ السلام کا مقام کیا سمجھتے ہیں تو یہ گمان ہوتا تھا کہ شاید یہ بحث اپنے اصل موضوع پر آ جائے مگر افسوس ایک بار پھر غیر متعلقہ سوالات کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اصل موضوع تو یہ تھا کہ جو شخص آنحضرت ﷺ کو آخری نبی نہیں سمجھتا اس کا اسلام میں Status کیا ہے؟

ہم نے انٹرویو میں مکرر پروفیسر غفور صاحب سے سوال کیا کہ کارروائی میں غیر متعلقہ سوالات کیوں کئے گئے۔ اس پر پھر ان کا جواب یہ تھا:

”وہ سارے سوال Relevant ہی تھے۔“

اب پڑھنے والے اس کے متعلق خود اپنی رائے قائم کر سکتے ہیں۔

جب ہم نے ڈاکٹر مبشر حسن صاحب سے یہ سوال کیا کہ کیا وجہ تھی کہ ساری کارروائی میں غیر متعلقہ سوالات پوچھے گئے؟ اس پر انہوں نے جواب دیا:۔

"I do not know۔ یہ تو ان سے پوچھیں یہ وکیل ہیں(یہ بات انہوں نے مرزا عدیل احمد صاحب کی طرف اشارہ کر کے کہی تھی جو وکیل ہیں اور اس انٹرویو میں شامل تھے) Cross Examination میں کیا کیا Relevant ہے۔"

اس طرح انہوں نے جواب دینے سے گریز کیا۔

(1) خطباتِ ناصر جلد پنجم، 525 تا 529۔

(2) خطباتِ ناصر جلد پنجم 529 تا 530۔

(3) روایت مکرم پروفیسر ڈاکٹر سلطان محمود شاہد صاحب(آپ نے یہ واقعہ خود دیکھا تھا)۔

(4) روایت طارق محمود جاوید صاحب (آپ اس واقعہ کے چشم دید گواہ ہیں)۔

(5) چٹان 4 /جون 1974 ء ص 3۔

(6) روزنامہ نوائے وقت، 30/ مئی 1974ء ص 1۔

(7) روزنامہ مشرق 30 / مئی 1974ء ص 3۔

(8) Dawn,May 30 1974p5

(9) تحریر مکرم بشیر رفیق صاحب سابق مشنری انچارج لندن مشن بنام مکرم وکیل اعلیٰ صاحب۔

(10) Pakistan Times,31 May 1974,last page

(11) نوائے وقت 31/ مئی 1974ء ص1۔

(12) نوائے وقت 4/ جون 1974ء ص1

(13) The National Assembly of Pakistan Debates, official report, Third seesion of 1974,1st june p78-91.

(14) نوائے وقت، یکم اپریل 1973ء ص1۔

(15) The National Assembly of Pakistan,Debates Official Report 3rd june 1974 p 121-131.

(16) سزا یافتہ سیاستدان، مصنفہ مرتضیٰ انجم، ناشر دارالشعور لاہور، ص121۔

(17) The National Assembly of Paksitan, Debates, Offical Report, 4th June,1974 p171-172.

(18) نوائے وقت 5/ جون 1974ء ص 1

(19) نوائے وقت 10/ جون 1974ء ص1۔

The Plain Dealer,June 9,1974 (20)

(21) نوائے وقت 13 / جون 1974ء ص 1۔

(22) (۲۳) نوائے وقت ۱۴ / جون ۱۹۷۴ء ص ۱۔

Dawn,14 June 1974 p1(24)

(25) خطباتِ ناصر، جلد پنجم ص 556، 557۔

(26) نوائے وقت 17 / جون 1974ء ص اول و آخر۔

(27) خطباتِ ناصر جلد پنجم ص 571 تا 574۔

(28) خطباتِ ناصر جلد پنجم ص 575۔

(29) نوائے وقت یکم جولائی 1974ء ص 1۔

Dawn,1st July 197 4 p1(30)

Pakistan Times,1st July 1974 p1 (31)

Pakistan Times July 2,1974 p1(32)

Dawn July 2,1974 p1(33)

Pakistan Times July 4, 1974 p1(34)

(35)روایت مکرم مجیب الرحمن صاحب ایڈووکیٹ۔

(36) Dawn 15 th July 1974 p1

(37)نوائے وقت یکم جولائی 1974ء ص2۔

(38) روزنامچہ مرتبہ افضال ربانی ص59 تا 83۔

(39)روایت مکرم محمود احمد و رپورٹ از جماعتِ احمدیہ کراچی۔

(40)نوائے وقت 11 / جولائی1974 ء ص1۔

(41) چٹان 3 / جون1974ء۔

(42)روایت مکرم مجیب الرحمن صاحب ایڈووکیٹ۔

(43)نوائے وقت 24 / جوالائی 1974ء ص1 ص5۔

(44)روحانی خزائن جلد15 ص432۔433۔

(45) روحانی خزائن جلد 22 ص167۔168۔

(46) روحانی خزائن جلد22ص185، 186۔

(47)انوارالعلوم جلد 6 ص112۔

(48)عرفانِ شریعت مرتبہ مولوی محمد عرفان علی صاحب الناشر سنی دارالاشاعت علویہ رضویہ ڈجکوٹ روڈ لائلپور ص77۔

(49) فتاویٰ عثمانی از مفتی محمد تقی عثمانی، ناشر مکتبہ معارف القرآن کراچی ص72 تا 81۔

(50) فتاویٰ عزیزی از مولانا شاہ عبد العزیز محدث دہلوی، ناشر سعید کمپنی کراچی ص362۔

(51) فتاویٰ رشیدیہ از رشید احمد گنگوہی ص62، 63۔

(52) مجموعۃ الفتاویٰ از مولوی عبد الحی فرنگی محلی ناشر سعید کمپنی کراچی ص24۔

(53) حسام الحرمین علی منحرالکفر والمین ص95۔

(54) فتاویٰ ھندیہ ترجمہ فتاویٰ عالمگیریہ جلد سوم ترجمہ سید امیر علی ناشر سراج الدین اینڈ سنز لاہور ص576 تا 599۔

(55) امروز 5 / اکتوبر 1978 ء ص1۔

(56) رپورٹ تحقیقاتی عدالت فسادات پنجاب 1953ء ص11۔

(57) مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصہ سوم مصنفہ ابو اعلیٰ مودودی صاحب ص 30۔

(58) روحانی خزائن جلد 5 ص344۔ 345۔

(59) Hammodur Rahman Commission Report, Published by Vanguard Company, P214.215

(60) مجموعہ اشتہارات جلد 1، ص588، اشتہار 1550۔

(61) تحفہ قیصریہ روحانی خزائن جلد 12 ص272۔ 273۔

(62) کشتی نوح، روحانی خزائن جلد 19 ص 17 و 18۔

(63) فتاویٰ مسیح موعودؑ ص 236-237۔

(64) فتاویٰ رشیدیہ کامل مبوب، مصنفہ رشید احمد گنگوہی، ناشر محمد سعید اینڈ سنز، ص 350۔

(65) حیاتِ چہار دہ معصومین مولفہ سید ذیشان حیدر جوادی ص 323-326۔

(66) قلائد الجواہر، تالیف محمد بن یحیٰی التادفی الحنبلی، مطبع شرکۃ مساھمۃ مصریہ ص 57۔

(67) روحانی خزائن جلد 13 ص 103-104۔

(68) سیفِ چشتیائی مصنفہ پیر مہر علی گولڑوی، ص 35 تا 37، 43۔

(69) چشتیائی مصنفہ مہر علی شاہ صاحب، ہمدرد سٹیم پریس راولپنڈی، ص 345۔

(70) روحانی خزائن جلد 19 ص 165۔

(71) یہ پوری نظم کتاب اقبال اور احمدیت مصنفہ شیخ عبد الماجد کے صفحہ 262-263 پر درج ہے۔

(72) مجموعہ تقویۃ الایمان مع تذکیر الاخوان مولفہ علامہ شاہ محمد اسمٰعیل رحمۃ اللہ علیہ، ناشر نور محمد اصح المطابع و کارخانہ تجارت کتب آرام باغ کراچی ص 37۔

(73) مسند امام احمد بن حنبلؒ، مسند عرباض بن ساریہؓ، جلد 4 ص 127۔

(74) روحانی خزائن جلد 18 ص 210۔

(75) مقالاتِ سرسید حصہ نہم ص 54-55۔

(76)سوانح احمدی، مولفہ مولوی محمد جعفر تھانیسری، صوفی پرنٹنگ اینڈ پبلشنگ کمپنی منڈی بہاؤالدین ص71۔

(77)مقالاتِ سرسید حصہ نہم ص57۔

(78) اشاعۃ السنہ جلد 6 نمبر 10اکتوبر نومبر ص287۔

(79) اشاعۃ السنہ جلد6 نمبر 10اکتوبر نومبر ص 293۔

(80) Indian Muslims, A political History,1858 -1947, by Ram Gopal, Book Traders Lahore, P102.

(81) A Book of readings on the The History of The Punjab,compiled by Ikram Ali Malik,published by Research Society of Pakistan ,2nd impression 1985 , P268.

(82) A Book of readings on the The History of The Punjab, compiled by Ikram Ali Malik, published by Research Society of Pakistan, 2nd impression 1985 P 272.

(83) A Book of readings on the The History of The Punjab, compiled by Ikram Ali Malik, published by Research Society of Pakistan ,2nd impression 1985 P 287.

(84) A Book of readings on the The History of The Punjab, compiled by Ikram Ali Malik,published by Research Society of Pakistan ,2nd impression 1985 P 291.

(85) روایت مجیب الرحمن ایڈووکیٹ صاحب۔

(86) خطباتِ ناصر جلد 5 ص615۔616۔

(87)خطباتِ ناصر جلد 5 ص620۔

(88)روحانی خزائن جلد17 ص64۔

(89)الفضل 13 نومبر 1946ء۔

(90)مقالاتِ سرسید حصہ نہم ص57۔58۔

(91) مقدمہ بہادر شاہ ظفر مصنفہ خواجہ حسن نظامی صاحب، اسلام اور مسلمین، دیباچہ مقدمہ کتاب۔

(92)مقدمہ بہادر شاہ ظفر ص132۔

(93)اشاعۃ السنہ اکتوبر، نومبر 1883 ص288۔

(94)انوارالعلوم جلد 8 ص394۔

(95)روحانی خزائن جلد16 ص 275۔276۔

(96)طبقاتِ ابنِ سعد جلد اول، ناشر دارالا شاعت کراچی 2003 ص205، 206۔

(97) روحانی خزائن جلد19 ص 212۔

(98) سنن ابنِ ماجہ، کتاب الفتن، فتنۃ الدجال و خروج عیسی ابن مریم و خروج یاجوج و ما جوج۔

(99) The Book of Readings on The History of The Punjab 1799-1947,by Ikram Ali,published by Rsearch Society of Pakistan ,University of The Punjab Lahore,April .1985 ,Page328-338

(100) فتوحاتِ مکیہ، الجزء الثالث، مطبع دارالکتب العربیہ الکبریٰ، ص350۔

اٹارنی جنرل صاحب بحث سمیٹتے ہیں

ہم جائزہ لے چکے ہیں کہ جب جماعت کے وفد سے سوالات کئے گئے تو کیا بیتی۔ پھر دو روز غیر مبائع احمدی احباب کے وفد سے سوالات کئے گئے۔ اس کے بعد جماعتِ احمدیہ کے مخالف ممبران کی طویل تقریروں کا سلسلہ چلا۔ بظاہر محسوس ہوتا ہے کہ اس کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ جب جماعتِ احمدیہ کے وفد پر گیارہ روز سوالات کئے گئے تو مطلوبہ نتائج نہیں نکل سکے۔ ہم اس کا تفصیلی جائزہ پیش کر چکے ہیں۔ ہر پڑھنے والا اپنی رائے خود قائم کر سکتا ہے۔ اب اس وقت جب کہ جماعت کا وفد موجود نہ ہو دل بھر کے زہر فشانی کر کے دل کی بھڑاس نکالی جا رہی تھی تاکہ جب یہ حضرات غلط یا خود ساختہ حوالہ پیش کریں تو کوئی یہ کہنے والا نہ ہو کہ یہ تو غلط بیانی کی جا رہی ہے، جب نامکمل عبارت پیش کر کے غلط تاثر پیش کرنے کی کوشش کی جائے تو کوئی مکمل عبارت پڑھنے والا نہ ہو اور جب غلط تاریخی حقائق پیش کئے جائیں تو کوئی تصحیح کرنے والا نہ ہو۔ ورنہ شاید اتنی طویل تقاریر کی ضرورت نہ ہوتی۔ چونکہ ان تقاریر میں تقریباً انہی نکات کا اعادہ تھا جن کا ہم جائزہ لے چکے ہیں، اس لئے اب اس کتاب میں علیحدہ ان نکات کو دہرانے کی ضرورت نہیں۔ البتہ اٹارنی جنرل صاحب کی آخری تقریر کے چند نکات کا جائزہ پیش کرنا ضروری ہے کیونکہ آخر میں اٹارنی جنرل صاحب نے بحث کو سمیٹا تھا اور ساری کارروائی کا خلاصہ پیش کیا تھا۔

اٹارنی جنرل صاحب نے آغاز کے رسمی جملوں میں کہا کہ وہ بالکل غیر جانبدار ہو کر اپنا تجزیہ پیش کریں گے تاکہ کل کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ اٹارنی جنرل صاحب نے اپنی پوزیشن کا غلط فائدہ اُٹھا کر غلط طریق پر ممبران پر اثر انداز ہوئے تھے۔ اس بات سے سب اتفاق کریں گے کہ نہ صرف اس تقریر کے دوران بلکہ تمام کارروائی کے دوران مکمل غیر جانبداری کا مظاہرہ ہونا چاہئیے تھا لیکن اب تک ہم کیا منظر دیکھتے رہے۔ غلط حوالے پیش کئے گئے یہاں تک کہ جعلی فوٹو سٹیٹ کاپی بنا کر پیش کی گئی لیکن کوئی وضاحت نہیں پیش کی گئی کہ کون ذمہ دار تھا؟ کس ممبر نے اُٹھ کر مذمت کی کہ یہ طریقہ کار ٹھیک نہیں۔ اس کارروائی کے دوران کسی قسم کی غیر

جانبداری نظر نہیں آتی، صرف بغض اور تعصب کا اظہار نظر آتا ہے۔ خود اٹارنی جنرل صاحب نے دعویٰ کیا کہ وہ جو حوالے پیش کر رہے ہیں وہ ان کے سامنے موجود ہیں لیکن جب بھی حوالہ غلط ثابت ہوا وہ پیش کردہ حوالے کا کوئی ثبوت پیش نہیں کر سکے۔ اب ہم جائزہ لیتے ہیں کہ اس تقریر کے دوران جو کہ 5 اور 6/ ستمبر کو کی گئی وہ کتنے غیر جانبدار رہے اور کتنی دیانتداری کا مظاہرہ کیا گیا۔

جیسا کہ پہلے ذکر آ چکا ہے کہ جب قومی اسمبلی ایک سپیشل کمیٹی قائم کرتی ہے تو یہ سپیشل کمیٹی وہ کام کرنے کی پابند ہوتی ہے جو اس کے سپرد کیا جائے وہ اس کام کو کرنے کے بعد وہ اس سے تعلق رکھنے والے کچھ امور پر بھی بحث کر سکتی ہے۔ اٹارنی جنرل صاحب نے اس سپیشل کمیٹی کے سپرد کام پڑھ کر سنایا اور وہ یہ تھا:۔

To discuss the question of the status in Islam of the persons who do not believe in the finality of Prophethood of Muhammad (Peace be upon him)

یعنی ان اشخاص کی اسلام میں کیا حیثیت ہے جو حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی ختمِ نبوت کو تسلیم نہیں کرتے۔ سوال یہ ہے کہ یہ پڑھتے ہوئے اٹارنی جنرل صاحب کو یہ خیال کیوں نہیں آیا کہ وہ گیارہ دن جماعتِ احمدیہ کے وفد سے جو سوالات کرتے رہے تھے ان میں سے نوے فیصد سے زائد سوالات کا مذکورہ مقصد سے کوئی تعلق ہی نہیں تھا۔ جب کبھی قسمت سے گفتگو اس موضوع کے قریب آنے لگی تو اٹارنی جنرل صاحب نے سوالات کا رخ کسی اور طرف کر دیا۔ اس کے بعد یحییٰ بختیار صاحب نے وہ قرارداد پڑھ کر سنائی جو کہ اپوزیشن کے 37 اراکین کی طرف سے پیش کی گئی تھی۔

اس کے بعد اٹارنی جنرل صاحب نے جو کچھ کہا وہ حیران کن تھا۔ انہوں نے کہا کہ وزیر قانون کی قرارداد کے نتیجے میں اس سپیشل کمیٹی کے جو اغراض و مقاصد طے ہوئے تھے وہ درست نہیں تھے۔ انہوں نے کہا:۔

The motion is a contradiction in terms

یعنی اس قرارداد میں جس میں اس سپیشل کمیٹی کے اغراض و مقاصد بیان کئے گئے تھے تضاد تھا۔ اگر اس سپیشل کمیٹی کے اغراض و مقاصد ہی ٹھیک طے نہیں ہوئے تھے تو اٹارنی جنرل صاحب کو یہ سوال شروع میں

اُٹھانا چاہیئے تھا تاکہ جو غلطی تھی وہ دور کر دی جائے لیکن دو ہفتہ وہ غیر متعلقہ بحث چلانے کے بعد کہہ رہے تھے کہ شروع ہی سے اس کمیٹی کے اغراض و مقاصد ٹھیک طے نہیں ہوئے تھے۔ پھر انہوں نے یہ نکتہ بیان کیا کہ اگر یہ طے کیا جائے کہ جو آنحضرت ﷺ کی ختمِ نبوت پر ایمان نہیں لاتا وہ غیر مسلم ہے تو پھر اس کا اسلام میں کوئی Status ہی نہیں۔ الفاظ یہ ہونے چاہیئے تھے In reference to Islam۔ وزیر قانون کی پیش کردہ Motion کو Contradictory قرار دینے کے بعد وہ اپوزیشن کی پیش کردہ قرارداد کی طرف متوجہ ہوئے۔ انہوں نے کہا:

Again, Sir, with all respect, the resolution moved by thirty seven members,is in ......my opinion, in some parts contradictory

یعنی سینتیس ممبران نے جو قرارداد پیش کی ہے اس کے بھی بعض حصے متضاد ہیں۔ اگر یہ دونوں قراردادیں ہی اندرونی تضاد کا شکار تھیں تو اتنے روز قومی اسمبلی کے سارے اراکین کیا کرتے رہے تھے؟ یہ ساری کارروائی غیر متعلقہ ہی نہیں بلکہ لایعنی بھی تھی۔ اپوزیشن کے بارے میں اٹارنی جنرل صاحب کا نکتہ یہ تھا کہ ایک طرف تو اس قرارداد میں لکھا ہے کہ قادیانیت ایک Subversive یعنی تخریب کار تحریک ہے اور اگر پھر ان کو علیحدہ مذہب کی حیثیت دی جائے تو پھر ان کے حقوق محفوظ کرنے ہوں گے اس طرح آپ تخریب کاری کو تحفظ دے رہے ہوں گے اور آپ کو ان کو اپنے مذہب کو Profess, Practice اور Propagate کرنے کی اجازت دینی ہوگی۔

اصل بات یہ تھی کہ اصل میں احمدیوں کے تمام حقوق سلب کرنے کی تیاری کی جا رہی تھی جیسا کہ بعد میں 1984ء کے آرڈیننس کے نتیجے میں احمدی مسلمانوں سے مذہب کو Profess, Practice اور Propagate کرنے کا حق بھی چھین لیا گیا۔

اب اٹارنی جنرل صاحب نے مزید موضوع سے بھٹکنا شروع کیا۔ انہوں نے کہا کہ ”منیر انکوائری رپورٹ“ میں لکھا ہے کہ مرزا غلام احمد (علیہ السلام) مرزا غلام مرتضٰی کے پوتے تھے۔ انہوں نے کہا کہ میرے خیال میں یہ صحیح نہیں ہے میرے خیال میں وہ ان کے بیٹے تھے۔ اب انہوں نے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے

حالات زندگی بیان کرنے شروع کئے۔ انہوں نے اعتراف کیا کہ وہ ایک قابل شخص تھے اور عربی، فارسی اور اردو میں اچھی طرح تحریر کر سکتے تھے اور1889ء تک ان کو مسلمانوں میں ہیرو سمجھا جاتا تھا۔ اس کے بعد انہوں نے پہلی بیعت کے متعلق اپنی تحقیق بیان کرنی شروع کی۔ انہوں نے کہا کہ میں نے اس بات پر غور کیا ہے کہ مرزا غلام احمد (علیہ السلام) نے قادیان کی بجائے لدھیانہ میں پہلی بیعت کیوں لی؟ انہوں نے کہا کہ اس بارے میں فیصلہ تو ممبرانِ اسمبلی کریں گے لیکن میرا خیال ہے کہ چونکہ روایات میں ہے آنے والا مسیح ”لد“ کے مقام پر اپنے مسیح ہونے کا اعلان کرے گا۔ اس لئے بانیِ سلسلہ احمدیہ نے قادیان کی بجائے لدھیانہ میں بیعت لی۔ اٹارنی جنرل صاحب بنیادی معلومات حاصل کئے بغیر سنسنی خیز نتائج پیش کر رہے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ روایت یہ نہیں ہے کہ مسیح ”لد“ کے مقام پر اپنے دعوے کا اعلان کرے گا بلکہ یہ ہے کہ مسیح بابِ لد پر دجال کو قتل کرے گا۔ چنانچہ صحیح مسلم کی کتاب الفتن کے باب ذکر الدجال میں حضرت نواس بن سمعانؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام نازل ہوں گے تو جس کافر تک آپ کا سانس پہنچے گا وہ مر جائے گا اور آپ دجال کا پیچھا کر کے اسے بابِ لد پر پکڑ لیں گے اور قتل کر دیں گے۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے پہلی بیعت کہاں لی اور کیوں لی؟ یہ بات بالکل نا قابلِ فہم ہے کہ اس کی وجہ کے بارے میں پاکستان کی قومی اسمبلی کیوں فیصلہ کرے گی؟ لیکن جب کوئی گروہ پٹری سے اترنا شروع کرے تو انجام ایسی خلافِ عقل باتوں پر ہوتا ہے۔

اب اٹارنی جنرل صاحب نے بیان کیا کہ یہ الزام لگایا گیا ہے کہ جب سوڈان سے سماٹرا تک مسلمان غیروں کے تسلط کے خلاف جد وجہد کر رہے تھے تو بانی سلسلہ احمدیوں کو انگریزوں نے اپنے مقاصد کے لئے کھڑا کیا۔ اس پس منظر میں جب بانی سلسلہ احمدیہ نے اپنی شرائطِ بیعت میں یہ شرط بھی رکھی کہ بیعت کرنے والے حکومتِ برطانیہ سے وفادار رہیں گے اور اس طرح حکومتِ برطانیہ سے وفاداری کو جزوِ ایمان بنا لیا تو اس کے خلاف مسلمانوں میں بہت ردِّ عمل ہوا جو کہ غیر ملکی حکومت سے نجات حاصل کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اب اٹارنی جنرل صاحب بڑے اعتماد سے جماعتِ احمدیہ کے خلاف جھوٹے الزامات کی فہرست سنا رہے تھے کیونکہ اب یہاں پر جماعت احمدیہ کا وفد موجود نہیں تھا۔ اب وہ ممبرانِ اسمبلی بیٹھے تھے جن کو سچائی سے کوئی

دلچسپی نہیں تھی۔ پہلی بات تو یہ کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی تحریر فرمودہ دس شرائطِ بیعت پہلی بیعت سے بھی پہلے ایک اشتہار کی صورت میں شائع ہو چکی تھیں اور اس کے بعد بھی جماعت کی سینکڑوں کتب میں یہ شرائط شائع ہوتی رہی ہیں ان میں سے برٹش گورنمنٹ سے وفاداری کی کوئی شرط شامل نہیں ہے اگر ہے تو یہ ہے:۔

" چہارم: یہ کہ عام خلق اللہ کو عموماً اور مسلمانوں کو خصوصاً اپنے نفسانی جوشوں سے کسی نوع کی نا جائز تکلیف نہیں دے گا۔ زبان سے نہ ہاتھ سے نہ کسی اور طرح سے۔"

"ہشتم: یہ کہ دین اور دین کی عزت اور ہمدردیِ اسلام کو اپنی جان اور اپنے مال اور اپنی عزت اور اپنے ہر ایک عزیز سے زیادہ سمجھے گا۔"

البتہ جیسا کہ ہم حوالہ درج کر چکے ہیں، جب حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی زندگی میں ہی ہندوستان کے مسلمانوں کی نمائندہ جماعت " آل انڈیا مسلم لیگ" کا قیام عمل میں آیا تو اس کے اغراض و مقاصد میں سے پہلا یہ تھا کہ یہ تنظیم مسلمانوں میں برٹش گورنمنٹ سے وفاداری کے خیال کو قائم رکھنے اور اس میں اضافہ کرنے کے لئے کوشاں رہے گی۔ نہ جانے اٹارنی جنرل صاحب سوڈان اور سماٹرا کیوں پہنچ گئے؟ آل انڈیا مسلم لیگ کے ان اغراض و مقاصد کی موجودگی میں یہ کس طرح کہا جا سکتا ہے کہ اس وقت ہندوستان کے مسلمان انگریز حکمرانوں سے نجات حاصل کرنے کے لئے کوششیں کر رہے تھے۔

اب یہ تقریر ایک وادی سے دوسری وادی میں بے تکلف بھٹک رہی تھی۔ اب انہوں نے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے اندازِ تفسیر کی طرف رخ کیا اور یہ انکشاف فرمایا کہ دعویٰ مسیحیت کے بارے میں چند آیات چھوڑ کر حضرت مسیح موعود علیہ السلام کا اندازِ تفسیر سر سید احمد خان صاحب جیسا ہی تھا۔ یہ دعویٰ وہی شخص کر سکتا ہے جسے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے علم کلام کی کچھ بھی خبر نہ ہو۔ اگر یہ صاحب صرف حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی تصنیف " برکات الدعاء " پر ایک نظر ہی ڈال لیتے تو ایسی فاش غلطی نہ کرتے۔

پہلی بیعت کے ذکر کے بعد انہوں نے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی جیسے وہ کوئی بہت ہی گہری تحقیق پیش کر رہے ہیں اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی جیسے نعوذُ باللہ حضرت مسیح موعود ایک منصوبے کے

تحت خود اپنے عقائد تبدیل کر رہے تھے۔ اور سپیکر کو مخاطب کر کے کہا کہ جہاں تک میں نے نظر ڈالی ہے بانی سلسلہ احمدیہ کی زندگی کو تین ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلا دور 1875-76ء لے کر 1888-89ء تک کا ہے، جب وہ آریہ سماج اور عیسائیوں سے مقابلہ کر رہے تھے۔ اس وقت ان کے وہی خیالات تھے جو کہ مسلمانوں کے دوسرے مسلمان لیڈروں کے تھے۔ اب اٹارنی جنرل صاحب نے اپنی طرف سے ختم نبوت کے بارے میں حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی وہ تحریریں پڑھنی شروع کیں جن کے متعلق ان کا دعویٰ تھا کہ یہ 1889ء سے پہلے کی ہیں اور اس بنیاد پر وہ مفروضوں کی ایک بلند عمارت کھڑی کر رہے تھے۔ ذرا اٹارنی جنرل صاحب کی پیش کردہ مثالیں ملاحظہ ہوں۔ واضح رہے کہ وہ تمام حوالے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی کتب کے مجموعے ”روحانی خزائن“ سے پیش کر رہے تھے اور اس کی جلدیں وہاں پر موجود تھیں اور روحانی خزائن میں سب کتب زمانی ترتیب سے جمع کی گئی ہیں اور ہر کتاب کے متعلق یہ واضح لکھا ہوا ہے کہ یہ کب شائع ہوئی۔ اس لئے کوئی بھی شخص جو صرف پڑھنا جانتا ہو بڑی آسانی سے معلوم کر سکتا ہے کہ یہ کتاب کب لکھی گئی۔ پہلی مثال انہوں نے روحانی خزائن جلد7 صفحہ 220 کی پیش کی اور کہا کہ وہ عربی عبارت کا ترجمہ پڑھ رہے ہیں۔ روحانی خزائن کی جلد 7 کے صفحہ220 پر حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی تصنیف ”حمامۃ البشریٰ“ چل رہی ہے۔ پہلی قابل ذکر بات یہ ہے کہ جو عبارت وہ پڑھ رہے تھے وہ اس صفحہ پر موجود ہی نہیں۔ دوسری بات یہ کہ جیسا کہ کتاب کے سرورق پر بھی اشاعت کا سال لکھا ہوا ہے اور پیش لفظ میں بھی واضح لکھا ہوا ہے۔ یہ کتاب 1893ء میں لکھی گئی اور فروری1894ء میں شائع ہوئی اور اٹارنی جنرل صاحب اسے1889ء سے قبل کی تحریر کے طور پر پیش کر رہے تھے۔ ایک مثال تو غلط ہو گئی۔ ایک غلطی تو کسی سے بھی ہو سکتی ہے۔ اب یہ دیکھتے ہیں کہ وہ اگلی مثال کس کتاب سے پیش فرماتے ہیں۔ انہوں نے اگلا حوالہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی تصنیف ”کتاب البریہ“ کا پڑھا اور حوالہ پیش کیا کہ یہ عبارت ”روحانی خزائن جلد 13 صفحہ 217و218“ کے حاشیہ میں موجود ہے۔ جیسا کہ اس جلد کے صفحہ 3 پر لکھا ہوا ہے اور کتاب کے سرورق پر بھی موٹا موٹا لکھا ہوا ہے یہ کتاب 1889ء کے نو سال بعد جنوری 1898ء میں شائع ہوئی تھی اور یحیٰ بختیار صاحب اس تحریر کو 1889ء سے پہلے کی تحریر کے طور پر پیش کر رہے تھے۔ اٹارنی جنرل صاحب سمجھتے تھے کہ وہ کوئی بہت گہری تحقیق پیش

فرما رہے ہیں۔ اس لئے انہوں نے دو مثالوں یا یوں کہنا چاہیئے دو غلطیوں پر اکتفا نہیں کی بلکہ ان میں اضافہ کرتے ہوئے تیسری مثال پیش کی۔ یہ مثال ”ازالہ اوہام“ کی تھی۔ انہوں نے تحریر کا حوالہ پڑھا روحانی خزائن جلد 3 صفحہ 412۔ یہ کتاب بھی 1889ء کے بعد 1891ء میں لکھی گئی تھی۔ چوتھی مثال وہ کسی اشتہار کی دینا چاہتے تھے لیکن چونکہ نہ نام صحیح پڑھا گیا اور صرف تاریخ بتائی سن نہیں بتایا اس لئے اس کا تجزیہ نہیں کیا جا سکتا۔

اٹارنی جنرل صاحب نے قومی اسمبلی کے علم میں اضافہ فرماتے ہوئے کہا کہ 1888ء یا 1889ء میں بانی سلسلہ احمدیہ کے دعاوی کا دوسرا مرحلہ شروع ہوتا ہے۔ انہوں ایک بار پھر ڈرامائی انداز میں کرسیِ صدارت کو مخاطب کر کے کہا کہ 1889ء میں بیعت کے بعد بانی سلسلہ احمدیہ نے بڑی احتیاط کے ساتھ اپنے موقف میں تبدیلی کرنی شروع کی۔ انہوں نے کہا کہ شاید میں غلط ہوں لیکن شروع میں بانی سلسلہ احمدیہ نے بہت محتاط انداز میں اپنے سابقہ موقف کو بدلنے کا سلسلہ شروع کیا۔ اب توقع یہ کی جا سکتی تھی کہ یہ صاحب ایسی تحریروں کی مثالیں پیش کریں گے جو کہ 1889ء کے معاً بعد کے زمانے کی ہیں لیکن اٹارنی جنرل صاحب نے ایک بار پھر تمام اندازوں کو غلط ثابت کرتے ہوئے لیکچر سیالکوٹ کی مثال پیش کی اور حوالہ پڑھا” روحانی خزائن جلد 20 صفحہ 327“۔ یہ لیکچر 1889ء کے کوئی پندرہ سال بعد 2/ نومبر 1904ء کو دیا گیا تھا اور اس سے کئی سال قبل حضرت مسیح موعود علیہ السلام کا دعویٰ نبوت سامنے آچکا تھا۔ شاید پڑھنے والوں کو یہ توقع ہو کہ اب ان کی غلطیوں کا سلسلہ ختم ہو گیا ہوگا لیکن انہوں نے جو اگلی مثال دی وہ ملاحظہ کیجئے۔ اٹارنی جنرل صاحب نے اگلی مثال ” تجلّیاتِ الٰہیہ“ کی پیش کی۔ یہ کتاب حضرت مسیح موعودؑ نے وفات سے صرف دو سال قبل 1906ء میں تحریر کی تھی اور حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی وفات کے کئی سال بعد 1922ء میں اسے شائع کیا گیا تھا۔ وہ بار بار بیچ میں ” مباحثہ راولپنڈی“ کا نام بھی لے رہے تھے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ذہن میں یہ تاثر تھا کہ یہ مباحثہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کا کوئی مباحثہ تھا۔ حالانکہ یہ مباحثہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی وفات کے کئی سال بعد خلافتِ ثانیہ میں ہوا تھا۔ پھر انہوں نے اپنی طرف سے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے دعوے کے دور کے دوسرے حصہ کی تحریروں کی مثال دیتے ہوئے ”حقیقۃ الوحی “ کا حوالہ دیا۔ یہ کتاب حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی وفات سے صرف ایک سال قبل مئی 1907ء میں شائع ہوئی تھی۔

اب ہر پڑھنے والے کے ذہن میں یہ سوال اُبھرے گا کہ اٹارنی جنرل صاحب نے کہا تھا کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نعوذُ باللہ ایک منصوبے کے تحت خاص طور پر ختم نبوت اور اپنے مقام کے بارے میں اپنا موقف تبدیل کررہے تھے اور ان کے مطابق اس عمل کو تین مراحل میں تقسیم کیا جاسکتا ہے جن کے مکمل ہونے کے بعد حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے سب دعاوی سامنے آئے۔ جیسا کہ ہم لکھ چکے ہیں کہ اٹارنی جنرل صاحب کے مطابق ”حقیقۃ الوحی “ کی اشاعت تک ابھی دوسرا مرحلہ چل رہا تھا اور یہ کتاب حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی وفات سے صرف ایک سال قبل شائع ہوئی تھی تو پھر حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے اس فرضی تیسرے مرحلہ پر جو عقائد اور دعاوی پیش کئے وہ کب کیے گئے ؟ کیونکہ اس کے بعد تو آپ کا وصال ہو گیا تھا۔

سب حیران ہو ں گے کہ اب اٹارنی جنرل صاحب اس فرضی تیسرے مرحلہ کی دلیل کے طور پر حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی کس کتاب کی تحریر پیش کریں گے؟ سب پڑھنے والوں کے لئے یہ بات حیران کن ہو گی کہ اس غرض کے لئے کیا طریقہ اختیار کیا۔ انہوں نے ممبرانِ اسمبلی کو مخاطب کر کے کہا کہ اب ہم تیسرے مرحلے کی طرف آتے ہیں۔ اس کی دلیل کے طور پر انہوں نے حضرت مرزا بشیر احمد صاحب کی کتاب” کلمۃ الفصل “ کا حوالہ پیش کیا اور اس کے ساتھ یہ بھی فرمایا کہ اس کی اشاعت ریویو آف ریلیجنز میں 1915ء میں ہوئی تھی۔ اٹارنی جنرل صاحب کو کچھ تو ہوش سے کام لینا چاہئیے تھا۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام تو 1908ء میں فوت ہو چکے تھے۔ یہ کس طرح ممکن ہے کہ ایک شخص اپنی وفات کے بعد بھی ایک منصوبے کے تحت اپنے عقائد تبدیل کر رہا ہو۔ اس کے بعد انہوں نے 5/ ستمبر 1974ء کی تقریر کو ختم کرتے ہوئے یہ نکتہ اُٹھایا کہ اگر بانیِ سلسلہ احمدیہ نبی تھے تو احمدی یہ کیوں نہیں تسلیم کرتے کہ ان کے بعد بھی نبی آ سکتا ہے۔ یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ وہ جماعت کا موقف نا مکمل طور پر پیش کر رہے تھے۔ حضور نے یہ فرمایا تھا کہ آنحضرت ﷺ کے بعد وہ نبی آ سکتا ہے جس کی آنحضرت ﷺ نے خبر دی ہو۔ اس طرح 5/ ستمبر 1974ء کی تقریر ختم ہوئی۔

جب اٹارنی جنرل صاحب نے 6/ ستمبر کو اپنی تقریر شروع کی تو ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ کوئی ممبر تو اس بات کی نشاندہی کرتا کہ کل آپ نے بہت سے تاریخی حقائق کو خلط ملط کیا ہے، اس بات کی درستگی ہونی چاہیئے۔ وہاں پر کئی جماعت کے مخالف ممبران ایسے بھی بیٹھے تھے جن کو دعویٰ تھا کہ وہ جماعتِ احمدیہ کے لٹریچر سے بخوبی وقف ہیں۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ ایسا کیوں نہیں ہوا؟ اس کی دو ہی وجوہات ہو سکتی ہیں:۔

1)۔ وہاں پر بیٹھے ہوئے سب احباب جماعتی لٹریچر سے مکمل طور پر نا واقف تھے۔ وہ یہ صلاحیت بھی نہیں رکھتے تھے کہ ان کتب کے اوپر موٹے حروف میں لکھے ہوئے سن اشاعت کو پڑھ سکیں۔

2)۔ ان احباب کو اس بات کی کوئی پرواہ نہیں تھی کہ انصاف اور عقل کے تقاضے پورے ہوتے ہیں کہ نہیں۔ وہ ہر قیمت پر جماعتِ احمدیہ کے خلاف نیش زنی کرنا چاہتے تھے خواہ اس کے لئے سفید جھوٹ ہی کیوں نہ بولنا پڑے۔

اب یحییٰ بختیار صاحب نے یہ لایعنی دعویٰ پیش کیا کہ حضرت مسیح موعود علیہ اسلام نے آخر میں نعوذُ باللہ آنحضرت ﷺ کے ساتھ برابری اور پھر اپنی فضیلت کا دعویٰ کیا تھا۔ اس سے زیادہ لایعنی دعویٰ کوئی نہیں ہو سکتا اور وہ یقیناً حقیقت جانتے تھے کیونکہ محضرنامہ میں آنحضرت ﷺ کی فضیلت کے بارے میں حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی تحریرات پر مشتمل پورا باب شامل کیا گیا تھا۔ اس باب کا نام تھا "شان خاتم الانبیاء ﷺ بانی سلسلہ احمدیہ کی نگاہ میں"۔ یہ باب محضرنامہ کے صفحہ 71 سے صفحہ 90 پر موجود ہے۔ ہر کوئی پڑھ سکتا ہے۔ ان حوالوں میں صاف لکھا ہے آنحضرت ﷺ تمام انبیاء سے بڑھ کر اور تمام انبیاء سے افضل ہیں۔ دنیا میں معصومِ کامل صرف آنحضرت ﷺ پیدا ہوئے ہیں۔ آنحضرت ﷺ کی عالی مقام کا انتہا معلوم نہیں ہو سکتا اور ان کی تاثیر قدسی کا اندازہ کرنا انسان کا کام نہیں۔ اب آسمان کے نیچے صرف ایک ہی نبی اور ایک ہی رسول ہے یعنی محمد مصطفےٰ ﷺ جو اعلیٰ اور افضل سب نبیوں سے اور اعلیٰ اور اکمل سب رسولوں سے ہے۔ تمام کمالاتِ نبوت آپ ﷺ پر ختم ہو گئے۔ وہ شخص جھوٹا اور مفتری ہے جو آپ کی نبوت سے الگ ہو کر کوئی صداقت پیش کرتا ہے۔ اب بجز محمدی نبوت کے سب نبوتیں بند ہیں۔ ان سب حوالوں کو پڑھ کر کوئی شخص خواہ کتنا ہی

کند ذہن کیوں نہ ہو یہ الزام کیسے لگا سکتا ہے کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے نعوذُ باللہ آپ پر فضیلت کا دعویٰ کیا تھا۔

اس الزام کو لگانے کے لئے انہوں نے یہ طریق کار اختیار کیا کہ پہلے اپنی طرف سے روحانی خزائن جلد 22 کے صفحہ 154 سے ایک عبارت پیش کی لیکن اس صفحہ پر یہ معین عبارت موجود نہیں ہے۔ پھر حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے کا ایک فارسی شعر پڑھ کر اس کا غلط ترجمہ پیش کیا۔ وہ شعر یہ تھا:۔

انبیاء گرچہ بودہ اند بسے
من بعرفان نہ کمترم زِ کسے

اس کا ترجمہ اٹارنی جنرل صاحب نے انگریزی میں پیش کیا

"I am better and superior to all the prophets who have come"

"یعنی میں تمام انبیاء سے بہتر اور افضل ہوں"

یہ ایک شرمناک حرکت تھی۔ وہ بخوبی جانتے تھے کہ ممبران کی بھاری اکثریت فارسی کی معمولی شد بد بھی نہیں رکھتی۔ یحییٰ بختیار صاحب غلط ترجمہ پیش کر کے اپنے مردہ دلائل میں جان ڈالنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس شعر کا ترجمہ یہ ہے

"اگرچہ انبیاء بہت سے ہوئے ہیں مگر میں معرفت الٰہی میں کسی سے کم نہیں ہوں"

اور یہاں پر نعوذُ باللہ آنحضرت ﷺ پر کسی فضیلت کا کوئی سوال ہی نہیں اُٹھ سکتا کیونکہ اگلے شعر میں آنحضرت ﷺ کے متعلق فرمایا ہے:۔

شدہ رنگین بر رنگِ یار حسین

یعنی میں اس حسین محبوب کے رنگ میں رنگین ہوں

کہاں پر فضیلت کا دعویٰ ہے؟ ان اشعار میں تو یہ کہا گیا ہے کہ حضرت محمد مصطفےٰ ﷺ میرے محبوب ہیں اور ان کے رنگ میں رنگین ہونے سے ہی مجھے قربِ الٰہی کا یہ مقام ملا ہے۔ جھوٹ بولنے کی بھی کوئی حد ہونی چاہیئے۔

اب اٹارنی جنرل صاحب نے یہ ثابت کرنے کی کوشش شروع کی کہ آخر میں حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے صاحبِ شریعت نبی ہونے کا دعویٰ کیا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ بالکل خلافِ واقعہ بات تھی۔ ہم پہلے ہی اس کتاب میں کئی حوالے درج کر چکے ہیں کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کا دعویٰ آنحضرت ﷺ کے تابع نبی ہونے کا تھا اور سوال و جواب کے دوران حضور اس بات کی اچھی طرح وضاحت فرما چکے تھے کہ قرآن کریم کے سوا ہمارے لئے کوئی اور شرعی کتاب نہیں۔ اگر اعتراض کرنے والے ذرا بھی عقل سے کام لیتے تو کم از کم اتنا تو سوچتے کہ اگر احمدیوں کی کوئی علیحدہ شریعت ہے تو ان کی وہ شرعی کتاب کون سی ہے؟ قرآن کریم کو چھوڑ کر احمدی مسلمان آخر کس شرعی کتاب کے پیروکار ہیں۔ اس اعتراض کو سو سال سے زیادہ عرصہ گزر گیا مگر اس فرضی کتاب کا ابھی تک نام بھی معلوم نہیں ہو سکا۔ یہ بات ثابت کرنے کے لئے اٹارنی جنرل صاحب نے یہ طریق کار اختیار کیا کہ نا مکمل حوالہ پڑھ کر مطلوبہ تاثر پیدا کرنے کی کوشش کی جائے۔ انہوں نے روحانی خزائن جلد 17 صفحہ 435و436۔ سے یہ عبارت پڑھنی شروع کی

"ما سوا اس کے یہ بھی تو سمجھو کہ شریعت کیا چیز ہے۔ جس نے اپنی وحی کے ذریعہ چند امر اور نہی بیان کیے اور اپنی امت کے لیے ایک قانون مقرر کیا وہی صاحب الشریعت ہو گیا۔ پس اس تعریف کی رو سے بھی ہمارے مخالف ملزم ہیں کیونکہ میری وحی میں امر بھی ہے اور نہی بھی۔"

یہ عبارت پڑھ کر اٹارنی جنرل صاحب یہ تاثر دینے کی کوشش کر رہے تھے کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے نئی شریعت کا دعویٰ کیا تھا۔ یہاں بالکل اور بحث چل رہی تھی اور وہ بحث یہ تھی کہ بعض لوگوں نے یہ اعتراض کیا تھا قرآنِ کریم میں جو یہ مذکور ہے کہ مفتری ہلاک ہوتا ہے وہ صاحبِ شریعت ملہمین کے لئے۔ حالانکہ قرآن کریم میں ہر اس شخص کا ذکر ہے جو اللہ پر افتراء کرے اور اس عبارت کے آگے یہ ہے کہ شریعت سے مراد صرف نئے احکامات نہیں ہیں۔ پھر اسی صفحہ پر حضرت مسیح موعود تحریر فرماتے ہیں:۔

"ہمارا ایمان ہے آنحضرت ﷺ خاتم الانبیاء ہیں اور قرآن ربّانی کتابوں کا خاتم ہے تاہم خدا تعالیٰ نے اپنے نفس پر یہ حرام نہیں کیا کہ تجدید کے طور پر کسی اور مامور کے ذریعہ سے یہ احکام صادر کرے کہ جھوٹ

نہ بولو۔ جھوٹی گواہی نہ دو۔ زنا نہ کرو۔ خون نہ کرو اور ظاہر ہے کہ ایسا بیان کرنا بیانِ شریعت ہے جو مسیح موعود کا بھی کام ہے۔"

(روحانی خزائن جلد17ص436)

اس عبارت سے صاف ظاہر ہے کہ یہاں پر قرآنی احکام کے بیان اور تجدیدِ دین کا ذکر ہے ، نئی شریعت لانے کا ذکر نہیں ہے۔

اس کے بعد انہوں نے یہ خلاف واقعہ دعویٰ کیا کہ چودہ سو سال سے تمام مسلمان خاتم النبیین کے معنی یہ کرتے آئے ہیں کہ آپ کے بعد کوئی نبی نہیں آ سکتا۔ یہ بالکل غلط دعویٰ تھا۔ ہم پہلے ہی بہت سے حوالے درج کر چکے ہیں اور اس قسم کے حوالے جماعتِ احمدیہ کے محضرنامہ میں بھی شامل تھے اور سپیشل کمیٹی میں بھی پڑھ کر سنائے گئے تھے کہ چودہ سو سال سے امت کے بہت سے اولیاء اس بات کے قائل رہے تھے کہ آنحضرت ﷺ کے بعد امتی نبی آ سکتا ہے۔

اس مرحلہ پر انہوں نے جو نظریات پیش کئے کہ وہ خوارج کے بعض گروہوں کے عقائد سے کافی ملتے تھے۔ انہوں نے علامہ اقبال کے کچھ حوالے پیش کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ ختمِ نبوت کی اصل فلاسفی یہ ہے کہ اب مسلمان اپنی سوچ میں آزاد ہیں۔ وہ قرآنِ کریم کی آیات سے خود استدلال کر سکتے ہیں اور آنحضرت ﷺ کے بعد کسی اور کی پیروی ان کے لئے ضروری نہیں۔ روحانیت میں ترقی کے لئے اب کسی اور کی پیروی کی ضرورت نہیں۔ وہ یہ دور کی کوڑی لا رہے تھے کہ اس طرح یہ سوچ کی آزادی کی ضمانت ہے۔ وہ خوامخواہ اپنی سوچ کو تمام مسلمانوں کی طرف منسوب کر رہے تھے۔ اُس اسمبلی میں بھی ایسے فرقوں سے وابستہ افراد کی بڑی تعداد بیٹھی ہوئی تھی جو کہ کسی نہ کسی امام کے مقلد تھے۔ جیسا کہ ہم پہلے حوالہ درج کر چکے ہیں کہ یہاں تک فتویٰ دیا گیا تھا کہ جو حضرت امام ابو حنیفہ کے قیاس کو نہ مانے وہ کافر ہے۔ سب سے بڑھ کر اگر آنحضرت ﷺ کے بعد کسی کی بھی تقلید ضروری نہیں تو آنحضرت ﷺ نے یہ کیوں ارشاد فرمایا تھا:۔

"فَعَلَيْكُمْ بِسُنَّتِيْ وَ سُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِيْنَ الْمَهْدِيِّيْنَ۔ عَضُّوْ عَلَيْهَا بِالنَّوَاجِذِ"

(سنن ابن ِماجہ۔ باب اتباع سنة الخلفاء الراشدين المهديين)

اس حدیث میں تو آنحضرت ﷺ نے واضح ارشاد فرمایا ہے کہ تم پر میری اور میرے خلفاءِ راشدین کی پیروی لازم ہے۔ اس کو مضبوطی سے پکڑے رکھو اور اٹارنی جنرل صاحب یہ کہہ رہے تھے ختمِ نبوت کا مطلب یہ ہے کہ اب کسی کی پیروی ضروری نہیں۔ اب ہر مسلمان آزاد ہے کہ وہ آیاتِ قرآنی سے جو مناسب سمجھے استدلال کرے۔ اگر اب ہدایت کے لئے کسی مقدس وجود کی کوئی ضرورت نہیں تھی تو آنحضرت ﷺ نے گمراہی کے دور کا ذکر کے کیوں فرمایا تھا:۔

”فَاِنْ رَأَ يْتَ يَوْمَئِذٍ خَلِيْفَةَ اللهِ فِي الْاَرْضِ فَالْزَمْهُ وَاِنْ نُهِكَ جِسْمُكَ۔“

(مسند احمد بن حنبل۔ حدیث حذیفہ بن الیمان۔ الجزء السادس۔ ص559۔ مطبوعہ بیروت لبنان)

”اگر تم اس دن زمین پر اللہ کے کسی خلیفہ کو پاؤ تو اس سے چمٹ جانا خواہ تمہارا جسم زخمی کر دیا جائے...“

معلوم ہوتا ہے کہ اب اٹارنی جنرل صاحب کے اعتماد میں اضافہ ہو رہا تھا۔ اب ان کی غلط بیانیوں پر انہیں کوئی نہیں روک رہا تھا۔ گیارہ روز جماعت کے وفد کی موجودگی میں انہیں جس روک ٹوک کا سامنا تھا اب وہ روک ٹوک موجود نہیں تھی کیونکہ جماعت کا وفد یہاں پر موجود نہیں تھا۔ ممبرانِ اسمبلی بت بن کر بیٹھے تھے۔ اس مرحلہ پر انہیں شاید یاد آگیا کہ جماعت کے وفد کی طرف سے بہت سے حوالے پیش کئے گئے تھے کہ ایک فرقے کے علماء نے دوسرے فرقے سے وابستہ افراد پر کفر کے فتوے لگائے ہیں۔ شاید وہ اس کا کچھ ازالہ کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ انہوں نے علامہ اقبال کا حوالہ پڑھ کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ ایک دوسرے پر کفر و ارتداد کے فتوے لگانے سے مذہبی معاملات میں عقل اور ذہانت میں خوب اضافہ ہوتا ہے اور سابقہ ادوار میں بھی عالمِ اسلام میں ذہنی ترقی کے لئے یہی نسخہ استعمال کیا گیا تھا۔ انہوں نے علامہ اقبال کی تحریرات میں سے یہ عبارت پڑھ کر سنائی

The history of Muslim theology shows that mutual accusation of heresy on minor points of differences has far from from working as a disruptive force, actually gave impetus to synthetic theological thought......

یعنی اسلامی مذہبی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر ایک دوسرے پر ارتداد کا الزام لگا دینے سے نہ صرف اتحاد میں کوئی رخنہ نہیں پڑا بلکہ اس سے تعمیری مذہبی سوچ کو ایک نئی تر و تازگی ملی ہے۔

اللہ ہی رحم کرے۔ اس وقت اٹارنی جنرل صاحب اور ان کے قابل ساتھی کیا منصوبہ بنائے بیٹھے تھے کہ ایک دوسرے پر ارتداد ، کفر اور الحاد کے فتوے لگا کر پاکستان میں ذہنی ترقی کے نئے دور کا آغاز کیا جائے گا۔ اگر یہی کلیہ صحیح تھا تو اس وقت پاکستانی قوم کو ذہنی طور پر سب سے زیادہ ترقی یافتہ قوم ہونا چاہئیے تھا۔ اس کے بعد انہوں نے یہ وضاحت پیش کرنے کی کوشش کی کہ یہ heresy اصل میں heresy below heresy ہوتی ہے۔ اس سے مراد ex.communication نہیں ہوتی۔ ویسے یہی بات کچھ روز پہلے حضور نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ ان کفر کے فتاویٰ کا صرف یہی مطلب لینا چاہئیے کہ فتویٰ لگانے والے کے نزدیک جن پر فتویٰ لگایا جا رہا ہے، ان کے اعمال اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں اور اس سے مراد یہ نہیں لینا چاہئیے کہ جس پر فتویٰ لگایا گیا ہے وہ ملتِ اسلامیہ کا فرد نہیں رہا۔

اب انہوں نے Ahmadiyyat or True Islam کے حوالے دے کر ثابت کرنے کی کوشش کی کہ حضرت مسیح موعودؑ کا دعویٰ صاحب شریعت نبی ہونے کا دعویٰ تھا۔ ہم اسی کتاب کے چند جملے پیش کرتے ہیں، جن سے روزِ روشن کی طرح یہ ثابت ہوجاتا ہے کہ اٹارنی جنرل صاحب محض لایعنی دعوے کر رہے تھے

Ahmadiyya Movement believes firmly in the Holy Quran and is a Movement of Muslims.

(Ahmadiyyat Or The Real Islam, By Hazrat Mirza Bashiruddin Mahmood Ahmad, 1959, published by Ahmadiyya Muslim Foreign Missions p 21)

پھر حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی آمد کے مقصد کے بارے میں لکھا ہے

The Messiah of Islamic dispensation should not only be from among his followers but should come to re-establish Quranic Law.

Ahmadiyya Movement believes firmly in the Holy Quran and is a Movement of Muslims.

(Ahmadiyyat Or The Real Islam, By Hazrat Mirza Bashiruddin Mahmood Ahmad, 1959, published by Ahmadiyya Muslim Foreign Missions p 18)

اسی کتاب کے ان دو حوالوں ہی سے ثابت ہو جاتا ہے کہ احمدیوں کے نزدیک قرآنِ کریم کے علاوہ کوئی شریعت نہیں اور حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی آمد کا مقصد ہی یہ تھا کہ وہ قرآنی احکامات کی ترویج کریں نہ کہ نعوذُ باللہ اپنی نئی شریعت پیش کریں۔

اس تقریر کے دوران یحیٰ بختیار صاحب نے یہ نکتہ بھی اُٹھایا کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر فضیلت کا دعویٰ کیا۔ یہاں دیکھنا چاہیئے کہ باقی فرقوں کے نزدیک جس امام مہدی کا ابھی ظہور ہونا ہے اس کا کیا مقام ہوگا؟ ہم صرف ایک مثال پیش کرتے ہیں۔ شیعہ احباب کے نزدیک جن امام محمد مہدی نے ابھی غیوبت سے ظہور فرمانا ہے ان کا مقام یہ ہے:۔

”آپ انبیاء سے بہتر ہیں۔“

(معاف الساغین ص 128 بحوالہ ”چودہ ستارے یعنی حضرات چہار دہ معصومین علیہم السلام کے حالاتِ زندگی مولفہ سید نجم الحسن ناظمِ اعلیٰ پاکستان شیعہ مجلس علماء و خطیب ص452)

(نور الابصار و بہامشہ کتاب اسعاف الراغبین فی سیرۃ المصطفیٰ و فضائل اھل بیتہ الطاھرین۔ ص 138۔ تألیف علاۃ زمانہ الاستاذ الشیخ محمد الصبان علیہ الرحمۃ والرضوان۔ ناشر مکتبۃ دار احیاء الکتب العربیۃ مصر۔ عیسیٰ البابی الحربی مصر1345ھ)

اس کے بعد اسی کتاب یعنی چودہ ستارے میں لکھا ہے کہ آپ کے ظہور کے بعد آپ پر جبرائیل اور میکائیل نازل ہوں گے اور نوید سنائیں گے اور آپ کی بیعت کریں گے۔ پھر اس کتاب کے صفحہ 465 پر لکھا ہے:۔

”... ایک لاکھ تئیس ہزار نو سو ننانوے انبیاء کے بعد چونکہ حضور رسولِ کریم ﷺ تشریف لائے تھے لہٰذا ان کے جملہ صفات و کمالات و معجزات حضرت محمد مصطفٰے صلعم میں جمع کر دیئے گئے تھے ... چونکہ آپ کو بھی اس دنیاءِ فانی سے ظاہری طور پر جانا تھا اس لئے آپ نے اپنی زندگی ہی میں حضرت علیؓ کو ہر قسم کے

کمالات سے بھرپور کر دیا تھا یعنی حضرت علی اپنے ذاتی کمالات کے علاوہ نبوی کمالات سے بھی ممتاز ہو گئے تھے۔ سرور کائنات کے بعد کائناتِ عالم میں صرف ایک علی کی ہستی تھی جو کمالاتِ انبیاء کی حامل تھی۔ آپ کے بعد سے یہ کمالات اوصیاء میں منتقل ہوتے ہوتے امام مہدی تک پہنچے۔"

اس عبارت سے صاف ظاہر ہے کہ ان احباب کے نزدیک نہ صرف حضرت علی بلکہ دیگر ائمہ اطہار میں تمام انبیاء کے کمالات جمع ہو گئے تھے۔ اس صورت میں یہی نتیجہ نکل سکتا ہے کہ ان کے نزدیک یہ ائمہ انبیاء سے افضل تھے۔ اس کے بعد اس پہلو سے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی تحریروں پر اعتراض بے معنی ہے۔

اس مرحلہ پر اٹارنی جنرل ٹھوس حقائق پیش کرنے کی بجائے شعر و شاعری کا سہارا لے کر اپنی تقریر کو آگے بڑھانے کی کوشش کر رہے تھے۔ انہوں نے اس وقت ہندوستان میں قائم برطانوی حکومت کی تعریف میں اور حکومتِ وقت کی وفاداری کے بارے میں حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے کچھ حوالے پڑھ کر یہ شعر پڑھا

بتوں سے تجھ کو امیدیں خدا سے نومیدی
مجھے بتا تو سہی اور کافری کیا ہے

اگر کفر کا یہی معیار ہے تو اس سے بہت زیادہ تعریف اپنی درخواستوں ، اپنی تقریروں، اپنے شعروں اور اپنی معروضات میں سر سید نے بھی کی ہے ، علاّمہ اقبال نے بھی کی ہے ، قائد اعظم نے بھی کی ہے بلکہ مسلمانوں کی نمائندہ تنظیم مسلم لیگ نے بھی مجموعی طور پر کی ہے۔ ہندوستان کے علماء نے جن میں احمد رضا خان صاحب، نواب صدیق حسن خان صاحب ، علامہ حائری صاحب ، مولوی محمد حسین صاحب بٹالوی اور علماءِ دیو بند بھی شامل ہیں اس سے بہت زیادہ تعریف کی ہے اور ہندوستان کے ان لاکھوں مسلمانوں کے متعلق کیا خیال ہے جنہوں انگریزوں کی فوج میں شامل ہو کر اپنی جانیں دیں ، ان کی خاطر دور دراز کا سفر کر کے جنگیں لڑیں اور مسلمانوں پر بھی گولیاں چلائیں۔ ہم پہلے بھی اس کے کئی حوالے درج کر چکے ہیں دہرانے کی ضرورت نہیں۔ اگر کوئی اپنی تاریخ سے واقف نہ ہو تو اس کا مواد اتنا ہے کہ کئی کتابوں میں بھی نہیں سما سکتا۔

اٹارنی جنرل صاحب نے ماحول کو جذباتی بنانے کے لئے کہا کہ جب بھی مسلمان ناخوش ہوتے تھے اس وقت قادیانی خوش ہوتے تھے اور اس کی مثال پیش کرتے ہوئے کہا کہ جب پہلی جنگِ عظیم کے موقع

پر اتحادیوں کی فتوحات پر مسلمان نا خوش تھے اس وقت قادیان میں چراغاں ہوا تھا۔ اس کا جواب بغداد کی فتح کے حوالے سے ہم دے چکے ہیں۔ اب ہم کچھ جھلکیاں پیش کرتے ہیں کہ جب پہلی جنگِ عظیم کے آخری حصہ میں اور اس کے اختتام پر مسلم لیگ کے پلیٹ فارم پر کس قسم کے جذبات کا اظہار کیا جا رہا تھا۔ جب پہلی جنگِ عظیم ختم ہو رہی تھی تو اس وقت آل انڈیا مسلم لیگ کا اجلاس ہوا اور اس کے خطبہ صدارت میں راجہ صاحب محمود آباد نے کہا کہ انگلستان نے چھوٹی قوموں کے تحفظ کے لئے جنگ میں حصہ لیا تھا اور ہندوستان کے ذہن نے فوراً بھانپ لیا تھا کہ انگلستان حق پر ہے۔

(The works of Quaid e Azam Muhammad Ali Jinnah, compiled by Dr. Riaz Ahmad Vol.4 p 484)

اور اس موقع پر مسلم لیگ نے جو پہلی قرار داد منظور کی اس کے الفاظ یہ تھے:۔

The All India Muslim League tenders its most loyal homage to His Majesty The King Emperor and assures the Government of steadfast and continued loyalty of the Muslim community of India throughout the present crisis

(The Works of Quad e Azam Muhhamad Ali Jinnah, compiled by Dr. Riaz Ahmad Vol.4 p 502)

یعنی آل انڈیا مسلم لیگ اپنا انتہائی وفادارنہ خراجِ تحسین بادشاہ کو پیش کرتی ہے اور یہ یقین دلاتی ہے کہ اس خطرے کے وقت مسلمان پہلے کی طرح وفادار رہیں گے۔

معلوم نہیں اٹارنی جنرل صاحب نے کس کتاب میں پڑھ لیا تھا کہ اس وقت مسلمان برطانیہ کی فتح پر اداس ہو رہے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلم لیگ کے پلیٹ فارم پر تو ہر طرح اپنی وفاداری کا یقین دلایا جا رہا تھا اور برطانیہ کو خراجِ تحسین پیش کیا جا رہا تھا اور ان کو حق پر قرار دیا جا رہا تھا۔

ستم ظریفی دیکھئے کہ اپنی تقریر کے آخری حصہ میں اٹارنی جنرل صاحب نے قائدِ اعظم کی اس تقریر کا ذکر بھی کیا جو کہ قائدِ اعظم نے 11 / اگست 1947ء کو کی تھی۔ اٹارنی جنرل صاحب اس کا ایک اہم حصہ بھول گئے تھے اور وہ یہ تھا:۔

You may belong to any religion or caste or creed that has got nothing to do with the business of the state .

یعنی آپ کا جو بھی مذہب ہو یا ذات ہو یا مسلک ہو اس کا ریاست کے کام سے کوئی تعلق نہیں۔

قائدِ اعظم نے تو یہ کہا تھا کہ آپ کا مذہب کیا ہے سٹیٹ کا اس سے کوئی تعلق نہیں اور اس وقت پاکستان کی قومی اسمبلی یہ فیصلہ کررہی تھی کہ کس کو مسلمان کہلانے کا حق ہے اور کس کو نہیں ہے۔ ممبران نے اس تقریر پر خوشی کا ظہار کیا اور اٹارنی جنرل صاحب کو داد دی اور اس طرح یہ اجلاس ختم ہوا۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ اس بحث کو سمیٹتے ہوئے اٹارنی جنرل صاحب نے اس بنیادی نکتے کا کوئی ذکر نہیں کیا جو کہ جماعت احمدیہ کے محضر نامہ میں اٹھایا گیا تھا یعنی کیا پاکستان کی قومی اسمبلی یا دنیا کی کوئی بھی سیاسی اسمبلی اس بات کی مجاز ہوسکتی ہے کہ وہ یہ فیصلہ کرے کہ کسی شخص کے مذہب کا کیا نام ہونا چاہیے؟ کیا پاکستان کا آئین قومی اسمبلی کو یہ اختیار دیتا ہے ؟ کیا مسلّمہ مذہبی اقدار کسی اسمبلی کو اس بات کی اجازت دیتی ہیں؟ کیا عقل اس بات کو قبول کرتی ہے؟

نہ صرف اٹارنی جنرل صاحب بلکہ تمام ممبران اسمبلی ان بنیادی سوالات سے گریزاں رہے۔ ان کی مثال اس شتر مرغ کی طرح تھی جو ریت میں سر دے کر سمجھتا ہے کہ طوفان ٹل گیا ہے۔

قومی اسمبلی کا فیصلہ

اسمبلی میں کارروائی شروع ہونے سے قبل یہ تو واضح نظر آ رہا تھا کہ حکومت اپنے سیاسی مقاصد حاصل کرنے کے لیے جماعتِ احمدیہ کو آئین میں غیر مسلم قرار دینے کا پکا ارادہ کر چکی ہے۔ پیپلز پارٹی کے قائد ،وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو صاحب اور ان کی پارٹی غیر مذہبی رجحانات کے لیے شہرت رکھتی تھی اوران کے سیاسی مخالفین اس بات کو ان کے خلاف پروپیگنڈا کے لیے استعمال کرتے تھے۔ اور اب بھٹو صاحب یہ سمجھتے تھے کہ احمدیوں کے خلاف فیصلہ کر کے وہ مذہبی حلقوں میں بھی مقبولیت حاصل کر لیں گے اور ان کے مخالفین کے ہاتھ میں ان کے خلاف استعمال کرنے کے لیے یہ ہتھیار نہیں رہے گا اور اس طرح ان کی پوزیشن بہت مستحکم ہو جائے گی۔ اپوزیشن میں بہت سی نام نہاد مذہبی جماعتیں موجود تھیں وہ تو ایک عرصہ سے اس بات کے لیے تگ و دو کر رہی تھیں کہ کسی طرح احمدیوں کو نقصان پہنچایا جائے اور آئین میں ایسی ترامیم کی جائیں جن کے نتیجے میں احمدیوں کے بنیادی حقوق بھی محفوظ نہ رہیں۔ قومی اسمبلی میں موجود تمام گروہ یہ سمجھتے تھے کہ وہ جماعتِ احمدیہ کو غیر مسلم قرار دے کر اپنے سیاسی قد کاٹھ میں اضافہ کر سکتے ہیں۔

20/ اگست کو جسٹس صمدانی نے ربوہ کے سٹیشن پر ہونے والے واقعہ پر اپنی تحقیقات وزیر اعلیٰ پنجاب کے سپرد کیں اور وزیرِ اعلیٰ نے اعلان کیا کہ اب صوبائی حکومت اس پر غور کر کے اسے وفاقی حکومت کی طرف بھجوائے گی تاکہ اسے قومی اسمبلی کی اس خاص کمیٹی میں پیش کیا جا سکے جو کہ قادیانی مسئلہ پر غور کر رہی ہے (1)۔

اس رپورٹ سے کوئی اتفاق کرتا یا اختلاف کرتا یہ الگ بات ہوتی لیکن اس رپورٹ کو بھی اس سارے تنازعہ کی دوسری باتوں کی طرح خفیہ رکھا گیا۔ جسٹس صمدانی صاحب نے عرصہ بعد جب اپنی یادداشتیں لکھیں تو اس کتاب میں اس رپورٹ کے حوالے سے لکھا:۔

”اس انکوائری سے متعلق مجھے دو باتیں اور بھی لکھنی ہیں تا کہ عوام میں جو غلط فہمیاں ہیں وہ دور ہو جائیں۔ پہلی بات تو یہ کہ انکوائری اس لیے کرائی گئی کہ عوام میں جو شدید ردِ عمل تھا وہ دور ہو۔ لیکن جب انکوائری مکمل ہو گئی اور حکومتِ پنجاب کو رپورٹ دے دی گئی تو وہ رپورٹ عوام کے لیے شائع نہیں کی گئی۔ کیوں ؟ کیا عوام کو انکوائری کا نتیجہ جاننے کا حق نہیں ہے جبکہ انکوائری کروائی ہی عوام کی تسلی کے لیے تھی۔ رپورٹ کے شائع نہ ہونے کی وجہ سے عوام میں جو سب سے بڑی غلط فہمی ہے (اور یہ میری دوسری بات ہے) وہ یہ ہے کہ میں نے احمدیوں کو کافر قرار دیا ہے جبکہ جن سوالوں پر مجھ سے انکوائری کرائی گئی تھی ان میں یہ سوال شامل ہی نہیں تھا۔ سو میں نے اپنی رپورٹ میں یہ نہیں لکھا کہ احمدی کافر ہیں یا نہیں۔“(2)

24/ اگست کو وفاقی وزیر برائے مذہبی امور کوثر نیازی صاحب نے بیان دیا کہ قادیانی مسئلہ کے بارے میں قومی اسمبلی جو فیصلہ کرے گی اس کے حل سے ملک کا وقار مزید بلند ہو گا اور اس فیصلہ میں ختمِ نبوت کو جو اسلام کی اساس ہے مکمل آئینی تحفظ حاصل ہو جائے گا(3)۔

ہم اس بات کا تفصیلی جائزہ لے چکے ہیں کہ اسمبلی کی کارروائی کے دوران ممبرانِ اسمبلی اصل موضوع پر سوالات کرنے کی ہمت بھی نہ کر سکے تھے اور اتنے روز محض اِدھر اُدھر کے سوالات کی تکرار میں وقت ضائع کیا گیا تھا۔ لیکن جماعت کے مخالف علماء اس بات پر بہت اطمینان کا اظہار کر رہے تھے کہ وہ قومی اسمبلی میں ہونے والی کارروائی سے مطمئن ہیں۔ چنانچہ 26/ اگست کو جمعیت العلماء اسلام کے قائد مولوی مفتی محمود صاحب نے یہ بیان دیا کہ وہ اسمبلی میں ہونے والی کارروائی سے مطمئن ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان مولوی حضرات کی مرضی بھی یہ تھی کہ اصل موضوع پر سوالات کی نوبت نہ آئے۔ اسی روز پیپلزپارٹی کے وفاقی وزیر کوثر نیازی صاحب نے بیان دیا کہ پاکستان میں اسلامی نظام کے سوا کوئی دوسرا نظام نافذ نہیں کیا جا سکتا۔ اور یہ دعویٰ کیا کہ موجودہ حکومت نے سب سے زیادہ اسلام کی خدمت کی ہے (4)۔ جماعت کے وفد پر سوالات ختم ہونے کے بعد کچھ دن کے لیے جماعتِ احمدیہ غیر مبایعین کے وفد پر سوالات ہوئے۔ اور 30/ اگست کو قومی اسمبلی پر مشتمل سپیشل کمیٹی نے پھر اجلاس کر کے اس مسئلہ پر غور کیا یا کم از کم ظاہر کیا کہ

اس پر غور کیا جا رہا ہے کیونکہ فیصلہ تو اس کارروائی کے آغاز سے قبل ہی ہو چکا تھا(5)۔ جماعت کے مخالف مولوی حضرات جلسہ کر کے یہ اعلان کر رہے تھے کہ یہ آخری موقع ہے کہ مرزائیت کے فتنہ کو حل کر دیا جائے۔ چنانچہ 2/ستمبر کو لاہور میں ایک جلسہ منعقد کیا گیا۔ اس میں مودودی صاحب نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ مرزائیت کے فتنے کو ختم کرنے کا یہ آخری موقع ہے۔ اگر ہم نے اسے کھو دیا تو ممکن ہے کہ یہ فتنہ ہمیں لے ڈوبے۔ نورانی صاحب نے کہا کہ اگر یہ فیصلہ ہماری مرضی کے مطابق نہ ہوا تو مسلمان اسے قبول نہیں کریں گے۔ عبدالستار نیازی صاحب جو کہ 1953ء کے فسادات میں داڑھی منڈوا کر بھاگے تھے نے اس جلسہ میں کہا کہ اگر یہ مسئلہ مسلمانوں کے عقائد کے مطابق حل نہ کیا گیا تو مسلمان اسے خود حل کر لیں گے۔ مودودی صاحب ابھی سے احمدیوں کے بارے میں نئے مطالبات کر رہے تھے۔ ان میں سے ایک مطالبہ یہ تھا کہ احمدی افراد کو کلیدی اسامیوں سے علیحدہ کیا جائے۔ پاسپورٹ میں ان کے مذہب کا علیحدہ اندراج کیا جائے۔ ووٹر لسٹ میں ان کا اندراج علیحدہ کیا جائے۔ شناختی کارڈوں میں بھی احمدیوں کے متعلق علیحدہ اندراج کیا جائے۔ ربوہ کی زمین جن شرائط پر دی گئی تھی ان کو تبدیل کیا جائے۔ ان سے یہ صاف ظاہر ہوتا تھا کہ احمدیوں کو آئین میں غیر مسلم قرار دے کر بھی ان انتہاء پسند مولویوں کی تسلی نہیں ہو گی بلکہ احمدیوں کو تمام بنیادی حقوق سے محروم کرنے کی کوششیں کی جائیں گی۔ اور اس کی بنیاد پر اپنی سیاسی دوکان چمکائی جائے گی(6،7)۔ ایک طرف تو قومی اسمبلی کے اراکین اور سپیکر صاحب اس بات کو بار بار یقینی بنانے کے لیے تاکید کر رہے تھے کہ اس کارروائی کو خفیہ رکھا جائے اور اسمبلی کے باہر اس بات کا تذکرہ تک نہ ہو کہ اندر کیا کارروائی ہوئی تھی اور دوسری طرف اسمبلی کے بعض مولوی حضرات اپنی کارکردگی پر جھوٹی تعلیاں کر رہے تھے۔ چنانچہ ان ہی دنوں میں نورانی صاحب نے سرگودھا میں خطاب کرتے ہوئے کہا کہ مرزا ناصر احمد ہمارے سوالات سے اس قدر بوکھلا اُٹھے کہ وہ یہ کہتے سنے گئے کہ میں تنگ آ چکا ہوں۔ سوالات کا یہ سلسلہ کب ختم ہو گا۔ ان کی یہ ڈینگ کس قدر دور از حقیقت ہے اس کا اندازہ کارروائی کے اس خلاصہ سے ہی ہو جاتا ہے جو ہم نے درج کیا ہے۔ یہ سب مولوی حضرات اس قسم کی ڈینگیں تو مارتے رہے لیکن کسی کو یہ توفیق نہ ہوئی کہ یہ مطالبہ کرے کہ کارروائی کو شائع کیا جائے تاکہ دنیا بھی دیکھے کہ انہوں نے کیسی فتح پائی

تھی۔ یہ مطالبہ ہمیشہ جماعتِ احمدیہ کی طرف سے ہی کیا گیا ہے۔ اسی جلسہ میں نورانی صاحب نے ایک طرف تو یہ کہا کہ قادیانیوں کو اقلیت قرار دے کر ان کے جان و مال کی حفاظت کی جائے اور دوسری طرف یہ بھی کہا مسلمانوں کی اجتماعی قوت کو ختم کرنے کے لیے یہ پودا کاشت کیا گیا تھا لیکن اب یہ وقت آگیا ہے کہ اس فتنہ کو جڑ سے اکھیڑ کر پھینک دیا جائے اور یہ بھی کہا کہ قادیانیوں سے بائیکاٹ جائز ہے(8)۔ اور جماعت اسلامی کی طلباء تنظیم واضح الفاظ میں حکومت کو یہ دھمکی دے رہی تھی کہ اگر اس معاملہ میں ان کی مرضی کے خلاف کوئی فیصلہ دیا گیا تو حکومت کے لیے عوام کے غیظ و غضب سے بچنا مشکل ہو جائے گا اور یہ دھمکیاں کوئی خفیہ انداز میں نہیں دی جا رہی تھیں بلکہ اخبارات میں شائع ہو رہی تھیں۔ (9)

4 / ستمبر کو اسلامی سیکریٹریٹ کے سیکریٹری جنرل حسن التہامی صاحب پاکستان آئے۔ انہوں نے بیان دیا کہ میں مختلف اسلامی ممالک میں رابطہ قائم کرنے کے لیے اسلامی ممالک کا دورہ کر رہا ہوں۔ اور کہا کہ میں ایک نہایت اہم مشن پر پاکستان آیا ہوں۔ جب ان سے پوچھا گیا کہ وہ وزیرِ اعظم بھٹو سے کس مسئلہ پر بات کریں گے تو انہوں نے کہا کہ وہ یہ نہیں بتا سکتے۔ (10)

یہ اعلان ہو چکا تھا کہ قومی اسمبلی 7/ ستمبر کو فیصلہ کرے گی۔ 6/ ستمبر کا دن آیا۔ یہ دن پاکستان میں یومِ دفاع کے طور پر منایا جاتا ہے۔ اگر کوئی صاحب عقل ہوتا تو یہ دن اس بات کو سوچنے کے لیے ایک موقع تھا کہ پاکستان کے احمدیوں نے اپنے ملک کے دفاع کے لیے کیا قربانیاں دی تھیں۔ جب احمدی جنرل میدانِ جنگ میں اترے تھے تو انہوں نے بزدلی نہیں دکھائی تھی بلکہ جنرل اختر حسین ملک، لیفٹننٹ جنرل افتخار جنجوعہ شہید اور میجر جنرل عبد العلی ملک جیسے احمدی جرنیلوں کے کارنامے ایسے نہیں جنہیں فراموش کیا جا سکے۔ جب جماعتِ احمدیہ تقسیم برصغیر کے وقت داغِ ہجرت کے بعد شدید بحران سے گزر رہی تھی اس وقت بھی پاکستانی احمدیوں نے رضا کارانہ طور پر ملک کے دفاع میں حصہ لیا تھا۔

خود ایک احمدی جنرل کے متعلق بھٹو صاحب کے خیالات کیا تھے؟ اس کا اندازہ ان کے اس تبصرے سے ہو جاتا ہے جو انہوں نے جیل میں اس وقت کیا تھا جب انہیں سزائے موت سنائی جا چکی تھی۔ کرنل رفیع صاحب جو اس وقت جیل میں ڈیوٹی پر تھے بھٹو صاحب کی ایک گفتگو کا حوالہ دیتے ہوئے کہتے ہیں:

”پھر کہنے لگے کہ جنرل اختر ملک کو کشمیر کے چھمب جوڑیاں محاذ پر نہ روک دیا جاتا تو وہ کشمیر میں ہندوستانی افواج کو تہس نہس کر دیتے مگر ایوب خان تو اپنے چہیتے جنرل یحییٰ خان کو ہیرو بنانا چاہتے تھے۔ 1965ء کی جنگ کے اس تذکرے کے دوران بھٹو صاحب نے جنرل اختر ملک کی بے حد تعریف کی۔ کہنے لگے اختر ملک ایک باکمال جنرل تھا۔ وہ ایک اعلیٰ درجہ کا سالار تھا۔ وہ بڑا بہادر اور دل گردے کا مالک تھا اور فنِ سپاہ گری کو خوب سمجھتا تھا۔ اس جیسا جنرل پاکستانی فوج نے ابھی تک پیدا نہیں کیا۔ پھر مسکراتے ہوئے کہنے لگے باقی سب تو جنرل رانی ہیں۔“(11)

لیکن توازن اور فراست ایسی اجناس نہیں تھی جو کہ اس دور کے صاحبانِ اقتدار کو میسر ہوں۔ اب تو ہر طرف جماعتِ احمدیہ کے خلاف نفرت کی آندھیاں چلائی جا رہی تھیں۔ ہر طرف سے یہ آوازیں اُٹھ رہی تھیں کہ انہیں مارو، ان کے گھروں کو جلاؤ، ان کا بائیکاٹ کرو، ان کو بنیادی حقوق سے محروم کر دو۔ ہر سیاستدان یہ سوچ رہا تھا کہ وہ اس مسئلہ پر بیان بازی کر کے کس طرح سیاسی مقاصد حاصل کر سکتا ہے۔ ایک روایت ہے کہ یوم دفاع کے دن وزیر اعظم ملک کے عوام کے نام ایک پیغام دیتے ہیں۔ اس روز وزیر اعظم بھٹو صاحب نے جو پیغام دیا اس میں انہوں نے کہا کہ ”اس وقت ملک کو مختلف النوع خطرات درپیش ہیں۔ بیرونی اشارے پر تخریبی کارروائیاں ہو رہی ہیں۔ ملک میں بعض سیاسی گروپ علاقہ پرستی کو ہوا دے رہے ہیں۔ اور انتہا پسند فرقہ پرست گروہ ہمارے دفاع کے لیے خطرہ بنے ہوئے ہیں“(12)۔

بہت خوب ! ملک کے دفاع پر آپ خود اقرار کر رہے ہیں کہ انتہا پسند فرقے ملک کے دفاع کے لیے خطرہ بن چکے ہیں۔ مگر جب ملک کو یہ خطرہ لاحق تھا تو آپ کیا کر رہے تھے؟ آپ ان کے مطالبات تسلیم کر کے ان کو تقویت دے رہے تھے اور یہ سوچ رہے تھے کہ احمدی تو ایک چھوٹا سا گروہ ہے اگر ان کے حقوق تلف بھی کر لیے گئے تو کیا فرق پڑتا ہے؟ یہ تو اپنا بدلہ لینے کی بھی طاقت نہیں رکھتے۔ اس سے ہم سیاسی فائدہ اُٹھا سکتے ہیں۔ یہ بات صحیح بھی تھی لیکن ایک بات پاکستان کے سیاستدان بھول رہے تھے ایک خدا بھی ہے جو احمدیوں پر ہونے والے ہر ظلم کا بدلہ لینے پر قادر ہے۔ اور تب سے اب تک اس ملک کی تاریخ عبرت کی داستانوں سے بھری ہوئی ہے۔

بہر حال فیصلے کے اعلان سے ایک روز پہلے اخبارات میں یہ فخریہ خبریں شائع ہونی شروع ہو گئیں کہ سوادِ اعظم کی خواہشات کے مطابق قادیانی مسئلہ کا قابلِ قبول حل تلاش کر لیا گیا ہے۔ (13)

6/ ستمبر کو جمعہ کا روز تھا۔ حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ نے خطبہ میں فرمایا:۔

”... جو شخص یہ کہے کہ میں دنیا کی طاقتوں سے مرعوب ہو گیا۔ دوسرے لفظوں میں وہ یہ اعلان کر رہا ہے کہ میرا خدا کے ساتھ واسطہ کوئی نہیں ... ورنہ آدم سے لے کر معرفت حاصل کرنے والوں نے خدا تعالیٰ کے پیار کے سمندر اپنے دلوں اور سینوں میں موجزن کئے اور سوائے خدا تعالیٰ کی خشیت کے اور کوئی خوف اور خشیت تھی ہی نہیں ان کے دلوں میں۔ یہ جو خشیت اللہ ہے یہ غیر اللہ کے خوف کو مٹا دیتی ہے۔ اللہ سے یہ ڈر کہ کہیں وہ ناراض نہ ہو جائے وہ ہر دوسرے کے خوف کو دل سے نکال دیتا ہے ...

شاید سات آٹھ سال گزر گئے غالباً 1966-1967ء کی بات ہے ایک موقع پر مجھے حاکمِ وقت سے ملنا تھا تو مجھے بڑے زور سے اللہ تعالیٰ نے یہ کہا کہ ءَ اَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ اور یہ میرے لئے عنوان تھا۔ ہدایت تھی کہ اس رنگ میں جا کر باتیں کرنی ہیں۔ پس یہ بھی اللہ تعالیٰ کا فضل ہے کہ کمزوری سے بچانے کے لیے وقت سے پہلے ہی راہ بتا دی۔“

(خطبات ناصر جلد پنجم صفحہ 624، 625)

اس خطبہ کے آخر میں حضور نے فرمایا:۔

”پس یہ دنیا جس میں دنیاکے لوگ بستے ہیں ایک اور دنیا ہے اور وہ دنیا جس میں احمدی بستے ہیں وہ ایک اور ہی دنیا ہے اور احمدیوں کا فرض ہے کہ اپنے نفسانی جذبات کو بالکل فنا کر دیں اور کسی صورت میں اور کسی حال میں غصہ اور طیش میں نہ آئیں اور نفس بے قابو ہو کر وہ جوش نہ دکھلائیں جو خدا تعالیٰ کی ناراضگی مول لینا ہے بلکہ تواضع اور انکسار کی انتہاء کو پہنچ جائیں اور اپنی پیشانیاں ہمیشہ خدا تعالیٰ کے حضور زمین پر رکھے رہیں۔“ (14)

عام خیال تھا کہ 7/ ستمبر کو قومی اسمبلی احمدیوں کے متعلق فیصلہ کرے گی۔ حالانکہ حقیقت یہ تھی کہ ان کی تمام کوششوں اور مخالفت کے باوجود اس فیصلہ کا یا اس جیسے دیگر فیصلوں کا جماعت پر اگر کوئی نتیجہ

مرتب ہوا تو وہ یہی تھا کہ جماعت پہلے سے بھی زیادہ تیز رفتاری سے ترقی کرنے لگ گئی لیکن اصل حقیقت یہ تھی کہ یہ فیصلہ پاکستان کے مستقبل کے بارے میں کیا جا رہا تھا اور ایک منفی فیصلے نے پاکستان کے لیے نہ ختم ہونے والی مصیبتوں کے دروازے کھول دیئے۔ بہر حال 7/ ستمبر کا دن آیا۔ دوپہر کو ساڑھے چار بجے اسمبلی کی کارروائی شروع کی گئی۔ تلاوت کے بعد سپیکر قومی اسمبلی صاحبزادہ فاروق علی خان صاحب نے وزیر قانون عبدالحفیظ پیرزادہ صاحب کو اپنی رپورٹ پیش کرنے کے لئے کہا

(الف) کہ پاکستان کے آئین میں حسبِ ذیل ترمیم کی جائے۔

(اوّل) دفعہ 106(3) میں قادیانی جماعت اور لاہوری جماعت کے اشخاص (جو اپنے آپ کو احمدی کہتے ہیں) کا ذکر کیا جائے۔

(دوم) دفعہ 106 میں ایک نئی شق کے ذریعے غیر مسلم کی تعریف درج کی جائے۔

مذکورہ بالا سفارشات کے نفاذ کے لیے خصوصی کمیٹی کی طرف سے متفقہ طور پر منظور شدہ مسودہ قانون منسلک ہے۔

(ب) کہ مجموعہ تعزیراتِ پاکستان کی دفعہ 295 الف میں حسبِ ذیل تشریح درج کی جائے

تشریح: کوئی مسلمان جو آئین کی دفعہ 260 کی شق نمبر 3 کی تشریحات کے مطابق حضرت محمد ﷺ کے خاتم النبیّین ہونے کے تصور کے خلاف عقیدہ رکھے یا عمل یا تبلیغ کرے وہ دفعہ ھٰذا کے تحت مستوجب سزا ہو گا۔

(ج) کہ متعلقہ قوانین مثلاً قومی رجسٹریشن ایکٹ 1973ء اور انتخابی فہرستوں کے قواعد 1974ء میں قانونی اور ضابطہ کی ترمیمات کی جائیں۔

(د) کہ پاکستان کے تمام شہریوں کے خواہ وہ کسی بھی فرقے سے تعلق رکھتے ہوں کے جان، مال، آزادی، عزت اور بنیادی حقوق کا پوری طرح تحفظ اور دفاع کیا جائے۔

وزیر قانون عبد الحفیظ پیر زادہ نے قرارداد کے الفاظ پڑھنے شروع کیے تھے کہ وزیرِ اعظم ذوالفقار علی بھٹو صاحب ایوان میں داخل ہوئے اور اس وقت ایوان کے ممبران نے ڈیسک بجا کر وزیر اعظم کا والہانہ

استقبال کیا لیکن اس موقع پر احمد رضا قصوری صاحب نے مداخلت کی اور کہا کہ اس آئینی ترمیم میں یہ الفاظ شامل کئے جائیں کہ مرزا غلام احمد قادیانی اور ان کے پیرو کار خواہ وہ کسی نام سے جانے جاتے ہوں قانون اور آئین کے حوالے سے غیر مسلم ہیں لیکن وزیر قانون نے اس کی مخالفت کی اور کہا کہ کمیٹی میں اس ترمیم کو متفقہ طور پر منظور کیا گیا تھا اور اب جب اس ترمیم کی شقوں پر رائے شماری کی گئی تو انہیں بھی ایوان میں متفقہ طور پر منظور کیا گیا۔ احمد رضا قصوری صاحب اپنی ترمیم ایوان کے سامنے پیش کرنے پر مصر تھے۔ وزیرِ اعظم ذوالفقار علی بھٹو صاحب نے بھی اسے خلافِ ضابطہ قرار دیا۔ سپیکر نے ایوان سے رائے لی کہ کیا احمد رضا قصوری صاحب کو اس بات کی اجازت دی جائے کہ وہ اس ترمیم میں اپنی ترمیم پیش کر سکیں تو ہر طرف سے نہیں نہیں کی آوازیں بلند ہونے لگیں۔ اس پر سپیکر صاحب نے کہا کہ وہ اس بات کی اجازت نہیں دے سکتے۔ احمد رضا قصوری صاحب نے کہا کہ وہ واک آؤٹ کر رہے ہیں کیونکہ انہیں (یعنی احمدیوں کو) غیر مسلم نہیں قرار دیا جا رہا۔ رائے شماری سے پہلے وزیر اعظم نے تقریر کرتے ہوئے اسے متفقہ قومی فیصلہ قرار دیا اور کہا کہ یہ نوے سالہ پرانا مسئلہ تھا جس کا مستقل حل تلاش کرلیا گیا ہے اور کہا کہ میں اس سے کوئی سیاسی فائدہ نہیں اُٹھانا چاہتا۔ پھر انہوں نے کہا کہ پاکستان کی بنیاد اسلام ہے اور اگر کوئی ایسا فیصلہ کیا جاتا جو مسلمانوں کے عقائد کے خلاف ہوتا تو اس سے پاکستان کی بنیاد پر ضرب پڑتی۔ پھر انہوں نے کہا کہ وہ امید رکھتے ہیں کہ اب یہ باب ختم ہو جائے گا۔ کل شاید ہمیں اور مسائل کا سامنا کرنا پڑے لیکن اب تک پاکستان کو پیش آنے والے مسائل میں یہ سب سے زیادہ سنگین مسئلہ تھا۔ لیکن ایک بات بھٹو صاحب بھی محسوس کر رہے تھے۔ قومی اسمبلی نے اتنا بڑا کارنامہ سرنجام دیا تھا لیکن اس کی کارروائی خفیہ رکھی گئی تھی۔ آخر کیوں؟ سب کو معلوم ہونا چاہیئے تھا کہ قومی اسمبلی کی کارروائی میں کیا ہوا تھا۔ بھٹو صاحب نے اس کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ اسمبلی کی یہ کارروائی خفیہ ہوئی ہے۔ اگر یہ کارروائی خفیہ نہ ہوتی تو ممبران اس یکسوئی سے اظہارِ خیال نہ کر سکتے۔ لیکن کوئی بھی چیز ہمیشہ کے لیے خفیہ نہیں رہتی۔ یہ کارروائی بھی ایک روز منظرِ عام پر آئے گی لیکن ابھی کچھ اضافی وقت لگے گا جس کے بعد یہ کارروائی منظرِ عام پر لائی جائے گی۔ میں یہ نہیں کہتا کہ ہم اس ریکارڈ کو دفن کر دیں گے۔ ہر گز نہیں یہ خیال ایک غیر حقیقی خیال ہوگا۔ اگر ہم بھٹو صاحب کی اس بات کا

تجزیہ کریں تو وہ یہ کہنا چاہ رہے تھے کہ اگر یہ کارروائی خفیہ انداز میں نہ کی جاتی تو ممبران اس طرح یکسوئی سے آزادانہ اظہارِ خیال نہ کر سکتے۔ جبکہ ہم اس حقیقت کا جائزہ لے چکے ہیں کہ ممبران کے سوالات میں اگر کوئی چیز نمایاں تھی تو وہ پراگندہ خیالی تھی۔ اتنے دن سوالات کرنے کے باوجود وہ اصل موضوع سے صرف کتراتے ہی رہے اور اگر یکسوئی کا یہی طریق ہے کہ کارروائی خفیہ ہو اور ممبران کی آزادانہ اظہارِ رائے کا بھی یہی طریق ہے تو پھر تو اسمبلی کی ہر کارروائی خفیہ ہونی چاہئے۔ بھٹو صاحب نے یہ تو کہا کہ وہ ایک دن اس کارروائی کو منظرِعام پر لے آئیں گے مگر اس کے بعد وہ کئی سال برسرِ اقتدار رہے لیکن انہوں نے اس کارروائی کو منظرِ عام پر لانے کا قدم کبھی نہیں اُٹھایا۔ یہ سوال ہر صاحبِ شعور ضرور اُٹھائے گا کہ آخر ایسا کیوں کیا گیا؟

سپیکر کے کہنے پر مولوی مفتی محمود صاحب نے مختصر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ وہ اور ان کی پارٹی اس ترمیم کی مکمل حمایت کرتے ہیں۔ اور متفقہ طور پر یہ ترمیم منظور کر لی گئی۔ کچھ ہی دیر بعد یہ بل سینٹ میں پیش کیا گیا اور وہاں پر متفقہ طور پر منظور کر لیا گیا۔ اور وہاں پر تالیاں بجا کر اس فیصلہ کا خیر مقدم کیا گیا۔ اس روز معلوم ہوتا تھا کہ پاکستان کے تمام سیاسی حلقے تالیاں پیٹ رہے تھے، ڈیسک بجا رہے تھے، مٹھائیاں تقسیم ہو رہی تھیں چراغاں کیا جا رہا تھا۔ اور بیچارے یہ سمجھ رہے تھے کہ وہ احمدیوں کی قسمت کا فیصلہ کر رہے تھے حالانکہ حقیقت یہ تھی کہ وہ اپنی اور ملک کی قسمت پر مہر لگا رہے تھے۔ مولوی خوش تھے کہ ہم نے ایک تیر مارا ہے اور حکومتی پارٹیاں اس بات پر خوشیاں منا رہی تھیں کہ ہم نے اپنی سیاسی پوزیشن اور مضبوط کر لی ہے۔

جلد ہی جو تبصرے آنے لگے تو ان سے بھی یہی معلوم ہوتا تھا کہ وقتی طور پر بھٹو صاحب کے حصہ میں بہت سی داد و تحسین آئی ہے۔ مجلسِ عمل برائے ختمِ نبوت کے مولوی محمد یوسف بنوری صاحب نے ایک پریس کانفرنس میں اس فیصلہ کا خیر مقدم کیا۔ صدر ورلڈ فیڈریشن آف اسلامک مشنز سید عبد القادر نے وزیرِ اعظم کو مبارکباد کی تار بھجوائی اور کہا کہ پوری دنیا کے مسلمان اس فیصلہ کا خیر مقدم کر رہے ہیں اور جس طرح آپ نے اس معاملہ کو طے کیا ہے اس کو سراہتے ہیں، شاہ احمد نورانی صاحب صدر جمعیت العلماء پاکستان

نے کہا کہ یہ مسلمانوں کے لیے عظیم فتح ہے اور انہوں نے اس کے لیے انتھک کوششیں کی ہیں، ایئر مارشل اصغر خان صدر تحریکِ استقلال نے کہا یہ ایک عظیم کامیابی ہے، جماعتِ اسلامی کے پروفیسر غفور صاحب نے کہا کہ وہ اس فیصلہ سے مکمل طور پر مطمئن ہیں صدر مجلس علماء پاکستان نے وزیر اعظم کو مبارکباد دی اور کہا کہ یہ اس صدی کی سب سے اچھی خبر ہے، جمعیت العلماء اسلام کے قائد مفتی محمود صاحب نے کہا کہ یہ فیصلہ تاریخ میں سنہری حروف سے لکھا جائے گا (15)۔ ان کے بہت سے دیرینہ مخالف بھی ان پر پھول نچھاور کر رہے تھے۔ مثلاً ایڈیٹر چٹان شورش کاشمیری صاحب نے کہا کہ اس فیصلہ پر ملتِ اسلامیہ ہی نہیں خود اسلام وزیر اعظم کا ممنون ہے (16)۔ اسلامک کانفرنس کے سیکریٹری حسن اَلتُّہامی صاحب نے جو کہ پاکستان میں موجود تھے بیان دیا کہ اب پاکستان صحیح معنوں میں ایک اسلامی ملک بن گیا ہے۔ اور کہا کہ اس فیصلہ کی نقول دوسرے اسلامی ممالک کو بھی بھجوائی جائیں گی اور امید ہے کہ یہ ممالک بھی اس فیصلہ کی پیروی کریں گے۔ اور اب اخبارات میں یہ خبریں شائع کی جا رہی تھیں کہ اب قادیانیوں کو تمام کلیدی آسامیوں سے ہٹا دیا جائے گا۔ پنجاب کے وزیر اعلیٰ حنیف رامے صاحب نے یہ فخریہ بیان دیا کہ ہماری حکومت نے صحیح معنوں میں علماء سے بھی زیادہ اسلام کی خدمت کی ہے۔ مجلس ختمِ نبوت کی مجلسِ عمل نے بیان جاری کیا کہ اس فیصلہ سے صحیح معنوں میں قومی اتحاد کی بنیاد پڑی ہے اور ان کے صدر نے کہا کہ امید ہے کہ اب اکثر قادیانی مسلمانوں کی تبلیغ کے نتیجہ میں اسلام قبول کر لیں گے۔ (17)

یہ تھے اس وقت مختلف لوگوں کے خیالات لیکن پھر کیا ہوا۔ کیا اس فیصلہ کے بعد قومی اتحاد قائم ہوا؟ ہر گز نہیں بلکہ پاکستان کا معاشرہ ہر پہلو سے اس بری طرح تقسیم ہوا کہ جس کا پہلے تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ کیا ملک میں اسلامی معاشرہ قائم ہوا؟ کوئی بھی یہ دعویٰ نہیں کر سکتا بلکہ قتل و غارت اور دہشتگردی کا وہ طوفان اٹھا کہ خدا کی پناہ۔ اور کیا یہ علماء جو اب بھٹو صاحب کی تعریف میں زمین آسمان ایک کر رہے تھے، ان کے وفا دار رہے؟ نہیں یہ مولوی طبقہ کبھی کسی کے ساتھ وفا نہیں کرتا۔ جلد ہی انہوں نے بھٹو صاحب کے خلاف ایک مہم چلائی اور ان کے خلاف، ان کے اہلِ خانہ کے خلاف ان کے آباء کے خلاف ملک بھر میں وہ گندہ دہنی کا طوفان اُٹھایا کہ شاید ہی کوئی گالی ہو جو نہ دی گئی ہو۔

7/ستمبر کو بھٹو صاحب اپنے آپ کو بہت مضبوط محسوس کر رہے تھے۔ لیکن کیا اس نے انہیں کوئی فائدہ دیا؟ جلد ہی ان کے خلاف ایک ملک گیر تحریک چلی اور پھر ان کی حکومت کا تختہ الٹ دیا گیا۔ ان پر احمد رضا قصوری صاحب پر قاتلانہ حملہ کرانے اور ان کے والد کے قتل کا مقدمہ چلایا گیا اور انہیں پھانسی کی سزا دی گئی۔

اگر یہ فیصلہ خدا کی نظر میں مقبول تھا تو اس کے کچھ آثار بھی تو نظر آنے چاہئے تھے۔ ہمیں اس کے بعد کی تاریخ میں ایسے کوئی آثار نظر نہیں آتے۔ کیا اس فیصلہ سے جماعتِ احمدیہ کی ترقی رک گئی؟ بالکل نہیں جماعتِ احمدیہ پہلے سے بہت زیادہ تیز رفتاری سے ترقی کرتی چلی گئی۔ جو نقصان ہوا ملک کا اور اس فیصلے کو کرنے والوں کا ہوا۔

بہت سے تجزیہ نگاروں نے اس فیصلہ کا تجزیہ کیا ہے اور آئندہ بھی کرتے رہیں گے۔ ان میں سے کچھ مثالیں پیش ہیں۔ موسیٰ خان جلال زئی اپنی کتاب The Sunni-Shia Conflict in Pakistan میں لکھتے ہیں۔

"صورتِ حال اس وقت تبدیل ہو گئی جب پنجاب حکومت نے 1951ء میں مرکزی حکومت کے خلاف مذہبی پتے کھیلنے کا فیصلہ کیا۔ موخر الذکر ثابت قدم رہی اور احمدیوں کے خلاف فسادات کو روکنے کے لیے فوج کو طلب کر لیا گیا۔ دو دہائیوں کے بعد بھٹو صاحب نے احمدیوں کی مخالفت کا پتہ کھیلنے کا فیصلہ کیا۔ شاید یہ اس لیے کیا گیا کہ پاکستان اسلامی ممالک کی قیادت کرنے والے ممالک کے گروہ میں بیٹھنے کے قابل ہو جائے۔"(18)

ایما ڈنکن (Emma Duncan) اپنی کتاب Breaking The Curfew میں بھٹو صاحب کا ذکر کرتے ہوئی لکھتی ہیں:۔

"غالباََ احمدیوں پر ان کا حملہ بھی اس نیت سے کیا گیا تھا تاکہ وہ قدامت پسند مذہبی حلقوں میں مقبولیت حاصل کر سکیں ... مگر 1974 میں احمدیوں کو غیر مسلم قرار دینے کا فیصلہ بھی شاید ان حلقوں میں سستی

مقبولیت حاصل کرنے کا طریق تھا جو کہ ان کو نا پسند کرتے تھے۔ اس کے باجود بھٹو صاحب کی پالیسی اور اخلاقیات حملے کی زد میں رہے۔"(19)

اس فیصلہ کے بعد پہلا جمعہ 13 / ستمبر کو تھا۔ قدرتاً احبابِ جماعت حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ کی زبانِ مبارک سے یہ ہدایت سننا چاہتے تھے کہ اس فیصلہ پر احمدیوں کا کیا ردِ عمل ہونا چاہیئے؟ حضور نے خطبہ جمعہ کے آغاز میں فرمایا کہ اس وقت تو یہ تبصرہ ہے کہ No Comments یعنی کوئی تبصرہ نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس پر تبصرہ سے قبل بڑے غور اور تدبر کی ضرورت ہے اور مشورے کی ضرورت ہے۔ اس پر مشورے اور غور کرنے کے بعد میں بتاؤں گا کہ جو پاس ہوا ہے وہ اپنے اندر کتنے پہلو لئے ہوئے تھا۔ کیا بات صحیح ہے کیا بات صحیح نہیں ہے۔ حضور نے فرمایا کہ حقیقت کو ابھرنے دیں۔ حقیقت کو Unfold ہونے دیں۔ اس کے بعد حضور نے تفصیل سے بیان فرمایا کہ اس فیصلہ پر کسی احمدی کے ردِ عمل میں ظلم اور فساد کا شائبہ تک نہیں ہو نا چاہیئے۔(20)

اس کے بعد حضور نے مختلف خطبات اور تقاریر میں بیان فرمایا کہ اس فیصلہ پر جماعتِ احمدیہ کا ردِ عمل کیا ہونا چاہیئے۔ جب جلسہ سالانہ کا وقت آیا تو ایک عجیب سماں تھا۔ حکومت نے پہلی مرتبہ فیڈرل سیکیورٹی فورس کے جوان ربوہ کے جلسہ پر بھجوائے تھے۔ حضور نے افتتاحی خطاب کے آغاز میں فرمایا:

"... لوگوں کی طرف سے بہت سی افواہیں پھیلائی گئیں۔ ایک افواہ یہ تھی کہ مستورات کا جلسہ نہیں ہو گا۔ حالانکہ مستورات کا جلسہ ہو رہا ہے ہماری احمدی بہنیں کافی تعداد میں پہنچ چکی ہیں لیکن بعض علاقوں سے بہت کم مستورات اس جلسہ میں شامل ہو رہی ہیں۔ ایک یہ افواہ بھی بعض جگہوں پر پھیلائی گئی کہ ربوہ کے مسافروں کو راستہ میں بہت تنگ کیا جا رہا ہے گویا کہ ان کے نزدیک ہمارے ملک میں کوئی حکومت ہی نہیں ہے۔ اس لئے بعض جگہوں سے لاریوں نے چلنے سے انکار کیا۔ بعض جگہوں پر احمدی تذبذب میں پڑ گئے حالانکہ یہاں حکومت ہے اور ان کا بڑا اچھا انتظام ہے۔ اس جلسہ پر یہاں بھی دوستوں کو پہلی بار گیلریوں کے اوپر حکومت کے باوردی نمائندے نظر آ رہے ہیں جو بڑے خوبصورت لگ رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو اپنی ذمہ داریوں کے نباہنے کی توفیق عطا کرے۔"(21)

اس موقع پر جب جماعتِ احمدیہ کے مخالفین بڑے طمطراق سے یہ دعوے کر رہے تھے کہ اب ہم اس جماعت کو ختم کر دیں گے۔ حضور نے یہ پیشگوئی فرمائی :

"... جنہوں نے علی الاعلان کہا کہ وہ زمین سے خدا کے نام کو اور آسمانوں سے اس کے وجود کو مٹا دیں گے۔ خدا نے ہمیں کہا تم ان کے لئے بھی دعائیں کرو۔ اس لئے ہم ان کی ہدایت کے لئے بھی دعائیں کرتے ہیں کیونکہ وہ لوگ خدا کے حقیقی پیار سے محروم ہیں۔ دنیا کی یہ عارضی ترقیات تو کوئی معنی نہیں رکھتیں۔ انسان نے پہلی دفعہ تو یہ ترقی نہیں کی۔ اصطلاحاً بڑے بڑے فراعنہ دنیا میں پیدا ہوئے اور ان میں ایک وہ بھی تھا جس کا نام بھی فرعون تھا۔ جس کی حکومت بڑی شاندار اور مہذب کہلاتی تھی۔ دنیا میں اس نے بڑا رعب قائم کیا مگر کہاں گئے وہ لوگ؟ اور کہاں گئیں سرمایہ دارانہ حکومتیں؟ ایک وقت میں سرمایہ دار دنیا پر چھائے ہوئے تھے اور وہ یہ سمجھتے تھے کہ انسان کے اوپر سوائے سرمایہ داری کے اور کوئی چیز حکومت نہیں کر سکتی وہ پیچھے چلے گئے۔

دوسرے نمبر پر کمیونزم آگیا۔ یہ بھی پیچھے چلا جائے گا۔ صدیوں کی بات نہیں...... درجنوں سالوں کی بات ہے کہ اشتراکی نظام بھی پیچھے چلا جائے گا اور پھر دوسری طاقتیں آگے آجائیں گی اور ایک وقت میں وہ بھی پیچھے چلی جائیں گی۔ پھر خدا اور اس کا نام لینے والی جماعت، حضرت محمد مصطفٰی ﷺ کی طرف منسوب ہونے والی جماعت، قرآنِ کریم کے احکام کا سکہ دنیا میں قائم کرنے والی جماعت، اسلام کا جھنڈا دنیا کے گھر گھر میں گاڑنے والی جماعت آگے آئیگی اور پھر اس دنیا میں اخروی جنت سے ملتی جلتی ایک جنت پیدا ہو گی اور ہر انسان کی خوشی کے سامان پیدا کئے جائیں گے اور تلخیاں دور کر دی جائیں گی۔" (22)

جہاں تک عالمی منظر پر رونما ہونے والی تبدیلیوں کے متعلق اس پیشگوئی کا تعلق ہے تو اس ضمن میں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ نے ۱۹۷۲ء کی مجلسِ شوریٰ سے خطاب کرتے ہوئے بھی یہ تجزیہ بیان فرمایا تھا کہ اشتراکیت ناکام ہو چکی ہے۔ انہوں نے انسانیت کی خدمت کی آواز تو بلند کی لیکن وہ ابھی تک ایسا کوئی نظام روس میں قائم نہیں کر سکے جس میں انہوں نے روس کے مفادات قربان کر کے دنیا کے ممالک کی بھلائی کی کوشش کی ہو۔ وہ دوسرے ممالک کو Dictate کرنا چاہتے ہیں کہ جو ہم کہتے ہیں تم وہ

مانو۔ اور خود روس کے مشرقی اور مغربی حصے کی ترقی میں بہت فرق ہے۔ حضور نے اپنا مشاہدہ بیان فرمایا کہ جب حضور 1967ء میں یورپ کے دورہ پر جاتے ہوئے کچھ دیر کے لئے ماسکو کے ایئر پورٹ پر رکے تو یہ دیکھا کہ وہاں ایک مردنی اور پژ مردگی چھائی ہوئی ہے، غذائی قلت کے آ ثار صاف نظر آ رہے تھے۔ کوئی بشاشت نہیں تھی کوئی مسکراہٹ نہیں تھی۔ انہوں نے اپنے ملک میں جو کام کیا وہ تو کیا لیکن وہ جو نہیں کر سکے وہ یہ ہے کہ وہ اپنے لوگوں میں بشاشت نہیں پیدا کر سکے۔ اس کے ساتھ ہی حضور نے ارشاد فرمایا کہ چین ایک بڑی قوت بن کر ابھر رہا ہے اور چینیوں نے جو نظام اپنے لئے منتخب کیا ہے اس میں وہ زیادہ سمجھداری اور عقلمندی سے آگے بڑھ رہے ہیں۔ (23) ۔

آئندہ چند دہائیوں میں دنیا کی آنکھ نے مشاہدہ کیا کہ یہ پیشگوئی حرف بحرف پوری ہوئی جیسا کہ حضور نے فرمایا تھا کمیونزم کی ناکامیاں سب کے سامنے آگئیں اور سوویت یونین بکھر کر رہ گیا اور مشرقی یورپ سے بھی کمیونزم کا نظام ختم ہو گیا۔ اور اس کے برعکس چین کے نظام نے بروقت اپنے اندر کچھ تبدیلیاں پیدا کر لیں اور چین ایک بڑی صنعتی قوت کے طور پر سامنے آیا۔

اس کے بعد بہت سے خطبات میں حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ نے جماعت کی راہنمائی فرمائی کہ پاکستان کے آئین میں اس ترمیم پر جماعتِ احمدیہ کا ردِ عمل کیا ہونا چاہیے۔ جب ہم ان تمام خطبات اور تقاریر کو پڑھتے ہیں تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ جماعتِ احمدیہ کے ردِ عمل کا حتمی اعلان حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ نے 1975ء کے جلسہ سالانہ کے افتتاحی خطاب کے دوران کیا تھا۔ جب یہ جلسہ شروع ہوا اور حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ سٹیج پر تشریف لے آئے توحسبِ سابق مشہور احمدی شاعر جناب ثاقب زیروی صاحب اپنی نظم ترنم سے سنانے کے لئے آئے۔ خاکسار کو خود بھی یہ لمحے یاد ہیں۔ نظم کا شروع ہونا تھا کہ ایک سماں بندھ گیا۔ اس نظم کا پہلا شعر تھا :

وہ جو گرد سی تھی جمی ہوئی وہ جبیں سے ہم نے اتار دی
شبِ غم اگرچہ طویل تھی شبِ غم بھی ہنس کے گزار دی

اس نظم کے کچھ اور اشعار یہ تھے

بھلا کیوں بقائے دوام کو نہ ہو ناز ان کے وجود پر	وہ جنہوں نے جاں سے عزیز شے بھی ترے حبیب پہ وار دی
وہی ٹھہرے موردِ کفر بھی جنہیں دین جاں سے عزیز تھا	وہی خار بن کر کھٹک رہے ہیں جنہوں نے فصلِ بہار دی
میرے زخم جس میں نہاں رہے مرا درد جس میں چھپا رہا	میرے چارہ گر تیرا شکریہ وہ قبا بھی تو نے اتار دی

جب حضور نے 26/ دسمبر 1975ء کو جلسہ سالانہ کے افتتاحی اجلاس سے اپنا روح پرور خطاب شروع فرمایا تو آپ نے آنحضرت ﷺ کی مختلف دعائیں پڑھیں اور یہ ارشاد فرمایا کہ دوست آمین کہتے ہوئے یہ دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ ان دعاؤں کو ہمارے حق میں بھی جو آپ کی امت میں سے ہیں قبول کرے۔ چنانچہ حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ یہ دعائیں پڑھتے گئے اور جلسہ سالانہ کے حاضرین جو کہ تعداد میں لاکھ سے زائد تھے آمین کہتے رہے۔ ان مبارک دعاؤں میں سے جو آخری دعا حضور نے اس جلسہ سالانہ کے موقع پر پڑھی اس کا آخری حصہ یہ تھا:

۔۔۔وَانْصُرْنِیْ عَلٰی مَنْ ظَلَمَنِیْ وَ اَرِنِیْ فِیْهِ ثَأْرِیْ وَ أَقِرَّ بِذٰلِكَ عَیْنِیْ

اور حضور نے اس کا یہ ترجمہ پڑھا:

”... اور جو مجھ پر ظلم کرے اس کے خلاف تو میری مدد فرما اور جو بدلہ تو اس سے لے وہ مجھے بھی دکھا دے اور اس طرح میری آنکھ کو ٹھنڈک عطا فرما۔“

اور وہاں پر موجود احباب نے آنحضرت ﷺ کی اس دعا پر آمین کہی۔ جیسا کہ جماعت کی تاریخ کا معروف واقعہ ہے کہ جب مارٹن کلارک نے حضرت مسیح موعود علیہ السلام پر قتل کا منصوبہ بنانے کا جھوٹا مقدمہ قائم کیا اور اللہ تعالیٰ کی قدرت نے یہ نشان دکھایا کہ انہی کے سکھلائے ہوئے آدمی نے ان کی سازش کا راز افشا کر دیا تو مقدمہ خارج کرتے ہوئے جج ڈگلس نے حضرت مسیح موعود علیہ السلام سے کہا کہ اگر آپ چاہیں تو ان پر مقدمہ کر سکتے ہیں تو حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے جواب دیا کہ میں نے اپنا مقدمہ آسمان پر دائر کر دیا ہے1974ء کے دوران جماعتِ احمدیہ پر جو مظالم کئے گئے اور جس طرح ایک خلافِ اسلام، خلافِ عقل اور خلافِ آئین فیصلہ کر کے اپنے زعم میں جماعتِ احمدیہ پر ضرب لگائی گئی، اس کا بیان تو گزر چکا ہے۔ ہم یہ ذکر کر چکے ہیں کہ ان اقدامات سے بھٹو صاحب اپنے سیاسی مقاصد حاصل کرنا چاہتے تھے اور

اس وقت بظاہر یہ لگ بھی رہا تھا کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو بھی گئے ہیں۔ وہ سیاسی طور پر اتنے مضبوط کبھی بھی نہیں تھے جتنا اس وقت نظر آرہے تھے۔ ان کے مخالف بھی جن میں مولوی گروہ کی ایک بڑی تعداد شامل تھی ان کے اس فیصلے کی تعریفوں کے پل باندھ رہی تھی۔ وہ صرف پاکستان کے مقبول وزیرِ اعظم ہی نہیں تھے ،عالمی سطح پر بھی ان کا طوطی بول رہا تھا۔ دوسرے مسلمان ممالک سے بھی واہ واہ کی صدائیں بلند ہو رہی تھیں۔ اس پس منظر میں کوئی کہہ سکتا تھا کہ اگر جماعت ِاحمدیہ پر کوئی ظلم ہو گیا ہے تو یہ ایک کمزور سی جماعت ہے ان کی کون سنے گا؟ کون ان کا بدلہ لے گا؟ یہ کمزور گروہ اپنے مقدمے کو کہاں لے کر جائے گا ؟لیکن 26/دسمبر 1975ء کی صبح کو یہ مقدمہ آسمان پر دائر کر دیا گیا تھا۔ بھٹو صاحب جیسے مقبول،ذہین اور منجھے ہوئے سیاستدان کا اقتدار سے رخصت ہونا اور پھر ایک تکلیف دہ اسیری سے گزرنا اور پھر قتل کے الزام میں ان کو پھانسی کی سزا ملنا ،یہ سب ایسے واقعات ہیں جن پر بہت کچھ لکھا گیا ہے اس کا بہت کچھ تجزیہ کیا گیا ہے اور آئندہ بھی کیا جائے گا۔ لیکن جب بھی کوئی روحانی آنکھ سے ان واقعات کا تجزیہ کرے گا تو اسی نتیجہ پر پہنچے گا کہ 26 /دسمبر 1975ء کو کی جانے والی دعا ایک مقدمہ تھی جو رب العالمین کے حضور دائر کیا گیا تھا اور چند سالوں کے بعد دنیا کی آنکھ نے فیصلہ بھی مشاہدہ کر لیا۔ اس فیصلہ کرنے والوں کا انجام کیا ہوا اور ملک اور قوم کو اس کا کیا خمیازہ بھگتنا پڑا اس کا جائزہ ہم مختلف مرحلوں پر لیتے رہیں گے۔

لیکن پیپلز پارٹی اور قومی اسمبلی میں شریک دوسری جماعتوں کے لیڈر اس وقت سے اب تک فخریہ بیان بازی کرتے آئے ہیں کہ ہم نے 1974ء میں یہ فیصلہ کر کے بڑا تیر مارا تھا۔ گو کہ اب کچھ آوازیں اس طرح کی بھی سننے میں آ رہی ہیں کہ اس کے ساتھ ملک میں تنگ نظری اور مذہبی دہشت گردی کا ایک نیا باب کھل گیا تھا۔ جماعت کے مخالف بیان بازی اصول اور سچائی سے کتنا خالی ہوتی ہے۔ اس کا اندازہ اس ایک مثال سے ہو سکتا ہے۔

اکتوبر 1975ء میں پاکستان کے وزیر مملکت برائے ریلوے میاں عطاء اللہ صاحب نے یہ بیان داغا کہ ہم نے تو اس فیصلہ کے ذریعہ 90 سالہ مسئلہ حل کر دیا ہے لیکن قادیانی سازش کر رہے ہیں کہ کسی طرح یہ

آئین منسوخ ہوجائے اور اس کا طریقہ یہ استعمال کر رہے ہیں کہ پیپلز پارٹی سے باغی ہونے والے کچھ اراکین کو وہ مالی مدد دے رہے ہیں۔ اس ضمن میں انہوں نے خاص طور پر پنجاب کے سابق وزیر اعلیٰ اور گورنر غلام مصطفےٰ کھر صاحب کا نام لیا کہ وہ قادیانیوں سے رشوت لے رہے ہیں اور صوبائی خود مختاری کا نعرہ لگا رہے ہیں وزیر موصوف نے بڑے اعتماد سے یہ دعویٰ کیا کہ حکومت کے پاس اس بات کے معین ثبوت موجود ہیں جو جلد منظرِ عام پر لائے جائیں گے۔ اس کے ساتھ انہوں نے علمِ تاریخ پر طبع آزمائی کرتے ہوئے یہ الزام بھی لگایا کہ قادیانی تو شروع سے ہی قیامِ پاکستان کے مخالف تھے۔ (24)

اس سنسنی خیز انکشاف کو تیس سال گزر گئے لیکن الزام لگانے والوں کو اب تک یہ توفیق نہ ہوئی کہ کوئی ثبوت سامنے لاتے۔ جس طرح انہیں باوجود وعدہ کرنے کے یہ ہمت نہیں ہوئی کہ اسمبلی کی کارروائی کو منظرِ عام پر لاتے اس طرح یہ نام نہاد ثبوت بھی سامنے نہ آسکا۔ لیکن ان کے جھوٹ کی قلعی خدا نے اس طرح کھول دی کہ غلام مصطفےٰ کھر صاحب کو، جو ان کے مطابق احمدیوں سے رشوت لے کر ملک کے اور پیپلز پارٹی کے خلاف سازشیں کر رہے تھے، ان کو دوبارہ نہ صرف پیپلز پارٹی میں قبول کیا گیا بلکہ وفاقی وزیر بھی بنا دیا گیا۔

بحیثیت ادارہ پاکستان کی قومی اسمبلی کا انجام

جماعتِ احمدیہ کا یہ موقف تھا کہ کسی ملک کی اسمبلی کا یہ کام نہیں کہ وہ لوگوں کے مذہبی امور کا فیصلہ کرے۔ لیکن جماعتِ احمدیہ کے انتباہ کے با وجود قومی اسمبلی نے اس مسئلہ پر کارروائی کا آغاز کیا اور ممبرانِ اسمبلی نے اپنے سیاسی مقاصد حاصل کرنے کے لئے بزعمِ خود مفتی بنتے ہوئے خدا کے مامورپر ایمان لانے والوں پر کفر کا فتویٰ بھی لگایا۔ یہ وہ دور تھا جب پاکستان میں ایک سال قبل ہی نیا آئین نافذ ہوا تھا اور جمہوریت کی بحالی اور نئے سیاسی نظام سے بہت سی امیدیں وابستہ کی جا رہی تھیں اور جماعت کا وفد اس سپیشل کمیٹی میں سوالات کے جوابات دے رہا تھا تو انہی دنوں میں بڑی امیدوں کے ساتھ قومی اسمبلی کی نئی عمارت کی بنیاد رکھی گئی تھی۔

لیکن اس کے بعد کیا ہوا؟ جیسا کہ ہم بعد میں ذکر کریں گے کہ نئے انتخابات ہوئے اور دھاندلی کے الزامات کی وجہ سے فسادات شروع ہو گئے اور پھر ملک پر ایک طویل مارشل لاء مسلط کر دیا گیا۔ اور اس دوران آئین معطل رہا۔ پھر آئین بحال ہونے کا وقت آیا تو ایک کے بعد دوسری اسمبلی ٹوٹتی رہی اور اس ادارہ کا وہ حشر ہوا کہ صاحبزادہ فاروق صاحب جو کہ اس کارروائی کے دوران قومی اسمبلی کے سپیکر تھے انہوں نے یہ بیان دیا کہ موجودہ پارلیمنٹ ہاؤس کی عمارت کا سنگِ بنیاد رکھوانا میری زندگی کی سب سے بڑی غلطی تھی اور یہ میرا ایک نا قابلِ معافی جرم تھا۔ انہوں نے کہا کہ اگر انہیں اندازہ ہوتا کہ اس اسمبلی کی حیثیت صفر ہو جائے گی اور عوام کی رائے خود اس اسمبلی میں بیٹھنے والوں کے ذریعہ ختم کر دی جائے گی تو وہ اس غلطی کا ارتکاب کبھی نہ کرتے۔ یہ تھا اس ادارے کا انجام جس نے احمدیوں پر کفر کا فتویٰ لگایا تھا۔ (25)

یہ فیصلہ دنیا کی تاریخ میں ایک انوکھا فیصلہ تھا کہ ایک ملک کی سیاسی اسمبلی نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ کسی فرقہ کا مذہب کیا ہونا چاہئے۔ اس وقت بھی پاکستان میں مذہبی انتہا پسندی کی ایک تاریخ تھی جس سے بھٹو صاحب بخوبی واقف تھے۔ اور بھٹو صاحب خود بھی برملا اس بات کا اظہار کر چکے تھے کہ ان واقعات کے پیچھے

بیرونی ہاتھ ملوث ہے۔ ظاہر ہے کہ جب کسی بیرونی ہاتھ کی خواہش کے مطابق ایسے اقدامات کئے جائیں تو اس سے ملک کو نقصان ہی پہنچ سکتا ہے۔ جب ہم نے ڈاکٹر مبشر حسن صاحب سے یہ سوال کیا کہ اگر ایسا تھا کہ یہ سب کچھ کوئی بیرونی ہاتھ کرار ہا تھا۔ اور یہ ساری سازش پاکستان کی سالمیت اور وحدت کے لئے خطرہ تھی پھر کیوں ان کے مطالبات تسلیم کر لئے گئے اور وہ بھی متفقہ طور پر۔ کیا اس سے بیرونی ہاتھ کے شروع کئے گئے کام کو تقویت نہیں ملی۔ اس کے جواب میں ڈاکٹر مبشر حسن صاحب نے کہا

”Actually he always thought (اصل میں ان کا ہمیشہ خیال ہوتا تھا)
کہ وہ کچھ بھی کر لیں اس پر قابو پالیں گے۔“

بھٹو صاحب کا یہ خیال درست ثابت ہو ا یا یہ ان کی سب سے بڑی بھول تھی اس کا جائزہ ہم بعد میں لیں گے۔

(1) مشرق 21 / اگست 1974ء ص 1

(2) جائزہ، مصنفہ جسٹس صمدانی، ناشر سنگِ میل پبلیکیشنز ص69، 70

(3) مشرق 25 / اگست 1974ء ص 1

(4) مشرق 27 / اگست 1974ء ص1

(5) مشرق 31 / اگست 1974ء ص1

(6) نوائے وقت 2 / ستمبر 1974ء ص آخر

(7) امروز 4 / ستمبر 1974ء ص1

(۸) نوائے وقت یکم ستمبر 1974ء ص1

(9) نوائے وقت 2 / ستمبر 1974ء ص2

(10) مشرق ۵ / ستمبر 1974ء ص1

(11) بھٹو کے آخری 323 دن، مصنفہ کرنل رفیع الدین، ناشر جنگ پبلیکیشنز، ص66

(12) امروز 6 / ستمبر 1974ء ص1

(13)نوائے وقت 6/ ستمبر 1974ء ص1

(14) خطباتِ ناصر جلد 5 ص624۔625، 630

(15)ڈان 9/ ستمبر 1974ء ص اول و آخر

(16)نوائے وقت 8/ ستمبر 1974ء ص1

(17)نوائے وقت 9/ ستمبر 1974ء ص1

(18) The Sunni Shia Conflict In Pakistan,by Musa Khan Jalalzai, published by Book Traders ,1998, page 235.

(19) Breaking The Curfew,By Emma Duncan, published by Arrow books, page 222-223

(20) خطباتِ ناصر جلد پنجم ص 631 تا 641

(21) الفضل 17/اپریل 1976ء ص2

(22) الفضل 17/ اپریل 1976ء ص6

(23) رپورٹ مجلسِ مشاورت 1976ء ص 5 تا9

(24) پاکستان ٹائمز، 14/ اکتوبر 1975ء

(25) روزنامہ ایکسپریس، 25 جنوری 2008ء ص1

نواب محمد احمد قصوری کا قتل

10 اور 11/ نومبر 1974ء کی درمیانی رات کو احمد رضا قصور ی صاحب اپنے والد نواب محمد احمد صاحب کے ہمراہ اپنی کار میں ایک شادی سے ماڈل ٹاؤن لاہور میں واقعہ اپنے گھر واپس آ رہے تھے۔ وہ کار کو ڈرائیو کر رہے تھے اور نواب محمد احمد صاحب ان کی ساتھ والی سیٹ پر بیٹھے تھے۔ ان کی والدہ اور ان کی بہن پچھلی سیٹ پر بیٹھی تھیں۔ جب وہ شاہ جمال شادمان کے چوک (Round about) پر پہنچے توان کی گاڑی پر گولیوں کی بوچھاڑ شروع ہو گئی۔ احمد رضا قصوری صاحب کو تو کوئی گولی نہیں لگی لیکن ان کے والد گولیوں کی زد میں آ گئے اور گاڑی کا فرش خون سے بھر گیا۔ وہ اسی گاڑی کو لے کر یو سی ایچ ہسپتال پہنچے لیکن ان کے والد جانبر نہ ہو سکے۔ ان کے سر پر ایک سے زیادہ گولیاں لگی تھیں۔ واقعہ کی اطلاع ملنے پر پولیس افسران جب ہسپتال پہنچے تو احمد رضا قصوری صاحب نے ایف آئی آر میں یہ درج کرانے پر اصرار کیا کہ میں اپوزیشن کا ممبر قومی اسمبلی ہوں اور مجھے وزیر اعظم نے قومی اسمبلی میں دھمکی دی تھی کہ میں اب تمہیں برداشت نہیں کر سکتا۔ قصوری صاحب نے وزیرِ اعظم کا نام ایف آئی آر میں درج کرانے پر اصرار کیا۔ بھٹو صاحب اس وقت اقتدار میں تھے تحقیقات بے نتیجہ رہیں اور احمد رضا قصوری صاحب ایک بار پھر بھٹو صاحب کی پارٹی میں شامل ہو گئے بلکہ ان کی تعریف میں خطوط بھی لکھتے رہے اور جب 1977ء کا الیکشن آیا تو وہ پی پی پی کے ٹکٹ کے لئے درخواست گزار بھی ہوئے مگر انہیں ٹکٹ نہیں دیا گیا۔

انجام بلند ایوانوں کا

بھٹو صاحب احمدیوں کے خلاف آئین میں ترمیم سے اپنے سیاسی مقاصد حاصل کرناچاہتے تھے یہ کوئی مفروضہ نہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے جس کا اقرار خود ان کے قریبی رفقاء اور وزراء جو اس کام میں ان کے ساتھ رہے تھے وہ بھی کرتے ہیں۔ بھٹو صاحب کی کابینہ کے وزیر برائے اطلاعات اور نشریات کوثر نیازی صاحب تحریر کرتے ہیں:۔

”یہ 15 ستمبر کی خنک رات تھی(جماعتِ احمدیہ کے خلاف آئینی ترمیم 7/ ستمبر کو منظور کی گئی تھی۔ناقل) وزیرِ اعظم بھٹو نے فرائض منصبی نمٹانے کے بعد عبدالحفیظ پیرزادہ، رفیع رضا اور مجھے ڈنر کے لئے اپنی قیام گاہ پر روکا ہوا تھا۔وہ حسبِ معمول تھوڑا سا بھنا ہوا قیمہ پلیٹ میں رکھے بیٹھے تھے۔بے تاثر چہرے کے ساتھ ہم تینوں کی طرف دیکھتے ہوئے نہایت سنجیدگی سے بولے۔

”یوم تشکر جس انداز میں منایا گیا ،اس کا حکومت کو کیا فائدہ ہوا؟“

وہ احمدیوں سے متعلق آئینی ترمیم کا حوالہ دے رہے تھے جس کی خوشی میں پاکستان بھر میں یوم تشکر منایا گیا تھا بھٹو صاحب کا خیال تھا کہ آئین میں اس ترمیم کا جو کریڈٹ حکومت کو ملنا چاہئے تھا وہ انہیں نہیں ملا،ان کو شکایت تھی کہ ... ”مولوی لوگ زبردستی اس کا سہرا اپنے سر باندھ رہے ہیں جس کے لئے ہمیں لوگوں کو اصل صورت حال بتانا چاہیے۔“

”لوگ اصل صورتِ حال جانتے ہیں جناب “ حفیظ پیرزادہ نے اپنی روایتی اکڑ فوں کا مظاہرہ کیا۔

”مولویوں کے کتنے آدمی اسمبلیوں میں ہیں ؟عوام انہیں خوب جانتے ہیں،وہ ان کے کھوکھلے دعووں کے فریب میں نہیں آئیں گے۔میرے خیال میں حکومت کو پورا کریڈٹ ملا ہے۔“

”آپ کا کیا خیال ہے مولانا“ وزیرِ اعظم بھٹو نے نیم واآنکھوں اور دبی دبی مسکراہٹ کے ساتھ مجھ سے سوال کیا ...

جب انہوں نے مجھ سے میرا خیال پوچھا تو ان کے ذہن میں در حقیقت صرف کریڈٹ کی بات نہ تھی معاملہ حقیقتاً کچھ اور تھا۔ان کی ذہنی کیفیت کا اندازہ لگا کر میں نے محتاط انداز میں بولنا شروع کیا۔“

”یہ درست ہے کہ علماء اس کا سہرا اپنے سر باندھ رہے ہیں کیونکہ وہ ایک مدت سے یہ مہم چلا رہے تھے۔ان کی طرف سے قربانیاں بھی دی گئیں لیکن فیصلہ تو بہر حال آپ کی حکومت نے کیا ہے۔اب جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں۔آپ انتخابات کے نقطہ نظر سے سوچ رہے ہیں ... اس اقدام سے مذہبی حلقوں میں آپ کی مقبولیت یقیناً بڑھی ہے لیکن انتخابات کے نتائج کبھی ان حلقوں میں مرتب نہیں ہوتے۔سیاسی فیصلہ ہمیشہ سوادِ اعظم کا ہوتا ہے۔۔“

"... 15/ ستمبر کی اُس رات جب بھٹو صاحب نے مجھ سے میرا خیال پوچھا تو میں نے اس وقت کی ملکی جذباتی فضا کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ہی انہیں پھر انتخابات کے انعقاد کا مشورہ دیا۔ مسٹر بھٹو احمدی مسئلہ پر قومی اسمبلی کا فیصلہ کرانے کے بعد انتخابات کے نقطہ نظر ہی سے سوچ رہے تھے۔" (1)

ہم اس مرحلہ پر ٹھہر کر جائزہ لیتے ہیں کہ 1974ء میں آئینی ترمیم کرنے کے بعد حکمران سیاستدان کس نفسیات سے حالات کا جائزہ لے رہے تھے۔ کچھ روز پہلے ہی آئین میں ایک انوکھی ترمیم کی گئی تھی۔ جس کے نتیجہ میں اسمبلی نے بزعمِ خود یہ اختیار لے لیا تھا کہ وہ یہ تعیّن کرے کہ کس گروہ کا مذہب کیا ہو۔ اس ترمیم کے نتیجہ میں بہت سے بھیانک مضمرات سامنے آ سکتے تھے اور ملک میں تنگ نظری اور مذہبی تعصب کا ایک نیا باب کھل سکتا تھا۔ مستقبل میں بہت سے آئینی اور قانونی مسائل سر اُٹھا سکتے تھے۔ اور ایسا ہوا بھی اور یہ عمل اب تک جاری ہے۔ انہی غلطیوں کی وجہ سے ملک ایک تاریک گڑھے میں گرتا جا رہا ہے۔ ملک کا امن و امان برباد ہو چکا ہے۔ لیکن اس وقت کے حکمرانوں کو اگر کوئی فکر لاحق تھی تو صرف یہ کہ ان کے ووٹوں پر کیا اثر پڑے گا۔ اس نام نہاد کارنامے کا کریڈٹ کسے کتنا مل رہا ہے۔ یہ فیصلہ اچھا تھا کہ برا، اس بحث کو تو رہنے دیں لیکن اس کا ملک پر بھی تو کوئی اچھا برا اثر پڑنا تھا۔ ان بالا ایوانوں میں یہ سوچنے کی زحمت کوئی نہیں کر رہا تھا۔ اتنی دور کی کون سوچتا اور ملک کی فکر کس کو تھی۔ یونین کونسل کے امیدواروں کی طرح صرف یہ فکر کی جا رہی تھی کہ اوہو کہیں مخالف اُس کا سہرا اپنے سر نہ باندھ لے۔ دور بینی کے دعووں کے باجود ان کی دور کی نظر کمزور ہو چکی تھی اور کوثر نیازی صاحب کو یہ تو یاد رہ گیا کہ اس رات بھٹو صاحب کی پلیٹ میں بھنا ہوا قیمہ پڑا ہوا تھا لیکن یہ ذکر انہوں نے نہیں کیا کہ ان فسادات میں کتنی بے رحمی سے احمدیوں کو شہید کیا گیا تھا۔ باپوں نے بیٹے کو شہید ہوتے دیکھا۔ بے بس بیٹیوں نے باپوں کو ظلم کی بھینٹ چڑھتے دیکھا اور انہیں تنہا اپنے باپ کی لاش اُٹھانی پڑی۔ ان کے گھروں اور دوکانوں کو نذرِ آتش کیا گیا۔۔ مریضوں کو دوائیاں بھی نہ مل سکیں۔ معصوم بچے مر گئے تو تدفین بھی نہ ہونے دی۔ سوشل اور اقتصادی بائیکاٹ کیا گیا۔ لیکن یاد رہا تو کیا؟ کہ بھٹو صاحب کی پلیٹ میں قیمہ پڑا ہوا تھا اور کوثر نیازی صاحب کو تو قیمے کی مقدار بھی یاد رہ گئی۔ اس محفل کی روئیداد سن کر تو بہادر شاہ ظفر کے دربار کی حالت یاد آجاتی ہے جس کا نقشہ کتاب بزمِ آخر میں کھینچا گیاہے۔ اس میں یہ ذکر تو

نہیں ملتا کہ اس دربار میں قوم اور ملک یا دہلی کے مستقبل کی بات بھی ہوتی تھی البتہ بہادر شاہ ظفر کے دستر خوان کی لمبی فہرست بڑے اہتمام سے لکھی گئی ہے۔ ایسی بزم بالآخر ”بزمِ آخر“ ہی ثابت ہوتی ہے۔

حکومت کے ایوانوں میں تو یہ گفتگو ہو رہی تھی کہ احمدیوں کو غیر مسلم قرار دے کر اور آئین میں یہ ترمیم کر کے وہ کتنے ووٹ حاصل کر سکتے ہیں اور دوسری طرف جماعتِ احمدیہ کا ردِ عمل کیا تھا، اس کا اظہار حضرت خلیفۃ المسیح الثالث نے اس گفتگو سے صرف دو روز قبل پہلے خطبہ جمعہ میں ان الفاظ میں فرمایا تھا:۔

”باقی جہاں تک کسی کے مسلم یا غیر مسلم ہونے کا سوال ہے یہ تو میں شروع سے کہہ رہا ہوں اس قرارداد سے بھی بہت پہلے سے کہتا چلا آیا ہوں کہ جس شخص نے اپنا اسلام لاہور کی مال (روڈ) کی دوکان سے خریدا ہو، وہ تو ضائع ہو جائے گا لیکن میں اور تم جنہیں خدا خود اپنے منہ سے کہتا ہے کہ تم (مومن) مسلمان ہو تو پھر ہمیں کیا فکر ہے۔ دنیا جو مرضی کہتی رہے تمہیں فکر ہی کوئی نہیں۔“

(خطبات ناصر جلد پنجم ص 641)

بہت سی وجوہات پر 1974ء میں قبل از وقت انتخابات تو نہیں کرائے گئے مگر 1977ء میں وقت سے کچھ عرصہ قبل انتخابات کرانے کا فیصلہ کیا گیا۔ انتخابات کا اعلان کرنے سے قبل بھٹو صاحب نے کچھ زرعی اصطلاحات نافذ کرنے کا فیصلہ کیا۔ نہری اراضی کے لئے زیادہ سے زیادہ ملکیت کی حد 150 ایکڑ سے کم کر کے 100 ایکڑ اور بارانی اراضی کی زرعی زمین کے لئے زیادہ سے زیادہ ملکیت کی حد 300 ایکڑ سے کم کر کے 200 ایکڑ کر دی گئی۔ ان کے ایک قریبی معتمد اور وفاقی وزیر اور ان کی انتخابی مہم کے نگران رفیع رضا صاحب لکھتے ہیں۔

“ZAB(Zulfikar Ali Bhutto)thought this would surprise the leftist in the PPP; having outflanked the rightist parties on the Qadiani issue, he now wanted to do the same to the left .”

ترجمہ: ذوالفقار علی بھٹو کا خیال تھا کہ یہ قدم پی پی پی میں بائیں بازو کے لوگوں کو حیران کر دے گا وہ قادیانی مسئلہ پر دائیں بازو کی جماعتوں کو مات دے چکے تھے اب وہ بائیں بازو کو بھی مات دینا چاہتے تھے۔(2)

باوجود تمام تجربہ اور ذہانت کے بھٹو صاحب اتنی سی بات بھی سمجھ نہیں پا رہے تھے کہ خواہ وہ زرعی اصطلاحات کا معاملہ ہو یا آئین میں مذہبی ترمیمات کا قضیہ ہو، ایسے فیصلوں کے ملک پر قوم پر اور سیاسی عمل پر دور رس نتائج مرتب ہوتے ہیں اور یہ سب معاملات پیشِ نظر رکھتے ہوئے ان کے بارے میں کوئی فیصلہ کرنا چاہئے۔ اگر صرف یہ سوچ کر یہ اقدامات کئے جائیں کہ اب اس کے ذریعہ میں دائیں بازو کو مات دے دوں یا اب اس کے ذریعہ میں بائیں بازو کو پچھاڑ دوں گا تو یہ تو بہت سطحی سوچ ہو گی اور نہ صرف ملک کے لئے بلکہ فیصلہ کرنے والوں کے حق میں بھی اس کے بہت خوفناک نتائج نکل سکتے ہیں اور ایسا ہی ہوا۔

جب الیکشن کا سال آیا بھٹو صاحب نے 7 /مارچ کو قومی اسمبلی کا انتخاب کرانے کا فیصلہ کیا اور سب سے پہلے وفاقی وزراء میں سے عبد الحفیظ پیرزادہ اور رفیع رضا صاحب اور امریکہ کے سفیر بایوروڈ (Byroad) کو اس فیصلہ سے مطلع کیا۔ ایک اہم ملکی معاملہ میں سب سے پہلے ایک غیر ملکی سفیر کو اعتماد میں لیا جا رہا تھا جب کہ خود ان کے اکثر وزراء اس فیصلہ سے بے خبر تھے۔ (3)

7/ جنوری 1977ء کو وزیرِ اعظم بھٹو نے قومی اسمبلی کے اجلاس میں ایک طویل تقریر کی۔ اس میں پہلے انہوں نے اپنے دورِ اقتدار کی کامیابیوں کا ذکر کیا۔ اسلام کے لئے اپنی خدمات کا ذکر کیا اور 1973ء کے آئین کی تشکیل کے کارنامے کا ذکر کیا۔ انہوں نے اپنی اقتصادی کامیابیوں کا ذکر کرتے ہوئے ڈرامائی انداز میں ایک بوتل نکالی کہ پاکستان میں ڈھوڈک کے مقام پر تیل دریافت ہوا ہے اور اپوزیشن کے لیڈر مفتی محمود صاحب کو سونگھائی کہ یہ تیل ہے۔ پھر انہوں نے انتخابات کی نئی تاریخ کا اعلان کیا۔ اس کے علاوہ اپنے دورِ اقتدار کو مزید مشرف بہ اسلام کرنے کے لئے انہوں نے یہ اعلان بھی کیا کہ اب سے جمعہ کے روز تعطیل ہو گی۔ اور کہا کہ اتوار کی تعطیل ایک غیر اسلامی چیز تھی جس کی اصلاح کر دی گئی ہے اور پھر فخریہ انداز میں کہا کہ یہ فرض بھی ہم گنہگاروں نے انجام دیا ہے۔ (6)

بھٹو صاحب کو ذاتی طور پر مذہب سے تو کم ہی دلچسپی تھی لیکن عموماً یہ رجحان ضعیف الاعتقادی کی طرف بھی لے جاتا ہے۔ چنانچہ اب جو انتخابات کا اعلان ہوا تو بھٹو صاحب نے نجومیوں اور دست شناسوں کی طرف رجوع کیا۔ ان کے ایک صوبائی وزیر انتخابات کی تاریخ کے سعد ہونے کی سند لینے کے لئے سری لنکا دوڑے

دوڑے گئے تاکہ وہاں کے نجومیوں کی رائے لی جا سکے۔ اور جب ان نجومیوں نے اس کے حق میں رائے دی تو انتخابات کا اعلان کیا گیا۔ پھر بھٹو صاحب نے اپنے ہاتھ کی لکیروں کا عکس ایک دست شناس کو بھجوایا۔

اس وقت اپوزیشن بٹی ہوئی تھی اور اس میں کوئی جان نظر نہیں آرہی تھی۔ لیکن جلد ہی اپوزیشن کی نو جماعتوں نے اتحاد کا اعلان کیا اور اقتدار میں آ کر نظامِ مصطفیٰ نافذ کرنے کا اعلان کیا۔ اور اس کے ساتھ ہی بھٹو صاحب کے خلاف ایک منظم اور جاندار انتخابی مہم شروع ہو گئی۔ دوسری طرف بہت سے لیڈروں نے جو پہلے کسی زمانے میں بھٹو صاحب کے سخت مخالف رہ چکے تھے پیپلز پارٹی کے ٹکٹ کے حصول کے لئے بزعمِ خود اپنے ہزاروں ساتھیوں سمیت پیپلز پارٹی میں شمولیت کے اعلانات کرنا شروع کر دیئے۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ بھٹو صاحب کے وزیر رفیع رضا صاحب کے مطابق اگر ان دعووں کی تعداد جمع کر دی جاتی تو پاکستان کی آبادی سے دوگنی نکلتی۔ لیکن بھٹو صاحب اس صورتِ حال میں بہت خوش تھے۔

جب انتخابات کے لئے پارٹی کے منشور کی تیاری کا مرحلہ آیا تو رفیع رضا صاحب بیان کرتے ہیں کہ وزیرِ اعظم ذوالفقار علی بھٹو صاحب نے خود اصرار کیا کہ حکومت کے کارنامے بیان کرتے ہوئے منشور میں یہ حصہ ضرور شامل کیا جائے

> ”نوے سالہ قدیم قادیانی مسئلہ کو خوش اسلوبی سے طے کر دیا۔ دستور میں واضح طور پر بیان کیا گیا ہے کہ جو شخص حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کو قطعی اور غیر مشروط طور پر آخری نبی نہیں مانتا وہ مسلمان نہیں۔“

(25-26)

بھٹو صاحب نے بھی ایک بھرپور انتخابی مہم شروع کی۔ پہلے جو ہوا تھا وہ تو ہوا تھا لیکن اس مہم کے دوران بھی بھٹو صاحب نے حضرت اقدس مسیح موعود علیہ السلام کے متعلق گستاخانہ کلمات استعمال کئے۔ انہوں نے قومی اتحاد کے لیڈروں کے متعلق یہ بیان دیا:۔

> ”... اگر الیکشن جیتنے کے لئے ان لوگوں کو مرزا غلام احمد قادیانی کی قبر پر بھی جانا پڑا تو یہ دریغ نہیں کریں گے“(4)

یہ نہ صرف ایک مامور من اللہ کی شان میں گستاخی تھی بلکہ سیاست کے اعتبار سے بھی تیسرے درجہ کی بیان بازی تھی۔ بہر حال اپنے بھیجے ہوئے مامورین کی شان میں گستاخی کا بدلہ خود خدا تعالیٰ لیتا ہے۔

بھٹو صاحب نے تو اپنی دانست میں احمدیوں کے خلاف آئین میں ترمیم کر کے مذہبی حلقوں کو مکمل طور پر لاجواب کر دیا تھا لیکن اب تمام مخالف جماعتیں قومی اتحاد کے نام سے اتحاد بنا کر ان کے خلاف صف آراء تھیں اور ان کا نعرہ تھا کہ وہ پاکستان میں نظامِ مصطفےٰ نافذ کریں گے اور مولویوں کا گروہ بھٹو صاحب کے خلاف سب سے زیادہ سرگرم تھا۔

مقررہ تاریخوں کو انتخابات ہوئے۔ نتائج کے مطابق پیپلز پارٹی نے 136 اور مخالف قومی اتحاد نے صرف 36 سیٹوں پر کامیابی حاصل کی۔ اپوزیشن نے انتخابات میں وسیع پیمانے پر دھاندلیوں کا الزام لگایا اور نتائج کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ اور اس کے ساتھ صوبائی انتخابات کے بائیکاٹ کا اعلان کر دیا گیا۔ جو کہ کامیاب رہا اور بہت کم لوگ صوبائی انتخابات میں ووٹ ڈالنے آئے۔

اپوزیشن وزیر اعظم کے مستعفی ہونے اور نئے انتخابات کا مطالبہ کر رہی تھی۔ یہ مہم تیز تر ہوتی گئی۔ بھٹو صاحب کے اکثر پرانے رفقاء انہیں چھوڑ چکے تھے یا پھر بھٹو صاحب نے خود ہی انہیں اپنے غضب کا نشانہ بنا کر اپنے سے علیحدہ کر دیا تھا۔ با وجود ایک طاقتور اور قدآور شخصیت ہونے کے اس وقت وہ تنہا اور بے بس نظر آرہے تھے۔ ان کے پرانے رفیق اور سابق وفاقی وزیر رفیع رضا صاحب لکھتے ہیں:

"پی پی پی کے ابتدائی گروہ میں سے اب صرف ممتاز بھٹو ذوالفقار علی بھٹو کے ساتھ تھے اور اس کی وجوہات بھی خاندانی تھیں۔ میں اور ممتاز اس بات پر تبصرہ کیا کرتے تھے کہ کس طرح اس وقت بھٹو صاحب نے اپنی ایجنسیوں کی بجائے ہمارے سے رجوع کیا ہے اگرچہ میں اس وقت وزیر نہیں تھا۔ گو بد قسمتی سے اس وقت تک بہت کچھ بگڑ چکا تھا۔ وہ بالکل بے بس نظر آتے تھے۔ ان کے پاس کہنے کو کوئی نئی بات نہیں تھی۔ ان کے پاس کرنے کو کچھ نیا نہ تھا۔ وہ پی پی پی کے پرانے دوستوں اور ساتھیوں کو کھو چکے تھے۔ پبلک اور پارٹی کا جو کچھ بھی بچا تھا ان کی مدد کو نہیں آ رہا تھا۔ اور اب انہیں احساس ہو گیا ہو گا کہ وہ طاقت پر بہت زیادہ انحصار

کرتے رہے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ ممتاز نے کچھ مہینے پہلے یہ پیشگوئی کی تھی کہ ذوالفقار علی بھٹو جس سمت میں جا رہے ہیں اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ فوج ان کا تختہ الٹ دے گی۔"

اس وقت پیپلز پارٹی کے سیکریٹری جنرل مبشر حسن صاحب تھے۔ وہ پہلے بھی تحریری طور پر بھٹو صاحب کو متنبہ کر چکے تھے کہ اس رویہ کا انجام اچھا نہ ہو گا۔ وہ اس صورتِ حال میں بالکل دل برداشتہ ہو چکے تھے۔ انہوں نے بھی مستعفی ہونے کا فیصلہ کرلیا لیکن اس سے پہلے انہوں نے کئی گھنٹے وزیرِ اعظم سے ملاقات کی۔ اس کے کچھ دنوں بعد بھٹو صاحب نے رفیع رضا صاحب کو اس ملاقات کی تفصیلات بتائیں تو بھٹو صاحب کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ انہوں نے کہا کہ مبشر نے الزام لگایا ہے کہ ان کے رشتہ دار اور ملازم بد عنوانیاں کر رہے ہیں اور اصرار کیا کہ وہ فون اُٹھا کر متعلقہ شعبہ سے اس کی تصدیق کریں۔ بھٹو صاحب نے کہا مبشر کا یہ الزام غلط تھا۔ مبشر حسن صاحب نے بھٹو صاحب کو مشورہ دیا کہ وہ اپنے ارد گرد درباریوں اور بیورو کریسی کے افراد سے نجات حاصل کریں اور مذہبی جماعتیں جس نظامِ مصطفےٰ ﷺ کا مطالبہ کر رہی ہیں اسے تسلیم نہ کریں اور یہ مطالبہ کیا کہ پارٹی کو اس کی اصلی حالت میں واپس لایا جائے اور اس بحران سے نمٹنے کے لئے بنیادی تبدیلیاں کی جائیں۔ بھٹو صاحب نے کہا کہ اس بحران میں یہ تبدیلیاں کرنا ممکن نہیں ہے۔ پھر بھٹو صاحب نے دکھ سے پوچھا کہ کیا وجہ ہے کہ پی پی پی میں ان کے پرانے ساتھی انہیں چھوڑ چکے ہیں۔ بہتر ہوتا کہ بھٹو صاحب اگر یہ سوال اپنے آپ سے پوچھتے۔(7)

اس صورتِ حال میں بھٹو صاحب کو یہی سوجھی کہ ایک مرتبہ پھر مولویوں کو خوش کر کے اپنے خلاف برپا اس شورش کو ٹھنڈا کریں۔ چنانچہ انہوں نے 18 /اپریل 1977ء کو ایک پریس کانفرنس میں ملک میں شریعت کے نفاذ کا اعلان کیا اور ابتدائی اقدامات کے طور پر ملک میں شراب کے استعمال پر، قمار بازی پر اور نائٹ کلبوں پر پابندی لگا دی اور ملک میں اسلامی نظریاتی کونسل کے دوبارہ احیاء کا اعلان کیا اور مودودی صاحب، مفتی محمود صاحب، شاہ احمد نورانی صاحب اور احتشام الحق تھانوی صاحب کو کونسل میں شامل کرنے کا اعلان کیا اور یہ یقین دلایا کہ اس کونسل کی سفارشات کو چھ ماہ کے اندر منظور کر لیا جائے گا۔ اب وہ مخالف مولویوں کے آگے گھٹنے ٹیک کر اپنے اقتدار کی طوالت کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہے تھے۔ لیکن وہ ایک بات بالکل

سمجھ نہیں پا رہے تھے کہ مولوی کو اس بات سے کم ہی دلچسپی ہوتی ہے کہ ملک میں اسلامی آئین ہے کہ غیر اسلامی آئین ہے۔ چھٹی جمعہ کو ہو رہی ہے یا اتوار کو ہو رہی ہے۔ نائٹ کلب کھلے ہیں یا درپردہ کام کر رہے ہیں۔ انہیں صرف اور صرف حصول اقتدار سے غرض ہوتی ہے۔

بھٹو صاحب کے خلاف تحریک کی شدت میں کوئی کمی نہیں آ رہی تھی اور ملک کی حالت بد سے بد تر ہوتی جا رہی تھی۔ جب نئی قومی اسمبلی نے کام شروع کیا تو 28 / اپریل 1977ء کو بھٹو صاحب نے اس سے خطاب کیا۔ انہوں نے اس تقریر میں الزام لگایا کہ ان کی حکومت کے خلاف اور پاکستان کے خلاف بیرونی ہاتھ سازش کر رہے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ یہ ہاتھی ہیں جو کہ ملک کے خلاف سازش کر رہے ہیں۔ ان ہاتھیوں کی یادداشت بہت تیز ہوتی ہے انہیں یاد ہے کہ ویت نام کے مسئلہ میں، چین سے تعلقات قائم کرنے میں ہم نے ان کی مرضی کے خلاف کام کیا تھا۔ ہم نے عرب ممالک کو فوجی مدد دی تھی۔ اس کا بدلہ لینے کے لئے ان ہاتھیوں نے اس حکومت کے خلاف تحریک چلوانے کے لئے پانی کی طرح پیسہ بہایا ہے۔ یہاں تک کہ کراچی میں ڈالر کی قیمت گر کر چھ سات روپے فی ڈالر تک آگئی۔ اس بیرونی ہاتھ نے ملک کو مفلوج کرنے اور پہیہ جام کرنے کے لئے تخریب کاروں کو تربیت دی۔ انہوں نے کہا کہ وہ جانتے ہیں میں پاکستان کے استحکام کا ستون ہوں۔ ہاتھیوں نے اس بات کو پسند نہیں کیا کہ پاکستان میں اسلامی سربراہی کانفرنس ہوئی، ہم نے یونان اور ترکی کے تنازعہ کو ختم کرانے کی کوشش کی۔ کوریا نے اپنا تنازعہ حل کرنے کے لئے پاکستان سے رجوع کیا۔ پاکستان نے فرانس سے ایٹمی ری پراسسنگ پلانٹ لینے کا معاہدہ کیا۔ انہوں نے کہا کہ اگر پاکستان کو نقصان پہنچا تو متحدہ عرب امارات، عمان اور سعودی عرب جیسے مسلم ممالک کی پیٹھ میں چھرا گھونپا جائے گا۔

اس تقریر کا لبِ لباب یہ تھا کہ یہ تحریک، یہ سیاسی ایجی ٹیشن بیرونی ہاتھ کی کارگزاری ہے۔ بھٹو صاحب نے اس الزام کو اپنی کتاب If I am Assassinated میں دہرایا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ قومی اتحاد میں شامل اکثر جماعتوں کو اس سازش کا کم از کم پورا علم نہیں تھا۔ خاکسار تحریک کو اس کا علم نہیں تھا NDP کو اس کا پورا علم نہیں تھا۔ جو جماعت پوری طرح اس سازش میں رابطہ بنی ہوئی تھی وہ جماعتِ اسلامی تھی۔ اور اس جرم کو چھپانے کے لئے اب جماعتِ اسلامی کے امیر میاں طفیل محمد امریکہ پر تنقید کرتے رہتے ہیں تا کہ پاکستان کے سادہ لوح

لوگوں سے حقائق کو پوشیدہ رکھا جا سکے۔ بھٹو صاحب لکھتے ہیں کہ اس اپوزیشن نے میری حکومت کا تختہ الٹنے کے لئے الیکشن سے قبل بیرونی طاقت سے 25 کروڑ اور الیکشن کے بعد 5 کروڑ لئے تھے۔ (8)

یہاں پر طبعاً ایک سوال اُٹھتا ہے۔ اور وہ یہ کہ تین سال قبل 1974ء میں جب احمدیوں کے خلاف تحریک چل رہی تھی۔ ان کا خون بہایا جا رہا تھا، ان کی املاک نذرِ آتش کی جا رہی تھیں، ان کا بائیکاٹ کر کے ان کا جینا دوبھر کیا جا رہا تھا اس وقت آپ نے برملا کہا تھا کہ نہ صرف آپ بلکہ دوسرے بھی یہ دیکھ رہے ہیں کہ اس کے پیچھے ایک بیرونی ہاتھ کام کر رہا ہے۔ مگر آپ نے نہ قوم کو یہ بتایا کہ وہ ہاتھ کون سا تھا اور نہ ہی اس کی سازش کے رد کرنے کے لئے کوئی مؤثر قدم اُٹھایا بلکہ اس کی سازش کا حصہ بن گئے اور آئین میں ترمیم کر کے احمدیوں کی مذہبی آزادی غصب کر لی۔ آج قومی اسمبلی کے سامنے آپ یہ کہنے پر مجبور تھے کہ ایک بیرونی ہاتھ آپ کی حکومت کے خلاف سازش کر رہا ہے۔ ملک کے استحکام کے خلاف سازش کر رہاہے اور یہ بیرونی ہاتھ دوسرے مسلمان ممالک کے لئے بھی خطرہ بن سکتا ہے۔ اگر بر وقت اس بیرونی ہاتھ کو روک دیا جاتا اور اسے کھل کر کھیلنے کا موقع نہ دیا جاتا تو یہ نوبت نہ آتی۔

بھٹو صاحب نے فوج کی مدد لینی چاہی کہ کسی طرح گولی چلا کر اس شورش کو ختم کیا جائے اور ملک کے تین شہروں کا نظم و نسق بھی فوج نے سنبھالا مگر جلد ہی جرنیلوں کے بدلتے ہوئے تیور ان کو نظر آ گئے۔ کچھ عرب ممالک نے بیچ میں آ کر مفاہمت کی کوشش کی مگر بے سود۔ عین اس وقت جب کہ پورا ملک ایک بحران کی لپیٹ میں تھا بھٹو صاحب نے کچھ عرب ممالک کا دورہ کیا۔

اپوزیشن کے قومی اتحاد نے مئی 1977ء میں اپنے مطالبات پیش کئے جس میں یہ مطالبہ بھی شامل تھا کہ نئے انتخابات کے نتیجہ میں جو صوبائی اور قومی اسمبلیاں وجود میں آئی تھیں ان کو تحلیل کیا جائے۔ مذاکرات کا لمبا دور شروع ہوا۔ 4/جولائی کی رات کو مذاکرات کامیابی کے قریب پہنچتے لگ رہے تھے۔ بہت سی تگ و دو کے بعد قومی اتحاد نے حتمی مطالبات سامنے رکھ دیئے تھے اور بھٹو صاحب نے تھکا دینے والے مذاکرات سے گزر کر آخر اس رات کو اپنے وزراء کو مطلع کر دیا تھا کہ وہ اب اس مفاہمت پر دستخط کردیں گے۔ وزیر اعظم کا یہ فیصلہ سن کر اور اس پر بات کر کے ان کے کچھ وزراء رات کے ڈیڑھ بجے اپنے گھروں کو واپس گئے۔ اور اسی رات

فوج نے ملک میں مارشل لا لگا دیا۔ یہ مارشل لاء فوج کے چیف آف سٹاف جنرل ضیاء الحق صاحب کے حکم پر لگایا گیا تھا۔ یہ وہی جنرل ضیاء الحق صاحب تھے جنہیں کئی ایسے جرنیلوں کی موجودگی میں جو ان سے سینیئر تھے بھٹو صاحب نے چیف آف سٹاف مقرر کیا تھا۔ یہ وہی جنرل ضیاء الحق صاحب تھے جنہوں نے اس وقت جب بھٹو صاحب کے خلاف قومی اتحاد کی تحریک چل رہی تھی تو انہوں نے بھٹو صاحب کے عرب ممالک کے دورہ پر روانہ ہونے سے قبل کہا تھا کہ بھٹو صاحب کی حکومت سے وفاداری قائدِ اعظم کے ارشاد کے مطابق ان کا ایک اہم اور واضح فرض ہے۔ (9)

یہ وہی جنرل ضیاء صاحب تھے کہ جب جرنیلوں کے ساتھ میٹنگ میں بھٹو صاحب کے ایک وزیر نے بحران کے ممکنہ حل بیان کرتے ہوئے کہا تھا کہ ایک راستہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ فوج اقتدار سنبھال لے اور بعد میں انتخابات کرائے۔ تو جنرل ضیاء صاحب نے فوراً کھڑے ہو کر اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر جھک کر کہا تھا:

"No Sir, we have no such intention, we are the right arm of the government. We are loyal and we will remain loyal".

نہیں سر، ہمارا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہم حکومت کا دایاں بازو ہیں۔ ہم وفادار ہیں اور وفادار رہیں گے۔ (10)

اور کچھ ہی عرصہ بعد انہی جنرل ضیاء صاحب نے ان کا تختہ الٹ کر انہیں قید کر دیا اور پھر تختہ دار تک پہنچا دیا۔ باقی رہے نام اللہ کا۔

جنرل ضیاء کا دورِ حکومت شروع ہوتا ہے

بھٹو صاحب کا تختہ الٹنے کے بعد جنرل ضیاء الحق نے اپنی پہلی نشری تقریر میں پاکستان کے عوام کو یقین دلایا کہ وہ نوے دن کے اندر اندر ملک میں نئے انتخابات کرا کے رخصت ہو جائیں گے۔ اور اس آپریشن کا نام انہوں نے آپریشن فیئر پلے رکھا۔ بھٹو صاحب کو کچھ ہفتہ نظر بند رکھ کر 28 / جولائی 1977ء کو رہا کر دیا گیا۔ ابتداء میں ضیاء صاحب نے بھٹو صاحب کے مخالف کوئی خاص جذبات ظاہر نہیں کئے بلکہ ان کے متعلق کچھ تعریفی کلمات بھی کہے۔ اگست کے شروع میں جب بھٹو صاحب لاہور گئے تو لوگوں کے عظیم ہجوم نے ان کا استقبال کیا۔ لوگوں کی اتنی بڑی تعداد انہیں ایئر پورٹ پر الوداع کہنے آئی تھی کہ عملاً ایئر پورٹ پر ان کی پارٹی

کے کارکنوں کا قبضہ ہو گیا تھا۔ یہ سب کچھ ظاہر کر رہا تھا کہ اب تک ان کی مقبولیت بڑی حد تک قائم ہے۔ جلد ہی کچھ ایسے آثار ظاہر ہونے لگے کہ ضیاء حکومت کے کچھ اور ارادے بھی ہیں۔ بھٹو صاحب نے فیڈرل سیکیورٹی فورس کے نام سے ایک تنظیم قائم کی تھی۔ ان کے مخالفین کا کہنا تھا کہ یہ ان کی ذاتی پولیس کے طور پر کام کرتی تھی۔ اس تنظیم کے سربراہ مسعود محمود کو گرفتار کر لیا گیا۔ 5/ ستمبر 1977ء کو بھٹو صاحب کو دوبارہ گرفتار کر لیا گیا۔ اس بار گرفتار کرنے والوں کے تیور بگڑے ہوئے تھے۔ گرفتار کرنے والوں نے ان پر سٹین گنیں تانی ہوئی تھیں۔ فوج کے کمانڈو ان کی بیٹیوں کے کمروں میں داخل ہو گئے۔ ملازموں کو مارا پیٹا گیا۔ پورے گھر کو الٹ پلٹ دیا گیا۔ 13/ ستمبر کو انہیں جسٹس صمدانی کے سامنے پیش کیا گیا۔ ان پر احمد رضا قصوری کے والد نواب محمد احمد کے قتل کا الزام تھا۔ آج بھٹو صاحب اسی جج کے سامنے پیش ہو رہے تھے، جس جج کو کچھ سال قبل انہوں نے ربوہ سٹیشن کے واقعہ کی تحقیق کے لئے مقرر کیا تھا۔ جسٹس صمدانی نے بھٹو صاحب کی درخواستِ ضمانت منظور کر لی مگر انہیں کچھ روز کے بعد ایک بار پھر مارشل لاء قواعد کے تحت گرفتار کر لیا گیا۔

مارشل لاء حکّام کے مطابق بھٹو صاحب پر قتل کے الزام کی بنیاد یہ تھی کہ جب 5/ جولائی 1977ء کویعنی جس روز مارشل لاء لگایا گیا تو فیڈرل سکیورٹی فورس کے ڈائریکٹر جنرل مسعود محمود صاحب کو بھی گرفتار کر لیا گیا۔ جب فوج نے انہیں گرفتار کر کے اپنی تحویل میں رکھا تو پھر ”ضمیر کے بوجھ“ سے مجبور ہو کر 14/ اگست 1977ء کو انہوں نے چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر جنرل ضیاء صاحب کو خط لکھا جس میں انہوں نے اعتراف کیا کہ اس وقت کے وزیرِ اعظم ذوالفقار علی بھٹو صاحب نے انہیں ہدایت دی تھی کہ احمد رضا قصوری صاحب کو قتل کرایا جائے اور پھر ان کی ہدایت پر فیڈرل سیکیورٹی فورس کے کارندوں سے لاہور میں احمد رضا قصوری صاحب پر قاتلانہ حملہ کرایا گیا، جس میں ان کے والد نواب محمد احمد قتل ہو گئے مگر احمد رضا قصوری صاحب بچ گئے۔ پھر مسعود محمود صاحب نے اسلام آباد کے ایک مجسٹریٹ کے رو برو بھی یہ بیان دیا۔ پھر7/ ستمبر 1977ء کو مسعود محمود نے وعدہ معاف گواہ بننے کی درخواست بھی دے دی۔ (11)

11/ اکتوبر 1977ء کو لاہور ہائی کورٹ میں بھٹو صاحب کا مقدمہ شروع ہوا۔ لاہور ہائی کورٹ کے چیف جسٹس مولوی مشتاق صاحب اس بنچ کی صدارت کر رہے تھے اور ان کے علاوہ چار اور جج بھی اس بنچ میں تھے

جن میں سے ایک جسٹس آفتاب بھی تھے۔ جسٹس آفتاب جماعتِ اسلامی سے روابط رکھتے تھے۔ جن جج صاحب نے بھٹو صاحب کی ضمانت کی درخواست منظور کی تھی انہیں اس بنچ میں شامل نہیں کیا گیا تھا۔ بھٹو صاحب پر فردِ جرم لگائی گئی اور انہوں نے Plead کیا کہ وہ not guilty ہیں۔ اس پر کارروائی شروع ہوئی۔ پہلے احمد رضا قصوری صاحب نے کئی دن گواہی دی کہ ان کے بھٹو صاحب سے اختلافات کیسے شروع ہوئے اور کس طرح بھٹو صاحب نے ان کو قومی اسمبلی میں دھمکی دی۔ انہوں نے کہا کہ وہ اپنے والد کے قتل کے بعد پیپلز پارٹی میں دوبارہ شامل ہو گئے اور ان کو تعریفی خطوط بھی لکھتے رہے کیونکہ وہ اپنی جان بچانا چاہتے تھے۔ پھر مسعود محمود صاحب نے نو دن میں اپنی گواہی مکمل کی۔ انہوں نے دعویٰ کیا کہ بھٹو صاحب نے انہیں مجبور کیا تھا کہ وہ ڈائریکٹر انٹیلی جنس فیڈرل سیکیورٹی فورس کو حکم دیں کہ وہ اپنے کارندوں کے ذریعہ احمد رضا قصوری صاحب کو قتل کرائیں۔ اس کے بعد فیڈرل سیکیورٹی فورس کے دیگر کارندوں کے بیانات قلمبند کئے گئے۔ بھٹو صاحب کے وکیل کو شکایت تھی کہ جج صاحبان کی تمام پابندیا ں ان کے لئے اور ان کے مددگار وکلاء کے لئے ہیں۔ بھٹو صاحب اس دوران بیمار ہو گئے انہیں ملیریا اور انفلوائنزا ہو گیا تھا۔ تین دن کے توقف کے بعد ان کے بغیر ہی کارروائی جاری رہی۔ دوبارہ کارروائی شروع ہوئی تو ایک مرحلہ پر بھٹو صاحب اور جج صاحبان میں تلخ کلامی ہو گئی۔ بھٹو صاحب نے اس دوران کہا کہ وہ جج صاحبان کا توہین آمیز رویہ کافی برداشت کر چکے ہیں۔ چیف جسٹس مولوی مشتاق صاحب نے پولیس کو کہا کہ اس شخص کو لے جاؤ جب تک اس کے ہوش و حواس بجا نہ ہو جائیں۔ 18/ دسمبر کو بھٹو صاحب نے درخواست دی کہ ان کے مقدمہ کو کسی اور بنچ کی طرف منتقل کیا جائے۔ لیکن یہ درخواست مسترد کر دی گئی۔ اب تلخی اتنی بڑھ گئی تھی کہ بھٹو صاحب کے وکیل اعوان صاحب نے عدالت کو مخاطب کر کے کہا کہ ان کے موکل نے ان کا وکالت نامہ منسوخ کر دیا ہے اور اپنے آپ کو عدالت کی کارروائی سے لاتعلق کر لیا ہے۔ اس سے عدالت کے غصہ میں اضافہ ہو گیا۔ بھٹو صاحب کی طرف سے گواہوں پر جرح بھی بند کر دی گئی۔ لیکن بھٹو صاحب کے پاس ایک موقع آنا تھا جب انہیں اپنے دفاع میں بولنے کا موقع ملنا تھا۔ یعنی جب عدالت میں ان کا بیان لیا جانے کا وقت آئے گا۔ جب 24/ جنوری 1978ء کو بھٹو صاحب کے بیان کا پہلا دن آیا اور بھٹو صاحب کمرہ عدالت میں داخل ہوئے تو وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے

کہ کمرہ عدالت میں جج اور وکلاء تو موجود تھے لیکن سامعین موجود نہیں تھے۔ کورٹ روم خالی تھا۔ انہیں استفسار پر بتایا گیا کہ اب سے مقدمہ کی کارروائی In Camera ہو گی۔ اس سے پہلے لاہور ہائی کورٹ کے چیف جسٹس مولوی مشتاق صاحب نے ایک پریس کانفرنس میں کہا تھا کہ کارروائی دن کی روشنی میں ہو گی اور اب جب کہ بھٹو صاحب کے جواب کا وقت آیا تو فیصلہ کیا گیا کہ کارروائی خفیہ ہو گی۔ بھٹو صاحب نے اس پر شدید احتجاج کیا۔ انہوں نے کہا کہ نہ صرف انصاف ہونا چاہئے بلکہ یہ نظر بھی آنا چاہئے کہ انصاف ہو رہا ہے۔ انہوں نے کہا کہ آپ اسے انصاف کہتے ہیں۔ آپ اسے مقدمہ چلانا کہتے ہیں۔ یہ بھی بھول جائیں کہ میں ملک کا صدر اور وزیرِ اعظم رہا ہوں۔ اسے بھی بھول جائیں کہ میں ملک کی سب سے بڑی پارٹی کا سربراہ ہوں۔ ان سب چیزوں کو بھول جائیں لیکن میں پاکستان کا شہری تو ہوں اور میں قتل کے مقدمے کا سامنا کر رہا ہوں۔ ایک عام آدمی کو بھی انصاف کے حصول سے نہیں روکا جاتا۔

بھٹو صاحب کو اس بات پر بہت اعتراض تھا کہ جب کہ ان کے خلاف پیش ہونے والے گواہوں کے بیان کو سرِ عام سنا گیا اور ان کے بیانات کی پوری طرح تشہیر ہوئی لیکن جب اس بات کی باری آئی کہ وہ جواب دیں تو خفیہ کارروائی شروع ہو گئی۔ انہوں اس بات کا تذکرہ اپنی کتاب If I am assassinated میں بھی کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:۔

"When I protested on the conversion of my trial for murder from open proceeding to in camera trial for my defence somehow I could not make clear to judges the differences between publicity and justice. I was demanding a public trial because the concept of justice is inextricably intertwined with an open trial, especially if it involves capital punishment ....The last and final messenger of God dispensed justice in an open mosque and not as a cloistered virtue".

جب میں نے اس بات پر احتجاج کیا کہ جب میرے دفاع کا وقت آیا تو کیوں میرے مقدمہ کو ایک کھلی کارروائی سے ایک خفیہ کارروائی میں تبدیل کر دیا گیا ہے تو میں ججوں پر یہ بات واضح نہ کر سکا کہ تشہیر اور

انصاف میں کیا فرق ہے۔ میں اس بات پر اصرار کر رہا تھا کہ سرِ عام کارروائی ہو کیونکہ کھلی کارروائی اور انصاف ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں خاص طور پر جب ایک قتل کے مقدمہ کی کارروائی کی جا رہی ہو … خدا کے آخری پیغمبر ﷺ بھی مسجد میں سرِ عام انصاف فرمایا کرتے تھے۔ یہ کام کسی خفیہ گوشے میں نہیں کیا جاتا تھا۔

بھٹو صاحب کے دلائل وزنی ہیں۔ واقعی اگر انصاف ہو رہا ہے تو سب کو نظر آنا چاہئے کہ انصاف ہو رہا ہے۔ خفیہ کارروائی یا جیسا کہ خود بھٹو صاحب نے الفاظ استعمال کئے ہیں IN CAMERA کارروائی سے تو یہی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ انصاف کے تقاضے پورے نہیں کئے جا رہے۔ لیکن اس کتاب میں In Camera کے الفاظ پہلے بھی کہیں آئے ہیں۔ کچھ برس پہلے بھٹو صاحب نے خود ہی قومی اسمبلی میں ایک کارروائی کے متعلق اعلان کیا تھا کہ وہ In Camera ہو گی۔ یعنی جب پوری قومی اسمبلی نے جماعت کے وفد کا موقف سنا تھا۔ یہ کارروائی تو بڑے اہتمام سے In Camera اور خفیہ کی گئی تھی اور اس کے بعد قرارداد منظور کی گئی تھی کہ احمدیوں کو آئین میں غیر مسلم اقلیت قرار دے دیا جائے۔ بھٹو صاحب نے فیصلہ کے بعد تقریر کرتے ہوئے یہ وعدہ کیا تھا کہ اس کارروائی کو منظرِ عام پر لایا جائے گا۔ لیکن تین سال گزر گئے ایسا نہیں کیا گیا۔ پھر اگر بھٹو صاحب کا کلیہ تسلیم کر لیا جائے تو یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ ۱۹۷۴ء میں انصاف کے کم از کم تقاضے پورے ہو گئے تھے۔ آج انہی کے الفاظ ان کو ملزم کر رہے تھے۔ اور دوسری طرف جماعت کے مخالفین کو کھلی چھٹی تھی کہ وہ اخبارات میں اعلان کریں کہ ہم نے یہ کارنامہ سرانجام دیا، ہم نے وہ کارنامہ کیا۔ لیکن جماعتِ احمدیہ کو کارروائی کے دوران بھی اس کارروائی کی کاپی نہیں مہیا کی گئی تھی تا کہ وہ اگلے روز کے جوابات سہولت سے تیار کر سکیں۔ جبکہ اسمبلی ممبران کو روزانہ کی بنیاد پر کارروائی کی کاپی مہیا کی جا رہی تھی۔ آج خدا کی قدرت خود بھٹو صاحب کے منہ سے نکلوا رہی تھی کہ In Camera کارروائی سے تو انصاف کے کم از کم تقاضے بھی پورے نہیں ہوتے۔

ہائی کورٹ کا فیصلہ

بہر حال اب فیصلہ کا وقت قریب آ رہا تھا۔ ہائی کورٹ نے 18 /مارچ 1978ء کو فیصلہ سنانا تھا۔ فیصلہ سے قبل بھاری پیمانے پر پیپلز پارٹی کے کارکنان کی گرفتاریاں شروع ہو چکی تھی۔ بڑے شہروں میں بڑے پیمانے پر پولیس گشت کر رہی تھی۔ فیصلہ سنایا گیا فیصلہ متفقہ تھا۔ ہائی کورٹ نے سابق وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو صاحب کو سزائے موت سنائی۔ اور سپریم کورٹ میں اپیل کرنے کے لئے صرف سات روز دیئے گئے تھے۔

تفصیلی فیصلہ جسٹس آفتاب نے لکھا تھا جو جماعتِ اسلامی کے ہمدرد سمجھے جاتے تھے۔ اس تفصیلی فیصلہ کا ایک متنازع حصہ جس پر بھٹو صاحب کو بھی بہت اعتراض تھا اس میں بھٹو صاحب کے بارے میں یہ تبصرہ کیا گیا تھا:۔

"It is, as is clear from the oath of the Prime Minister as prescribed in the constituition, a constituitional requirement that the Prime Minister of Pakistan must be a Muslim and a believer inter alia in the total requirement and teachings of the Holy Quran and the Sunnah.He could not be a Muslim only in name who may flout with impunity his oath without caring for ugly consequences"........

یعنی آئین میں وزیرِ اعظم کے لئے مقرر کردہ حلف نامے سے یہ واضح ہے کہ وزیر اعظم کو مسلمان ہونا چاہئے اور اسے قرآن اور سنت کے تمام تقاضوں اور تعلیمات پر یقین رکھنا چاہئے نہ کہ ایسا شخص جو کہ صرف نام کا مسلمان ہو اور نتائج کی پرواہ کئے بغیر اپنے حلف کی توہین کرتا پھرے ... ۔(3)

جب 1973ء کے آئین میں یہ عجیب قسم کے حلف نامے رکھے گئے تو گزشتہ دساتیر کی نسبت ان کو مختلف اس لئے رکھا گیا تھا کہ کہیں کوئی احمدی ان عہدوں پر مقرر نہ ہو سکے اور اس طرح مولویوں کو اور ان کے پیچھے کام کرنے والے ہاتھوں کو خوش کیا گیا تھا لیکن اب انہیں حلف ناموں کی بنیاد پر اس آئین کے بنانے والے کے خلاف فیصلہ سنایا جا رہا تھا۔

سپریم کورٹ میں اپیل

جیسا کہ توقع تھی بھٹو صاحب نے اس فیصلہ کے خلاف سپریم کورٹ آف پاکستان میں اپیل کی۔ اب ان کے کیس کی پیروی کرنے والے وکلاء کی قیادت سابق اٹارنی جنرل یحیٰی بختیار کر رہے تھے۔ وہی یحیٰی بختیار جنھوں نے قومی اسمبلی میں اٹارنی جنرل کی حیثیت سے حضرت خلیفۃ المسیح الثالث ؒ سے سوالات کئے تھے۔ وہ آج بھٹو صاحب کی سزائے موت کے خلاف اپیل کے لئے سپریم کورٹ میں پیش ہو رہے تھے۔ یحیٰی بختیار صاحب کی اعانت وکلاء کی ایک ٹیم کر رہی تھی، جس میں ملک کے سابق وزیرِ قانون عبد الحفیظ پیرزادہ صاحب بھی شامل تھے۔ جب 1974ء کا واقعہ ہوا تو پیرزادہ صاحب اس سٹیرنگ کمیٹی کے سربراہ بھی بنے تھے جس نے قومی اسمبلی میں کارروائی کرنے کا فیصلہ کیا تھا اور ملک کے وزیرِ قانون کی حیثیت سے 1974ء کی آئینی ترمیم میں ان کا بہت کچھ عمل دخل تھا۔ پہلے تو یہ امید تھی کہ فیصلہ چھ سات ہفتوں میں ہو جائے گا مگر پھر یہ کارروائی دس ماہ چلی۔ اس دوران ضیاء صاحب کی مارشل لاء حکومت اپنے پاؤں مضبوطی سے گاڑتی گئی۔ انتخابات کرانے کا منصوبہ کھٹائی میں ڈال دیا گیا۔

16/ مئی کو بھٹو صاحب کو کوٹ لکھپت جیل لاہور سے راولپنڈی جیل منتقل کیا گیا۔ پھانسی کی سزا پانے تک بھٹو صاحب یہیں پر رہے۔ کرنل رفیع صاحب یہاں پر ڈیوٹی پر تھے، انہوں نے اپنی کتاب میں اس دور میں بھٹو صاحب کی گفتگو کا خلاصہ درج کیا ہے۔ اس میں وہ لکھتے ہیں:۔

"احمدیہ مسئلہ: یہ ایک ایسا مسئلہ تھا جس پر بھٹو صاحب نے کئی دفعہ کچھ نہ کچھ کہا۔ ایک دفعہ کہنے لگے "رفیع! یہ لوگ چاہتے تھے کہ ہم پاکستان میں ان کو وہ رتبہ دیں جو یہودیوں کو امریکہ میں حاصل ہے یعنی ہماری ہر پالیسی ان کی مرضی کے مطابق چلے۔ ایک بار انہوں نے کہا کہ قومی اسمبلی نے ان کو غیر مسلم قرار دیا ہے اس میں میرا کیا قصور ہے۔

ایک دن اچانک مجھ سے پوچھا کہ کرنل رفیع کیا احمدی آجکل یہ کہہ رہے ہیں کہ میری موجودہ مصیبتیں ان کے خلیفہ کی بد دعا کا نتیجہ ہیں کہ میں کال کوٹھری میں پڑا ہوا ہوں۔ ایک مرتبہ کہنے لگے کہ بھئی اگر ان کے اعتقاد کو دیکھا جائے تو وہ تو حضرت محمد مصطفٰے ﷺ کو آخری نبی ہی نہیں مانتے اور اگر وہ مجھے ہی اپنے آپ

کو غیر مسلم قرار دینے کا ذمہ دار ٹھہراتے ہیں تو کوئی بات نہیں۔ پھر کہنے لگے میں تو بڑا گناہ گار ہوں اور کیا معلوم میرا یہ عمل ہی میرے گناہوں کی تلافی کر جائے اور اللہ میرے تمام گناہ اس نیک عمل کی بدولت معاف کر دے۔"(20)

اپیل کا آغاز 20 / مئی 1978ء کو ہوا۔ پہلے دن کی معروضات کے اختتام پر یحییٰ بختیار صاحب نے کہا کہ میری اپیل کی بنیاد یہ ہے کہ یہ مقدمہ جھوٹا ہے، گھڑا ہوا ہے اور سیاسی بنیادوں پر بنایا گیا ہے اور یہ بھٹو صاحب کے خلاف ایک بین الاقوامی سازش ہے۔ اور انہیں ایک منتخب وزیرِ اعظم ہوتے ہوئے اقتدار سے علیحدہ کر دیا گیا ہے تا کہ انہیں سیاسی طور پر اور جسمانی طور پر ختم کر دیا جائے۔ ان کے اس آغاز نے عدالت میں ایک کھلبلی مچا دی۔ ایک بار پھر بیرونی ہاتھ کا تذکرہ کیا جا رہا تھا۔

اس کے ساتھ سپریم کورٹ میں ایک طویل کارروائی کا آغاز ہوا۔ جس میں دونوں طرف سے دلائل کا تبادلہ ہوا۔ ہم اس تمام تذکرے کو چھوڑ کر آخر میں ایک اہم حصہ کی طرف آتے ہیں۔ یعنی جس روز بھٹو صاحب کے وکلاء نے ان کی طرف سے دلائل نہیں دیئے تھے بلکہ خود بھٹو صاحب نے سپریم کورٹ کے سامنے اپنی معروضات پیش کیں۔ یہ اٹھارہ دسمبر 1978ء کا دن تھا۔ جس کمرہ میں اس مقدمہ کی سماعت ہونی تھی وہ آج کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ بھٹو صاحب جب کمرہ عدالت میں داخل ہوئے تو ان کے حامی احتراماً کھڑے ہو گئے۔ بھٹو صاحب ایک خوش لباس شخص تھے۔ آج بھی وہ ایک نفیس سوٹ میں ملبوس تھے۔ لیکن یہ سوٹ ان پر ڈھیلا لگ رہا تھا۔ اسیری کے دنوں میں ان کی صحت بُری طرح متاثر ہوئی تھی اور ان کا وزن خطرناک حد تک گر چکا تھا۔ پہلے کچھ دیر یحییٰ بختیار صاحب نے اپنے دلائل کو مکمل کیا۔ پھر بھٹو صاحب اپنی معروضات پیش کرنے کے لئے کھڑے ہوئے۔ بھٹو صاحب قابل شخص تھے۔ اس سے کوئی انکار نہیں۔ وہ ایک نہایت عمدہ مقرر بھی تھے۔ سپریم کورٹ میں ان کی تقریر جو ان کی آخری تقریر ثابت ہوئی پاکستان کی تاریخ کا ایک اہم حصہ ہے۔ یہ تقریر چارروز جاری رہی۔ سینکڑوں مصنفوں، قانون دانوں اور محققین نے اپنے طور پر اس کا جائزہ لیا ہے۔ ہم بھی اس کے چند پہلوں کا جائزہ پیش کریں گے۔

پہلے روز بھٹو صاحب نے اپنے اس دفاع کا خلاصہ پیش کیا جو انہوں نے آئندہ آنے والے دنوں میں پیش کرنا تھا۔ بولتے بولتے ان کا رنگ زرد ہو جاتا تھا اور ان کے ماتھے پر پسینہ آجاتا تھا۔ انہوں نے اس بات کی شکایت کی کہ جیل میں ان کے ساتھ ناروا سلوک کیا گیا ہے۔ یہ ذکر شروع کرنے سے پہلے انہوں نے کہا کہ ایک سال سے زیادہ عرصہ ہو گیا ہے کہ میں موت کی کوٹھری میں بند ہوں جس کا رقبہ ۷*۱۰ فٹ ہے۔ میں غیر ملکی افراد کے سامنے اس حقیقت کا ذکر نہیں کرنا چاہتا جو مجھ پر بیت چکی ہے۔ میں اپنے جسم پر نشانات یا ایسی چیزیں لوگوں کے سامنے دکھانا پسند نہیں کروں گا۔ کوٹ لکھپت جیل میں کئی روز ان کے ساتھ کی کوٹھریوں میں پاگلوں کو رکھا گیا جن کی چیخیں انہیں سونے نہیں دیتی تھیں۔ راولپنڈی میں مجھے پریشان کرنے کے لئے یہ ترکیب نکالی گئی کہ کوٹھری کی چھت پر پتھر پھینکے جاتے تھے جن کا شور مجھے سونے نہیں دیتا تھا اور گزشتہ رات بھی مجھے سونے نہیں دیا گیا۔ یہ مصائب بیان کرتے ہوئے ان کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ پہلے روز کی کارروائی کے اختتام پر بھٹو صاحب نے کہا کہ اگلے روز وہ بات کا آغاز نام کے مسلمان کے مسئلہ سے کریں گے اور کہا کہ میں ان پیرا گرافس کا حوالہ دوں گا جو اس موضوع پر ٹرائل کورٹ نے اپنے فیصلے پر شامل کئے ہیں۔ جو پیرا گراف 209 سے 215 تک محیط ہیں۔

دوسرے روز ان کے بیان میں پہلے دن سے زیادہ روانی تھی۔ اس روز وہ خرابِی صحت اور رنگت کے زرد ہوجانے کے باجود روانی سے اپنا بیان دے رہے تھے۔ ایک مرحلہ پر ان کے وکیل نے ان کے کان میں کہا کہ اب انہیں رک جانا چاہئے تو انہوں نے کہا کہ میں تھکا ہوا ہوں لیکن مجھے اپنا بیان جاری رکھنا ہے۔ اس دن انہوں نے ہائی کورٹ کے فیصلے کے اس حصہ پر شدید تنقید کی، جس میں انہیں نام کا مسلمان کہا گیا تھا۔ فیصلہ کے اس حصہ نے انہیں اتنا شدید صدمہ پہنچایا تھا کہ انہیں یہ حصہ زبانی یاد تھا۔ جب اس دوران ان کے وکیل نے انہیں پیراگراف کا نمبر بتانا چاہا تو انہوں نے بے صبری سے کہا کہ میں ان پیراگرافوں کو جانتا ہوں۔ انہوں نے اس بیان کے آغاز پر مذہب کی تاریخ پر روشنی ڈالنا چاہا لیکن چیف جسٹس صاحب نے کہا یہ سب کچھ بہت دلچسپ ہے لیکن آپ براہِ راست متعلقہ موضوع پر آجائیں۔ (13)

انہوں نے اپنا بیان شروع کرتے ہوئے کہا:۔

”ایک اسلامی ملک میں ایک کلمہ گو کے عجز کے لئے یہ ایک غیر معمولی واقعہ ہو گا کہ وہ یہ ثابت کرے کہ وہ مسلمان ہے۔ میرے خیال میں یہ اسلامی تمدن کی تاریخ کا پہلا واقعہ ہے کہ ایک مسلم صدر ، ایک مسلم راہنما ایک وزیرِ اعظم جسے مسلمان قوم نے منتخب کیا ہو ،ایک دن وہ اپنے آپ کو اس حیثیت میں پائے کہ وہ یہ کہے کہ وہ مسلمان ہے۔

یہ ایک ہراساں کر دینے والا ہی مسئلہ نہیں ہے۔ بلکہ ایک کربناک معاملہ بھی ہے۔ یورلارڈ شپس! یہ مسئلہ کیسے کھڑا ہوا؟ آخر کس طرح ؟ یہ مسئلہ اصطلاحاً عوام کے انقلاب یا کسی تحریک کے نتیجے میں کھڑا نہیں کیا گیا جو اس کے خلاف چلائی گئی ہو کہ وہ شخص مسلمان نہیں ہے۔ یہ ایک آئیوری ٹاور سے آیا ہے۔ اسے بطور ایک رائے کے ایک فرد نے دیا ہے۔ اب یہ دوسری بات ہے کہ وہ خود خواہ کتنے ہی اعلیٰ عہدے پر کیوں نہ ہو لیکن دراصل اسے اس معاملے میں دخل دینے کا کوئی استحقاق نہیں ہے۔ جو امور اس کی سماعت کے دائرے میں آتے ہیں ان میں یہ معاملہ قطعی طور پر شامل نہیں۔ نہ ہی یہ ایسا موضوع ہے کہ جس پر وہ اپنا موقف بیان کر سکے۔ کسی فرد، کسی ادارے اور کسی عدالتی بنچ کا یہ حق نہیں بنتا کہ وہ ایک ایسے معاملے پر اپنی رائے دے۔ جس پر رائے دینے کا اسے کوئی جائز حق حاصل نہیں۔

چونکہ انسان اور خدا کے درمیان کوئی بیچ کا واسطہ نہیں ہے۔ اس لئے یہاں معاشرے میں غلطیاں ہوتی ہیں۔ سماج میں سماجی برائیاں جنم لیتی ہیں۔ اور ان کی سزا اسی دنیا میں ہی دی جاتی ہے۔ جیسے چوری غنڈہ گردی زنا وغیرہ۔ لیکن خدا کے خلاف بھی انسان جرم کرتے ہیں۔ جن کا اسلام میں ذکر موجود ہے لیکن ان گناہوں کا تصفیہ اللہ اور انسان کا معاملہ ہے اور اس کا فیصلہ خدا خود روزِ حشر کرے گا ...

مائی لارڈ! جیسا کہ میں اس سے پہلے کہہ چکا ہوں کہ ایک مسلمان کے لئے کافی ہے کہ وہ کلمے میں ایمان رکھتا ہو کلمہ پڑھتا ہو۔ اس حد تک بات کی جا سکتی ہے کہ جب ابو سفیان مسلمان ہوئے اور انہوں نے کلمہ پڑھا تو رسول اللہ ﷺ کے بعض صحابہ نے سوچا کہ اس کی اسلام دشمنی اتنی شدید تھی کہ شاید ابو سفیان نے اسلام کو محض اوپری اور زبانی سطح پر قبول کیا ہو لیکن رسول اللہ ﷺ نے اس سے اختلاف کیا اور فرمایا کہ جونہی اس نے ایک بار کلمہ پڑھ لیا تو وہ مسلمان ہو گئے۔“(14)

لاہور ہائی کورٹ کے ان ریمارکس نے بھٹو صاحب کو اتنا شدید صدمہ پہنچایا تھا کہ سلمان تاثیر صاحب جو بعد میں گورنر پنجاب بھی بنے اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ اس مرحلہ پر ان کی آواز سسکیوں میں ڈوب گئی۔ (15)

بھٹو صاحب نے اس بات پر کہ انہیں کورٹ نے نام کا مسلمان کہا ہے اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ

"یہ اصلی صورتِ حال ہے جب آپ مجھ پر الزام لگاتے ہیں تو مجھے ذلیل نہیں کرتے بلکہ آپ پاکستان کے عوام کو ذلیل کرتے ہیں۔ جب مجھے نام کا مسلمان کہا جاتا ہے تو دراصل ان عوام کو یہ الزام دیا جاتا ہے کہ وہ اچھے مسلمان نہیں بلکہ نام کے مسلمان ہیں...

مائی لارڈ! آپ میری جگہ نہیں کھڑے ہیں آپ نہیں جانتے ان ریمارکس نے مجھے کتنا دکھ پہنچایا ہے۔ اس کے مقابلے میں تو میں پھانسی کو ترجیح دوں گا۔ اس الزام کے بدلے میں پھانسی کے پھندے کو قبول کروں گا۔" (16)

بھٹو صاحب کا یہ بیان بہت سی وجوہات کی بنا پر بہت اہم ہے۔ ان کے دلائل واقعی وزنی ہیں۔ یہ دلائل اتنے زوردار تھے اور انہیں اس خوبصورتی سے پیش کیا گیا تھا کہ پاکستان کی عدالتِ عظمیٰ کے ایک معزز جج جسٹس صفدر شاہ نے ان دلائل کے درمیان ہی کہہ دیا کہ ہم فی الوقت آپ کو اپنی یہ رائے بتا سکتے ہیں کہ ہمارے نزدیک لاہور ہائی کورٹ کے فیصلہ کے یہ پیراگراف غیر متعلقہ ہیں۔ (17)

لیکن یہ ایک قانونی مسئلہ ہے۔ یہ ایک مذہبی مسئلہ ہے۔ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس کے تار ماضی قریب اور ماضی بعید کے بہت سے تاریخی واقعات کے ساتھ الجھے ہوئے ہیں۔ اور اس کتاب کے پڑھنے والے کو شاید یہ محسوس ہو رہا ہو کہ اس جیسے دلائل کا تذکرہ چند سال پہلے کے واقعات کا ذکر کرتے ہوئے گزر چکا ہے لیکن اس وقت یہ دلائل کسی اور طرف سے پیش کئے جا رہے تھے اور اب جو ملزم بن کے کھڑے تھے اس وقت وہ اپنے زعم میں منصف بنے ہوئے تھے۔ بھٹو صاحب ایک قد آور شخصیت تھے اور ایسی قد آور شخصیات کے اہم بیانات

ہوا میں گم نہیں ہو جاتے۔ تاریخ ان کا بار بار تجزیہ کرتی ہے۔ بھٹو صاحب کا یہ بیان واقعی بہت اہم ہے۔ ہم اس کے ایک ایک جملے کا تجزیہ کریں گے۔

بھٹو صاحب نے اس وقت جب وہ اپنی زندگی کی جنگ لڑ رہے تھے۔ یہ کہا کہ ایک مسلمان کہلانے کے لئے یہی کافی ہے کہ وہ کلمہ پڑھتا ہو اور یہ بھی کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے کسی کو یہ حق نہیں دیا کہ وہ اس کی نیت پر شک کرے۔ تو سوال یہ اُٹھتا ہے کہ پھر 1974ء میں بھٹو صاحب اور ان کی حکومت نے یہ قدم کیوں اُٹھایا کہ ایک سیاسی اسمبلی کے سپرد یہ کام کیا کہ وہ یہ فیصلہ کرے کہ ایک جماعت ، ایک فرقہ مسلمان ہے یا نہیں۔ اور یہ جماعت ایک کلمہ گو جماعت ہے۔ اسمبلی کئی روز کھڑکیاں دروازے بند کر کے غیر متعلقہ کارروائی میں الجھی رہی اور اصل موضوع پر بات کا خاطر خواہ آغاز بھی نہیں کر سکی اور اگر ہر کلمہ گو قانون کی رو سے مسلمان ہے اور کسی کو اس نیت پر شک کرنے کا حق نہیں تو پھر 1974ء میں آئین میں ترمیم کر کے ایک سیاسی اسمبلی نے یہ فیصلہ کیوں کیا اب پاکستان میں قانون کی رو سے لاکھوں کلمہ گو مسلمان شمار نہیں ہوں گے۔

ذوالفقار علی بھٹو صاحب نے بڑا زور دے کر یہ بات کہی کہ کسی فرد، کسی ادارے یا عدالتی بنچ کا یہ اختیار نہیں کہ وہ کسی شخص کو کہے کہ وہ مسلمان نہیں ہے اور یہ بھی کہا اور بالکل درست کہا کہ مذہب خدا اور انسان کے درمیان معاملہ ہے۔ کسی انسان کو اس میں دخل دینے کی اجازت نہیں ہے۔ ہم کچھ دیر کے لئے 1974ء کی طرف واپس جاتے ہیں جب جماعتِ احمدیہ کی طرف سے قومی اسمبلی کے تمام اراکین کو اور حکومت کو ایک محضر نامہ بھجوایا گیا جس میں جماعتِ احمدیہ کا موقف بیان ہوا تھا کہ قومی اسمبلی کو نہ یہ اختیار ہے اور نہ اسے یہ زیب دیتا ہے کہ وہ کسی جماعت یا کسی شخص کے مذہب کے بارے میں یہ فیصلہ کرے۔ لیکن جماعتِ احمدیہ کا یہ موقف نظر انداز کر دیا گیا۔ آج آپ یہ کہنے پر مجبور ہوئے ہیں کہ کسی ادارے کو یہ اختیار نہیں کہ وہ کسی کے مسلمان ہونے یا نہ ہونے کے بارے میں فیصلہ کرے تو پھر 1974ء میں آپ کی حکومت کا وہ فیصلہ کسی طور پر صحیح نہیں کہلا سکتا۔ لیکن بھٹو صاحب اپنے سابق عمل اور موجودہ بیان میں تضاد دیکھ نہیں پا رہے تھے۔ اسی نکتہ پر اپنا دفاع کرتے ہوئے انہوں نے اپنی خدمات گنوائیں اور ان میں اسلام کی یہ خدمت بھی گنوائی کہ ان کے دور میں احمدیوں کو غیر مسلم قرار دے کر نوے سالہ پرانا مسئلہ حل کیا گیا تھا۔

بھٹو صاحب نے عدالت میں اپنا بیان جاری رکھتے ہوئے کہا کہ عدالت اس حد تک بڑھ گئی ہے کہ مجھے نام کا مسلمان قرار دیا گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ جنابِ والا اگر آپ نام کے مسلمان کے مسئلے پر جاتے ہیں تو پھر میں ایک ایسا شہری ہوں جس کا کوئی ملک نہیں کیونکہ یہ شہریت دستور میں ایک مسلمان یا اقلیتوں کو فراہم کی گئی ہے۔ یہ شہریت اس جانور کو نہیں دی جا سکتی جو نام کا مسلمان ہو۔ میں نہیں جانتا اور کتنے لوگوں کو اس درجہ بندی میں شامل کر کے انہیں بے ملک بنا دیا جائے گا اور اگر ہم بے ملک لوگ بنا دیئے گئے تو ہم کہاں جائیں گے۔(18)

بہت خوب۔ بہت مؤثر انداز بیان ہے بہت مضبوط دلائل ہیں۔ لیکن یہاں پر ایک سوال اُٹھتا ہے۔ وہ جماعت جو کہ کلمہ گو ہے اور اور اس کا عقیدہ ہے کہ وہ مسلمان ہے۔ اور وہ کسی اور مذہب کی طرف اپنے آپ کو منسوب کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتی۔ ایک روز ڈیڑھ سو کے قریب سیاستدان بیٹھتے ہیں اور یہ مضحکہ خیز فیصلہ کرتے ہیں کہ اب سے قانون کی رو سے یہ جماعت مسلمان نہیں ہے۔ بھٹو صاحب کہتے ہیں کہ اس ملک کے آئین میں شہریت کے حقوق یا مسلمان کے لئے ہیں یا پھر غیر مسلم کے لئے تو پھر کیا ۱۹۷۴ء کا فیصلہ کرنے سے پہلے انہوں نے سوچا تھا کہ یہ جماعت اپنے آپ کو غیر مسلم نہیں سمجھتی ایسا کہنا یا سمجھنا اس کے ضمیر کے خلاف ہے، اس کے بنیادی عقیدہ کے خلاف ہے تو پھر اس کی شہریت کے حقوق کا کیا بنے گا۔ ایک نامعقول فیصلے نے خود آپ کے بیان کردہ معیار کے مطابق ان کو شہریت کے حقوق سے محروم کر دیا۔ 1974ء میں اسمبلی کی کارروائی شروع ہونے سے پہلے جماعتِ احمدیہ نے ایک محضر نامہ میں اپنا موقف بیان کیا تھا۔ اور اس میں کرتا دھرتا افراد کو ان الفاظ میں متنبہ کیا تھا

”ظاہر ہے کہ مندرجہ بالا صورتیں عقلاً قابلِ قبول نہیں ہو سکتیں اور بشمول پاکستان دنیا کے مختلف ممالک میں ان گنت فسادات اور خرابیوں کی راہ کھولنے کا موجب ہو جائیں گی۔“(19)

اور یہ حقائق ثابت کرتے ہیں کہ ایسا ہی ہوا جو آگ 1974ء میں جماعتِ احمدیہ کے خلاف بھڑکائی گئی تھی، اس وقت کے وزیر اعظم کا آشیانہ بھی بالآخر ان کے شعلوں کی نذر ہو گیا۔

دوسرے روز کے بعد بھی بھٹو صاحب کا بیان دو روز مزید جاری رہا۔ 21 دسمبر کو بھٹو صاحب نے سپریم کورٹ میں اپنا بیان ختم کیا۔

ان دنوں میں بھٹو صاحب اس نازک وقت میں اپنی پارٹی کی کارکردگی سے بھی مایوس ہوتے جا رہے تھے۔ ان کی جیل میں متعیّن کرنل رفیع صاحب تحریر کرتے ہیں۔

"لیکن جوں جوں وقت گزرتا گیا بھٹو صاحب کچھ مایوس سے ہوتے گئے۔ اوائل 1979ء میں وہ اپنی پارٹی سے جو امیدیں لگائے بیٹھے تھے وہ بر نہیں آ رہی تھیں۔ ایک دن وہ کچھ مایوسی کے عالم میں مجھ سے کہنے لگے کہ وہ حرامزادے کدھر ہیں جو کہا کرتے تھے کہ ہم اپنی گردنیں کٹوا دیں گے (اپنی انگشتِ شہادت گردن کی ایک طرف سے دوسری طرف کھینچتے ہوئے) میرے خیال میں وہ دن ایسے تھے (فروری مارچ 1979ء) جب بھٹو صاحب اپنی پارٹی سے مایوس ہوتے جا رہے تھے۔"(21)

سپریم کورٹ کا فیصلہ اور پھانسی

سپریم کورٹ کی کارروائی ختم ہوئی تو فیصلہ کا انتظار شروع ہوا جو کئی ہفتہ تک طول کھینچ گیا۔ بالآخر 6/فروری 1979ء کو صبح گیارہ بجے کورٹ فیصلہ سنانے کے لئے جمع ہوئی۔ سپریم کورٹ نے سابق وزیرِ اعظم ذوالفقار علی بھٹو کی اپیل مسترد کر دی تھی اور ہائی کورٹ کا فیصلہ برقرار رکھا گیا تھا۔ فیصلہ متفقہ نہیں تھا۔ چار ججوں نے پھانسی کی سزا برقرار رکھنے کا فیصلہ کیا تھا، ان کے نام جسٹس انوارالحق (چیف جسٹس) جسٹس نسیم حسن شاہ، جسٹس اکرم اور جسٹس چوہان تھے اور تین ججوں یعنی جسٹس صفدر شاہ، جسٹس دراب پٹیل اور جسٹس حلیم نے فیصلہ سے اختلاف کیا تھا۔ بھٹو صاحب نے تحمل سے جیل میں فیصلہ کی خبر سنی۔ ان کے وکلاء نے ریویو پیٹیشن داخل کی لیکن یہ بھی مسترد ہو گئی۔ بیرونی دنیا کے بہت سے لیڈروں نے رحم کی اپیلیں کیں لیکن ان کا بھی کوئی اثر نہیں ہوا اور پریس کو بتایا گیا کہ صدرِ پاکستان جنرل ضیاء نے کیس میں مداخلت نہ کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ بھٹو صاحب کو یقین نہیں آرہا تھا کہ ان کو سزائے موت دے دی جائے گی لیکن فیصلہ کیا گیا کہ 3 اور 4/اپریل کی درمیانی شب کو بھٹو صاحب کو پھانسی دے دی جائے گی۔ فیصلہ آنے کے بعد جیل کے حکام کا رویہ بھٹو صاحب سے بہت بدل گیا تھا اور وہ بار بار اس بات کی شکایت کرتے تھے کہ وہ ان سے بے عزتی کا برتاؤ کر

رہے ہیں۔ جب انہیں بتایا گیا کہ آج ان کا آخری دن ہے اور اب انہیں پھانسی دے دی جائے گی اور وہ اب اپنی وصیت لکھ سکتے ہیں تو انہوں نے ڈیوٹی پر متعین کرنل رفیع صاحب سے پوچھا کہ رفیع یہ کیا کھیل ہے؟ اس پر رفیع صاحب نے انہیں بتایا کہ جناب آج آخری حکم مل گیا ہے آج انہیں پھانسی دے دی جائے گی۔ رفیع صاحب ان لمحوں کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچتے ہیں۔

”مسٹر بھٹو میں پہلی مرتبہ میں نے وحشت کے آثار دیکھے۔ انہوں نے اونچی آواز میں ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا۔ بس ختم؟ بس ختم؟

میں نے جواب میں کہا۔ جی جناب۔

بھٹو صاحب کی آنکھیں وحشت اور اندرونی گھبراہٹ سے جیسے پھٹ گئیں ہوں۔ ان کے چہرے پر پیلاہٹ اور خشکی آگئی جو میں نے پہلے کبھی نہ دیکھی تھی۔ میں اس حالت کو صحیح بیان نہیں کر سکتا۔ انہوں نے کہا ”کس وقت؟“ اور پھر کہا کس وقت اور پھر کہا آج؟ میں نے اپنے ہاتھوں کی سات انگلیاں ان کے سامنے کیں ...

انہوں نے کہا سات دن بعد؟ میں نے ان کے نزدیک ہو کر سرگوشی میں بتایا۔ جناب گھنٹے۔ انہوں نے کہا۔ آج رات سات گھنٹوں بعد؟ میں نے اپنا سر ہلاتے ہوئے ہاں میں جواب دیا۔

بھٹو صاحب جب پنڈی جیل میں لائے گئے اس وقت سے وہ مضبوط اور سخت چٹان بنے ہوئے تھے لیکن اس موقع پر وہ بالکل تحلیل ہوتے دکھائی دے رہے تھے ... “(22)

انہوں نے خود کلامی کے انداز میں کہا ”میرے وکلاء نے اس کیس کو خراب کیا ہے۔ یحییٰ میری پھانسی کا ذمہ دار ہے۔ وہ مجھے غلط بتاتا رہا۔ اس نے اس کا ستیاناس کیا ہے۔ اس نے ہمیشہ سبز باغ دکھائے۔ پھر کہنے لگے میری پارٹی کو مُردہ بھٹو کی ضرورت تھی زندہ بھٹو کی نہیں۔ (23)

ہم جیسا کہ ذکر کر چکے ہیں کہ یحییٰ بختیار صاحب کو اور اس مقدمہ میں ان کے معاون وکیل عبدالحفیظ پیرزادہ صاحب کو بھٹو صاحب کا بہت اعتماد حاصل تھا۔ یحییٰ بختیار صاحب نے بحیثیت اٹارنی جنرل 1974ء میں جب قومی اسمبلی میں حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ پر کئی روز سوالات کئے تھے اور وہ خود بھی اپنے اس کام کو اپنا

ایک اہم کارنامہ خیال کرتے تھے۔ اور اسی طرح عبدالحفیظ پیرزادہ صاحب اس سٹیرنگ کمیٹی کے چیئر مین تھے جس نے اس مسئلہ کو قومی اسمبلی میں پیش کرنے کا فیصلہ کیا تھا اور اس کے متعلق قواعد طے کئے تھے۔ جب بھٹو صاحب کی اپیل سپریم کورٹ میں زیرِ سماعت تھی تو ضیاء حکومت نے ان کے خلاف ایک قرطاسِ ابیض (White Paper) شائع کیا تو انہوں نے جیل سے اس کے جواب میں ایک کتاب If I am Assassinated تحریر کی۔ اس میں انہوں نے 1974ء میں یحییٰ بختیار صاحب کی کارکردگی کے متعلق لکھا:۔

As Attorney General of Pakistan he rendered yeoman service to successfully piloting the sensitive Ahmadi issue in Parliament

یعنی انہوں نے (یحییٰ بختیار صاحب نے) بحیثیت اٹارنی جنرل نے پارلیمنٹ میں احمدیوں کے حساس مسئلہ کے بارے میں کارروائی کے دوران اہم اور کامیاب خدمات سرانجام دیں۔

خدا کی قدرت کے کچھ عرصہ بعد بھٹو صاحب انہی یحییٰ بختیار صاحب کو اپنی پھانسی کی سزا کا ذمہ دار بتا رہے تھے اور کہہ رہے تھے انہوں نے اس مقدمہ کا ستیاناس کر دیا۔

جیل کے عملہ نے پھانسی کی تیاریاں شروع کیں۔ زائد حفاظتی اقدامات کے علاوہ ایک زائد یہ بھی تیاری کی جا رہی تھی کہ انٹیلی جینس ایجنسیوں کے ایک فوٹو گرافر کا انتظام کیا گیا۔ اس کا کام کیا تھا اس کے متعلق وہاں ڈیوٹی پر متعین کرنل رفیع صاحب لکھتے ہیں کہ یہ فیصلہ کیا گیا:۔

”ایک فوٹو گرافر جو ایک انٹیلی جنس ایجنسی سے تھا، اپنے سامان کے ساتھ تین اپریل شام پانچ بجے جیل میں رپورٹ کرے گا۔ وہ بھٹو صاحب کی لاش کے فوٹو لے گا (تاکہ معلوم ہو سکے کہ ان کے ختنے ہوئے تھے یا نہیں؟) (مجھے سرکاری طور پر بتایا گیا تھا کہ مسٹر بھٹو کی ماں ہندو عورت تھی جو ان کے والد نے زبردستی اپنا لی تھی اور مسٹر بھٹو کا پیدائشی نام نتھارام تھا اور غالباً ان کے ختنے نہیں کرائے گئے تھے) پھانسی اور غسل کے بعد اس فوٹو گرافر نے بھٹو صاحب کے جسم کے درمیانی حصہ کے نزدیکی فوٹو لئے تھے۔ پڑھنے والوں کے لئے میں بتا دوں کہ بھٹو صاحب کا اسلامی طریقہ سے باقاعدہ ختنہ ہوا تھا۔“(25)

بھٹو صاحب کا کسی سے لاکھ اختلاف ہو لیکن اس وقت کا یہ قدم سوائے بیہودگی کے اور کچھ نہیں تھا اور اس کی جتنی بھی مذمت کی جائے وہ کم ہے۔ اس سے صرف حکم جاری کرنے والوں کی پیچ ذہنیت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ جب ریاست اور حکومت اس بحث میں الجھ جائے کہ کون مسلمان ہے اور کون نہیں تو اس کا انجام اس قسم کی نامعقول اور قابلِ نفرت حرکات پر ہی ہوتا ہے کہ ایک مردہ آدمی کی نعش کو برہنہ کر کے یہ دیکھا جائے کہ اس کے ختنے ہوئے تھے کہ نہیں۔ گویا اس کے مسلمان ہونے کی ایک ہی دلیل رہ گئی کہ اس کے ختنے ہوئے تھے کہ نہیں۔

بھٹو صاحب نے اپنی وصیّت لکھی لیکن پھر اُسے جلا دیا اور کہا کہ وہ اپنے خیالات کو مجتمع نہیں کر پا رہے۔ جب پھانسی کا وقت آیا تو وہ کئی روز کی بھوک ہڑتال کی وجہ سے اور اس مرحلہ کی وجہ سے بہت کمزور ہو چکے تھے۔ ان کا رنگ زرد ہو چکا تھا۔ وہ اس قابل نہیں تھے کہ خود چل کر پھانسی کی جگہ تک جا سکیں۔ انہیں پہلے اُٹھایا گیا اور پھر سٹریچر پر لٹایا گیا وہ پھانسی گھاٹ تک بالکل بغیر حرکت کے رہے۔ پھانسی دینے والے تارا مسیح نے ان کے چہرے پر ماسک چڑھا دیا اور ان کے ہاتھ پشت پر باندھ دیئے گئے۔ اس کی تکلیف کی وجہ سے ان کے منہ سے صرف یہ نکلا کہ "یہ مجھے"۔ رات کے دو بج کر چار منٹ پر لیور دبا دیا گیا اور ان کا جسم ایک جھٹکے کے ساتھ پھانسی کے کنویں میں گر پڑا۔

پاکستان میں اور مسلمان ممالک میں بہت سے سیاستدان سیاست کے میدان میں سرگرم ہیں۔ بہت مرتبہ انہیں اس قسم کے سوال کا سامنا کرنا پڑتا ہے جب انہیں بتایا جاتا ہے کہ اگر وہ مذہبی جذبات کو اپنے سیاسی مقاصد کے لئے استعمال کریں یا پھر احمدیوں کے خلاف تحریک کا حصہ بن کر ان پر ظلم کا دروازہ کھول کر مُلّا سے تعاون کریں تو اس سے ان کو بہت سیاسی فائدہ ہو گا۔ اور کم از کم مُلّا طبقہ تو ان کا حامی ہو جائے گا۔ اگر مذہبی اور اخلاقی پہلو کو ایک طرف بھی رکھا جائے اور سیاسی حقائق پر توجہ مرکوز رکھی جائے تو کم از کم ان سیاستدانوں اور حکمرانوں کو چاہئے کہ وہ بھٹو صاحب کے حالات کا بغور مطالعہ کریں۔ خود ان حقائق کا جائزہ لیں۔ بھٹو صاحب کوئی معمولی سیاستدان نہیں تھے۔ وہ بہت ذہین آدمی تھے۔ طویل سیاسی تجربہ رکھتے تھے۔ ان کی مثبت خدمات سے بھی انکار نہیں۔ وہ ملک میں مقبول ترین لیڈروں میں سے تھے۔ اس بات سے بھی انکار نہیں کہ آج جب کہ ان

کی موت کو قریباََ تیس سال گزر چکے ہیں ان کے نام پر ووٹ دیئے جاتے ہیں۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ بھٹو صاحب نے سیاسی فوائد حاصل کرنے کے لئے 1974ء میں جماعت احمدیہ کو غیر مسلم قرار دینے کے لئے آئین میں ترمیم کی اور جماعت احمدیہ کے بنیادی حقوق کی بھی پروا نہیں کی گئی، انہیں بُری طرح پامال کیا گیا۔ اس کا نتیجہ کیا نکلا کیا مُلّا خوش ہو گیا۔ کچھ ہی سالوں میں ان کے خلاف اس طبقہ نے ایک ایسی مہم چلائی کہ کوئی گالی ہو گی جو کہ انہیں اور ان کے اہل خانہ کو نہ دی گئی۔ بالآ خر ان کو اقتدار سے محروم کر دیا گیا۔ اور قتل کے الزام میں جیل میں ڈال دیا گیا۔ بھٹو صاحب نے جیل میں اپنی کتاب میں لکھا کہ جماعتِ اسلامی اور دوسری مذہبی جماعتیں بیرونِ پاکستان ہاتھوں سے مدد لے کر ان کے خلاف سازشیں کر رہے ہیں۔ پھر انہیں پھانسی چڑھا دیا گیا۔ پھر نامعلوم حالات میں ان کے دونوں بیٹے قتل کر دیئے گئے اور پھر ان کی بیٹی اور سیاسی وارث ملک کی سابق وزیر اعظم بے نظیر بھٹو کو انہیں مذہبی انتہا پسندوں نے قتل کر دیا۔ آخر اس فیصلہ سے بھٹو صاحب کو کیا ملا؟ یہ ایک تاریخی سبق ہے کہ مُلّا کبھی کسی کا نہیں ہوتا اور نہ مذہبی مسائل کو سیاسی مقاصد کے لئے استعمال کرنے سے کوئی فوائد حاصل کئے جا سکتے ہیں۔ سیاستدانوں کو چاہئے کہ وہ ان تاریخی حقائق کا بار بار مطالعہ کریں۔ خود ان کا جائزہ لیں۔

1974ء کے حالات قلمبند کرتے ہوئے ہم نے اس وقت کے سیاسی قائدین کے انٹرویو بھی لئے تھے۔ ان میں سے ایک انٹرویو معراج محمد خان صاحب کا بھی تھا۔ یہ صاحب ایک وقت میں بھٹو صاحب کے قریبی سیاسی رفیق تھے۔ بھٹو صاحب نے ایک مرتبہ ان کو اپنا سیاسی جانشین بھی قرار دیا تھا۔ وہ بھٹو صاحب کی کابینہ میں وزیر بھی رہے۔ لیکن پھر بھٹو صاحب کے ان سے اختلافات ہو گئے اور بھٹو صاحب نے ان کو انتقاماََ جیل میں ڈال دیا۔ جب یہ انٹرویو ختم ہوا تو انہوں نے آخری بات یہ کہی اور یہ بات انہوں نے اس انٹرویو میں بہت مرتبہ کہی تھی کہ آپ جہاں دوسری باتیں لکھیں یہ ضرور لکھیں کہ وہ بہت ذہین آدمی تھے، بہت جفاکش تھے، وہ بہت بڑے آدمی تھے۔ لیکن ایک اور بات جو انہوں نے اس انٹرویو میں ایک سے زائد مرتبہ کہی وہ یہ تھی کہ جب کوئی بڑا آدمی غلطی کرتا ہے تو وہ بھی بہت بڑی ہوتی ہے۔ ہم نے ان کی خواہش کے مطابق معراج صاحب کی یہ بات درج کر دی ہے لیکن ایک اور بات کا اضافہ کر دیں کہ جب کوئی بڑا آدمی ایسی غلطی کرتا ہے

تو بسا اوقات پوری قوم کو اس کی غلطی کا خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے۔ مسلمان سیاستدانوں کو چاہئے کہ تاریخی حقائق سے سبق حاصل کریں اور ان غلطیوں کو نہ دہرائیں جن کو کر کے بھٹو صاحب اور دولتانہ صاحب جیسے سیاستدانوں نے اپنی سیاسی زندگی یا خود اپنی زندگی کا خاتمہ کر لیا۔ جو سیاستدان ہیں وہ صرف سیاست کریں، مذہب کے ٹھیکیدار بننے کی کوشش نہ کریں۔

پاکستان پر اس قرار داد کا کیا اثر پڑا

جب ہم نے ڈاکٹر مبشر حسن صاحب سے سوال کیا کہ آپ کے نزدیک اس قرارداد اور آئینی ترمیم کا ملک اور قوم پر کیا اثر پڑا؟ تو ان کا جواب تھا ”بہت بُرا اثر پڑا۔ نہایت بُرا اور دور رس۔“ جب اس سوال کو دوسرے الفاظ میں دہرایا گیا تو ان کا جواب تھا:

”آپ دیکھ تو رہے ہیں گورنمنٹ کا کیا حشر ہوا۔ ان کی پارٹی کا کیا حشر ہوا۔ اس سے بُرا ہو سکتا تھا؟“

جب ہم نے صاحبزادہ فاروق علی خان صاحب سے سوال کیا کہ اس قرارداد کا ملک پر کیا اثر پڑا تو ان کا یہ کہنا تھا کہ کوئی اثر نہیں پڑا نہ اچھا نہ برا۔ نہ ملک پر کوئی اثر پڑا اور نہ احمدیوں پر کوئی اثر پڑا۔

عبد الحفیظ پیرزادہ صاحب نے اس سوال کے جواب فرمایا کہ اس قسم کے فیصلوں کا کبھی ملک پر اچھا اثر نہیں پڑتا۔ جب یہ سوال پروفیسر غفور صاحب سے کیا گیا تو انہوں نے فرمایا کہ میرے نزدیک تو یہ فیصلہ نہایت مناسب ہوا اور قادیانیوں کی پوزیشن بھی ایک مرتبہ آئین میں متعین ہو گئی۔

---

(1) اور لائن کٹ گئی، مصنفہ کوثر نیازی، جنگ پبلیکیشنز فروری 1987ء ص 15 تا 18۔

(2) Zulfikar Ali Bhutto and Pakistan 1967-1977, by Rafi Raza, published by OXFORD University Press 1997p317.

(3) Zulfikar Ali Bhutto and Pakistan 1967-1977, by Rafi Raza, published by OXFORD University Press 1997p318.

(4) اور لائن کٹ گئی، مصنفہ کوثر نیازی، جنگ پبلیکیشنز فروری 1987ء ص 40۔

(5) Zulfikar Ali Bhutto and Pakistan1967-1977,by Rafi Raza,published by OXFORD University Press 1997p295.

(6) نوائے وقت 8/ جنوری 1977ء ص1۔

(7) Zulfikar Ali Bhutto and Pakistan1967-1977,by Rafi Raza,published by OXFORD University Press 1997 p345,346.

(8) If I am Assassinated,by ZA Bhutto,published by Classic Lahore, p170 .

(9) If I am Assasinated,by ZA Bhutto,published by Classic Lahore, p149.

(10) اور لائن کٹ گئی، مصنفہ کوثر نیازی، جنگ پبلیکیشنز فروری1987ء ص134۔

(11) Bhutto Trial Documents,compiled by Syed Afzal Haider,National Comission on History and Culture, p27

(12) If I am Assassinated,By ZA Bhutto,published by Classic Lahore, p193&194.

(13) Bhutto Trial and Execution,by Victoria Schofield,Published by Classic Mall Lahore,169-183

(14) ذوالفقار علی بھٹو، ولادت سے شہادت تک، مصنفہ سجاد علی بخاری ناشر فکشن ہاؤس 1994ء ص256 تا 262۔

(15) ذوالفقار علی بھٹو بچپن سے تختہ دار تک، مصنفہ سلمان تاثیر، ناشر سلمان تاثیر نومبر 1988ء، ص201۔

(16) ذوالفقار علی بھٹو، ولادت سے شہادت تک، مصنفہ سجاد علی بخاری ناشر فکشن ہاؤس 1994ء ص259۔260۔

(17) The Pakistan Times, Dec. 20 1978, p5

(18) ذوالفقار علی بھٹو، ولادت سے شہادت تک، مصنفہ سجاد بخاری ناشر فکشن ہاؤس 1994ء 263۔

(19) محضر نامہ، ناشر اسلام انٹر نیشنل پبلیکیشنز لمیٹڈ، ص5۔

(20) بھٹو کے آخری 323 دن، مصنفہ کرنل رفیع الدین، ناشر احمد پبلیکیشنز لاہور جولائی 2007ء، ص67۔

(21) بھٹو کے آخری 323دن، مصنفہ کرنل رفیع الدین، ناشر احمد پبلیکیشنز لاہور جولائی 2007ء، ص75۔

(22) بھٹو کے آخری 323دن، مصنفہ کرنل رفیع الدین، ناشر احمد پبلیکیشنز لاہور جولائی 2007ء، ص118۔119۔

(23) بھٹو کے آخری 323دن، مصنفہ کرنل رفیع الدین، ناشر احمد پبلیکیشنز لاہور جولائی 2007ء، ص120۔

(24) If I am Assassinated, by Z. A. Bhutto, Published by Classic Lahore, p91.

(25) بھٹو کے آخری 323 دن ، مصنفہ کرنل رفیع الدین ، ناشر احمد پبلیکیشنز لاہور جولائی 2007ء، ص 93۔

(26) روزنامہ مساوات 26/ جنوری 1997ء ص 3۔

1974ء کے فیصلہ کا منطقی انجام

اب 2012ء میں پاکستان کے جو حالات ہیں وہ سب پر واضح ہیں۔ تنگ نظری اور تعصب کے جن راستوں پر جو سفر 1974ء میں شروع کیا گیا تھا، اس نے آج ملک اور قوم کو ایک بھیانک موڑ پر لا کھڑا کیا ہے۔ یہ عمل صرف احمدیوں تک محدود نہیں رہا۔ پچھلے چند سالوں میں وہ خوفناک مناظر دیکھنے میں آئے جن کا 1974ء میں تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ مسلمانوں نے ایک دوسرے کا خون بہایا۔ مساجد میں نمازیوں کو شہید کیا گیا۔ حضرت داتا گنج بخش جیسے بزرگوں کے مزار میں بھی دھماکے کئے گئے۔ نہ عام آدمی محفوظ رہا اور نہ بڑے بڑے لیڈر محفوظ رہے۔ 1974ء میں ملک کے وزیرِ اعظم کی صاحبزادی اور ملک کی سابق وزیرِ اعظم بھی اس قتل و غارت کا نشانہ بنیں۔ ملک میں بغاوت کی فضا قائم کر دی گئی۔ عملاً بعض علاقوں پر حکومتِ پاکستان کی عملداری ختم کر دی گئی۔ حتیٰ کہ ملک کے دارالحکومت میں بھی بغاوت کھڑی کرنی کی کوشش کی گئی جسے کئی روز کے آپریشن کے بعد ختم کیا گیا۔ دہشت گردوں نے خود پاکستان کی فوج کو اور ان کے مراکز کو بھی بار بار نشانہ بنایا یہاں تک کہ ایک روز پاکستان کے شہریوں نے یہ روح فرسا خبر بھی سنی کہ دہشت گردوں نے پاکستان کی بری افواج کے ہیڈ کوارٹر پر بھی حملہ کر دیا ہے۔ ہر پڑھنے والے کے ذہن میں یہ سوال اُٹھے گا کہ ایسا کیوں ہوا کہ مسلمان ایک دوسرے کا خون بہانے لگ گئے اور پاکستان کو پوری دنیا میں ایک تماشہ بنا دیا گیا؟ کیا اس بھیانک عمل کا فتاویٰ تکفیر سے بھی کوئی تعلق ہے؟ پوری دنیا میں اس موضوع پر بہت کچھ لکھا گیا ہے اور آئندہ بھی لکھا جائے گا۔ ہم ان میں سے صرف ایک تحقیق کی مثال پیش کرتے ہیں۔ یہ تحقیق سید سلیم شہزاد صاحب کی کتاب Inside Al-Qaeda and Taliban کی صورت میں پوری دنیا میں شہرت پا چکی ہے۔ اس تحقیق کی پاداش میں سید سلیم شہزاد صاحب کو بھی نامعلوم قاتلوں نے بے رحمی سے قتل کر دیا۔

اس کتاب میں مصنف نے اس سوال کا تفصیلی جائزہ لیا کہ یہ نوبت کیوں آئی کے خود مسلمانوں نے اپنی ہی حکومت کے خلاف بغاوت کر دی اور نہ صرف حکومت سے وابستہ اشخاص کو بلکہ عام مسلمانوں کو بھی قتل و غارت کا نشانہ بنایا جبکہ یقینی طور پر یہ عمل اسلام کی تعلیمات کے خلاف تھا۔ سید سلیم شہزاد صاحب اپنی کتاب کے ایک باب Takfeer and Kharuj میں اس سوال کا جائزہ لیتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ پہلے یہ سوال اُٹھایا گیا کہ کیا یہ حکومت اور اس سے وابستہ افراد اور افواج سے وابستہ افراد مسلمان ہیں کہ نہیں؟ اور پھر اپنے گروہ میں اس کا یہ جواب پیش کیا گیا اور ان کے ذہنوں میں اچھی طرح راسخ کرایا گیا۔

The conclusion arrived at by one strain of this debate is that barring small clusters in Muslim societies, the majority of the people who call themselves Muslims have in fact given up Islam. This has not come from purely academic debate or sectarian discussion of a particular clerical order, but is factually basis of Al-Qaida's ideology which todays paradoxically aims at polarization of societies in the Muslim world .

(Inside Al-Qaeda and the Taliban beyond Bin Laden and 9/11, by Syed Salim Shahzad, published by Pluto Press,2011,p 124)

ترجمہ: ایک مکتبہ فکر نے یہ نتیجہ نکالا کہ مسلمانوں کے معاشرے میں چھوٹے چھوٹے گروہوں کو چھوڑ کر باقی وہ تمام لوگ جو اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں، دراصل اسلام کو ترک کر چکے ہیں۔ یہ محض کوئی نظریاتی یا فرقہ وارانہ بحث نہیں تھی جو کہ علماء کے ایک طبقہ کی طرف سے کی جارہی تھی بلکہ حقیقت میں القاعدہ کے نظریات کی بنیاد ہے اور یہ ایک تضاد ہے کہ اس کا مقصد عالمِ اسلام میں اختلاف پیدا کرنا ہے۔

تو اس طرح اس عمل کا یہ خوفناک نتیجہ نکلا پہلے تو حکومت کو استعمال کر کے تکفیر کا عمل شروع کرایا گیا تھا اور پھر آخر میں یہ ہوا کہ اس عمل کو ہاتھ میں لے کر جس کو چاہا کافر، مرتد اور واجب القتل قرار دے دیا اور جب اس گروہ کے مفادات نے تقاضا کیا تو اس وقت مسلمان ممالک کی حکومتوں اور ان سے وابستہ تمام افراد کو بھی کافر قرار دے کر ان ممالک میں بسنے والے مسلمانوں کو ان کے خلاف بغاوت پر آمادہ کیا جیسا کہ اس تاریخی عمل کا جائزہ لیتے ہوئے سید سلیم شہزاد صاحب لکھتے ہیں:۔

That situation necessitated a strategy that would separate all newly popped up Islamic factions from statecraft and bring then under Al-Qaeda. Takfeer (declaring them apostate) was the best way in which to serve this cause. From the mid 1990's carefully crafted literature was published and circulated .

(Inside Al-Qaeda and the Taliban beyond Bin Laden and 9/11, by Syed Salim Shahzad, published by Pluto Press,2011,p 134)

یعنی صورت حال کا تقاضا تھا کہ ایسی حکمتِ عملی اپنائی جائے کہ مسلمانوں میں بننے والے یہ گروہ ریاستی اداروں سے مکمل طور پر علیحدہ رہیں۔ تکفیر اس مقصد کو حاصل کرنے کا آسان ترین حل تھا۔ اس مقصد کے لئے 1990ء کی دہائی کے وسط سے بہت احتیاط سے تیار کیا گیا لٹریچر شائع کیا گیا اور پھیلایا گیا۔

اور صرف یہ ہی نہیں بلکہ تکفیر کو ایک باقاعدہ پیشہ بنا کر اس کے قوائد کے بارے کتب شائع کی گئیں اور انہیں پھیلایا گیا۔ جیسا کہ اس کتاب میں لکھا ہے کہ دیگر لٹریچر کے علاوہ ایک کتاب ” قوائد التکفیر “ کی باقاعدہ اشاعت کی گئی کہ مسلمانوں کو کافر قرار دینے کے قوائد کیا ہیں؟

پاکستان میں اس عمل کو آگے بڑھانے کے لئے یہ فتوے تیار کئے گئے اور یہ مرحلہ آیا کہ علماء کی ایک مجلسِ شوریٰ طلب کی گئی اور اس نے پاکستان کی حکومت کے کافر ہونے کا فتویٰ صادر کیا اور اس کی غرض یہ تھی کہ اپنے زیرِ اثر لوگوں کو خروج (بغاوت) پر آمادہ کیا جائے۔ بات آگے بڑھی تو پاکستان کے دار لحکومت میں موجود ایک دارالافتاء نے یہ فتویٰ دیا کہ جو جو پاکستانی فوجی جو جنوبی وزیرستان میں لڑتے ہوئے شہید ہوئے ہیں، نہ ان کی نمازِ جنازہ پڑھی جائے اور نہ انہیں مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کیا جائے۔ پھر سوات میں تسلط حاصل کر کے ایک جلسہ عام میں یہ فتویٰ صادر کیا گیا کہ جمہوریت کفر ہے اور پاکستان کی ہائی کورٹس اور پاکستان کی سپریم کورٹ شرک کے ایسے مراکز ہیں جہاں بتوں کی پرستش کی جاتی ہے۔

Inside Al-Qaeda and the Taliban beyond Bin Laden and 9/11, by Syed Salim) (Shahzad, published by Pluto Press,2011,p46, 160, 174

یہ کوئی اتفاق نہیں تھا کہ حالات اس انتہا کو پہنچے۔ یہ ایک سوچا سمجھا منصوبہ تھا اور جماعتِ احمدیہ کے محضر نامہ کے صفحہ 167 پر یہ انتباہ کر دیا گیا تھا اور باقاعدہ ثبوت درج کر کے کیا گیا تھا کہ ابھی سے یہ منصوبے بن چکے ہیں کہ تنگ نظر گروہ دوسرے فرقوں سے وابستہ افراد پر کفر کے فتوے لگانے اور ان کو واجب القتل اور واجب التعزیر قرار دینے کی تیاریاں کر رہے ہیں اور جیسا کہ ہم ذکر کر چکے ہیں سوال وجواب کے دوران بھی حضور نے ممبرانِ اسمبلی کے سامنے یہ انتباہ کر دیا تھا اور اپنی آخری تقریر میں اٹارنی جنرل صاحب نے یہ نامعقول نظریہ پیش کیا تھا کہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر کفر کے فتوے لگانے سے نہ صرف کوئی انتشار نہیں پیدا ہوتا بلکہ مذہبی معاملات میں ذہنی ترقی ہوتی ہے۔ اب نتیجہ سب کے سامنے ہے۔ پڑھنے والے خود فیصلہ کرسکتے ہیں کہ کون صحیح تھا اور کون غلط؟

اب ایک ہی راستہ ہے۔ پاکستان کو اس منزل کی طرف سفر شروع کرنا ہوگا جس کا تعین قائدِ اعظم نے 11/اگست 1947ء ان الفاظ میں کیا تھا۔

You are free; you are free to go to your temples. You are free to go to your mosques or any other place of worship in this state of Pakistan. You may belong to any religion or cast or creed that has got nothing to do with the business of the state .

یعنی آپ آزاد ہیں۔ آپ اپنے گرجوں میں جانے کے لئے آزاد ہیں۔ پاکستان کی ریاست میں آپ اپنی مساجد میں یا جو بھی عبادت کی جگہ ہے جانے کے لئے آزاد ہیں۔ آپ کا جو بھی مذہب، ذات یا مسلک ہو اس کا ریاستی معاملات سے کوئی تعلق نہیں۔

جہاں تک مذہبی معاملات کا تعلق ہے ہر ایک کو اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہمیشہ راہنما اصول کے طور پر سامنے رکھنا چاہئے:

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ(البقرۃ:257)

دین کے معاملے میں کوئی جبر نہیں